مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اسلامیات

پہلا پرچہ

اسلام۔تعارف اور تعلیمات

(ایم۔اے، سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

(Accredited "A" Grade by NAAC)

پروفیسر محمد میاں
شیخ الجامعہ

ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد
نائب شیخ الجامعہ

پروفیسر کے۔آر۔اقبال احمد
ڈائرکٹر

ڈاکٹر محمد فہیم اختر
کورس کوآرڈی نیٹر

خود اکتسابی مواد برائے

اسلامک اسٹڈیز (سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-500032

EPABX : 040-23008402/03/04

یونیورسٹی فون نمبر: 040-23006612-15

www.manuu.ac.in

طبع: 2014

کاپی رائٹ © مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی انداز میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کتاب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نصاب کا ایک جزو ہے۔

تحریری معاونین

مصنفین:

نام	اکائیاں
ڈاکٹر محمد ارشد	1 تا 5
ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی	6 تا 10
مولانا محمد اعظم ندوی	11 تا 13
ڈاکٹر جمشید احمد	14 تا 17
ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی	18 تا 21

مدیرین:

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

ڈاکٹر وارث مظہری

مدیر اعلیٰ: (تصحیح، تہذیب، ترتیب)

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

فہرست مضامین

بلاک 1 : عقائدوایمانیات

اکائی:1	توحید (ایک اللہ پر ایمان)	12-35
اکائی:2	رسالت (رسولوں پر ایمان)	36-50
اکائی:3	آخرت	51-70
اکائی:4	فرشتے اور آسمانی کتابیں	71-92
اکائی:5	تقدیر	93-105

بلاک 2 : عبادات

اکائی:6	نماز	109-131
اکائی:7	روزہ	132-147
اکائی:8	زکاۃ	148-163
اکائی:9	حج	164-179
اکائی:10	جہاد	180-190

بلاک 3 : معاملات

اکائی:11	حقوق اللہ	193-216
اکائی:12	حقوق العباد	217-249
اکائی:13	آداب زندگی	250-275

بلاک 4 : سیرت نبوی ﷺ

اکائی:14	سیرت کی تدوین	279-303
اکائی:15	سیرت نبوی، (مکی دور)	304-333
اکائی:16	سیرت نبوی (مدنی دور)	334-365
اکائی:17	سیرت نبوی بحیثیت اسوہ حسنہ	366-383

بلاک 5 : خلافت راشدہ

اکائی:18	حضرت ابوبکر صدیقؓ	387-415
اکائی:19	حضرت عمر ابن خطابؓ	416-441
اکائی:20	حضرت عثمان ابن عفانؓ	442-465
اکائی:21	حضرت علی ابن ابی طالبؓ	466-484

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی، ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو زبان کے ذریعے مختلف مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت سائنس اور سماجی علوم کے اندر پانچ سالہ مربوط پی جی پروگرام، سائنس، سماجی علوم، لسانیات، انتظامیہ وکامرس، تعلیم وتربیت اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں یوجی اور پی جی کی سطح سے لے کر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جارہے ہیں، وہیں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جارہے ہیں، جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ وطالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم اے 'اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے، جس کی دوسالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جارہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔اے کے تین سالہ کورس میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر 'اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد 'اسلامیات' کے ساتھ بی اے کی تعلیم مکمل کرچکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ فاصلاتی نظام کے تحت 'اسلامیات' میں ایم اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کئے جارہے تھے۔ اب اسی ضرورت اور طلبہ وطالبات کے تقاضوں کے پیش نظر ایم اے 'اسلامیات' کا آغاز کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کورس کے لئے تیار کئے گئے 'خود تدریسی مواد' (Self Learning Material) کا مجموعہ ہے۔

ایم اے اسلامیات کورس کے لئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کئے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہورہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم اے اسلامیات کا درسی مواد معیاری سطح پر پیش کیا جارہا ہے۔ اور اس سے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہورہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت اور علوم وفنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ شامل ہے۔ اس لئے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں، بلکہ انسانی سماج کے گونا گوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دوسال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے گا۔ سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کے تعارف اور بنیادی تعلیمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسلامی علوم کے تحت قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی وتصوف کے موضوعات کا جامع تعارف پیش کرتے ہوئے ان میدانوں میں ہونے والے علمی کاموں اور اصحاب کار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے مختلف میدانوں سے متعلق اسلامی افکار ونظریات اور ان کی تشکیل میں حصہ لینے والے مسلم اسکالرس اسلامیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر اسلام کے سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظریات کے عناوین کے تحت متعدد اکائیوں کے تحت جامع اور تجزیاتی بحث کی گئی ہے۔ اسی ضمن میں عصر حاضر کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اٹھنے والے اہم ترین سوالات اور مسائل جیسے اسلام اور حقوق انسانی، اسلام اور ماحولیات، اسلام اور خواتین اور اسی طرح اسلام اور علم کے موضوعات پر اسلامی تصورات اور تعلیمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ کے ذیل میں ماقبل اسلام عرب سماج کے مذہبی واخلاقی احوال، اسلام کی آمد، عہد نبوی ﷺ کے مکی اور مدنی دور، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس کی ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر مشرق اور مغرب میں قائم ہونے والی چھوٹی خاندانی حکومتوں کی تمدنی تاریخ کے علاوہ عہد عثمانی کی جامع تاریخ وثقافت پر گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب سال اول کا پہلا پرچہ ہے، جو ''اسلام کا تعارف اور بنیادی تعلیمات'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس میں پانچ بلاک شامل ہیں، جو ایمانیات وعقائد، عبادات، معاملات، سیرت رسول ﷺ اور خلافت راشدہ کے موضوعات پر ہیں۔ ان پانچ بلاکوں میں اکیس اکائیوں کے تحت تعارف اسلام کے تمام ضروری مباحث کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اسلام کے مرکزی دور اور اس کی بنیادی تعلیمات کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصابی مواد کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشورانِ فن سے استفادہ کیا ہے، جنھوں نے بڑی محنت اور استناد کے ساتھ اسے تیار کر کے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی، ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر محمد میاں

شیخ الجامعہ

بلاک:1   عقائدوایمانیات

فہرست

اکائی نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
1.	توحید(ایک اللہ پر ایمان)	12-35
2.	رسالت (رسولوں پر ایمان)	36-50
3.	آخرت	51-70
4.	فرشتے اورآسمانی کتابیں	71-92
5.	تقدیر	93-105

بلاک پڑھنے سے پہلے

حضور نبی پاکؐ کی اس دنیا میں بعثت انسانی تاریخ کے ایک ایسے دور میں ہوئی جب دنیا ضلالت وگمراہی کا گہوارہ بن چکی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو خود کو ان کا پیرو کہنے والے ہی بھلا چکے تھے۔ ہدایت کی جو شمع حضرت موسیٰؑ نے روشن کی تھی، وہ بھی فتنوں کی نذر ہو چکی تھی۔ ایران میں زرتشت کی تعلیمات کا شعلہ بھی سرد پڑ چکا تھا۔ ہندوستان میں آریائی مہا پرشوں کی روحانی ہدایات بھی پوری طرح پامال ہو چکی تھیں۔ ایک شب ظلمت تھی جو پورے عالم پر چھائی ہوئی تھی۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی خدائے واحد، بزرگ و برتر کا نام لیوا نہ تھا۔ یہ حالات تھے جب رحمت ایزدی نے ایک بار پھر دنیا اور انسانیت کو صحیح اور سچے عقیدے سے روشن اور منور کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا فیصلہ جس میں خدائی تعلیمات ہمیشہ باقی رہنے والی تھیں یعنی پیغمبر اسلام، نبی آخرالزماں کی بعثت ہوئی تا کہ وہ رہتی دنیا تک کے لیے خدائی ہدایات وتعلیمات کو واضح کردیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اسے عقل وشعور کی نعمت سے بھی نوازا۔ اسی عقل وشعور کے مطابق انسان تعلق ومعاملہ کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو انسانی تعلقات کی نوعیتیں بنیادی طور پر دو ہیں۔ ایک تعلق تو وہ ہے جو انسان کا اپنے خالق و مالک کے ساتھ ہوتا ہے جس کے تحت وہ اپنے آقا اور رب کے احسانات کا ادراک کرتا اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق اس کا شکر بجالاتا ہے۔ انسانی تعلق کی دوسری نوعیت اپنے جیسے انسانوں اور خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ ہوتی ہے جس کے تحت انسان کی سماجی زندگی آگے بڑھتی ہے۔

انسان کا وہ تعلق جو اس کے رب کے ساتھ ہوتا ہے، وہ فہم وادراک اور قلب وروح سے تعلق رکھتا ہے اور قلبی تعلق میں اعضاء وجوارح اور مال وجائداد بھی شامل ہو جائیں تو اس تعلق کو عبادت کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان اور انسان یا دوسری مخلوقات کے درمیان تعلق کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جس کی حیثیت قانونی ہوتی ہے اور دوسرا تعلق وہ ہے جس کی بنیاد نصح وخیرخواہی ہوتی ہے۔ قانون پر مبنی تعلق کو معاملات کا نام دیا جاتا ہے اور نصح وخیرخواہی پر مبنی تعلق کو اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔

انسانی تعلق کی ان مختلف نوعیتوں کو--- خواہ ان کا تعلق خدا اور بندے سے ہو، انسان اور انسان سے ہو یا انسان اور دیگر مخلوقات سے--- قرآن مجید میں ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کی دنیا وآخرت میں کامیابی کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ آئندہ سطور میں ہماری کوشش ہوگی کہ ایمانیات، یا جنہیں عقائد کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، پر تفصیل سے گفتگو کی جائے اور ان میں سے ایک ایک کو اچھی طرح واضح کیا جائے۔ البتہ عقائد پر فرداً فرداً گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے اور یہ بھی جان لیا جائے کہ بنیادی عقائد میں کون سی چیزیں شامل ہیں اور ان کی اصل کیا ہے۔

عقائد وایمانیات

انسان کا ہر عمل اس کے ارادے کا تابع اور پابند ہوتا ہے اور اس کے ارادے کا محرک وہ جذبات وخیالات ہوتے ہیں جن کا مسکن دل ہے۔ حقیقت میں ان خیالات کی بنیاد کچھ پختہ، مضبوط اور شک وشبہ سے پاک اصولی خیالات پر قائم ہوتی ہے اور انہیں کو

عقائد کا نام دیا جاتا ہے۔اس طرح انسان کے تمام اعمال میں اس کے عقائد کی جھلک موجود ہوتی ہے اور چونکہ اسلام نے عقیدے کو دل سے وابستہ کیا ہے اس لیے دل کی اصلاح اور درستی سب سے پہلے ضروری ہے۔معلم انسانیت حضور نبی پاکؐ کا ارشاد ہے۔

الا و ان فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله، الا وهی القلب.(صحيح بخاری. كتاب الايمان)

ترجمہ: سنو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہو تو تمام جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے۔سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

گویا انسان جو بھی عمل کرتا ہے اس میں اس کا ایمان وعقیدہ کارفرما ہوتا ہے جیسا اس کا ایمان اور عقیدہ ہوگا اسی طرح کے اعمال بھی اس سے صادر ہوں گے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے اور اسے ہونا چاہیے بھی کہ بظاہر تو انسان کے تمام کاموں میں اس کی رہنمائی عقل کرتی ہے جو کچھ اس کی عقل سجھاتی ہے وہ وہی سب کچھ کرتا ہے تو پھر کیوں کر اس کے عمل کا ذمہ دار اس کے عقیدے اور ایمان کو ٹھہرایا جائے۔قدیم زمانے سے لے کر آج تک فلسفیوں نے اسی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کہ جیسی انسان کی عقل اور سمجھ ہوگی اسی طرح کے اعمال بھی اس سے صادر ہوں گے۔لیکن گہرائی سے اگر دیکھا جائے تو عقل بھی آزاد نہیں ہے وہ بھی انہیں تیقنات اور دلی رجحانات کی تابع ہوتی ہے جنہیں ہم عقیدے اور ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔عقل ہمیں مشورے ضرور دیتی ہے لیکن ہم کرتے وہی ہیں جو ہمارا یقین کہتا ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں جہاں بھی عمل صالح کی بات کہی گئی ہے اس سے پہلے ایمان کا ذکر ضرور موجود ہے۔اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عمل وہی قابل قبول ہے جس کے پیچھے ایمان کی قوت ہو۔

دنیا کے تمام مذاہب میں عقائد کا نظام موجود ہے لیکن یا تو ان مذاہب میں عقائد کو جو اہمیت ملنی چاہیے تھی نہیں ملی یا پھر انہیں ذہنی الجھاؤں میں اس طرح پھنسا دیا گیا کہ وہ کسی صحیح عمل کی بنیاد بننے کے قابل ہی نہیں رہے۔اس کے برعکس اسلام میں عمل کو عقیدے کا تابع قرار دیا گیا۔اسلام نے اپنے ماننے والوں کو عقائد کی فلسفیانہ توجیہہ و تاویل میں الجھانے کے بجائے انہیں عمل کرنے پر زیادہ زور دیا ہے اور ایمان لانا صرف انہیں بنیادی حقیقتوں اور سچائیوں پر ضروری قرار دیا ہے جن کے بغیر عمل کے صحیح رخ کا تعین ہی نہیں ہوسکتا اور وہ ابدی حقائق اور سچائیاں قرآن کے الفاظ میں یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِىَ نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِىَ أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللّهِ وَمَلاَئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيداً(النساء:136)

ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور جو اس نے پہلے اتاری۔اور جو شخص انکار کرے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا وہ بہت زیادہ گمراہ ہے۔

اسی کی تعلیم ہمیں اللہ کے رسولؐ کے اس ارشاد میں بھی ملتی ہے جسے ہر مسلمان ایمان مفصل کے طور پر یاد رکھتا اور اپنے اعمال میں رہنما بناتا ہے اور جس کا ذکر حدیث جبرئیل میں ہے یعنی:

أن تـومـن بـالـلـه و مـلائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتومن بالقدر خيره وشره

(مسلم: کتاب الایمان)

ترجمہ: یہ کہ تم ایمان رکھو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور ایمان رکھو تقدیر کی بھلائی اور برائی پر۔

یہ وہ ابدی سچائیاں ہیں جن پر دل کی گہرائیوں سے یقین اور جن کا زبان سے اقرار ضروری ہے۔ جب تک کوئی انسان ان کو پوری طرح تسلیم نہیں کر لیتا دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کا کوئی نیک عمل اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ یہ تسلیم کرے کہ اللہ ایک ہے وہ اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ سارے کام اسی کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ ایک پتا بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ اسے تمام چیزوں کا علم ہے، ان کا بھی جو ہمیں نظر آتی ہیں اور ان کا بھی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اللہ کے ساتھ اس کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کی مرضی کا علم ہمیں انہیں کے واسطے سے ہوا۔ اور انبیاء کے سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمدؐ ہیں۔ اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کیونکہ اللہ کے قوانین کا نفاذ انہیں کے ذریعے ہوتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہوتے ہیں اور انسان کے اعمال پر نظر بھی رکھتے ہیں۔ اللہ کی ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو عطا ہوئیں انہیں سینوں اور صحیفوں میں محفوظ رکھا گیا اس لیے ان کتابوں کی سچائی اور صداقت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید ہے جو حضرت محمدؐ کو عطا ہوئی۔ انسان کو جب تک اپنے اعمال کی بازپرس اور جواب دہی کا خطرہ اور ڈر نہ ہو وہ سیدھے راستے پر گامزن نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ آخرت کے عقیدے یعنی موت اور موت کے بعد جزا و سزا کا ماننا ضروری ہے۔ آخرت کا عقیدہ انسان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسے دنیا میں درندہ بننے سے بچاتا ہے۔

یہ وہ چھ بنیادی عقائد ہیں جن کو تسلیم کرنا اور جن کو اپنے عمل کی بنیاد بنانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ انسان کے تمام اعمال اکارت ہو جائیں اگر ان کے پیچھے ان بنیادی عقائد کی روح کارفرما نہ ہو۔

بنیادی عقائد کی تعداد کے حوالے سے ایک اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قرآن میں پانچ کا ذکر ہے اور حدیث میں چھ کا ذکر ہے یعنی تقدیر پر ایمان اللہ پر ایمان میں شامل ہے اس لیے قرآن میں الگ سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جب کہ حدیث میں بعض مصالح کی وجہ سے تقدیر کا الگ سے اس کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی ہر عقیدہ کے علیحدہ مستقل بیان کی طرف۔

اکائی 1 : توحید (ایک اللہ پر ایمان)

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

1.2 تمہید

1.3 توحید کا معنی ومفہوم

1.4 حقیقت توحید

1.5 توحید کے دلائل

1.5.1 توحید کے عقلی دلائل

1.5.2 توحید کے دلائل قرآن میں

1.6 اللہ کے اسماء وصفات

1.6.1 اسماء وصفات جمال

1.6.2 اسماء صفات جلال

1.6.3 اسماء صفات کمال

1.6.3.1 اسماء وصفات وحدانیت

1.6.3.2 اسماء وصفات وجود

1.6.3.3 اسماء وصفات علم

1.6.3.4 اسماء وصفات قدرت

1.6.3.5 اسماء وصفات تنزیہہ

1.7 صفات کے بیان کا مقصد

1.8 عقیدۂ توحید کے تقاضے

1.9 عقیدہ توحید کا اثر انسانی زندگی پر

1.10 خلاصہ

1.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1.1 مقصد

اس اکائی کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے تصورِ توحید کو اس کے تمام لوازم کے ساتھ اس طرح بیان اور واضح کر دیا جائے کہ طالب علم اس کے مطالعے کے بعد توحید اور ایک اللہ پر ایمان کے حوالے سے تمام طرح کے سوالات اور شکوک وشبہات کو نہ صرف یہ کہ خود اپنے ذہن ودماغ سے رفع کر سکے بلکہ توحید کے مختلف پہلوؤں پر جو بھی اور جس طرح کے بھی سوالات اٹھتے اور قائم ہوتے ہیں ان کے جواب دینے کا اہل ہو جائے۔ اس اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ توحید کا معنی ومفہوم بتانے اور بیان کرنے کے بعد توحید کا ایک ایسا جامع ومانع تخیل پیش کریں جو قرآن وسنت سے مدلل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم یہ بھی کوشش کریں گے کہ توحید کے عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل پیش کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی بحث بہت ہی قدیم ہے۔ ہم اس بحث کے الجھاؤ میں نہ پڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور صفات کی مختلف اقسام کا اجمالی تعارف پیش کر دیں۔ اکائی کے آخر میں یہ بتانے کی بھی کوشش کی جائے گی کہ توحید کا عقیدہ کیوں ضروری ہے اور انسانی زندگی پر توحید کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟۔

1.2 تمہید

کسی بھی عقل وشعور کے حامل انسان کے ذہن ودماغ پر جو سوالات بار بار دستک دیتے ہیں ان میں ایک بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھ یہ لامحدود کائنات کیسے اور کیونکر وجود میں آ گئے؟ ان کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ کون ہے جس کی طاقت وقوت اس تمام رنگ ورعنائی کے پیچھے کارفرما ہے۔ جس نے انسان سمیت اس تمام عالم رنگ وبو کو وجود بخشا ہے وہ تنہا اور اکیلا ہے یا پھر اس کے کچھ شریک اور ساجھی دار بھی ہیں؟ یہ اور اس طرح کے دیگر سوالوں کے جواب انسان کو دو طرح سے ملتے ہیں۔ ا۔ ایک عقل کے ذریعے لیکن انسانی عقل ناقص ہے اس لیے اس راہ میں ٹھوکریں کھاتی اور گمراہ ہوتی ہے۔ ۲۔ دوسرا طریقہ وحی کا ہے یعنی انسان کا خالق ومالک اپنے منتخب بندوں کے توسط سے انسانی سوالات کے جواب دیتا ہے۔ عقل کے مقابلے وحی زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔ آخری وحی اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی ہے اس لیے ان تمام سوالات کے جواب کے لیے سب سے معتبر اور مستند گواہی حضرت محمدؐ کی ہے۔

توحید کو حضرت محمدؐ کی تعلیم میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بنیاد کلمہ لا الٰہ الا اللہ (کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے) ہے۔ اس کلمے میں ہر طرح کے شرک کی نفی کرنے کے بعد کامل توحید کا اثبات ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے جس کا اقرار یا انکار انسان کی دنیا بدل دیتا ہے۔ جو لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں وہ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) میں شامل ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اس کلمے کا انکار کرتے ہیں وہ غیر اللہ کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ توحید کے اقرار کے بعد انسان کی شان ہی بدل جاتی ہے۔ اس کے روز وشب بدل

جاتے ہیں۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ ایک خدا کے سامنے سر جھکا کر وہ در در کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اس کی پوری زندگی بامقصد بن جاتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ جبکہ توحید کا انکار کرنے والا انسان ہر طرح خسارے میں رہتا ہے۔ اس کے سامنے نہ تو کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور اس کے لیے تگ و دو۔ چنانچہ ایک بے مقصد زندگی کی جتنی برائیاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس میں در آتی ہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی بھٹکتا پھرتا ہے اور ناکام و نامراد اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ آیئے اس تمہید کے بعد توحید کے معنی و مفہوم اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

1.3 توحید کا معنی و مفہوم

توحید عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ''وحد'' ہے اور اس کا لفظی معنی ایک بنانا یا یکتائی کو ثابت کرنا ہے۔ اسی لیے متکلمین اسلام کے نزدیک لفظ توحید کا اطلاق اللہ کی وحدانیت اور توحد پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح توحید کا معنی اللہ کو ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ اصطلاح میں توحید کا معنی یہ ہوا کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو اس کا شریک نہ مانا جائے یعنی یہ عقیدہ رکھا جائے کہ الٰہ ہونے اور الوہیت کی خصوصیت میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا شریک اور ساجھی دار نہیں ہے۔ گویا توحید کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی یک لفظی تعبیر ہے یعنی اللہ تعالیٰ ایک ایسی ہستی ہے جس کی شان، جلال اور برتری ایسی ہے کہ اس کی پرستش، عبادت اور بندگی کی جائے وہی ایک ایسی ذات ہے جس کے آگے سر جھکایا جائے، وہ بے انتہا قدرت کا مالک ہے، عقل اس کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور زندگی کے معاملات میں سب اس کے محتاج ہیں اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور ہیں۔

توحید شرک کی ضد ہے اس لیے توحید کو صحیح طریقہ پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شرک کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جانا جائے۔ قرآن اور پیغمبر اسلام نے شرک کو تمام برائیوں کی جڑ بتایا ہے۔ قرآن کے الفاظ بہت واضح ہیں:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ

ترجمہ: شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کرسکتا ہے لیکن شرک اسے کسی حال میں بھی برداشت نہیں اور نہ وہ شرک کرنے والے کو معاف کرے گا:

إِنَّ اللَّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاء (النساء:116)

ترجمہ: یقیناً اللہ شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کردے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چلانے کے لیے ایک سلسلۂ اسباب قائم کیا ہے اور خود مسبب الاسباب ہے۔ شرک کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ انسان اسباب کو ہی اصل مان لیتا ہے اور پھر خدا کو چھوڑ کر انہیں کے آگے سر جھکانے لگ جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے دنیا میں شرک کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہوسکتی تھیں سب کا استیصال کیا ہے مثلاً:

آپؐ کے زمانے میں جو قومیں بھی موجود تھیں انہوں نے متعدد خدا بنا لیے تھے مختلف کاموں کے لیے مختلف خدا تھے۔ سب سے پہلے آپؐ نے اس تصور پر ضرب لگائی اور بتایا کہ خدا ایک ہے۔ دو، تین یا اس سے زیادہ خدا نہیں ہو سکتے کیونکہ اس طرح نظام عالم ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

شرک کا ایک بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ بزرگوں اور بڑوں کی ایسی تعظیم و تکریم کی جائے جو شرک تک پہنچ جائے۔ اس کو شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی ایسی تکریم کی کہ انہیں خدا بنا دیا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کے لیے ان کی تنبیہ کی گئی ہے۔ خود آں حضرتؐ کے بارے میں کہا گیا:

قل انما انا بشر مثلكم يوحى إلى انما إلهكم إله واحد (الكهف:110)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

شرک یہ بھی ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے درمیانی واسطے بنا لیے جائیں اور یہ جانتے ہوئے بنا لیے جائیں کہ یہ خدا نہیں ہیں لیکن خدا کے دربار میں سفارشی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا سے نہ مانگ کر سب کچھ انہیں سے مانگا جانے لگتا ہے اور جو التجائیں اور دعائیں خدا سے کی جانی چاہئیں وہ ان واسطوں سے کی جانے لگتی ہیں۔ اسلام نے اس سے بھی روکا ہے اور بتایا ہے کہ جن سے حاجتیں مانگی جاتی ہیں اور جنہیں بھی حاجت روا سمجھا جاتا ہے انہیں اس دنیا میں کسی بھی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ شرک کا ایک بڑا ذریعہ وہ غلط فہمی بھی ہے جو لوگوں میں خوارق عادات یعنی معجزات و کرامات کے حوالے سے پائی جاتی ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جن سے یہ امور سرزد ہوئے ہوتے ہیں وہ خدا نہ بھی ہوں تو خدائی میں کسی قدر دخل ضرور رکھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر وہ ان سے اپنی ضرورتیں مانگنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی معجزات کا ذکر ہے وہاں باذن اللہ (اللہ کی اجازت سے) کے الفاظ کی قید ضرور لگائی گئی ہے۔

شرک یہ بھی ہے کہ اللہ کے جو اوصاف ہیں وہ دوسروں میں بھی تسلیم کر لیے جائیں مثال کے طور پر علم غیب اللہ کا وصف ہے۔ اب اگر کوئی یہ ماننے لگے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا بھی کچھ لوگوں کو ہے تو یہ شرک ہے۔ قرآن نے اس سے روکا ہے:

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ (النمل:65)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو کہ خدا کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

حضور نبی کریمؐ نے خود اپنی ذات سے بھی غیب کی نفی کی ہے۔ ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ ایک شادی میں موجود تھے اور انصار کی کچھ لڑکیاں گا رہی تھیں، ان کے گانے میں یہ بھی تھا:

وَفِيْنَا رَسُوْلٌ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ

ترجمہ: اور ہم میں ایک ایسا رسول ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آپؐ نے اس سے منع فرمایا۔ (بخاری، کتاب النکاح)

شرک یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کے بارے میں یہ خیال رکھا جائے کہ وہ گناہوں کے باوجود شفاعت کریں گے اور جس طرح دنیوی درباروں میں سفارشیوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں اس طرح اللہ کے دربار میں بھی سفارش کی ضرورت ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ کو چھوڑ کر ان سفارشیوں کی ہی آؤ بھگت میں لگ جاتا ہے اور انہیں کو خوش رکھنا اپنے لیے کامیابی کی ضمانت تصور کرتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے اس طرح کی شفاعت کو غلط قرار دیا ہے اور لوگوں کو اس سے روکا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاء قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئاً وَلَا يَعْقِلُونَ. قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعاً لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ(زمر: 44-43)

ترجمہ: کیا انہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ کہہ دو کہ اگر ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی؟ کہہ دو کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں شفاعت کے عقیدے کی کلی تردید ہے۔ جس شفاعت کی اجازت اللہ کی جناب میں ہوگی وہ حق کی گواہی ہے اور اللہ کی اجازت سے ہوگی۔ یعنی شفاعت وہی کر سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ انہیں لوگوں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود اللہ کو منظور ہوگا۔

یہ اور اس طرح کے شرک کے مختلف اور بھی ذرائع اور شکلیں ہیں جن کا احاطہ یہاں مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ شرک کی کوئی بھی شکل وصورت ہو، خواہ وہ جلی ہو یا خفی، اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہرگز ہرگز قبول نہیں۔ وہ احد (یک وتنہا) ہے۔ وہ بے نیاز ہے (اسے کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت نہیں)۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ ہی وہ جنا گیا ہے۔ (یعنی نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ وہ آپ سے آپ ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا) اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔ (کائنات میں کوئی نہیں جو اس کی برابری کا دعویٰ کر سکے)۔

1.4 حقیقت توحید

توحید اور اس کی حقیقت کو صحیح معنوں میں جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نظر انسانی تاریخ پر ڈالی جائے۔ انسان کی معلوم تاریخ کے جو حالات بھی محفوظ رہ گئے ہیں اور جو کچھ آثار بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں، ان کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی زمانہ اور دور ایسا نہیں گزرا جس میں انسان نے کسی نہ کسی کو خدا نہ مانا ہو اور کسی کی عبادت نہ کی ہو۔ انسان ہر زمانے میں خدا کو مانتا اور اس کے آگے سر جھکاتا رہا ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک دنیا میں جتنی قومیں بھی گزری ہیں یا جو موجود ہیں، خواہ وہ تہذیب وتمدن کے کسی بھی مرحلے میں رہی ہوں ان میں خدا کا تصور ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ اسے صرف مانتی ہی نہیں اس کی عبادت بھی کرتی ہیں۔ گویا خدا کا تصور انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ انسان ہو ہی نہیں سکتا جو خدا کو مانتا نہ ہو۔ آج بھی جب خدا کا انکار اور دہریت کا اعلان بظاہر فیشن بن چکا ہے دنیا کی متمدن سے متمدن اقوام سے لے کر وحشی ترین قوموں تک ہر جگہ خدا کا تصور موجود ہے اور وہ کسی نہ کسی خدا کی پرستش ضرور کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ موجودہ دور کے دہریے بھی جب مشکلات میں پڑتے ہیں تو انہیں خدا کے علاوہ کسی دوسرے کا سہارا نظر نہیں آتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کی ہستی ہے اور ہر کوئی اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور ہے تو پھر وہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اس کی خوبیاں اور صفات کیا کیا ہیں؟ کون سی باتیں ہیں جو اس کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن چیزوں اور باتوں سے اس کی ذات پاک ہے؟ وہ اپنے بندوں سے کس طرح کا تعلق رکھتا ہے؟ اگر کوئی اس کا بندہ ہے تو اسے کیسے اس کے آگے جھکنا چاہیے؟ اس خدا سے بندے کو کیا مانگنا چاہیے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیے؟ بندے کو خدا سے کیوں ڈرنا چاہیے اور اس ڈرنے کی حقیقت کیا ہونی چاہیے؟ کیا خدا سے محبت کی جاسکتی ہے؟ اگر کی جاسکتی ہے تو اس محبت کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کا علم کتنا ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا قریب ہے؟ اس کے تقدس اور بڑائی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟ ہمیں خدا پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے تو کیونکر کرنا چاہیے؟ کیا وہ خدا انسانوں میں سے کچھ لوگوں سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور کیا وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر شے کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ اور اس جیسے دوسرے اور بھی سوالات وہ ہیں، جو انسانی تمدن جیسے جیسے ترقی کرتا جاتا ہے، ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان کے جواب بھی پانا چاہتے ہیں۔

حضور نبی پاکؐ عرب کے جس معاشرے میں مبعوث کیے گئے تھے وہ بہت ہی سادہ معاشرہ تھا، ان عربوں کے ذہن تمدنی ترقیات کے نتیجے میں اٹھنے والے سوالات سے آلودہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے یہاں ایک بزرگ و برتر خدا کا تصور تھا لیکن ان کا تخیل اس سطح کا نہیں تھا کہ وہ خدا کے بارے میں سوالات کی پیچیدہ گتھیوں میں الجھتے۔ لیکن جب اللہ کے رسولؐ ان کے درمیان مبعوث ہوئے تو انہوں نے ان کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کیا وہ ایسا جامع و مانع تھا کہ وہ تمدن کی کسی بھی سطح پر پہنچ جائیں، اس میں ان کے تمام سوالات کا جواب موجود تھا۔

آپؐ نے عربوں کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کیا اس میں انہیں یہ بتایا کہ خدا کی حقیقی عظمت کیا ہے؟ وہ یکا و تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثال بھی ہے کوئی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ انہیں اس سے بھی باخبر کیا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کی قدرت اور مشیت سے ہی ہوتا ہے، اس کے ارادے اور مرضی کے بغیر زمین کا ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ انہیں ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی تعلیم دی جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے۔ جس کے علم کے احاطے میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہے، انسان کو اس کے مواخذے سے ڈرنا چاہیے اور اس کی رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔ وہ ہمیشہ سے انسانوں کا محبوب ہے اور اس کی محبت میں ہی انسان کی سربلندی وسرفرازی ہے۔ اس کا فضل وکرم بے پایاں ہے اور اس کا لطف ومحبت ہر شے کو محیط ہے۔ اس کی قوت سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں، اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ ہے اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض ہے اور اس کی اطاعت ہر مکلّف پر

واجب ہے۔ اس کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور وہ ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ انسانی حافظہ بہت کمزور ہے، وہ بہت جلد چیزوں کو بھلا دیتا ہے چنانچہ انسانوں کی یاد دہانی کے لیے اور ان کے تزکیہ واصلاح کے مقصد سے اللہ نے رسول اور پیغمبر بھیجے۔ ان پیغمبروں کو اللہ سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا اور وہ اس کی ہدایات انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیوی زندگی گزارنے کے لیے کچھ احکام اور قوانین عطا کیے ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اللہ ایسا ہے جو اندھیروں کو روشن کرتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، جو مایوس ہو چکے ہیں ان میں امید کی کرن روشن کرتا ہے، بے قرار دلوں کو تسلی کا سامان فراہم کرتا ہے اور بے کسوں کو سہارا دیتا ہے۔ وہ اللہ ایسا ہے جو ہم سے ہماری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہم جب اور جہاں کہیں بھی اسے پکاریں وہ ہماری سنتا ہے۔ اللہ کو نیکیاں پسند اور گناہوں سے نفرت ہے۔ اسی کے دست قدرت میں ساری کائنات کا نظام ہے وہ جب چاہے زمین و آسمان سب کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ کوئی بھی کام اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس کی یعنی خدا کی رضا و محبت ہی اس دنیوی زندگی کا حاصل ہے۔ اس کی عبادت و اطاعت ہی ہماری تمام کوششوں اور سرگرمیوں کا مرکز و محور ہونا چاہیے اور ہمارے بے بیار دلوں کو اس کی یاد سے ہی راحت ملنی چاہیے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے حضور نبی پاکؐ نے عرب کے ان امیوں کے سامنے پیش کیا تھا جو سادہ دل تھے، جو خدا کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے خدا' یہ تصور آیا اور انہوں نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ جو طاقت کی ہر علامت کے سامنے سر جھکا دیا کرتے تھے اس تعلیم کے نتیجے میں ایسے موحد اور خدا پرست بن گئے کہ کو ان کے سامنے دنیا کی تمام طاقتیں اور قوتیں ہیچ ہو گئیں۔ البتہ خدا کے اس ادراک نے انہیں دنیا سے بے زار اور بے گانہ بھی نہیں کیا۔ نہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی نہ ہی رہبانیت کا لبادہ اوڑھ کر جنگلوں کی راہ لی۔ وہ اس مادّی دنیا میں رہے لیکن اس کی آلائشوں سے ایسے محفوظ کہ انہیں دنیا کی کوئی بھی تجارت و منفعت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرنے پاتی تھی۔ دنیا کی ہر محبت پر اللہ کی محبت غالب تھی۔ اللہ پر ان کا توکل ایسا تھا کہ اس کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے بعد بھی غنی (مالداری) کے نشے میں سرشار رہتے تھے۔ خدا کے خوف نے انہیں تمام ڈروں سے بے نیاز کر دیا تھا اور خدا کی بندگی نے انہیں تمام دنیا کی بندگی سے نجات دلا دی تھی۔

1.5 توحید کے دلائل

خدا ہے اور اس کے سامنے سرِ بندگی کو جھکانا اور خم کرنا چاہیے اس سے تو عقل کے ماروں کے علاوہ کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس کا جو جامع و مانع تصور اوپر کی سطور میں پیش کیا گیا کیا وہ کسی ایک ذات اور ہستی میں سما سکتا ہے؟ انسانی ذہن نے اس معاملے میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور بار بار کھائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ تمدنی ترقی کی ایک خاص سطح تک نہیں پہنچ گیا بار بار اور مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور رسول بھیجتا رہا اور سب سے آخر میں سیدنا حضرت محمدؐ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا۔ انسان جب اپنے آپ کو اور اپنی مجبوریوں کو دیکھتا ہے اور پھر اپنے اردگرد اور اطراف میں بکھرے ہوئے قدرت اور طاقت کے مظاہر کو دیکھتا ہے تو خود بخود اس کے اندر کا جذبہ عبودیت عود کر آتا ہے اور وہ اپنا سر غرور خم کرنا چاہتا ہے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سر جھکے تو کس کے سامنے جھکے؟ طاقت کے تمام مظاہر کے سامنے جھکے۔ ان میں سے کچھ کے سامنے جھکے یا پھر کسی ایسی ماوراء اور بالاتر ہستی کے سامنے

جھکے جس کے تابعِ فرمان یہ سب ہیں۔ انسانی ذہن جیسے جیسے ترقی کرتا جاتا ہے اس کا تصور خدا بدلتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مرحلے میں جب وہ کائنات اور اس کے نظام پر گہرائی کے ساتھ غور وخوض کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات ایک لگے بندھے نظام کا حصہ ہے۔ اس میں کہیں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور اس منظّم ترین نظام کی پشت پر کوئی ایک ہی قوت کارفرما ہوسکتی ہے اور پھر ایسے میں اگر اسے خدائی ہدایت اور رہنمائی --- جو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی اور سب سے آخر میں حضرت محمدؐ اسے لے کر آئے --- بھی مل جاتی ہے وہ خدائے واحد تک پہنچ جاتا اور موحد بن جاتا ہے۔

1.5.1 توحید کے عقلی دلائل

دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی چیز ہو، وہ خود بخود نہیں بن جاتی، کوئی نہ کوئی اس کا خالق اور بنانے والا ہوتا ہے۔ جب یہ معمولی چیزیں بھی کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتیں تو پھر یہ زمین، یہ آسمان، یہ سورج، یہ چاند یہ پوری کائنات خود بخود تو وجود میں نہیں آئی ہوگی۔ ان کا بھی کوئی خالق اور بنانے والا ہوگا۔ اور چونکہ ان تمام تخلیقات میں ایک طرح کا توافق اور توازن ہے اس لیے ان کے خالق اور بنانے والے کئی نہیں ہوسکتے۔ کوئی ایک ہی ہستی ہے جس نے ان کی تخلیق کی ہے۔

یہ پوری کائنات جو ہمارے سامنے بظاہر بکھری پڑی نظر آتی ہے اور جس کے معمولی سے حصّے کو بھی ابھی تک انسانی عقل سمجھ نہیں پائی ہے اس میں جو یکسانی ونظم ہے۔ مخلوقات کے درمیان جو تعاون واشتراک اور اتحاد ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ کائنات کی وحدت کی دلیل ہے بلکہ اس کی بھی دلیل ہے کہ کوئی ایک ہی ہستی ہے جس نے نہ صرف ان چیزوں کو پیدا کیا بلکہ انہیں ایک انتظام میں پرو دیا ہے۔ اگر وہ خدا واحد اور اکیلا نہ ہوتو پھر یہ نظام عالم قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ غور کیجیے دنیا میں کوئی بھی چیز اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہوسکتی جب تک اس دنیا میں کارفرما تمام قوتوں میں توافق، تعاون اور اشتراک عمل نہ ہو۔ زمین سے ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں اُگ سکتا جب تک کہ خود اس میں اُگنے کی صلاحیت نہ ہو، زمین میں اسے اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، ہوا، پانی اور موسم اس کے مناسب اور موافق نہ ہوں، سورج سے اسے مناسب گرمی اور روشنی نہ ملے جب یہ تمام عناصر اور ان کی قوتیں ایک توازن کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تب کہیں جا کر دانہ زمین سے اگتا ہے، برگ و بار لاتا ہے اور انسانیت کے لیے سودمند ہوتا ہے، اگر خدا ایک نہ ہو، کئی خودمختار قوتیں ہوں تو پھر ایک لمحے کے لیے بھی یہ نظام عالم قائم نہ رہ پائے۔ باہم متصادم اور ٹکرا کر یہ ختم ہوجائے۔ اگر ایسا نہیں ہورہا ہے اور بلاشبہ نہیں ہورہا ہے تو پھر ہمیں یہ ماننا اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا ایک ہے اور خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہی ہے جس نے نظام عالم اور کائنات کو قائم رکھا ہے۔

توحید یعنی خدا کے ایک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ زمین وآسمان اور پوری کائنات کی ایک ایک چیز ایک نظم وضبط اور اصول وقانون کی پابند ہے سورج چاند سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی اور جمادات ونباتات تک جہاں بھی نظر جاتی ہے یہی معلوم پڑتا ہے کہ ہر ایک مقررہ نظام اور اصول کا پابند ہے۔ وہ اس قانون سے ذرا بھی نہیں ہٹتا اور یہ قانون کی پابندی ہی اس دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ انسان خود اپنے وجود ہی پر نظر ڈالے تو وہ خدا کی وحدانیت کا قائل ہوجائے۔ بظاہر آزاد اور خودمختار نظر آنے والا انسان کتنا پابند ہے کہ اگر اس پابندی کے بند کو وہ توڑنا چاہے تو اس کا وجود ختم ہوجائے۔ وہ آنکھ سے دیکھتا ہے، کان سے سنتا ہے، پاؤں سے چلتا ہے، دماغ سے سوچتا ہے۔ اب غور کیجیے انسان اگر ان پابندیوں کو توڑنا چاہے، ان میں سے کسی عضو سے اس کے

مخصوص کام کے بجائے کوئی دوسرا کام لینا چاہے تو کیا اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ بلاشبہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ کچھ اصولوں اور ضابطوں کا پابند ہے اور اسے ان اصولوں اور ضابطوں کا پابند جس ہستی نے بنایا ہے وہ ایک ہے اور وہ خدائے واحد کی ہستی ہے۔

1.5.2 توحید کے دلائل قرآن میں

قرآن مجید جس زمانے میں نازل ہوا یا رسول اللہؐ کی بعثت جس زمانے میں ہوئی، شرک و بت پرستی پوری دنیا میں عام تھی۔ خدائے واحد کے نام لیوا کہیں باقی نہیں رہے تھے۔ اس وقت کی جو مشہور و معروف قومیں تھیں یا تو وہ شرک میں مبتلا تھیں یا قدرتی مظاہر کو خدا مان کر بت پرستی میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔ لیکن یہ نزول یکبارگی نہیں ہوا۔ ایک تدریج کے ساتھ ۲۳/ برس کی مدت میں اللہ نے اپنے احکام وتعلیمات رسول اللہؐ کو عطا کیے۔ اس ۲۳/ سالہ مدت میں بھی اگر غور کیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ نبوت کے بعد کی پوری مکی زندگی میں کامل تیرہ برس تک قرآن مجید جو کچھ بھی نازل ہوا اس میں بنیادی طور پر جو تعلیم سب سے نمایاں ہے وہ توحید کا اثبات اور شرک کا--- اس کی تمام شکلوں کے ساتھ--- ابطال اور تردید ہے۔ اس تمام مدت میں روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسی اہم عبادات بھی فرض نہیں کی گئیں۔ بس لا الہ الا اللہ کی جڑوں کو راسخ و مستحکم کیا جاتا رہا۔ سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ قرآن مجید کی ایک تہائی تعلیم یعنی توحید کا خلاصہ ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (1) اللَّهُ الصَّمَدُ (2) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (3) وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ (4)

(سورہ اخلاص)

ترجمہ: کہہ دو! اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے (یعنی سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں) نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

قرآن مجید کی یہ سورہ توحید کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اس میں خدا کی وحدانیت، اس کے یکتا، بے نیاز و بے مثال ہونے کو جس خوبصورتی اور جامع انداز میں اس سورہ میں پیش کر دیا گیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے حوالے سے سورہ زمر بھی انتہائی اہمیت کی حامل سورہ ہے۔ یہ سورہ بھی مکہ میں نازل ہوئی اور پوری سورہ میں-- جو ۷۵/ آیتوں پر مشتمل ہے--- شرک کی جتنی بھی صورتیں اس زمانے میں رائج تھیں سب کا ابطال کیا گیا ہے اور خدا کی توحید کو ثابت کیا گیا ہے۔ توحید و شرک کے باب میں اس سورہ کا مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ یہاں اس کا موقع نہیں (طلبہ توحید کا مطالعہ کرتے ہوئے اس سورہ کا ترجمہ ایک بار ضرور پڑھ لیں) اب ہم بغیر کسی تفصیل وتفسیر کے قرآن مجید کی توحید کے اثبات سے متعلق کچھ منتخب آیات کو نقل کرتے ہیں:

وَإِلَـهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لاَّ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (163) (البقرہ: 163)

ترجمہ: اور تمہارا معبود اکیلا معبود ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ (آل عمران: 64)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو! اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر (مشترک) ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے علاوہ رب بنائیں۔

اللّٰہُ لا إِلَـہَ إِلاَّ ہُوَ الْحَیُّ الْقَیُّومُ (2) (آل عمران: 2)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ حی اور قیوم ہے۔ (یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ خود قائم ہے اور پوری کائنات کو قائم رکھے ہوئے ہے)

قُلْ أَرَأَیْتُـمْ إِنْ أَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَأَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلَی قُلُوبِکُم مَّنْ إِلَـہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَأْتِیْکُم بِہِ (الانعام:46)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو: کیا تم نے غور کیا؟ اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے علاوہ وہ کون خدا ہے جو تمہیں یہ قوتیں پھر دے سکے گا (یعنی کوئی دوسرا نہیں ہے)۔

لا إِلَـہَ إِلاَّ ہُوَ یُحْیِـی وَیُمِیْتُ (الاعراف: 158)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی اور موت دیتا ہے۔

إِنَّمَا إِلَہُکُمُ اللَّہُ الَّذِیْ لَا إِلَہَ إِلَّا ہُوَ وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْماً (طٰہٰ: 98)

ترجمہ: تمہارا خدا صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (کیونکہ) اس کا علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے۔

لَوْ کَانَ فِیْہِمَا آلِہَۃٌ إِلَّا اللَّہُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء: 22)

ترجمہ: زمین و آسمان میں اگر کئی (متعدد) معبود ہوتے تو وہ دونوں بگڑ جاتے (ٹوٹ پھوٹ جاتے)۔

مَنْ إِلَہٌ غَیْرُ اللَّہِ یَأْتِیْکُم بِلَیْلٍ تَسْکُنُونَ فِیْہِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (القصص: 72)

ترجمہ: اللہ کے سوا کون خدا ہے جو تمہارے لیے رات (اور دن ایک دوسرے کے بعد) لاتا ہے۔ جس (رات) میں تم سکون حاصل کرتے ہو۔ کیا تم بصیرت سے کام نہیں لیتے؟

وَلَـئِـن سَـأَلْتَہُـم مَّـن نَّـزَّلَ مِـنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْیَا بِہِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِہَا لَیَقُولُنَّ اللَّہُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّہِ بَلْ أَکْثَرُہُمْ لَا یَعْقِلُونَ (العنکبوت: 63)

ترجمہ: اور اگر تم ان سے دریافت کرو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا (اور) اس کے ذریعے زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا تو یقیناً وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں بلکہ اکثر لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔

لَیْسَ کَمِثْلِہِ شَیْئٌ وَہُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

وَلَہُ الْکِبْرِیَاءُ فِیْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (الجاثیہ:37)

اور اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

1.6 اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى(طٰہٰ:8)

ترجمہ: اللہ کے علاوہ وہ کوئی معبود نہیں۔اس کے لیے سب اچھے نام ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا (الاعراف:180)

ترجمہ: اور سب اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔تو اسے ان ناموں سے پکارو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو بھی اچھے نام ہیں یا ہو سکتے ہیں، سب کے سب اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔انسان اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اسماء کا علم عطا کیا۔حضرت آدم کی تخلیق کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: **وعلم آدم الاسماء کلھا** (اور آدم کو تمام اسماء کا علم دیا یا آدم کو تمام اسماء (نام) سکھائے) اور اسی بنا پر حضرت آدم مسجود ملائکہ قرار پائے۔لیکن انسان کا یہ علم اسماء بھی محدود ہے۔وہ کتنی بھی تگ ودو کر لے اللہ کے اسماء کو شمار نہیں کر سکتا۔قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے جن ناموں اور اوصاف کا ذکر آیا ہے وہ سو سے زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ناموں کے حوالے سے جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق آپؐ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے 99 (ننانوے) نام ہیں۔جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا۔خدا طاق ہے اور طاق عدد کو پسند کرتا ہے''۔(صحیح بخاری، کتاب التوحید، صحیح مسلم، کتاب الذکر) حدیث میں آخری ٹکڑا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے 99 نام ہی کیوں رکھے گئے سو کیوں نہ ہوئے؟ ایسا اس لیے ہوا کہ سو پورے ہونے کی صورت میں عدد طاق نہ رہ جاتا جب کہ اللہ تعالیٰ خود طاق ہے اور طاق عدد کو ہی پسند کرتا ہے۔صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی تفصیل یا صراحت موجود نہیں ہے۔ناموں کی جو تفصیل ملتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ راویوں نے قرآن مجید اور صحیح حدیثوں سے تلاش وجستجو کے بعد انہیں اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔اور انہیں الگ الگ بیان بھی کیا ہے۔ایک تصریح کے مطابق یہ تمام نام وہ ہیں جو یا تو بطور علم یا بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آں حضرتؐ نے اپنی دعاؤں میں ان کی تعلیم دی ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہ اسماء وصفات عام طور پر تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جاتے ہیں۔1) اسماء وصفات جمال یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نام اور صفات جن سے اس کا رحم وکرم اور عفو ودرگزر ظاہر ہوتی ہے۔2) اسماء وصفات جلال یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نام اور صفات جن سے اس کے جلال و جبروت، حکومت واستیلا اور شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔3) اسماء وصفات کمال یعنی وہ اسماء اور صفات جن سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ ظاہر ہوتے ہیں۔

1.6.1 اسماء وصفات جمال

ذیل میں اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات درج کیے جا رہے ہیں جن سے اس کے رحم وکرم اور شفقت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔

الـلّٰــہ : یہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا اسم ذات ہے اور اسے قرآن پاک میں ہر جگہ علم (نام) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔یعنی

ایسی ہستی جو اپنی شان اور جلال و برتری کے لحاظ سے اس قابل ہو کہ اس کی پرستش کی جائے اور اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ جو بے انتہا قدرت کا مالک ہو، جس کی پناہ حاصل کی جائے اور جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت ومحبت رکھے جو ایک ماں اپنے بچوں سے رکھتی ہے۔

الرحمان : اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جسے علم (نام) کی حیثیت حاصل ہے۔اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔وہ جس کے رحم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

الرحیم : رحم کرنے والا۔وہ جس کی رحمت میں تسلسل ہے۔اصلاً یہ لفظ رِحم سے نکلا ہے یعنی بچہ دانی جس سے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔اس لیے اس میں بھی محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

رحمان اور رحیم اللہ تعالٰی کی وہ دو صفتیں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی انہیں دو صفات کا مظہر ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جو کچھ ہوگا اس میں بھی اس کی صفات رحمانی و رحیمی کی کارفرمائی ہوگی۔

الرب: پرورش کرنے والا۔یعنی وہ ہستی جو وجود کے پہلے مرحلے سے لے کر آخری منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور وترقی کی ذمہ دار ہے۔

اللطیف: لطف والا۔مہربان۔

العفو: معاف کرنے والا۔درگزر کرنے والا۔

الودود: محبوب،محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

السلام: امن وسلامتی،صلح وآشتی، ہر عیب سے پاک وصاف۔

المحب: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

المومن: امان دینے والا،امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الشکور: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

الغفور و الغفار: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

الحفیظ و الحافظ: حفاظت کرنے والا،نگہبان، بچانے والا۔

الوھاب: دینے والا،عطا کرنے والا،بخشنے والا۔

الرازق و الرزاق: روزی دینے والا،نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولی: دوست،حمایتی،طرف دار۔

الرؤف: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

المقسط: انصاف والا، عادل۔

الھادی: راہ دکھانے والا، رہنما۔

المجیب: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

الکافی: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

الحلیم: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

التواب و قابل التوب: توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کرکے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الحنان: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

المنان: احسان کرنے والا۔

النصیر: مدد کرنے والا۔

ذوالطول: کرم والا۔

ذوالفضل: فضل والا۔

الکفیل: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الوکیل: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

المقیت: روزی پہنچانے والا۔

المغیث: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

المجیر: پناہ دینے والا۔

المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

1.6.2 اسماء وصفات جلال

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن سے اس کے جلال و جبروت، بڑائی و کبریائی اور حکومت و شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے:

الملک و الملیک: بادشاہ، فرماں روا۔

العزیز: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

القاھر و القھار: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

المنتقم: سزا دینے والا، برائیوں کا بدلہ دینے والا۔

الجبار: جبروت والا، جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

المھیمن: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

المتکبر: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا۔

شدید العقاب: سخت سزا دینے والا۔

شدید البطش: بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

1.6.3 اسماء وصفات کمال

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن میں اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء وصفات کی پانچ قسمیں ہیں: 1) ایک وہ جو اللہ کی وحدانیت سے متعلق ہیں، 2) دوسرے وہ جو اس کے وجود سے متعلق ہیں، 3) وہ جو اس کے علم سے متعلق ہیں، 4) وہ جو اس کی قدرت سے متعلق ہیں، 5) وہ جو اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہہ سے متعلق ہیں۔ ہم ان پانچوں کی تفصیل الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

1.6.3.1 اسماء وصفات وحدانیت

یعنی وہ صفات جو اللہ کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔

الواحد: ایک، اکیلا، تنہا۔

الاحد: ایک، یکتا، یک وتنہا۔

الوتر: طاق، جس کا کوئی جوڑا نہ ہو۔

1.6.3.2 اسماء وصفات وجود

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور لازوال ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں صفات وجودی بھی کہتے ہیں:

الموجود: وجود والا، ہست۔

الحی: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

القدیم: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم: جو بذات خود قائم ہے اور اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الدائم: ہمیشہ رہنے والا۔

الاول: وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الآخر: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم: جو سب سے آگے ہے۔

المؤخر: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاہر: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)۔

الباطن: جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔

1.6.3.3 اسماء وصفات علم

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جو اس کے علم، باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں:

الخبیر: خبر رکھنے والا۔

العلیم: جاننے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع: سننے والا۔

البصیر: دیکھنے والا۔

المتکلم: بولنے والا، اپنے علم اور ارادے کو ظاہر کرنے والا۔

الواجد: پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہ ہو۔

الشہید: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

الحسیب: حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔

المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔

المدبر: تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

الحکیم: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

المرید: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

القریب: نزدیک جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

1.6.3.4 اسماء وصفاتِ قدرت

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے:

الفاتح و الفتاح: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

القدیر و القادر: قدرت والا۔

المقتدر: اقتدار والا جس کے سامنے کوئی چوں چرا نہیں کرسکتا۔

القوی: زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

المتین: مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

الجامع: جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

الباعث: اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعے اور حادثے کا محرک اول۔

مالک الملک: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

البدیع: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

الواسع: سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

المحیط: احاطہ کرنے والا جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں۔

المحی و الممیت: جلانے والا اور مارنے والا۔

القابض و الباسط: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

المعز و المذل: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

الخافض و الرافع: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

المعطی و المانع: دینے والا اور روک لینے والا۔

النافع و الضار: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

المبدئ و المعید : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہواس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا ہو گئی ہو اس کو دوبارہ وجود میں لانے والا۔

1.6.3.5 اسماء وصفات تنزیہہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب ونقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتے ہیں۔

العلی: مرتبہ والا

العظیم: عظمت والا

الکبیر: بڑا

الرفیع: بلند

الجلیل: بزرگ

الکریم: شریف

الغنی: بے نیاز

الصادق: سچا، راست باز

الماجد: عزت والا

الحمید: تعریف والا

القدوس: پاک

الحق: سچا اور اصلی یعنی اس کے سوا سب باطل ہیں

الجمیل: اچھا، خوبصورت

البر: نیک

العدل: عادل

سبوح: ہر عیب سے پاک

الصمد: بزرگی کی ہر صفت میں کامل

الرشید: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کے ناموں اور صفات کا احاطہ ممکن ہی نہیں ۔ 99 کا مطلب اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی کثرت بھی لیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات کے حوالے سے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی صفات جلال کا ذکر ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اس کے عدل، حکمت اور علم کی صفات کا ذکر بھی کیا گیا ہے تا کہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ اللہ کا جلال بھی عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے ۔ اسی طرح بعض صفتیں ایسی ہیں کہ ان میں بظاہر قبح نظر آتا ہے ۔ جیسے الضار (نقصان پہنچانے والا) ۔ اس طرح کی صفات کے تنہا استعمال سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے ان کا تنہا استعمال درست نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت بھی استعمال کی جاتی ہے یعنی الضار کے ساتھ النافع کا استعمال لازمی ہے ۔ اس کا مقصد خدا کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہے یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچانے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو تو اس کا نفع پہنچانا کوئی کمال نہیں ۔ کمال یہ ہے کہ نقصان پہنچانے کی قدرت رکھنے کے باوجود نفع پہنچائے ۔

معلومات کی جانچ

1. توحید کا لغوی معنی بیان کیجیے۔
2. اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات جمال لکھیے ۔
3. صفات کمال میں سے تین معنی کے ساتھ لکھیے ۔

1.7 صفات کے بیان کا مقصد

ذہن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اور احادیث مبارکہ میں بھی اس کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بیان کا مقصد کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا ہے ۔ اس حیثیت میں اس کے اندر ان صفات وخصوصیات سے نسبت کا پیدا ہونا ضروری ہے جس کا کہ وہ نائب ہے ۔ گویا خلیفہ فی الارض ہونے کے ناطے انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان اوصاف سے نہ صرف نسبت پیدا کرے بلکہ اپنے لیے ان اوصاف کو معیار بناتے ہوئے ان کے حصول کی کوشش کرے ۔ البتہ اس حوالے سے احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ انسان کے لیے صرف انہیں اوصاف کا اپنانا لائق ستائش ہے جن کی نقل وہ کر سکتا ہے ۔ وہ صفات جو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور جو انسان کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں ان سے روکا گیا ہے ۔ اوپر اللہ تعالیٰ کی صفات کی جو تین قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں صفات جلال کا مستحق انسان نہیں ہو سکتا بلکہ بندگی اور عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے مقابل کی صفات انسان کے اندر پیدا ہوں مثلاً عاجزی، تواضع، خاکساری وغیرہ ۔ اسی طرح اللہ سبحانہ تعالیٰ کی صفات کمال میں سے وحدانیت اور ازلی وابدی کو چھوڑ کر انسان بقیہ اوصاف سے نسبت پیدا کر سکتا ہے ۔ البتہ خدا کی صفات جمال وہ صفات ہیں جن سے نسبت پیدا کرنے، جن کو معیار بنانے اور جن سے فیض یاب ہونے کا دروازہ ہر صاحب توفیق انسان کے لیے کھلا ہے اور وہ اخلاق انسانی کا معیار ہیں ۔ زمین میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت میں انسان کو انہیں اپنانا اور اختیار کرنا چاہیے ۔ اور ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر کی صفات ہیں' اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور ان سے درگزر کرنے والا ہے انسان کو بھی چاہئے کہ وہ دیگر انسانوں کے گناہوں پر پردہ ڈالے ۔

1.8 عقیدۂ توحید کے تقاضے

اللہ تعالیٰ کی صفات میں صفت توحید (واحد، احد وغیرہ) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔جس طرح اسلام کی روح عقائد ہیں اسی طرح عقائد کی روح عقیدۂ توحید ہے؛ کیونکہ دوسری تمام صفات کا نقطۂ کمال یہی صفت ہے اس لیے ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو جانا اور سمجھا جائے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے فرمان اور رسول اللہؐ کے ارشادات کے مطابق عقیدۂ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے درج ذیل ہیں:

1. اللہ کے سوا کوئی نہیں جو خود اپنا وجود رکھتا ہو۔صرف اللہ کی ذات ہے جو آپ سے آپ وجود میں ہے۔اللہ کے علاوہ کائنات کی تمام چیزیں مخلوق ہیں اور اللہ کی ہی پیدا کی ہوئی ہیں۔سب کا مالک وہی ہے۔یہ ساری چیزیں اس کی محتاج ہیں اور سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ان تمام اشیاء میں ان کی اپنی کوئی ذاتی خوبی نہیں ہے بلکہ جو خوبیاں بھی ان کے اندر ہیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔اور یہ خوبیاں اسی وقت تک ان کے اندر رہ سکتی ہیں جب تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔اس کا تقاضا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو ازلی وابدی، خالق و پروردگار مانا جائے۔

2. کائنات میں جو چیزیں بھی موجود ہیں ان میں صرف اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ ایک ایسی ہستی ہے جو ان تمام سے مختلف اور الگ ہے۔کوئی نہیں جو اس کی ہمسری یا ہم جنسی کا دعویٰ کر سکے۔لیس کمثلہ شیئی (شوریٰ:11)،اس کے مثل جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔یہ حقیقت ہم سب جانتے ہیں کہ مثل اصل کے برابر نہیں ہوتی لہٰذا اس آیت کو سمجھنا آسان ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو کسی بڑی سے بڑی ہستی پر بھی قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ واللّٰہ المثل الاعلیٰ (نحل:60)۔

   خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔لم یلد ولم یولد (اخلاص:3) (نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ جنا گیا ہے)۔نہ وہ کسی دوسری ہستی کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور نہ کسی شئی کے اندر حلول کرتا ہے۔نہ اس کا کوئی جسم ہے اور نہ ہی وہ جسمانی صفات رکھتا ہے۔

3. صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کی رضا وخوشنودی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے اور اس کے لیے جدوجہد اور کوشش بھی کرنی چاہیے۔انسان کے جو بھی اور جتنے بھی اعمال ہیں ان کا اصل محرک بھی رضائے رب کا حصول ہونا چاہئے اور ان کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ کسی طرح اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔

4. انسان کے وہ سارے اعمال اور حرکات جو اپنی حقیقت یا صورت کے اعتبار سے عبادت و پرستش جیسے یا اس کی قسم سے ہوں، وہ سب کے سب صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں۔سجدہ صرف اسی کو کیا جاسکتا ہے، سر صرف اسی کے آگے جھکایا جاسکتا ہے۔نذر صرف اسی کے نام کی مانی جاسکتی ہے۔دعا صرف اسی سے کی جاسکتی ہے۔نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جاسکتی ہے اور غیبی امداد کے لیے بھی صرف اسی کو پکارا جاسکتا ہے۔

5. انسان کے وہ جذبات اوراحساسات بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خاص ہونے چاہئیں جن کے اندر بندگی وسرافگندگی کی روح پائی جاتی ہو۔توکل اوربھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پرکیا جائے۔امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔تقویٰ صرف اللہ تعالیٰ کا اختیارکیا جائے،ڈراورخوف صرف اسی کا رکھا جائے۔حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے کسی دوسرے سے نہیں۔

6. اس پوری کائنات کا،جس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہماری یہ دنیا ہے،مقتدراعلیٰ صرف اورصرف اللہ تعالیٰ ہے۔حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو ہے،کسی کام سے منع کرنے کا حق بھی صرف اسی کو ہے اوراگرکوئی اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق ہے تو وہ صرف اورصرف اللہ تعالیٰ ہے۔حقیقی شارع اور قانون سازبھی وہی ہے۔کون سی مخلوق کون سے اورکیا کام انجام دے گی ان کے فرائض زندگی متعین کرنے کا اختیاربھی صرف اللہ تعالیٰ کوحاصل ہے۔کسی مخلوق کے معاملے میں کیا فیصلہ کیا جائے،اسے معاف کرنے یاسزادینے کا اختیاربھی پورے کاپوراصرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

7. اللہ تعالیٰ کےعلاوہ کوئی بھی اس شان کا حامل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے،اسے پوجا جائے،اس کے آگے سرجھکایا جائے یا اس کی رضا اورخوشنودی طلب کی جائے۔اللہ کےعلاوہ کوئی اورنہیں جواس لائق ہوکہ اس کے آگے انسان کی پیشانی جھکے،کوئی اورنہیں جس کے سامنے نذرپیش کی جائے،کوئی نہیں جس کی نعمت کا اعتراف کیا جائے۔اللہ کےعلاوہ کوئی دوسرانہیں جسے ولی اورکارساز،حاجت رواورمشکل کشاسمجھا جائے۔جس سے دعائیں کی جائیں اورحاجتیں مانگی جائیں۔کوئی نہیں جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔کوئی نہیں جس پرتوکل اوربھروسہ کیا جائے۔اللہ کےسواکوئی نہیں جس کا خوف اورتقویٰ رکھا جائے،جس سےکوئی امیدوابستہ کی جائے اورجس سے حقیقی محبت کی جائے۔اللہ کےسواکوئی اورنہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدارکا کوئی ذرہ بھی ہو،جوبال برابربھی کسی کونفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو۔جوکسی کے لیےقانون بنانے اوراپناحکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہواورجس کی بےقیداطاعت جائزہو۔

یہ ہیں توحید کے وہ بنیادی تقاضے جواس عقیدے کوتسلیم کرلینے کے بعدایک انسان پرعائدہوتے ہیں۔یہ تقاضے اتنے اہم ہیں کہ اگرکوئی انسان ان میں سے کسی ایک کا بھی انکارکرتا ہےتو گویا اللہ پرایمان کا اس کا دعویٰ کھوکھلا اوربےمعنی ہے۔مطلب یہ کہ عقیدۂ توحید کے جوبھی تقاضےاوپر بیان ہوئے ہیں،عقیدۂ توحید کےمفہوم میں وہ سب کے سب شامل ہیں اورصحیح معنوں میں مومن و مسلم ہونے کے لیےضروری ہے کہ عقیدۂ توحیدکواس کےمکمل مفہوم اورتقاضوں کےساتھ دل سے مانا اورتسلیم کیا جائے۔

1.9 عقیدۂ توحید کا اثر انسانی زندگی پر

پہلے یہ معلوم ہوچکا کہ توحید کا عقیدہ تمام عقائد کی جان ہے۔اس عقیدے کواس کے تمام تقاضوں کے ساتھ تسلیم کیے بغیرکوئی مسلمان نہیں ہوسکتا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توحید کا عقیدہ جب اس اہمیت کا حامل ہےتواس کوتسلیم کرلینے کے بعدوہ کون سی تبدیلیاں ہیں جوایک انسان کےاندرواقع ہوتی ہیں یاانسانی زندگی پراس کےکیااثرات مرتب ہوتے ہیں:

1. توحید کا اقرار کر لینے کے بعد انسان کے اندر سب سے پہلی اور اہم تبدیلی یہ رونما ہوتی ہے کہ موحد انسان کا ذہنی افق بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ تنگ نظر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جس کی خدائی پوری کائنات کو محیط ہے، جس نے زمین و آسمان پیدا کیے اور جو مشرق و مغرب میں جو کچھ بھی ہے سب کا مالک ہے اور جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ توحید پر ایمان لانے کے بعد بندے کو کائنات میں مخلوقات کے درمیان کہیں بھی فرق نظر نہیں آتی۔ سب اس کی نگاہ میں برابر ہو جاتے ہیں کیونکہ سب اسی ایک خالق و مالک کی ملکیت، غلام اور رعایا ہیں۔ ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد بندے کی نظر غیر محدود ہو جاتی ہے۔ وہ دائروں کا پابند نہیں رہتا، اس کی ہمدردی، محبت اور خدمت کا دائرہ پوری انسانیت تک پھیل جاتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو توحید کا قائل نہ ہو اس کے اندر یہ وسعت نظری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

2. کلمۂ توحید کے اقرار کے بعد انسان کے اندر غیر معمولی غیرت و خودداری اور عزت نفس پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ نفع اور نقصان پہنچانے کی قوت اور مارنے اور جلانے کی طاقت اسی کے ہاتھ اور اختیار میں ہے۔ جب بندے کو یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے تو وہ قوت و طاقت کے ظاہری تمام مراکز سے بے خوف اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی کے آگے سرِ نیاز خم کرتا ہے، نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ کسی سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔ وہ ایک خدا کے سامنے سجدہ کر کے دیگر تمام سجدوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جب کہ ایسا انسان جو عقیدۂ توحید کا حامل نہ ہو معمولی معمولی مفادات کے حصول کے لیے جہاں تہاں سر جھکا دیتا ہے اور چھوٹے موٹے نفع و نقصان کی خاطر سبھی کے سامنے دست سوال دراز کر دیتا ہے۔

3. عقیدۂ توحید پر یقین انسان میں خودداری کے ساتھ ساتھ انکساری بھی پیدا کرتا ہے۔ خودداری اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ صرف ایک خدا کا بندہ اور غلام ہوتا ہے اور انکساری و عاجزی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں اسے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے زور بازو کا نتیجہ نہیں محض اللہ کی دین اور نوازش ہے۔ اس نے جس طرح دیا ہے اسی طرح چھین بھی سکتا ہے۔ چنانچہ وہ غرور و تکبر اور ہر طرح کے گھمنڈ سے دور رہتا ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل ایسا شخص جو خدائے واحد پر یقین نہیں رکھتا اگر اسے کسی طرح کا دنیوی اقتدار اور کمال حاصل ہو جائے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی حصولیابیوں کو اپنے زور بازو کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

4. عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان نیکی، پاک نفسی اور راست روی کا طریقہ اختیار کرتا ہے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ نیک اعمال ہی کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہیں۔ اگر وہ خدا کے احکام کی پابندی نہیں کرتا تو کوئی طاقت نہیں جو اسے عادل خدا کی گرفت سے بچا سکے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہدایت و رہنمائی ہوتی ہے تو وہ لوگ جھوٹی توقعات اور امیدوں پر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی کسی مخلوق کو نذر و نیاز دے کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ دنیوی ذمہ داریوں سے آزاد ہو گیا اور اب وہ جو چاہے کرتا رہے۔ کوئی کسی برگزیدہ شخصیت سے یہ توقع وابستہ کر لیتا ہے کہ وہ اس کی خدا کے ہاں سفارش کریں گے اور اسے اس کی بداعمالیوں سے بچا لیں گے۔ کوئی خود کو اللہ کا چہیتا سمجھ بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کچھ بھی کرتا رہے اسے اس کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ اسی طرح کوئی یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہمارے

لیے کفارہ بن گیا، اب ہمارے گناہوں کی باز پرس نہیں ہوگی۔ سب اپنے نفس کے غلام اور بندے بن جاتے ہیں جب کہ مومن احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔

5. انسان بہت ہی عجلت پسند پیدا کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی تمام نتائج حاصل کر لینا چاہتا ہے اور اگر اسے من چاہے نتائج نہیں ملتے تو وہ بہت جلد مایوسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان کسی بھی حال میں دل شکستہ اور مایوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کے تمام خزانے ہیں، جس کا فضل و کرم بے پایاں ہے اور جس کی قدرت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جب وہ ایسے ستودہ صفات خدا پر یقین رکھتا ہے تو پھر وہ کسی بھی حال میں مایوس نہیں ہوتا، ہمیشہ پر امید رہتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ خواہ تمام ظاہری اسباب و وسائل اس کا ساتھ چھوڑ دیں پھر بھی اللہ کا سہارا اسے حاصل رہے گا۔ اور جب اسے اللہ کا سہارا حاصل رہے گا تو اس کی امیدیں بھی قائم رہیں گی اور وہ جدوجہد اور کوشش بھی کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے ان کا سارا یقین ظاہری اسباب و وسائل پر ہوتا ہے اور جب ظاہری اسباب و وسائل نہیں حاصل ہو پاتے تو پھر وہ مایوس و دل شکستہ ہو جاتے ہیں۔ مایوسی کئی بار ان کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ خودکشی تک کر گزرتے ہیں۔

6. عقیدۂ توحید کا حامل انسان حوصلہ مند اور پر عزم ہوتا ہے۔ اس کے اندر صبر و توکل کی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اس حوصلہ مندی اور طاقت کے سہارے ایمان والا دنیا کا بڑے سے بڑا کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ ظاہری اسباب و وسائل وہ ضرور استعمال کر رہا ہے لیکن اصل کرنے والی طاقت اللہ کی ہے اور چونکہ اللہ کا بندہ ہونے کے ناطے اسے اللہ کی مدد اور پشت پناہی حاصل ہے اس لیے تمام مشکلیں اور رکاوٹیں بھی وہی دور کرے گا۔

7. عقیدۂ توحید کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس عقیدے کا حامل انسان بزدل نہیں رہتا بلکہ وہ بہت ہی بہادر ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کا ایمان خدائے واحد پر ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی جان و مال اور ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے اس لیے اسے کسی بھی چیز کا خوف نہیں رہتا۔ بنیادی طور پر کسی انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں: 1) ایک جان و مال اور بال بچوں کی محبت اور 2) دوسری موت کا خوف۔ چونکہ بندۂ مومن خدا پر کامل یقین رکھتا ہے، اسے پتہ ہوتا ہے کہ کارساز صرف اللہ کی ذات ہے اور موت و حیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے' وہ اگر مارنا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا اور اگر وہ زندہ رکھنا چاہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی' تو پھر وہ دنیاوی اسباب سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور بہادری کے وہ کارنامے انجام دیتا ہے کہ کفار و مشرکین اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایک خدا میں یقین نہیں رکھتے ان میں جان و مال اور اولاد کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ موت سے ڈرتے ہیں اس لیے بزدل ہو جاتے ہیں۔

8. عقیدۂ توحید انسان کے اندر قناعت اور بے نیازی پیدا کرتا ہے۔ چونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے وہ جس کو چاہے زیادہ دے، جسے چاہے کم دے، جسے چاہے عزت، طاقت اور ناموری دے اور جسے چاہے نہ دے۔ اسی طرح اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کام اپنی حد تک صحیح صحیح اور جائز طریقے سے کوشش کرنا ہے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے فضل پر

موقوف ہوتی ہے۔اس لیےاسے جو کچھ بھی مل جاتا ہےاس پر قناعت کرتے ہوئے خدا کا شکر بجالاتا ہےاور جونہیں ملتااس سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہوجاتا ہے کہ اس میں اللہ کی مصلحت شاید کچھ اور ہے۔اس کے برعکس جو لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے وہ دنیوی کامیابی و ناکامی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اس لیے ان پر ہمیشہ حرص و ہوس مسلط رہتی ہے اور وہ قناعت و بے نیازی سے محروم رہتے ہیں۔

9. عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان خدا کے قانون کا پابند ہوتا ہے۔وہ وہی کرتا ہے جو کچھ کہ خدا نے اسے کرنے کا حکم دیا ہے۔وہ کام نہیں کرتا ہے جس سے کہ اسے اللہ نے روک دیا ہے۔چونکہ مؤمن کو یقین ہوتا ہے کہ خدا ہر حاضر و غائب سے واقف ہے وہ ہر کھلے اور چھپے سے باخبر ہے اس لیے وہ اندھیرے اور تنہائی میں بھی، جب کہ بظاہر اسے کوئی دیکھ نہیں رہا ہوتا ہے کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو خدا کو ناپسند ہو کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بہت وسیع ہے وہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے اس لیے کوئی بھی کام اس سے چھپا کر نہیں کیا جا سکتا۔اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا، وہ بھاگنا بھی چاہے تو خدا کی قائم کردہ حدود سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے وہ خدا کی ہدایت پر اس طرح عمل کرتا ہے کہ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے ان سے ہر حال میں بچتا ہے اور جن کا حکم دیا ہے انہیں ہر حال میں بجالاتا ہے۔

عقیدۂ توحید کو اسلام میں مرکزیت اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اگر کوئی سماج اس عقیدے پر قائم ہے یا اس میں عقیدۂ توحید کے ماننے والوں کی اکثریت ہے تو اس میں خیر کا پہلو غالب رہے گا۔عقیدۂ توحید جیسے جیسے اور جتنا کمزور پڑتا جاتا ہے سماج سے خیر کم ہوتا جاتا اور برائیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

1.10 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی معاشرہ اور سماج خدا کے وجود کا منکر نہیں رہا۔یہ الگ بات ہے کہ ان میں خدائے واحد کا تصور مختلف اوقات میں شرک کی ژولیدگی کا شکار ہوتا رہا۔اسلام اور پیغمبر اسلامؐ نے آکر عقیدہ توحید کی تکمیل کی اور اس کا ایک جامع و مانع تصور پیش کیا۔آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ خدا ایک وتنہا اور بے مثل ہے، اس کی قوت اور مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔اس کا حکم ہر حکم سے بالا ہے۔اس کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور جتنے بھی اچھے اوصاف ہیں وہ ان سب کا حامل ہے۔لہذا اس خدا کی رضا ہی انسان کی دنیوی زندگی کا حاصل ہونا چاہیے اور ہماری تمام سرگرمیوں کا مرکز ومحور اللہ کی اطاعت اور عبادت ہونا چاہیے۔جب کوئی انسان عقیدہ توحید کو مان لیتا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو اس کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔اس میں غیرت وخودداری پیدا ہوتی ہے، وہ عجز وانکسار کا پیکر بن جاتا ہے۔اس کے اندر پاکبازی اور راست روی کی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ ہمیشہ نیک اعمال کرتا ہے، وہ دل شکستہ و دل برداشتہ نہیں ہوتا۔اس کے برعکس اس کے اندر بلا کا عزم وحوصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔وہ چونکہ ایک خدا پر یقین رکھتا ہے اس لیے وہ ہر کسی سے بے نیاز ہوجاتا ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس سے خدا ناراض ہو۔ہر عمل میں اس کے پیش نظر صرف اور صرف اللہ کی رضا ہوتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقیدہ توحید پر مبنی سماج ہر طرح کی خیر وبرکت کا مظہر بن جاتا ہے۔

1.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1. توحید کا مفہوم بیان کیجئے۔
2. توحید اور اس کے دلائل پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

1.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عقیدہ اسلامی	:	علامہ محمد غزالی/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات	:	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
3. اسلام ایک نظر میں	:	مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات	:	مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد	:	علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر/ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
6. سیرۃ النبی (جلد چہارم)	:	علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 2 : رسالت (رسولوں پر ایمان)

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

2.2 تمہید

2.3 رسالت: معنی ومفہوم

2.4 رسالت: اہمیت اور ضرورت

2.5 رسالت کی حقیقت

2.6 رسالت محمدیؐ

2.7 ختم نبوت

2.8 رسالت محمدیؐ کی خصوصیات

2.9 رسالت محمدیؐ پر ایمان کا تقاضہ

2.10 خلاصہ

2.11 نمونے کے امتحانی سوالات

2.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

2.1 مقصد

اسلامی عقائد میں توحید کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رسالت کی ہے۔اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا معنی ومفہوم کیا ہے؟ انسانیت کو رسولوں اوران کی تعلیمات کی ضرورت کیوں ہے؟ رسولؐ کس طرح کے لوگوں کو بنایا جاتا ہے؟ طلبہ اس بات سے واقف ہوسکیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تسلسل کے ساتھ نبی اور رسولؐ کیوں بھیجے۔سب سے آخر میں حضرت محمدؐ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا۔اب ان کے بعد کوئی نبیؐ اس دنیا میں نہیں آئے گا۔نیز اس طرح آنحضرتؐ کی تعلیمات کی خصوصیات سے بھی طلبہ آگاہ ہوں گے۔

2.2 تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اپنی بندگی اور عبادت کے لیے،لیکن اسے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ انسان کی تمام تر ضروریات

کا اس نے انتظام بھی کیا۔ پیدا ہونے سے لے کر انسان کی موت تک جن چیزوں کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں وافر مقدار میں مہیا کر رکھی ہیں اور انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سانس لینے کے لیے ہوا، پینے کے لیے پانی، کھانے پینے کے لیے طرح طرح کے اناج اور پھل اور نہ جانے کیا کیا چیزیں سب کچھ اللہ نے انسان کو دی ہیں۔ جو اللہ اپنے بندے کے تئیں اتنا زیادہ مہربان ہے کہ اس نے اس کے لیے تمام مادّی ضروریات فراہم کر رکھی ہیں کیا وہ ایسا ہوسکتا ہے کہ اپنے بندے کی روحانی ضرورت، جو اس کا مقصد تخلیق ہے، کا اس نے خیال نہیں رکھا ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی مادی ضروریات کا خیال رکھا ہے اسی طرح اس نے انسان کی روحانی ضروریات کو بھی پورا کیا ہے۔ انسان اللہ کا بندہ اور غلام ہے، کائنات کے چپے چپے پر اس کی نشانیاں موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی پر بس نہیں کیا کہ انسان اپنے طور پر ادھر ادھر سر مارتا پھرے بلکہ اس نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا ایک مستقل نظام قائم کیا جس کے تحت اللہ کے منتخب بندے ہر قوم، ہر زبان، ہر علاقے اور ہر دور میں انسانیت کی ہدایت کا پیغام لے کر اس دنیا میں آتے رہے اور انسانوں کو یہ بتاتے رہے کہ انہیں اس دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلے انسان کو اس دنیا میں بھیجا (یعنی حضرت آدم) اسے نبی بھی بنایا اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے کہ انسانیت کے سفر کا اس دنیا میں آغاز پوری روشنی میں ہوا وہ ہدایت ورہنمائی کے لیے ادھر ادھر بھٹکتی نہیں پھری ہے۔

ہدایت ورہنمائی کے اس سلسلے کا نام ہی رسالت ونبوت ہے جس کا آغاز سیدنا حضرت آدم سے ہوتا ہے اور جس سلسلے کی آخری کڑی ہمارے اور ساری دنیا کے رسولؐ حضرت محمدؐ ہیں۔ اس درمیان اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مختلف علاقوں، قوموں، زبانوں اور زمانوں میں ایک روایت کے مطابق تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورسل اس دنیا میں مبعوث فرمائے اور ان سب نے ایک ہی پیغام اپنے اپنے زمانے اور علاقے میں انسانوں کو دیا کہ وہ اللہ کے بندے اور غلام بن کر رہیں۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسالت کے اس پورے سلسلے پر ایمان ویقین رکھے' جن کے نام اسے معلوم ہیں ان کے نام کے ساتھ اور جن کے نام معلوم نہیں ہیں ان پر عمومی طور پر۔ اور پھر یہ بھی یقین رکھے کہ حضرت محمدؐ اس سلسلہ رسالت کی آخری کڑی ہیں۔ اب رہتی دنیا تک ہدایت ورہنمائی کا کام انہیں کی تعلیمات اور دی گئی ہدایات میں ہے۔ دنیا وآخرت کی کامیابی اور فلاح کے لیے ضروری ہے کہ شریعت محمدیؐ کی پیروی کی جائے۔

2.3 رسالت : معنی ومفہوم

رسالت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ رس ل ہے اور اسی سے مصدر رسالت ہے یہ خط وکتابت کرنا، ربط پیدا کرنا، بھیجنا وغیرہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سفارت اور پیغامبری (پیغام پہچانا) کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں رسالت اس سفارت اور پیغامبری کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے، انہیں اپنی تعلیمات وہدایات سے آگاہ کرنے اور انہیں اپنی مرضی کا راستہ یا طریقہ بتانے کے لیے قائم کیا۔ رسالت کا دوسرا نام نبوت بھی ہے۔ اسی سے رسولؐ کا لفظ بھی نکلا ہے اور عام طور پر قاصد، ایلچی، پیغام بر یا پیغام لانے والے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں رسولؐ سے مراد اللہ کا وہ برگزیدہ اور منتخب بندہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام (اپنی مرضی اور

ہدایات) پہنچانے کے لیے بھیجتا ہے۔ وہ اللہ تعالی کا منتخب کیا ہوا ہوتا ہے اور اس کا کام لوگوں کو ڈرانا اور خوش خبری دینا ہوتا ہے۔ رسولؐ آزاد ہوتا ہے، انسانِ کامل ہوتا ہے اور آدم کی اولاد میں سے ہوتا ہے۔

رسالت کا ادارہ یا شعبہ انسانیت کے آغاز سے ہی قائم ہے اور یہ اس وقت تک باقی اور قائم رہا جب تک کہ انسانیت علمی ترقی اور تمدنی ارتقاء کی اس خاص سطح اور منزل تک نہیں پہنچ گئی جہاں آخری اور کامل و مکمل ہدایت بھیجی جا سکتی تھی اور جو رہتی دنیا تک کے لیے ہدایت و رہنمائی کا کام کر سکتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے انسان یعنی حضرت آدم کو بھیجا اسے رسول بھی بنایا تاکہ وہ اپنی آنے والی نسلوں تک خدا کی مرضی اور احکامات کو پہنچا دے۔ اس کے بعد انسانیت جب جب خدا کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹکتی اور گمراہ ہوتی رہی اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے رسول اور نبی بھیجتا رہا ہے یہاں تک کہ سب سے آخر میں حضرت محمدؐ کو اپنی آخری اور مکمل ہدایت دے کر معبوث فرمایا جو جب تک کہ دنیا قائم اور باقی ہے، موجود رہے گی اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے کام آتی رہے گی۔ ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل رسالت کے ادارے کے تحت بھیجے جنہوں نے اپنے اپنے زمانے، علاقے قوم اور زبان میں اللہ کی مرضی اور احکام کو انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی۔

2.4 رسالت : اہمیت اور ضرورت

رسالت اسلام کے بنیادی عقائد میں نہایت اہم عقیدہ ہے۔ عقیدہ توحید کے بعد رسالت کے عقیدے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے' کیوں کہ رسالت کے عقیدے کو تسلیم کیے بغیر انسان یہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس دنیا میں اسے بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسالت کی اہمیت اور ضرورت کیوں اتنی زیادہ ہے؟ وہ کون سی وجوہات ہیں جو اس کو ضروری بنا دیتی ہیں؟ اور کیوں اسے ایمانیات میں شامل کیا گیا ہے؟

ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ اس نے انسان کی تمام طرح کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اسے بہترین ساخت پر پیدا کیا اور پھر اس کے سانس لینے کے لیے ہوا چلائی۔ اس کی غذائی ضروریات کے لیے غلہ اگایا، اس کے لیے پانی کا ذخیرہ مہیا کیا۔ اس کے لیے دن رات، چاند، سورج غرض پوری کائنات بنائی جس کا ایک ایک ذرہ انسان کی خدمت پر مامور ہے۔ انسان کے لیے اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اس سے اللہ کا بس ایک مطالبہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت و بندگی کرے، اس کی عبادت کرے اور اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے تابع کر دے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ انسان اگر دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارتا ہے تو اللہ اسے آخرت میں کامیاب و کامران کرے گا اور ابدی زندگی کے ساتھ ساتھ ابدی نعمتیں بھی عطا کرے گا۔

اب یہ سوال فطری طور پر اٹھتا ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت و بندگی کیسے کرے؟ کہاں سے اسے اس سلسلے میں ہدایت ملے؟ اس کی عبادت کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ اور اس کی مرضی کس طرح معلوم کی جائے، وہ کیسے یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کون سی باتیں ہیں جو اسے ناپسند ہیں؟ کن کاموں سے وہ خوش ہوتا ہے اور وہ کون سے کام ہیں جو اس کے غضب کو دعوت

دیتے ہیں؟ بلاشبہ اللہ نے انسان کو عقل وشعور سے نوازا ہے، اسے سوچنے اور سمجھنے کے قوت دی ہے اور اسے ارادہ واختیار کی آزادی بھی دی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جب عقل وشعور جیسی دولت دی ہے تو وہ اس کو استعمال کر کے اللہ کی مرضی کو معلوم کرسکتا ہے۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ تمام انسان تو کجا کوئی ایک فرد بھی محض اپنی عقل کے ذریعہ نہ اپنی زندگی اور نہ ہی اس کائنات کے حقائق معلوم کرسکتا ہے اللہ کی ذات اور اس کے تقاضوں کو جاننا تو بہت دور کی بات ہے۔ انسانی عقل اللہ کی رضا اور اس کے احکامات جان لینے سے پوری طرح قاصر ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی عقل نارسا ہوسکتی ہے لیکن نفس کی ریاضت کے ذریعہ انسان اپنے وجدان اور قوت ادراک کو اس درجہ ترقی دے سکتا ہے کو وہ اللہ کی مرضی اور اس کے احکامات تک رسائی حاصل کرلے۔ لیکن اول تو ہر انسان کے لیے ایسا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ریاضت نفسکے ذریعے تمام انسان ایک ہی نتیجے تک پہنچیں۔ دوسرے یہ کہ کون یہ فیصلہ کرے گا کہ کسی نے ریاضت نفس کے ذریعہ جو ہدایات اور احکام حاصل کیے ہیں وہ الٰہی احکام اور اس کی مرضی ہیں۔ اس لیے خدا کی مرضی اور اس کی ہدایات کو جاننے کا یہ ذریعہ بھی ناقص ہے۔

اللہ کی ہدایات اور مرضی کو جاننے کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہر انسان فرداً فرداً اپنے طور پر ان کو جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے لوگ اجتماعی طور پر غور وفکر کریں۔ لیکن یہ طریقہ بھی قابل عمل نہیں ہے۔ جب کوئی فرد غور وفکر کے نتیجے میں اللہ کے احکامات کو نہیں معلوم کرسکتا تو پھر افراد کا مجموعہ بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ اس لیے یہ طریقہ بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان ایک فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس فطرت کے ذریعہ اسے بہت سی چیزوں کی اچھائی یا برائی کا علم ہو جاتا ہے لیکن محض اس بنیاد پر کہ انسان بہت سی اچھی اور بری چیزوں کو خود بخود جان لیتا ہے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات، ہدایات اور مرضی کو بھی معلوم کرسکتا ہے۔

اس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان محض اپنے عقل وشعور، انفرادی واجتماعی ریاضت اور وجدان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور مرضی کو نہیں جان سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس اللہ نے انسان کی تمام مادی ضروریات کا خیال رکھا اور انہیں فراہم کیا اس نے انسان کی اس بنیادی ضرورت، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا، اس کا خیال نہ رکھا ہوگا؟ بلاشبہ اللہ کی ذات کے ادراک کے لیے انسان کے اندرون سے لے کر کائنات کے چپے چپے پر ایسے نشانات موجود ہیں جو اس کے خالق ومالک ہونے کا پتہ دیتے ہیں البتہ اس نے اپنی مرضی اور احکامات کو انسانوں تک ٹھیک ٹھیک اور پورے طور پر پہنچانے کے لیے ایک خارجی ذریعہ کا انتظام کیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق، مالک اور رب ہے اس نے انسان کی تمام ضرورتوں کو جب پورا کیا ہے تو پھر اس کے عدل وحکمت کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ انسان کی اس اہم ضرورت کو بھی پورا کرے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو اپنی پیغام رسانی کے لیے منتخب کیا تاکہ وہ اس کی مرضی اور احکام کو ٹھیک ٹھیک اور پورے طور پر انسانوں تک پہنچادیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس انتظام کا نام رسالت ہے اور اس نے اپنے جن بندوں کو اس کام کے لیے منتخب کیا انہیں ہم رسول کے نام سے جانتے ہیں۔

رسالت کے بغیر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی اور احکام کو نہیں جان سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ کا مومن، مسلم اور فرماں بردار بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسالت پر ایمان لائے۔ رسالت پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر انسان کو اللہ اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کا بھی علم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے رسالت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔

2.5 رسالت کی حقیقت

یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا کی ہر قوم، علاقے، زبان اور زمانے میں نبی اور رسول انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے جاتے رہے لیکن جب ہم مختلف مذہبی روایتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ رسالت کا تصور ان کے یہاں کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ ان میں بہت ساری چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو رسالت کی شان کے منافی بھی ہیں۔ یہ اسلام ہے اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ ہیں جنہوں نے رسالت کی حقیقت کو پوری طرح واضح کیا اور یہ بتایا کہ رسالت ایک امتیازی وصف اور منصب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کچھ خاص انسانوں کو عطا کیا اور ان پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ خدا کی مرضی اور احکام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ رسالت کے منصب پر جو لوگ بھی فائز ہوئے وہ انسانوں میں سے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھا یعنی وہ معصوم تھے۔ وہ دنیا کی ہر قوم اور علاقے میں بھیجے گئے اور اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری انہیں دی تھی انہوں نے اسے پورا پورا ادا کیا اور اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ آگے ہم رسالت سے متعلق بعض اہم حقیقتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

1. سبھی رسول انسان تھے

رسالت کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے انسانوں میں سے ہی کچھ لوگوں کا انتخاب کیا تاکہ وہ اس کے احکامات کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسری مخلوق کے افراد کو کبھی بھی رسول نہیں بنایا نہ ہی خود کوئی روپ دھار کر کے انسانوں کے بیچ آیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِکَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِیٓ إِلَیۡهِم (یوسف: 109)

ترجمہ: اور (اے محمدؐ) ہم نے تم سے پہلے بھی (رسولؐ بنا کر) صرف آدمیوں ہی کو بھیجا تھا، جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔"

اس کی حکمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تھی کہ اللہ نے رسولوں کو محض ڈاکیہ بنا کر نہیں بھیجا' بلکہ وہ پیغامبر کے ساتھ داعی، معلم، شارح اور خود ان احکام پر عمل کرنے والے بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کا انسانوں میں سے ہونا ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں کے سامنے عملی نمونہ اور معیار بھی پیش کریں۔

2. رسول اللہ کے مخصوص منتخب بندے تھے

رسالت کوئی ایسی چیز نہیں جسے علم و ریاضت سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص دین ہے جسے وہ اپنے خاص بندوں میں سے کچھ لوگوں کا انتخاب کر کے عطا کرتا ہے۔ اس پر کوئی دوسرا اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

اللّٰهُ أَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام:124)

ترجمہ: اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے تھی۔

3. رسول ہر قوم میں بھیجے گئے

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی اور رسول بھیجے کیوں کہ انسان اور انسان سب برابر ہیں سب کا مقصد تخلیق ایک ہے، ذمہ داری اور جواب دہی میں سب برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے اس کے عدل اور رحمت کا تقاضا تھا کہ وہ دنیا کی سبھی قوموں میں رسول اور نبی بھیجے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ (الفاطر: 24)

ترجمہ: کوئی بھی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ گزر چکا ہو۔

4. رسول کی تعلیمات اللہ کی جانب سے ہوتی ہیں

رسول اللہ کا فرستادہ اور بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے دین و شریعت کے نام پر وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اور لوگوں کو جو کچھ بھی بتاتا ہے سب کا سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ رسولؑ دین کے معاملے میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى (النجم: 3-4)

ترجمہ: نبی (دین کے معاملے میں) اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

5. رسول خطا سے معصوم ہوتا ہے

رسولؑ ہر طرح کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہوتا ہے۔ وہ نفس، شیطان اور جذبات کے بہکاوے میں نہیں آتا۔ اس کی اخلاقی قوت اور فکری بصیرت ایسی کامل اور پختہ ہوتی ہے کہ اس کا نفس پورا کا پورا اس کے قابو میں ہوتا ہے۔ رسول کا معصوم ہونا اس کے منصب رسالت کا تقاضا بھی ہے کیوں کہ اسی صورت میں وہ اللہ کے احکامات و ہدایات کو پورے طور پر اور صحیح ڈھنگ سے لوگوں کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے اس کے علاوہ انسانوں میں سے کوئی بھی خواہ وہ زہد وتز کیے کے کسی بھی منصب پر فائز ہو جائے معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

6. رسول کی اطاعت فرض ہے

رسول اللہ کے احکامات و ہدایات لے کر انسانوں کے پاس آتا ہے تاکہ وہ انہیں اس سے باخبر کرے۔ خود بھی ان پر عمل کرے اور لوگوں کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے۔ اس لیے رسول کی مکمل اطاعت اور پیروی فرض ہے۔ دین کے معاملے میں رسول کے ہر فرمان کی بے چون و چرا تعمیل کی جانی چاہیے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس فرمان کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ رسول سراپا حق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (النساء: 64)

ترجمہ: ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی پیروی کی جائے۔"

رسول کچھ بھی اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اس لیے رسول کی اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80)

ترجمہ: جو اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے حقیقت میں وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

7. تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے

رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے حضرت آدم سے لے کر حضرت محمدؐ تک جتنے بھی رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں نام کے ساتھ ہے ان پر نام کے ساتھ ایمان لانا ہے اور جن کا ذکر نام کے ساتھ نہیں آیا ان پر بحثیت مجموعی' کیوں کہ اللہ نے ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک رسول کا بھی انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

2.6 رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)

لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے (آخری) رسول ہیں، اسلام کا بنیادی کلمہ ہے۔ اور کوئی شخص اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اس کلمے کا زبان سے اقرار نہ کرے، دل سے اس کی تصدیق نہ کرے اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہو۔ اس کلمے میں خدا پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح حضرت محمدؐ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ آپ بھی انبیاء کے اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے کہ اللہ کے احکام و ہدایات کو اپنے اپنے زمانے میں لوگوں تک نہ صرف پہنچایا بلکہ ان پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ حضرت محمد ایک ایسے زمانے میں دنیا میں تشریف لائے جب الٰہی تعلیمات اس دنیا سے مٹ چکی تھیں۔ پوری دنیا میں گمراہی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک روشنی کی کوئی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لوگوں نے سابقہ انبیاء کی تعلیمات کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ کچھ لوگ ان کا نام ضرور لیتے تھے لیکن ان کی تعلیمات سے پوری طرح بے گانہ تھے۔ دعوی تو ان کے پیرو ہونے کا کرتے تھے لیکن ان کے اعمال وعقائد سے ان کے زبانی دعووں کی تردید ہوتی تھی۔ خدائی ہدایات جو کتابوں کی صورت میں انہیں ملی تھیں انہوں نے نہ صرف ان پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ ان میں من مانی تحریفات کر دی تھیں۔ اس گھور اندھیرے سے انسانیت کو نکالنے اور اسے روشن راستے پر گامزن کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ ایک اور نبی کی بعثت ہو۔ چنانچہ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد کو عرب کے صحرا میں بیت اللہ کے شہر مکہ مکرمہ میں مبعوث کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے زمانے میں اور ایک ایسی قوم میں مبعوث کیا گیا جب ہر طرف گناہوں اور برائیوں کا بازار گرم تھا اور جو قوم تمدن سے نا آشنا تھی۔ اللہ کے رسولؐ ان ناسازگار حالات میں ایک ایسے انسان کے طور پر ابھرے جو اخلاق و کردار کا اعلیٰ اور بہترین نمونہ تھا۔ جو برائیوں میں پوری طرح لت پت قوم کے درمیان پروان چڑھتے ہوئے بھی ان میں ذرا سا بھی ملوث نہیں ہوا اس نے ایک ایسی مثالی شخصیت کی تعمیر کی کہ نوجوانی میں ہی قوم نے اسے صادق اور امین جیسے اعزازات سے سرفراز کیا۔ اور جب اس نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو انکار کرنے والوں کے پاس سوائے ہٹ دھرمی کے کوئی دوسری دلیل نہ تھی۔ خود دقرآن نے اس کی شہادت دی ہے:

فقد لبثت فيكم عمراً من قبله. افلا تعقلون. (يونس: 23)

ترجمہ: پس یقیناً میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت محمدؐ نے صرف 23 برس کی قلیل مدت میں اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار اور بہترین دعوت وتبلیغ کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو نہ صرف یہ کہ مکّہ اور عرب کے علاقوں میں پھیلایا بلکہ اس دوران اسلام کی دعوت اس وقت کی معلوم دنیا کے دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ گئی۔ آپ نے اخلاق و کردار کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آپؐ کے دشمن دوست اور مخالف موافق بن گئے۔ جن لوگوں نے آپؐ کو تنگ کرنے اور ستانے میں کوئی دقیقہ بھی چھوڑ نہ رکھا تھا جب آپؐ کو ان پر بھی فتح حاصل ہوئی تو ان سے بدلہ لینے کے بجائے انہیں معاف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب آپؐ کے گرویدہ ہو گئے۔

عرب کی وہ قوم جو تمدن نا آشنا تھی۔ جس کے اندر دنیا جہان کی برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں آپؐ نے اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ انہیں وحشت و جہالت سے نکال کر اعلیٰ درجے کی مہذب اور متمدن قوم بنا دیا۔ ان کے اخلاق و کردار کو ایسا صیقل کیا کہ ان کی مثالیں دی جانے لگیں۔ ان کی تربیت اس طرح کی کہ وہ اسلام کے پیغام کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے اور انسانیت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے میں اپنی زندگیاں اور تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ 32 سال تک دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب آپؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے متبعین کی ایک ایسی ٹیم چھوڑی جس نے خود کو آپ کے مشن کے لیے پوری طرح وقف کر دیا تھا۔ اسے دنیا کا کوئی بھی لالچ اس کے راستے سے ہٹا نہ سکتا تھا اور آپ نے رہتی دنیا تک اپنے پیروؤں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو سامان چھوڑا وہ تھا کتاب (قرآن مجید) اور سنت (آپؐ کے اقوال، افعال اور تقریر و تائید)۔

دنیا میں حضرت محمدؐ کی ذات ہی ایسی واحد ہستی ہے جن کی زندگی کا (خاص طور سے نبوت کے بعد کی زندگی کا) ایک ایک لمحہ، ایک ایک عمل اور ایک ایک قول روزِ روشن کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہے۔ آپؐ کو جو کتاب (قرآن مجید) اللہ کی جانب سے عطا ہوئی آپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے سینوں اور سفینوں دونوں میں اس طرح محفوظ کرا دیا کہ آج تک اس میں ایک حرف یا ایک زیر وزبر کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک زیر زبر کا فرق بھی کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں ایسے حفاظ کرام موجود ہیں جن کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر مسلمان کو یاد ہے۔ قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ نبوت محمدؐ کا اعجاز ہے۔

2.7 ختم نبوت

رسالت و نبوت کا سلسلہ انسانیت کے آغاز سے ہی جاری ہے۔ پہلے انسان حضرت آدمؑ پہلے نبی بھی تھے، اس کے بعد دنیا جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی جب جب ضرورت پڑتی رہی اللہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنے رسولؑ بھیجتا رہا اور سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو مبعوث فرمایا جن کی ہدایت و رہنمائی اب رہتی دنیا تک ہمیشہ کے لیے ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لیے رسولوں کا اتنا طویل سلسلہ قائم کیا تو اب محمدؐ اللہ کے آخری رسولؐ کیوں؟ آپؐ کے بعد اب کوئی دوسرا رسولؐ کیوں نہیں آ سکتا؟ کیا آج کی دنیا میں گمراہی نہیں ہے جس کی ہدایت کے لیے رسول کی ضرورت نہ ہو؟

اس سوال یا ان جیسے دیگر سوالات کا جواب پانے کے لیے ہمیں تھوڑا پیچھے جانا ہوگا۔ ہم سب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا کوئی ذریعہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکامات اور مرضی کو اپنے مخصوص بندوں کے ذریعہ ان کی قوموں تک پہنچائے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ کئی بار اپنے رسولوں کو کتاب کی صورت میں بھی اپنی ہدایات عطا کرتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اور نبی روز روز مبعوث نہیں فرماتا بلکہ دنیا میں یا کسی قوم میں اللہ تعالیٰ اسی وقت نبی بھیجتا ہے جب اس سے پہلے نبی کی تعلیمات ختم ہو جائیں، لوگوں نے انہیں بدل ڈالا ہو یا جو کتاب اس کو دی گئی تھی لوگوں نے اس میں تحریف کر ڈالی ہو اور اب وہ اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہی ہو۔

اب ہم اس مسئلے پر آتے ہیں کہ نبی جب اس دنیا میں تشریف لائے تو کیا کسی نبی کی تعلیمات یا کوئی آسمانی کتاب اپنی اصل حالت میں دنیا میں موجود تھی۔ اس سے پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ آپ سے پہلے جو بھی انبیاء مبعوث ہوئے تھے یا جو بھی آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی تھیں ان کی تعلیمات ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل صورت پر باقی نہیں رہی تھی یہاں تک کہ ان انبیاء کی زندگی کے حالات بھی ان کے پیروؤں کو پوری طرح معلوم نہیں تھے۔ ان کی تعلیمات پوری طرح مٹ چکی تھیں۔ اس لیے ایک نبی کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کا انتخاب کیا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آپ کو آخری نبی کیوں بنایا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک دنیا تدریج کے مراحل سے گزر رہی تھی آپؐ سے پہلے تک دنیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے کوئی ایک نبی ہی مبعوث کیا جاتا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم (اللہ کی عبادت و اطاعت) ایک تھی لیکن شریعت و منہاج الگ الگ تھے۔ نبیؐ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے دنیا ترقی اور تمدن کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جہاں پوری دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک نبی اور ایک کتاب بھیجی جا سکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو آخری نبی بنا کر بھیجا اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید آپ پر نازل فرمائی تاکہ جب تک دنیا قائم رہے اللہ کی آخری کتاب اور حضرت محمدؐ کا اسوہ و تعلیمات انسان کی رہنمائی کرتے رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی آپ کی زندگی اور تعلیمات صاف و شفاف آئینے کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ قرآن مجید جو آخری آسمانی کتاب ہے اور جو ہر طرح سے مکمل ہے وہ نہ صرف یہ کہ ایک زندہ زبان میں ہے بلکہ اس کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جب نبی کی زندگی اور

آپ پر نازل ہونے والی کتاب کامل ومکمل دنیا میں موجود ہیں تو پھر کسی دوسرے نبی یا کتاب کی ضرورت کیوں کر پیش آسکتی ہے۔اس لیے حضرت محمدؐ آخری نبی اور قرآن مجید آخری کتاب ہے۔اب نہ تو کوئی دوسرا نبی آنے والا ہے نہ ہی کوئی دوسری کتاب نازل ہونے والی ہے۔جب تک دنیا قائم ہے نبی کے اسوے اور قرآن مجید سے دنیا کو ہدایت و رہنمائی ملتی رہے گی۔کسی بھی نبی کے بعد دوسرا نبی تین وجھوں سے آتا ہے:

1. پہلے نبی کی تعلیم و ہدایت مٹ گئی ہو اور اس کو دنیا کے سامنے پھر سے پیش کرنے کی ضرورت ہوں۔
2. پہلے نبی کو جو تعلیم و ہدایت دی گئی ہو وہ مکمل نہ ہو، بعد میں اس میں ترمیم یا اضافہ کرنے کی ضرورت ہو۔
3. پہلا نبی کسی خاص قوم یا علاقے کے لیے ہی بھیجا گیا ہو اور دوسری قوموں یا علاقوں کے لیے نبی کی ضرورت ہو۔

جب ہم حضرت محمدؐ کی بعثت اور زمانے پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ نئے نبی کی بعثت کی اوپر مذکور تینوں وجھوں میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں ہے اس لیے اب آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہی۔مثال کے طور پر پہلی وجہ کو لیجیے۔ حضرت محمدؐ کو جو تعلیم و ہدایت دی گئی تھی وہ مٹی یا ختم نہیں ہوئی بلکہ زندہ ہے۔آپؐ نے جو تعلیمات و ہدایات دیں وہ نہ صرف یہ کہ پوری طرح محفوظ ہیں بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب بھی ہیں۔کوئی جس وقت بھی دین اسلام کی تعلیمات و ہدایات کے بارے میں معلوم کرنا چاہے اسے معلومات مل جائیں گی۔آپؐ نے جن باتوں سے روکا ہے وہ بھی معلوم ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ بھی پوری طرح معلوم ہے۔ان پر زمانہ گزرنے کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے اس لیے جب آپؐ کے ذریعے آنے والی تعلیمات و ہدایات موجود ہیں اور مٹی نہیں ہیں تو پھر ان کی موجودگی میں نئے سرے سے کسی نئے نبی کے ذریعہ انہیں تعلیمات و ہدایات کے بھیجے جانے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے۔اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ بنتی ہے۔

اسی طرح حضرت محمدؐ کے ذریعے جو دین اور شریعت اللہ تعالیٰ نے بھیجا وہ پوری طرح مکمل ہے۔اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔زمانہ خواہ کتنا بھی آگے کیوں نہ بڑھ جائے دین اسلام کی تعلیمات و ہدایات ہر زمانے اور حالات کے مطابق ہیں ان میں نہ تو کوئی کمی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان میں کچھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔جب دین اسلام میں کوئی نقص یا کمی ہے ہی نہیں وہ پوری طرح کامل و اکمل ہے تو پھر نئے سرے سے کسی نئے نبی کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

حضرت محمدؐ کی دعوت صرف مکہ والوں یا عربوں کے لیے نہیں تھی۔آپؐ دنیا کے لیے ہی نہیں عالمین (تمام جہانوں) کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔آپؐ کو جو کتاب ہدایت دی گئی وہ صرف عربوں یا مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہی نہیں بلکہ ھدی للناس (انسانوں کے لیے ہدایت) ہے۔آپؐ کی رسالت پوری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔اس لیے کسی نئے نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

یہ وہ وجہیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو آخری نبیؐ بنا کر اور آخری آسمانی کتاب دے کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا۔آپؐ کی بعثت سے لے کر جب تک دنیا قائم ہے اب وہی دین لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے کام آتا رہے گا جسے آپؐ اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔

2.8 رسالت محمدؐ کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین ایک ہے۔اس نے دنیا میں جتنے بھی رسول اور نبی بھیجے اسی دین کو لے کر بھیجے۔اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سارے رسولوں کی دعوت ایک تھی اس لیے رسالت کے اوصاف میں تمام انبیاء برابر ہیں۔البتہ حضرت محمدؐ کو اللہ نے اپنا آخری رسولؐ بنا کر بھیجا، ساری دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور قیامت تک کے لیے رسول بنا کر بھیجا اس لیے حضرت محمدؐ کی رسالت کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں جو انہیں دوسرے انبیاء سے نمایاں وممتاز کرتی ہیں :

1. حضرت محمدؐ کی رسالت عالم گیر ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی سب سے پہلی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی رسالت عالم گیر ہے۔آپ کسی خاص خطے یا قوم کے لیے نبیؐ بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ آپؐ ساری دنیا کے لیے اور اس پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ کی رسالت محدود نہیں ہے اس کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (السبا: 28)

ترجمہ: ہم نے تمہیں (اے محمدؐ) جو بھیجا ہے تو سارے ہی لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔لیکن بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے :

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً (الا عراف :158)

ترجمہ: (اے محمدؐ) کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

یہ وہ خصوصیت اور امتیاز ہے جو رسولوں میں صرف اور صرف حضرت محمدؐ کو حاصل ہے، بقیہ جو بھی نبی اور رسول بھیجے گئے ان کی دعوت اپنی اپنی قوموں اور علاقوں کے لیے خاص اور محدود تھی۔آپؐ ساری دنیا کی طرف معبوث کیے گئے' چنانچہ آپؐ نے خدا کا جو تصور پیش کیا وہ بھی عالم گیر اور آفاقی ہے کہ اللہ رب العالمین ہے(الحمدللہ رب العالمین)اسی طرح محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے جو کتاب (قرآن) دی وہ بھی عالم گیر ہے یعنی ھدی للناس (تمام لوگوں کے لیے ہدایت) ہے۔اور خود محمدؐ کو بھی کسی کے ساتھ منحصر نہیں کیا بلکہ رحمۃ للعالمین (تمام جہانوں کے لیے رحمت) بنایا۔

2. حضرت محمدؐ کی رسالت ہمیشہ کے لیے (دائمی) ہے

حضور نبیؐ پاکؐ کی رسالت کی دوسری بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی رسالت کسی خاص وقت یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اب جب تک دنیا قائم اور باقی رہے گی تب تک کے لیے آپؐ ہی رسول، ہادی اور رہنما ہیں۔ وحی ورسالت کا سلسلہ آپؐ کی ذات پر ختم اور تمام ہو گیا۔اب قیامت تک کوئی بھی نبی نہیں آئے گا۔خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب: 40)

ترجمہ: بلکہ وہ اللہ کے رسولؐ اور سارے نبیوں کے خاتم (مہر، آخری) ہیں۔

عربی زبان میں خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے تو گویا اب اس میں کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح سلسلہ رسالت کا خاتمہ آپؐ پر ہو گیا۔ اب کوئی بھی رسول آپ کے بعد نہیں آ سکتا۔ اب قیامت تک جسے بھی ہدایت ملنی ہے اور جسے بھی نجات کے راستے پر گامزن ہونا ہے اسے ہدایت و نجات آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی ملے گی۔

3. حضرت محمدؐ کی رسالت (دین و شریعت) کامل و مکمل ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کو جو دین اللہ کی جانب سے عطا ہوا اور جو شریعت آپ کو دی گئی وہ ہر پہلو سے کامل اور مکمل ہے۔ اس میں کہیں سے بھی کسی طرح کا ذرا بھی نقص اور کمی نہیں ہے۔ بلا شبہ دین تو اللہ نے ایک ہی بھیجا لیکن اس کی تکمیل کا اعلان حضرت محمدؐ پر ہی کیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (المائدہ:3)

ترجمہ: (لوگو!) آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

اس طرح دین کامل ہونے کا شرف صرف اسلام کو حاصل ہے جس کی دعوت حضرت محمدؐ نے لوگوں کی دی۔ یہاں ایک ضروری احتیاط یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کو ناقص نہ کہا جائے کیوں کہ وہ جن لوگوں میں اور جس زمانے میں بھیجے گئے ان کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ حضرت محمدؐ پر آ کر رسالت کے ساتھ ساتھ دین کی بھی تکمیل ہوئی ہے۔

4. حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والا پیغام (قرآن مجید) محفوظ ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کو جو پیغام قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دیا گیا وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ اس میں ذرا بھی کہیں پر کسی طرح کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ آپؐ کے زمانے میں تھا اور قیامت تک یہ اسی طرح محفوظ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے: اور اس کا یہ وعدہ ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: 9)

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور یقیناً اس کی حفاظت کرنے والے بھی ہم خود ہی ہیں۔

یہ مسلمانوں کا عقیدہ اور عقیدت نہیں تاریخ اس پر گواہ ہے کہ قرآن مجید جیسا کہ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا تھا بعینہٖ ایک زبر زیر کے فرق کے بغیر آج تک محفوظ ہے۔ مسلمانوں نے اس کی حفاظت حفظ و تلاوت اور کتابت ہر طریقے سے کی ہے اور اب جس طرح کے حالات ہیں اس میں قرآن مجید کے قیامت تک بعینہٖ محفوظ رہنے میں کسی طرح کے شک و شبہے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔

5. حضرت محمدؐ کی زندگی اور سیرت بھی محفوظ ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی پوری زندگی اور سیرت کا ایک ایک واقعہ تاریخ کی پوری روشنی میں ہے اور محفوظ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی لیڈر اور رہنما ایسا نہیں گزرا جس کی زندگی کے حالات ان تفصیلات کے ساتھ موجود ہوں جن کے ساتھ کہ نبی کے حالات زندگی محفوظ ہیں۔ آپؐ کی زبان سے جو کچھ بھی نکلا اور آپؐ کے اعضاء و جوارح سے جن افعال و اعمال کا بھی صدور ہوا آپؐ کے ساتھیوں نے اور ان کے بعد ان کے ساتھیوں نے پوری طرح محفوظ کر لیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

6. حضرت محمدؐ کی زندگی اسوہ اور نمونہ ہے

حضرت محمدؐ کی زندگی کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اسوہ اور نمونہ موجود ہے۔ ایک مسلمان کی گھریلو زندگی کیسی ہو اس کے لیے حضور کی زندگی کا نمونہ موجود ہے۔ تجارت اور کاروبار مسلمان کرے تو کیسے کرے اس کے لیے بھی نبیؐ کی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھے تو کون اس کا رہنما ہو اس کی رہنمائی بھی نبی کی زندگی میں موجود ہے۔ غرض ہر طرح کے حالات میں مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نبیؐ کی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔

7. حضرت محمدؐ کا پیغام اور دعوت عملی ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی دعوت بالکل عملی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ”الدین یسر“ (دین آسان ہے) اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حالات خواہ کیسے بھی بدل جائیں، دین اسلام میں وہ لچک موجود ہے کہ ہر طرح کے حالات میں اس پر عمل کرنا اور ایک باعمل مسلمان کی زندگی گزارنا آسان ہے۔ آج دنیا نے کتنی زیادہ ترقی کر لی ہے انسان نے فضاؤں میں کمندیں ڈال دی ہیں لیکن دین اسلام کی موزونیت کو کبھی کہیں کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوا۔ اسلام ایک زندہ اور موزوں مذہب کے طور پر انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آج بھی موجود ہے۔

8. حضرت محمدؐ نے اپنے پیغام پر خود عمل کر کے دکھایا

رسالت محمدی کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے محض افکار و نظریات نہیں پیش کیے۔ بلکہ جس پیغام کی طرف آپؐ نے لوگوں کو بلایا پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ نے لوگوں سے جن بنیادوں پر سماج کی تشکیل کا مطالبہ کیا پہلے خود انہیں بنیادوں پر ایک کامیاب معاشرہ تشکیل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ام المومنین سیدہ حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ آپؐ کی زندگی کیسی تھی؟ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم نے قرآن مجید نہیں پڑھا؟ اللہ کے رسولؐ کی ذات چلتا پھرتا قرآن مجید تھی۔

9. حضرت محمدؐ نے دین کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا

رسالت محمدؐ کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے دین کو صرف چند عقائد اور عبادات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلام کو ایک نظام زندگی کے طور پر پیش کیا۔ جس میں سماج کے تمام طبقات اور زندگی کے تمام گوشوں کے لیے ہدایت و رہنمائی موجود ہے۔

2.9 رسالت محمدیؐ پر ایمان کا تقاضہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسالت کا سلسلہ قائم کیا اور ہر زمانے علاقے اور قوم میں اپنے رسول لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے بھیجے سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو اپنا آخری رسول بنا کر اور اپنا آخری پیغام (قرآن مجید) دے کر بھیجا اب حضرت محمد کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں۔ آپ آخری رسول ہیں اور آپ کی رسالت کی حیثیت یہ ہے کہ وہی قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ قیامت تک اب کوئی دوسرا نبی اس دنیا میں نہیں بھیجا جائے گا۔ لہذا اب اگر کسی کو نجات حاصل کرنا ہے، خدا کی ہدایت اور رہنمائی کا طالب ہونا ہے تو اسے یہ نجات اور ہدایت ورہنمائی یہیں سے ملے گی۔ اس لیے اس پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ رسالت محمدیؐ پر نہ صرف ایمان لایا جائے بلکہ اس کے لازمی تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔

اس کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ صرف اور صرف دین اسلام کی پیروی کی جائے۔ کیوں کہ اب دنیا میں کوئی ایسا مذہب باقی نہیں جس کی اصل تعلیمات اور ہدایات باقی اور محفوظ ہوں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات وہدایات باقی ومحفوظ ہیں۔ اس لیے اب اگر کسی کو خدا کی بھیجی ہوئی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دین اسلام کی پیروی کرے۔ خود اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّهِ الإِسْلاَمُ (آل عمران: 19)

ترجمہ کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک (مقبول) دین اسلام ہے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: 85)

ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ان آیتوں میں بالکل واضح کردیا گیا ہے کہ اب اگر کسی کو ہدایت حاصل کرنی ہے اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے تو اس کے لیے صرف اور صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے اسلام کا راستہ جس کی دعوت حضرت محمدؐ نے انسانوں کو دی ہے۔

رسالت محمدی پر اس کی خصوصیات کے ساتھ ایمان لانے کا دوسرا تقاضہ یہ ہے کہ آخرت کی نجات اب صرف اور صرف اسلام کو ماننے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے میں ہے۔ کیوں کہ اب جب کہ دین صرف اسلام ہی ہے، تمام لوگوں کو ہدایت و نجات کے لیے صرف اسی کی پیروی کرنی ہے تو آخرت کی نجات بھی صرف اسلام کی پیروی کرنے میں ہے۔ حضرت محمدؐ سے پہلے جو بھی شریعتیں اور طریقے اللہ تعالیٰ نے بھیجے تھے حضرت محمدؐ کی رسالت نے ان سب کو منسوخ کردیا ہے۔ اب کامل اور مکمل دین و شریعت محمدؐ کے ذریعہ انسانوں تک پہنچ چکا اس لیے جو لوگ آخرت کی نجات کے طلب گار ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی آخری دین اسلام کی پیروی کریں اور اسی پر عمل پیرا ہو کر نجات کی امید کریں۔

2.10 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ رسالت پر ایمان اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ رسالت پر ایمان لائے بغیر ہم توحید و آخرت جیسے اہم اور بنیادی عقائد کو بھی نہیں جان سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے جس طرح اس کی مادی ضروریات کا سامان اس پوری کائنات میں پھیلا دیا ہے اسی طرح اس نے انسان کی روحانی ضرورت کو بھی پورا کیا۔ اسے اس کا مقصد تخلیق بتانے کے لیے اس نے ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نبی اور رسول اس دنیا میں بھیجے۔ یہ رسول کسی خاص خطے اور علاقے میں نہیں بھیجے گئے بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر علاقے، ہر زبان اور ہر دور میں بھیجے گئے۔ سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا۔ محمدؐ اللہ کے آخری رسول ہیں اب ان کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں آنے والا۔ ان کے ذریعہ جو دین انسانیت کو ملا اب رہتی دنیا تک انسانوں کی ہدایت و رہنمائی اسی دین کے ذریعے ہوتی رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت محمدؐ کو جو دین اللہ تعالی نے دیا وہ کامل اور مکمل ہے۔ آپ کو اللہ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنی آخری کتاب قرآن مجید۔ یہ کتاب اور نبی کا اسوہ پوری طرح محفوظ ہے حالات چاہے کیسے بھی اور کتنے ہی بدل جائیں اللہ کے رسول کی زندگی اور قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے کافی ہیں۔ ہدایت اور رہنمائی صرف اور صرف قرآن مجید اور محمدؐ کی تعلیمات سے مل سکتی ہے اور آخرت کی نجات بھی اب صرف اور صرف اسلام کو ماننے اور اس کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے میں ہے۔

2.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1. رسالت کا معنی و مفہوم بتاتے ہوئے اس کی اہمیت اور ضرورت پر ایک مضمون لکھیے۔
2. رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ واضح کیجیے۔
3. ختم نبوت کو دلائل کے ساتھ واضح کیجیے۔
4. حضرت محمدؐ کی رسالت کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر/ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 3 : آخرت

اکائی کے اجزاء

3.1 مقصد

3.2 تمہید

3.3 معنیٰ ومفہوم

3.4 عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت

3.5 عقیدہ آخرت قرآن مجید میں

3.6 آخرت کی زندگی کے مختلف مراحل

3.6.1 برزخ

3.6.2 قیامت

3.6.3 حساب کتاب اور جزا وسزا

3.6.4 جنت اور جہنم

3.7 شفاعت اور اس کا اسلامی تصور

3.8 عقیدہ آخرت کا اثر انسانی زندگی پر

3.9 خلاصہ

3.10 نمونے کے امتحانی سوالات

3.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

3.1 مقصد

آخرت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے۔ آخرت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ آخرت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ وہ کون سے امور ہیں جو عقیدہ آخرت کے ضمن میں آتے ہیں اس اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ آخرت کے عقیدہ پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے ان تمام مباحث کا احاطہ کریں جو اس عقیدے کے ضمن میں آتے

ہیں ۔تاکہ طلبہ اس اکائی کے بعد ان تمام باتوں سے واقف ہو جائیں ۔اسی اس عقیدے کی وجہ سے انسان کے اندر جواب دہی کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اور اس جوابدہی کے احساس کے نتیجے میں انسان کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے بھی طلبہ کو واقفیت ہوگی ۔

3.2 تمہید

انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے ۔ایک عمر یہاں پر گزارتا ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے یہاں سے رخت سفر باندھتا ہے یعنی انسان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔جس طرح دنیا میں انسان کی پیدائش اور پھر زندگی ایسی حقیقتیں ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، اسی طرح موت (یعنی دنیوی زندگی کا خاتمہ) بھی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار آج تک کوئی نہیں کر سکا ۔ جو بھی جاندار اس دنیا میں پیدا ہوا ہے، اسے ضرور بالضرور ایک دن مرنا بھی ہے اس حقیقت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں، خواہ وہ کسی بھی مذہب اور عقیدے کے ماننے والے ہوں یا سرے سے کسی مذہب یا خدا کا انکار کرتے ہوں ۔موت برحق ہے اس کا اعتراف سبھی کو ہے ۔لیکن موت کے بعد کیا ہے؟ اس حوالے سے انسانی ذہن نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں ۔انسانوں کا ایک گروہ تو وہ ہے، جو بزعم خود اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے اور سائنس داں وغیرہ ہونے کے دعوے کرتا ہے ۔اس کے خیال میں یہ دنیا کی زندگی ہی کل ہے ۔موت کے بعد کچھ بھی نہیں، مرنے کے بعد انسان گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے ۔اس کے بعد کچھ ہونے والا نہیں ۔ ماضی کے دہریوں کا بھی دنیوی زندگی اور موت کے بارے میں یہی خیال تھا ۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کسی نہ کسی مذہب کو مانتا ہے اس کے خیال میں یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس کے خاتمے یعنی موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے ۔البتہ موت کے بعد کی زندگی کے حوالے سے اس گروہ میں بھی دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں ۔ایک یہ کہ مرنے کے بعد انسان اسی دنیا میں دوسرا جنم لیتا ہے ۔اور جیسے اس نے اعمال اپنی پہلی زندگی میں کیے ہوئے ہیں اسی کے مطابق اس کی دوسری زندگی کی شکل وصورت طے ہوتی ہے ۔اور اس طرح آواگون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی کے خاتمے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں اسے دوبارہ زندگی دی جائے گی اور جیسے اچھے برے اعمال اس نے اس دنیوی زندگی میں کیے ہوں گے اس کے مطابق اسے دوسری زندگی میں بدلہ ملے گا ۔ یہ دوسری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگی ۔اگر اس نے اچھے کام کیے ہوں گے تو ہمیشہ کے لیے نعمتوں بھری زندگی اس کا مقدر ہوگی اور اگر اس کی برائیوں اور غلط کاموں کا پلڑا بھاری ہوگا تو پھر ہمیشہ ہمیش کے لیے سزا اس کا مقدر ہوگی ۔

3.3 آخرت : معنی ومفہوم

آخرت عربی زبان کا لفظ ہے ۔اس کی اصل ء خ ر ہے جس کے معنی بعد میں آنے کے ہوتے ہیں ۔آخرت (ۃ) کا لفظ آخر کا مونث ہے اور اس کا معنی ہے 'سب سے بعد کی' ۔آخرت کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ کئی بار صفت کو موصوف کا قائم مقام بنا دیا جاتا ہے اور موصوف کو ظاہر نہیں کیا جاتا ۔مثال کے طور پر دنیا کے لفظ کو لے سکتے ہیں جس کے معنی ''قریب ترین'' کے ہیں ۔ یہ لفظ بھی صفت ہے اور اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ظاہر نہیں کیا جاتا لیکن جب دنیا کا لفظ ہم بولتے ہیں تو اس سے مراد قریب ترین زندگی (یعنی اس جہان کی زندگی) یا قریب ترین گھر (یعنی موجودہ عالم یا جہاں) مراد ہوتا ہے ۔اسی طرح آخرت کا لفظ بول کر اس سے مراد بھی الحیاۃ الآخرۃ ((بعد میں آنے والی (پچھلی) زندگی یا الدار لآخرۃ (بعد

میں آنے والا (پچھلا) گھر ہوتا ہے۔یعنی ابھی جو زندگی ہے۔اس کے خاتمے کے بعد آنے والی دوسری زندگی۔ایک تحقیق کے مطابق قرآن پاک میں آخرت کا لفظ اس معنی میں 113 (ایک سو تیرہ) جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا موصوف الحیاۃ یا الدار ہے۔

ایک اصطلاح کے طور پر جب ہم آخرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد موت کے بعد سے شروع ہونے والے وہ تمام مراحل، منازل اور مقامات ہوتے ہیں جو انسان کی موت سے لے کر حشر ونشر، حساب کتاب اور جنت وجہنم تک پیش آتے ہیں۔ اس طرح گویا جو شخص آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے وہ فی الواقع درج ذیل چیزوں پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے۔

1. ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ تعالی اس دنیا کو اور اس میں جو بھی مخلوقات ہیں سب کو مٹا کر ختم کر دے گا۔اس دن کو قیامت کہتے ہیں۔
2. اس کے بعد اللہ تعالی ایک نئی دنیا برپا کرے گا۔سب کو (جو بھی اس دنیا میں رہے ہوں) ایک دوسری زندگی عطا کرے گا۔اس دن سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔اس دن کا نام حشر ہے۔
3. دنیا میں جو بھی آیا ہے اور اس نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو بھی عمل کیے ہیں۔ان سب کاموں کا کچّا چٹھا (نامہ اعمال) اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا۔اسے یوم الحساب کہتے ہیں۔
4. پھر اللہ تعالی ہر شخص کے اچھے اور برے کاموں کا جائزہ لے گا۔سب کے اعمال وزن کیے جائیں گے۔جس کی بھلائیوں (اچھے اور نیک کاموں) کا پلڑا برائیوں (برے کاموں) سے بھاری ہوگا اللہ تعالی اسے کامیاب قرار دے کر بخش دے گا۔اور جس کے برے کام اس کے نیک کاموں پر بھاری ہوں گے، اللہ تعالی کی جناب میں وہ ناکام قرار پائے گا اور اللہ تعالی اس کو سزا دے گا۔اسے یوم الجزا کہتے ہیں۔
5. جن لوگوں نے اچھے کام کیے ہوں گے اور اللہ تعالی نے انہیں بخش دیا ہوگا وہ جنت میں جائیں گے اور برے کام کرنے والے جو سزا کے مستحق قرار پائے انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کو جو شخص آخرت پر ایمان لاتا ہے گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق اور پیدائش ایک خاص اور متعین مقصد کے تحت ہوئی ہے۔اسے اس دنیا میں ایک ذمہ دار ہستی بنا کر بھیجا گیا ہے۔یہی نہیں اللہ جو اس کا پیدا کرنے والا ہے اس نے اسے زندگی گزارنے کے لیے ہدایت نامہ بھی دیا ہے جو اس ہدایت پر چلتا اور عمل کرتا ہے وہی سیدھے راستے پر ہے اور جو من مانا راستہ اختیار کرتا ہے اس نے گمراہی اختیار کی ہے۔انسان کی زندگی اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ زندگی ایک مسلسل اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی عمل کرتا ہے بظاہر وہ یہیں پر ختم ہو جاتے ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس کے عمل باقی رہتے ہیں۔جب قیامت آ جائے گی اور دنیا کا یہ سارا کارخانہ ختم ہو جائے گا تو اللہ تعالی ایک بار پھر تمام جانداروں کو پیدا کرے گا۔سب اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔حشر کے میدان میں جمع ہوں گے۔پھر اللہ کی عدالت قائم ہوگی سارے انسان اس کی عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔انسان کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور اسے تولا جائے گا۔نیکوکاروں اور اس دن اللہ کی عدالت میں کامیاب قرار پانے والوں کو بے حد وحساب نعمتیں ملیں گی۔جن کا عمل کھوٹا ہوگا اور جن کے برے اعمال زیادہ ہوں گے انہیں لازوال اذیتوں کا سامنا ہوگا۔اس کے بعد ایک ایسی زندگی شروع ہوگی جو ہمیشہ باقی رہے گی، کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی۔اس زندگی میں موت نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی، یہ ہے آخرت پر ایمان لانے کا مفہوم اور مطلب۔

3.4 عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت

آخرت کا عقیدہ بھی اسی طرح اہمیت کا حامل ہے جس طرح کہ عقیدہ توحید۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لیے ایک خدا پر اس کی تمام صفات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح آخرت پر اس کے تمام متعلقات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ آخرت پر ایمان نہ لائے۔ اور اگر کوئی آخرت کے عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر چاہے وہ ایک خدا کو ماننے والا ہی کیوں نہ ہو اس کا ایک خدا پر ایمان اسے کچھ بھی فائدہ نہیں دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آخرت کی جواب دہی، حشر ونشر، حساب کتاب اور جنت وجہنم کا انکار کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالی کی بہت سی صفات کا بھی انکار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالی کی ایک صفت عدل ہے، ایک صفت حکمت ہے، ایک صفت رحمت ہے، ایک اور صفت حاکمیت ہے وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص ایسا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو گویا وہ اللہ تعالی کی ان تمام صفات کا بھی انکار کرتا ہے کیوں کہ جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں ہمارے اعمال کے اخلاقی نتائج اس طرح سامنے نہیں آتے جس طرح کہ آنے چاہئیں۔ کئی بار ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم ظلم کرتا رہتا ہے، اس کی نہ صرف یہ کہ پکڑ نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ترقی کرتا اور آگے بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ اچھے کام کرتے ہیں لیکن انہیں ان کاموں کا وہ صلہ نہیں ملتا جو کہ ملنا چاہیے اس لیے اگر کوئی ایسا دن نہ ہو جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کاموں کا ٹھیک ٹھیک اور صحیح بدلہ نہ ملے تو یہ بات اللہ تعالی کے عدل، حکمت، حاکمیت اور رحمت جیسی صفتوں کے منافی اور برخلاف ہوگی۔ اللہ تعالی کی ان صفات کا تقاضا ہے کہ قیامت قائم ہو، حشر میں تمام انسان اکٹھا ہوں، حساب کتاب ہو اور جس نے جیسے اعمال اس دنیا میں کیے ہوں ان کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے۔

آخرت کے عقیدے کی اہمیت کو جان لینے کے بعد ضروری ہے کہ یہ بھی جانا جائے کہ عقیدہ آخرت کی ضرورت کیوں ہے؟ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ آخرت کا عقیدہ دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے عقیدہ آخرت ان کی تعلیم کا بنیادی حصہ تھا جس طرح انہوں نے خدا اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دی اسی طرح آخرت پر ایمان لانے کا بھی مطالبہ کیا۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ عقیدہ آخرت کے بغیر خدا اور رسول پر ایمان لانا بالکل بے معنی ہے کیوں کہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس سے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو کرے گا تو اس کا کیا فائدہ ہوگا اور نہ کرنے کا کیا نقصان ہوگا۔ یہ بات انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ وہی کام کرتا ہے جس کا کہ اسے کوئی فائدہ نظر آتا ہے یا وہ انہیں کاموں سے بچتا ہے جن کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ ان کے کرنے سے اسے نقصان اٹھانا پڑنے گا۔ انسان بے فائدہ کاموں کے کرنے کی زحمت نہیں کرتا اسی طرح وہ ان کاموں سے بچنا بھی ضروری نہیں سمجھتا جن کا کوئی نقصان نہ ہو۔ اب اگر کوئی شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا، اسے جواب دہی اور جزا وسزا کا کوئی خوف نہیں ہے تو پھر وہ کیوں کر ایسے کام کرے گا جن کو کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یا کیوں کر ان کاموں سے بچے گا جن سے کہ اللہ نے روکا ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو خدا اور رسول کا ماننا بھی بے کار ہے کیوں کہ اسے جب آخرت کی جواب دہی کا یقین ہی نہیں ہے تو پھر وہ کیوں اللہ اور اس کے رسول کے احکام وہدایات کی پیروی کرے گا۔

آخرت پر ایمان انسان کے اندر نہ صرف یہ کہ یوم آخر کی جواب دہی کا تصوّر پیدا کرتا ہے بلکہ اس عقیدے کی وجہ سے انسان اس دنیا میں بھی ایک ذمہ دار انسان کے طور پر زندگی گزارتا ہے۔ جو شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا اسے اگر دنیاوی قانون کا خوف نہ ہو تو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ کسی کام کے کرنے سے وہ دنیا کے بنائے ہوئے قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا نہ ہی اس سے اس کی سماجی عزت اور احترام پر بٹہ لگے گا تو وہ اس کام کے کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی شخص آخرت کی جواب دہی پر یقین رکھتا ہے تو خواہ دنیا میں اس کی گرفت ہو یا نہ ہو، اس کی سماجی عزت کو خطرہ ہو یا نہ ہو، وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا ہے جو خدا اور اس کے رسول کی منشا کے خلاف ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی کام میں اسے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فائدہ مل رہا ہو لیکن وہ خدا اور اس کے رسول کے احکامات کے خلاف ہے تو وہ اسے نہیں کرے گا۔ اسی طرح کسی کام کے کرنے میں جو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہو، خواہ اسے دنیا میں بظاہر نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو، وہ ہچکچائے گا نہیں کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا اجر تو اسے آخرت میں ملنا ہی ہے۔ سود اور زکوٰۃ اس کی مثالیں ہیں۔ ایک مسلمان سود نہیں لے گا حالانکہ بظاہر اس میں فائدہ ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرے گا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس سے روکا ہے اور آخرت میں اسے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اسی طرح ایک مسلمان زکوٰۃ دے گا۔ حالانکہ زکوٰۃ ادا کرنے میں بظاہر اسے مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے کرنے کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور آخرت کے دن اس سے اس بارے میں باز پرس ہوگی۔ آخرت کا عقیدہ صرف مسلمان کو ہی نہیں کسی بھی انسان کو اس دنیا میں بھی ذمہ دار اور جواب دہ بناتا ہے۔ جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کرسکتا کیوں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اگر کسی طرح اس دنیا کی جواب دہی سے بچ بھی گیا تو بھی آخرت کی باز پرس اور جواب دہی سے اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت بچا نہیں سکے گی۔ اسی طرح آخرت کے عقیدے کو ماننے والا اس دنیا میں ہر اچھا کام کرے گا خواہ ظاہری طور پر دنیا میں اس کی وجہ سے اسے کچھ نقصان ہی اٹھانا کیوں نہ پڑے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے دنیا میں اچھے کام نہیں کیے تو آخرت میں اس سے اس بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ اس لیے وہ نقصان اٹھا کر بھی اچھے کام کرتا ہے۔

3.5 عقیدہ آخرت قرآن مجید میں

قرآن مجید میں صرف آخرت کا لفظ 113 مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات میں عقیدہ آخرت کے مختلف پہلوؤں پر دلائل دیئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ اگر چند الفاظ میں بیان کرنے کے لیے کہا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات ہے۔ خاص طور پر قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بہت تفصیل کے ساتھ آخرت اور اس کے مقامات و منازل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں ہم آخرت سے متعلق چند آیات اور ان کے ترجمے کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی مومنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:

وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (البقرة : 4)

ترجمہ: اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں قیامت کے اثبات اور اس کے مناظر کا بیان نہایت ہی مؤثر انداز میں کیا گیا ہے۔ اور اسے انسانی فطرت (جزاو سزا کا تصوّر) سے بہت قریب کر کے بیان کیا گیا ہے مثلاً سورہ قیامت میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (القيامة: 36)

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں ہے:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ . (المومنون: 115)

ترجمہ: (اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔ قرآن مجید میں قیامت کے وقوع اور روز جزا (بدلے کے دن) کے اثبات کا بیان متعدد مقامات پر ہوا ہے اور اسے اللہ تعالی کے عدل وانصاف کا تقاضہ اور اس کی حکمرانی کے اثبات میں پیش کیا گیا ہے مثلاً سورہ تین میں اللہ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُون فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنِ(التين: 6-8)

ترجمہ: لیکن جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی۔ کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔

قرآن مجید میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اچھے کام کرنے والے اور برے کام کرنے والے یکساں نہیں ہو سکتے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاء مَّحْيَاهُم وَمَمَاتُهُمْ سَاء مَا يَحْكُمُونَ (الجاثية: 21)

ترجمہ: کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ گمان (خیال) کیا ہے کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے۔ ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی۔ ان کا یہ خیال برا ہے۔

انسان کو آخرت پر ایمان لانے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ یہ خیال کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں مختلف مثالیں دے کر اسے سمجھایا گیا ہے۔ سورہ ق کی ابتدائی آیات (1-15) پڑھ جایئے ایک ایک آیت میں اللہ تعالی کی قدرت اور کائنات کی مختلف اشیاء کی تخلیق کا ذکر ہے اور آخر میں فرمایا:

أَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (ق: 15)

ترجمہ: کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سرِ نو پیدائش میں شک ہے۔

جو اللہ پہلے انسان کی تخلیق پر قادر ہے (جب کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا) وہ اللہ انسان کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

اسی بات کو سورہ قیامت میں مزید منطقی انداز میں سمجھایا ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (36)أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى (37)ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى (38)فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (39)أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلَى أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَى (40) (القيامة: 36-40)

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا۔ پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا۔ پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو جوڑا کیا یعنی نر اور مادہ کیا۔ کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم: 27)

ترجمہ: اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا۔ اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لیے آسان ہے۔

3.6 آخرت کی زندگی کے مختلف مراحل

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانی زندگی بنیادی طور پر دو مرحلوں میں تقسیم ہے۔ ایک دنیوی زندگی جس کا دائرہ انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک وسیع ہے۔ قرآن مجید میں اسے حیات دنیا، اولیٰ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اس دنیا میں اس کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ ابدی زندگی ہے اور اسے قرآن مجید میں آخرت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ والآخرۃ خیر من الاولیٰ (اعلیٰ:) (اور آخرت (بعد والی زندگی) پہلی (زندگی) سے بہتر ہے)۔

آخرت کی زندگی جو انسان کی موت کے ساتھ شروع ہوتی ہے اس کے بھی کئی مراحل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ذکر یہاں کسی قدر تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

3.6.1 برزخ

برزخ کے معنی حجاب اور پردے کے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں برزخ کا لفظ 3 مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ (سورہ رحمان 20، الفرقان 53، المومنون 100) اور ہر جگہ پردے اور حجاب کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے انسان کی موجودہ زندگی اور بعد میں آنے والی زندگی کے درمیان جو پردہ اور حجاب ہے اسے برزخ کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (المومنون 100)

ترجمہ: اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربی اور بہت ساری دوسری زبانوں میں بھی دونوں زندگیوں کی اسی درمیانی منزل کا نام 'قبر' ہے۔انسان مرنے کے بعد خواہ زمین میں دفن ہوا ہو، خواہ غرق آب کر دیا گیا ہو، خواہ اسے درندوں اور پرندوں نے اپنی خوراک بنالیا ہو یا اسے نذر آتش کر دیا گیا ہو، ان تمام حالتوں پر قبر کا اطلاق ہوتا ہے۔مطلب یہ کہ قبر ہر اس جگہ کو کہیں گے جہاں مرنے کے بعد انسانی جسم نے جگہ حاصل کی ہو۔اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِيُ الْقُبُورِ (الحج: 7)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ کن حالات سے دوچار ہوتا ہے؟ برزخ میں انسان کی کیفیت وحالت کو سمجھنے کے لیے جو سب سے بہتر اور مناسب وموزوں مثال دی جاتی ہے وہ عالم خواب کی ہے۔یعنی نینداور موت کے درمیان بہت ہی قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت میں نفس وروح کا رشتہ جسم سے ٹوٹتا نہیں بلکہ قائم رہتا ہے اس لیے جسم زندہ اور باقی رہتا ہے جب کہ موت کی صورت میں نفس کا رشتہ انسانی جسم سے ختم ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں ختم ہو کر بکھر جاتے ہیں۔موت کے بعد اور دوسری زندگی کے آغاز سے پہلے انسانی روح کا رشتہ اس کے جسم سے تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس درمیانی منزل میں جسے ہم برزخ اور قبر سے تعبیر کرتے ہیں انسانی روح لذت والم کی کیفیات سے اسی طرح دوچار اور متاثر ہوتی ہے جس طرح نیند کی حالت میں خواب دیکھتے ہوئے انسانی روح لذت والم کو محسوس کرتی ہے اور نیند سے بیداری کے بعد گو کہ اس کے مادّی جسم پر اس لذت والم کے ظاہری آثار دکھائی نہیں دیتے لیکن اس کا احساس بیداری کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

قرآن اور حدیث کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت ہی واضح ہیں کہ عالم برزخ میں عذاب وراحت کے مناظر انسانی روح کے سامنے سے نہ صرف یہ کہ گزرتے ہیں بلکہ روح ان سے دوچار بھی ہوتی ہے۔مثلاً جو اللہ کے نیک اور پاکباز بندے ہیں انہیں برزخ کے دوران ہی جنت اور اس کی نعمتوں کے منظر دکھائے جاتے ہیں اور جو لوگ کہ غلط کار اور گنہ گار رہیں ان کے سامنے دوزخ کا منظر پیش کیا جاتا ہے اور عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ بھی چکھایا جاتا ہے۔اللہ کے رسول حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے: تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح وشام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے۔اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ میں سے ہوتا ہے تو دوزخ۔پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔'' (صحیح مسلم، کتاب الجنۃ والنار جلد دوم) یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو عام طور پر ''قبر'' کی اصطلاح کے حوالے سے پائی جاتی ہے۔صحیح حدیثوں میں عالم برزخ کے حالات کو عام طور پر قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔البتہ ان میں قبر کے لفظ سے مراد زمین کا وہ ٹکڑا نہیں ہے جہاں کہ مردے کا جسم دفن (یا دبا پڑا) ہوتا ہے بلکہ وہاں پر اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں کہ مذکورہ مناظر پیش آتے ہیں اور اس سے مراد ارواح وانفس کی دنیا ہے نہ کہ مادی عناصر کی دنیا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس عالم کے تعلق سے نفس اور نفوس سے خطاب کیا گیا ہے اور ان ہی نفوس کے عذاب وثواب کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے (اصل جسم نہیں) کیوں کہ اعمال کی اصل ذمہ دار انسان کی روح ہے، مٹی کا بنا ہوا اس کا

جسم نہیں۔ کل نفس بما کسبت رھینۃ (المدثر:38) (ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہے۔) جسم ایک آلہ ہے۔ دنیا میں وہ خاکی شکل میں ہوتا ہے اور برزخ میں وہ مادّے سے پاک ہوتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں انسانی روح کہاں رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی ہدایات کا انکار کیا ان کی روحیں مرنے کے بعد زمین میں آوارہ پھرتی ہیں۔ وہیں سے جہنم کے مناظر کا مشاہدہ کرتی اور تکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ اللہ کے نیک اور پاکباز بندوں کی روحیں اپنے پروردگار کے پاس جنت میں ہوتی ہیں اور جنت کی لازوال نعمتوں کا نظارہ کرتی ہیں۔ اسی طرح صحیح حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ عالم برزخ میں (مرنے کے بعد قبر میں) فرشتے آتے ہیں اور مرنے والوں سے توحید و رسالت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ایمان والے جس طرح اپنی دنیا کی زندگی میں ایمان پر قائم اور ثابت قدم رہتے ہیں اسی طرح برزخ میں بھی ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو لوگ دنیا میں کفر و شرک کرتے ہیں برزخ میں بھی وہ فرشتوں کے سوالوں کے صحیح جواب نہیں دے سکیں گے اور بہک جائیں گے۔

3.6.2 قیامت

قیامت کا لفظ قیام کی مونث ہے جس کے معنی اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ (تائے تانیث یہاں زور دینے کے لیے ہے۔) قرآن مجید میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے (تقریباً 70 مقامات پر) اور اس کے علاوہ بھی قیامت کے لیے متعدد نام استعمال ہوئے ہیں۔ اصطلاح میں قیامت سے مراد ایک ایسا دن ہے جب ہستی کی ساری بساط لپیٹ دی جائے گی۔ کائنات کا تمام کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ کوئی بھی چیز باقی نہیں بچے گی۔ پھر اللہ تعالی جو اس سارے نظام کا خالق و مالک ہے نئی زمین اور نئے آسمان پیدا کر کے ایک نیا نظام تشکیل دے گا۔ روز اوّل سے لے کر آخری وقت تک جو بھی انسان دنیا میں پیدا ہوئے انہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ کی عدالت قائم ہوگی اور ہر کسی کو اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔

اس بات پر دنیا کے تقریباً سبھی مذاہب کا یہاں تک کہ سائنس دانوں کا بھی تقریباً اتفاق ہے کہ جس طرح انسان کی زندگی ایک متعینہ مدت کے بعد ختم ہو جاتی ہے، دنیا کی بیشتر اشیاء وجود میں آنے کے بعد فنا ہوتی ہیں اسی طرح یہ نظام عالم بھی ایک نہ ایک دن درہم برہم ہو کر فنا ہو جائے گا۔ اس عظیم تباہی کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں نہ ہمارے سائنس داں کچھ بتاتے ہیں اور نہ ہی دنیا کے دیگر مذاہب میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد کی حقیقت کی تفصیل اور تشریح سب سے واضح اور مکمل شکل میں اگر ہمیں کہیں ملتی ہے تو وہ قرآن مجید اور حضرت محمدؐ کی احادیث ہیں۔ قرآن مجید میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے مثلاً الساعۃ (وہ گھڑی)۔ الیوم الحق (سچا دن) الیوم الموعود (موعودہ دن)، یوم عسیر (ایک سخت دن)، الحاقۃ (ضرور آنے والی گھڑی)، القارعۃ (کھڑکھڑانے والی) الغاشیۃ (چھا جانے والی) وغیرہ۔ اسی طرح قیامت کا بیان فقروں اور جملوں میں بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً یوم ینفخ فی الصور (جس دن صور پھونکا جائے گا) ولیوم لاریب فیه (جس دن میں کوئی شک نہیں) وغیرہ ان تمام الفاظ اور جملوں میں قیامت کے دن کی ہولناکی اور انسان کی عاجزی و بے کسی کا بھرپور اظہار ہے۔

قیامت کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نظام عالم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ حقیقت ہم خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی وجود پذیر ہوتا ہے، ایک نہ ایک دن اسے فنا ہونا ہے۔ افراد واقوام ہر سطح پر قدرت کا یہ نظام جاری وساری ہے۔ جو آج ہے کل کو فنا ہو جائے گا۔ اسی اصول پر کائنات کا نظام بھی گامزن ہے اس لیے جس طرح افراد اور اقوام فنا کے گھاٹ اترتے رہتے ہیں اسی طرح ایک دن اقوام کا یہ مجموعہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور یہی قیامت ہے۔ قیامت کو سمجھنے کا ایک دوسرا ذریعہ بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دنیا کو تضادات کے گہوارے کے طور پر پیدا کیا۔ ہر جگہ متضاد قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ اس تضاد کے باوجود اگر دنیا اور اس کا نظام قائم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر جگہ ایک اعتدال پایا جاتا ہے۔ متضاد قوتیں جب ایک اعتدال کے ساتھ باہم ملتی ہیں تو ان میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ہی یہ اعتدال ختم ہوتا ہے وہ آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب دنیا کا توازن واعتدال بگڑ جائے گا پھر سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اور وہی دن قیامت کا دن ہوگا۔

قیامت کس طرح قائم ہوگی؟ اس سلسلے میں قرآن مجید اور خاص طور پر احادیث مبارکہ میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔ جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے، پھر قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا جو ایک طرح سے قیامت کے آنے کا اعلان ہوگا، (جس طرح کہ کسی بڑی اور اہم خبر سے پہلے نقارہ بجانے کی روایت خود انسانی معاشروں میں موجود ہے) یا پھر اسی آواز کے نتیجے میں تمام کا تمام نظام عالم درہم برہم ہو کر ختم ہو جائے گا۔ قیامت کی ہولناکیوں کا بھی قرآن مجید میں اور حدیثوں میں بھی تذکرہ موجود ہے کہ کس طرح نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ کوئی کسی کو نہ پوچھے گا۔ ماں اپنے دودھ پیتے بچے تک کو چھوڑ دے گی وغیرہ وغیرہ۔ قیامت کے نتیجے میں جب ایک بار دنیا کا کارخانہ ختم ہو جائے گا تو پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا۔ اس کی آواز سن کر سب سے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک سبھی لوگ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے' اللہ کے حکم سے نئی زمین اور نئے آسمان وجود میں آئیں گے۔ سب لوگ ایک جگہ اکھٹا ہوں گے' اسے حشر کہتے ہیں۔ پھر حساب کتاب ہوگا، جس نے پہلی زندگی میں جیسا کچھ اور جو کچھ بھی کیا ہوگا سب کچھ اس کے سامنے آجائے گا۔ اگر دنیا میں اعمال اچھے رہے ہوں گے تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر دنیا میں برے کام زیادہ کیے ہوں گے تو پھر برا بدلہ ملے گا۔

قیامت کا آنا ضروری ہے۔ اس پر قرآن مجید نے دو طرح سے استدلال کیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالی نے انسان کو اور پھر اس کے لیے کائنات کے اس پورے کارخانے کو یوں ہی بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا اس کے اچھے برے اعمال پر مواخذہ ہو اور پھر اس کے مطابق بدلہ بھی ملے۔ ایسا ہونا قیامت کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالی عادل اور منصف ہے۔ اس کے عدل وانصاف کا لازمی تقاضا ہے کہ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے اور برے اعمال کی سزا ملے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو گویا اللہ تعالی (نعوذ باللہ من ذلک) ظالم قرار پائے گا۔ چونکہ اس دنیا میں انسان کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا عام طور پر نہیں ملتی اس لیے ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب اللہ تعالی انسانوں کے درمیان عدل وانصاف کرے۔ اس دن کا قیام قیامت کے بغیر ممکن نہیں۔

جو لوگ بھی قیامت کا انکار کرتے ہیں ان کی بنیادی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جب دنیا میں مرنے کے بعد دوبارہ کوئی نہیں جیتا تو پھر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد قیامت کے دن انسان کا جی اٹھنا مزید محال ہے۔ چونکہ انسانی تجربہ اس کی نفی کرتا ہے اس لیے دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ قرآن مجید نے منکرین قیامت کے وہم کا درج ذیل طریقوں سے ازالہ کیا ہے:

1. قرآن مجید میں ایسی مثالیں پیش کی گئیں جن میں اس دنیا میں دوبارہ زندگی ملی مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کا پرندوں کو زندہ کرنے کا معجزہ،اصحاب کہف کا قصہ یا حضرت عیسی کا مردوں کو زندہ کردینا۔

2. قرآن مجید میں زمین کی مثال پیش کی گئی ہے کہ تپش اور گرمی کے سبب وہ ایسی ہو جاتی ہے کہ اس میں زندگی کی ذرا بھی رمق باقی نہیں رہ جاتی۔لیکن جیسے ہی بارش کے چھینٹے اس پر پڑنے شروع ہوتے ہیں وہ زندہ ہو اٹھتی ہے اور سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔جب مردہ زمین دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے تو پھر مردہ انسانوں کو بھی اللہ دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

3. جو خدا زمین،آسمان اور کائنات کی ایک ایک چیز بنانے اور پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس خدا کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہو سکتا کہ وہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کردے۔

4. جب انسان اور یہ کائنات کچھ بھی نہیں تھا تو اللہ تعالی نے عدم سے ان چیزوں کو وجود بخشا۔جو خدا عدم سے وجود عطا کر سکتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بار کسی چیز کو بنا لینے کے بعد وہ اس کے دوبارہ وجود میں لانے پر قادر نہ ہو۔

5. افراد کے مرنے اور مٹ جانے پر ہم سب آسانی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کیوں کہ ہمارے سامنے یہ روز مرّہ کا معمول ہے لیکن قوموں اور بڑے بڑے گروہوں کا مٹنا اور ختم ہونا آسانی سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔اس کے باوجود یہ تاریخی حقیقت ہمارے سامنے موجود ہے کہ دنیا میں کتنی بڑی بڑی قومیں اٹھیں،عروج کو پہنچیں اور صدہا برس نظام عالم پر چھائی رہیں لیکن پھر فنا بھی ہو گئیں،اب ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔اس طرح یہ دنیا بھی ایک دن فنا ہو جائے گی جس طرح ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لیتی رہتی ہے اسی طرح اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا قائم ہوگی۔

قیامت میں انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا۔اس کی یہ دوبارہ زندگی محض روحانی نہیں بلکہ جسمانی ہوگی۔انسان ایک نئے جسم کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور اس کا یہ جسم اس کے اعمال کے مطابق ہوگا یعنی جیسے انسان کے اعمال ہوں گے ان کی روحوں کو انہیں اعمال کے مطابق جسموں میں داخل کیا جائے گا۔اصل مواخذہ اور ذمہ داری روح سے متعلق ہے چنانچہ قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی موجود ہیں جن میں عمل اور اچھے برے نتیجے کی ذمہ داری روح پر ڈالی گئی ہے مثلاً سورہ فجر میں ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر 27-30)

ترجمہ: اے مطمئن نفس اپنے رب کی طرف خوشی خوشی پلٹ جا پس داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

3.6.3 حساب کتاب اور جزا وسزا

اسلام کے مطابق آخرت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسان یہ جان لے کہ وہ جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے اس کا کچھ بدلہ تو اس دنیا میں مل جاتا ہے لیکن پورا پورا بدلہ اس وقت ملے گا جب قیامت کے نتیجے میں یہ دنیا ختم ہو جائے گی،ایک نئی دنیا قائم ہوگی،انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا،ان کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور پھر اعمال کے مطابق ہی اچھا یا برا بدلہ دیا جائے گا۔اسی لیے اسے یوم الدین یعنی بدلے کا دن کہا جاتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ پورے کا پورا جواب دہی کے تصور پر قائم ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو ذمہ دار بناتا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا ہر عمل ایک ذمہ دار کی حیثیت میں ہے۔ وہ جو کچھ بھی یہاں کرتا ہے نہ صرف یہ کہ اس کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے بلکہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس کے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ اسے دیا جائے گا۔ صرف اسلام ہی نہیں دنیا کے تمام مذاہب نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق قرار دیا ہے اور ان سب میں جواب دہی اور جزا وسزا کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ ہندومت میں آواگون کا تصوّر ہو یا عیسائیت اور یہودیت جیسے مذاہب میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے مصائب کا بیان ہر جگہ انسان کے ذمہ دار ہونے اور اعمال کا بدلہ دیے جانے کی بات واضح ہے۔ البتہ اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس نے عقیدہ آخرت کے ذریعہ جواب دہی اور جزاوسزا کے تصوّر کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا بلکہ اسے انتہائی کمال تک پہنچا دیا۔ دیگر مذاہب میں اس حوالے سے جو تصوّرات ناقص تھے اسلام نے ان کی تکمیل کر دی اور جواب دہی اور جزاوسزا کے بارے میں جو بھی شکوک وشبہات انسانی ذہن میں اٹھتے ہیں اسلامی تعلیمات میں ان کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک خاص نظام اور قانون کا پابند بنایا ہے جس پر کہ یہ جاری ہے۔ سائنس داں اور فلسفی اس نظام و قانون کو قدرت یا Nature کہتے ہیں جب کہ مذہب والے اسے تقدیرِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے اس نظام وقانون کے تحت اس دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے اس کے اثرات ونتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ اصول صرف مادی چیزوں میں ہی جاری نہیں بلکہ انسان کی اندرونی کیفیات اور اعمال بھی اس اصول کے پابند ہیں مثلاً جس طرح زہر انسانی جسم کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح گناہ انسان کی روح کو مردہ کر دیتا ہے۔ جس طرح علاج اور پرہیز سے بیمار انسانی جسم کو صحت ملتی ہے اسی طرح تزکیہ نفس انسانی روح کو بالیدہ اور روحانی بیماریوں سے شفایاب کرتا ہے۔ غرض عمل اور ردّعمل کا سلسلہ جس طرح انسان کی مادی وجسمانی زندگی میں جاری ہے، انسان کی روحانی زندگی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انسان کا ہر قول وفعل اثرات کا حامل ہوتا ہے اچھے قول وعمل کا اثر اچھے بدلے کی صورت میں ظاہر ہوگا اور برے قول وعمل کا لازمی نتیجہ برے بدلے کی صورت میں سامنے آئے گا۔ مطلب یہ کہ انسان کو جزاوسزا جو بھی ملے گی وہ اس کے دنیا میں کیے گئے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ اس کی صراحت اللہ کے رسولؐ کے پاک ارشاد میں اس طرح ملتی ہے۔ ''اللہ تعالیٰ قیامت میں فرمائے گا اے میرے بندو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تمہیں لوٹا رہا ہوں۔ تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔ (صحیح مسلم کتاب الزہد)

ہم انسان اپنی روزمرہ کی دنیاوی زندگی میں بار بار یہ دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک انسان بڑی تکلیف سے بچنے کے لیے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں آسانی سے برداشت کر لیتا ہے مثلاً کسی بیماری کی تکلیف سے بچنے کے لیے کڑوی کسیلی گولیاں کھاتا ہے۔ اسی طرح کسی بڑی راحت اور خوشی کے حصول کے لیے چھوٹی موٹی خوشیاں تج دیتا ہے مثلاً اس کا جسم صحت مند رہے اس کے لیے وہ صبح کی میٹھی نیند سے بے دار ہوتا ہے اور مختلف طرح کی ورزشیں کرتا ہے۔ اور ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ نتائج کے بارے میں اسے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح انسان دنیوی معاملات کے ماہرین کی باتوں کا یقین کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہوتا ہے اسی طرح اگر وہ آخرت کے معاملات کے ماہرین انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے عمل کرے یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو آخرت میں اچھا بدلہ ضرور ملے گا۔

انسان اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ بھی کرتا ہے، چونکہ وہ اپنے ایک ایک عمل کے لیے جواب دہ ہے اس لیے اللہ تعالی کی جانب سے اس کے تمام اچھے برے اعمال کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالی کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ (آل عمران: 30)

ترجمہ: جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ (7) وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ (8) (الزلزال: 7-8)

ترجمہ: تو جو کوئی ایک ذرّہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو ذرّہ برابر بھی بدی (برا کام) کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

اس کا مطلب ہے کہ انسان جو کچھ بھی اچھا برا عمل کرتا ہے سب کا سب نہ صرف یہ کہ اللہ کی نظر میں ہے بلکہ سب کا ریکارڈ بھی اس نے محفوظ کر رکھا ہے اور انکار کی صورت میں اللہ تعالی سب کچھ پیش کر دے گا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (الزخرف: 80)

ترجمہ: کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے؟ کیوں نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس (اعمال کو) لکھتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ انسان کا نامہ اعمال اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَلْقَاهُ مَنشُوراً (13) اقْرَأْ كَتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيباً (14) (بنی اسرائیل! 13-14)

ترجمہ اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے۔ آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

نامہ عمل کے لیے کتابت اور رجسٹر وغیرہ الفاظ کنایے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ انسان کا ایک ایک عمل محفوظ رہے۔ آج کے کمپیوٹر ٹکنالوجی کے دور میں ہمارے لیے اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہو گیا ہے۔ ایک معمولی چپ (Chip) لگا کر ہم گاڑیوں کی نگرانی کر سکتے ہیں اللہ کی ذات سے بالکل بعید نہیں کہ ہر انسان کے جسم میں کوئی ایسی چیز تخلیق کر دے جو اس کے ایک ایک عمل اور بات کو محفوظ رکھے جیسا کہ اوپر کی آیت میں اشارہ بھی ہے۔ انسان کے اعضاء کی شہادت سے متعلق آیات و احادیث اس سلسلے میں بہت ہی واضح ہیں۔

انسان عام طور پر اچھے اور برے دونوں طرح کے عمل کرتا ہے اس کے کچھ عمل اچھے ہوتے ہیں اور کچھ عمل برے ہوتے ہیں۔ قیامت میں (آخرت میں) جب اللہ تعالی انسان کو اچھا یا برا بدلہ دینے کا فیصلہ کرے گا تو انہی اچھے اور برے اعمال کی بنیاد پر کرے گا۔ آخرت کے دن جب اللہ کی عدالت قائم ہوگی دنیا کے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک سبھی انسانوں کا کچّا چٹھا اس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالی کی میزان میں انسان کے تمام اعمال تولے جائیں گے۔ کسی کے ساتھ ذرّہ برابر بھی زیادتی نہیں

ہوگی۔اس دن جس کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا اسے اللہ کی عدالت سے اچھا بدلہ دیے جانے کا فیصلہ ہوگا اور جس کے برے اعمال زیادہ ہوں گے اسے برا بدلہ دیا جائے گا۔اللہ تعالی کے حساب میں کسی قسم کا ذرا بھی نقص نہیں ہوگا۔

3.6.4 جنت اور جہنم

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔انسان یہاں پر اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے مطابق زندگی گزار کر دنیا کے اس امتحان میں کامیاب ہو اور ابدی نعمتوں سے ہم کنار ہو۔البتہ اللہ تعالی نے انسان کو اختیار کی آزادی بھی دی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ چاہے تو دنیا میں امتحان کی تیاری اس ڈھنگ سے کرے کہ کامیاب ہو جائے اور چاہے تو یہاں جو وقت اور موقع اسے حاصل ہیں انہیں یوں ہی کھیل کود اور تفریح میں گزار دے اور آخرت میں ناکام ہو جائے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے دنیا کا یہ کارخانہ کیوں قائم کیا؟ اس نے انسان کو عمل کی تکلیف کیوں دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی انسان کو ابدی سعادت اور لامتناہی ترقی سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے اور اس کی نبیاد اس پر رکھی ہے کہ انسان اپنی دنیا کی زندگی میں اچھے عمل کرے اور غلط اور برے کاموں سے بچے۔اس نے انسان کو یونہی نہیں چھوڑا بلکہ اچھے اور برے کاموں کے درمیان تمیز کے لیے ہدایت و رہنمائی کا انتظام بھی کیا۔اس کے بعد اگر کوئی اچھے کام کرتا ہے اور برے کاموں سے بچتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ابدی سعادت کی اس آخری منزل پر فائز کرے گا جس کا کہ اس نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے اور جسے ہم جنت کے نام سے جانتے ہیں۔اور اگر کوئی اپنے ارادہ و اختیار سے اللہ کی عطا کی ہوئی ہدایت و رہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی ان دیکھی کرتے ہوئے غلط اور برے کام کرتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ابدی سعادت یعنی جنت سے ہم کنار ہو بلکہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جہاں اسے اس کی غلط کاریوں کی سزا ملے گی۔

جنت وہ مقام ہے جو ابدی ہے اور جہاں انسان کو اللہ تعالی کی وہ تمام نعمتیں میسر ہوں گی جن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا؟ جنت ہی انسان کی حقیقی منزل اور مقام ہے کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدمؑ کو تخلیق کے بعد اللہ سبحانہ تعالی نے جنت میں ہی رکھا تھا۔جب ایک نافرمانی کے نتیجے میں انہیں دنیا میں اتارا گیا تو بھی دنیا کی خلافت کے ساتھ ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ اور ان کی نسل اس ابدی مقام میں پھر سے داخلہ چاہتی ہے جہاں وہ رہ بھی چکے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل میں اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے پابند رہیں۔یہی وہ طریقہ اور راستہ ہے جس پر چل کر وہ جنت کی ابدی اور دائمی راحت و مسرت کو حاصل کر سکتے ہیں۔گویا جنت انسان کا وہ ورثہ ہے جس کے حصول کے لیے وہ اس دنیا میں ہے لہذا اس کی سعی و عمل کا اصل مرکز و محور اسی جنت کا حصول ہونا چاہیے جہاں وہ ابدی سعادت سے ہم کنار ہوگا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر جہنم کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی غفور و رحیم کے ساتھ ساتھ عادل و منصف بھی ہے۔یہ اس کے عدل و انصاف کے خلاف ہوگا کہ وہ فرماں بردار اور نافرمان دونوں طرح کے انسانوں کو ایک ہی جگہ اکھٹا کر دے۔چنانچہ جس طرح اس نے فرماں بردار بندوں کے لیے جنت کے مقام میں واپسی کا وعدہ کر رکھا ہے اسی طرح نافرمانوں کو ان کی نافرمانی کے بدلے سزا دینے کی دھمکی بھی دے رکھی ہے اور سزا کا جو مقام ان کے لیے مقرر ہے وہ دوزخ یا جہنم ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان کے لیے سزا کی وہ تمام انتہائیں موجود ہیں جن کا کہ وہ تصوّر بھی کر سکتا ہے۔جہنم ان لوگوں کا ابدی ٹھکانہ اور مقام ہے جنہوں نے کہ کفر اور شرک کا رویہ اختیار کیا اور اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی موجودگی میں اس کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس سے انحراف کرتے ہوئے برائیوں اور غلط کاموں پر عمل پیرا رہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جو فی الواقع تو ایمان رکھتے ہیں لیکن انسانی تقاضوں اور لذات دنیا میں پڑ کر اللہ کی ہدایت ورہنمائی سے غافل ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے غلط اور برے کاموں کا پلڑا ان کے اچھے کاموں کے مقابلے بھاری ہو جاتا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ایسے لوگ اللہ کی ذات وصفات اور اس کی ہدایت پر یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کا اصل اور آخری ٹھکانہ تو جنت ہی ہے لیکن چونکہ انہوں نے بہت سارے برے کاموں کا ارتکاب کیا ہوا ہے اس لیے ان برائیوں کی پاداش میں انہیں عذاب دنیا، عذاب برزخ اور عذاب آخرت (جہنم) سے دو چار ہونا پڑ سکتا ہے اور اپنی برائیوں اور گناہوں کے سبب وہ ایک عرصے تک جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کی رحمت ومغفرت سے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالاخر جنت میں داخل ہوں گے۔مگر یہ کہ یہ سزا کتنی طویل اور کیسی سخت ہوگی ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اچھے عمل کر لیں اور جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔

3.7 شفاعت اور اس کا اسلامی تصور

آخرت کے عقیدے کو اس کی صحیح شکل میں اور اصل اسپرٹ کے ساتھ جاننے، سمجھنے اور تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی جس کا شکار لوگ اکثر ہوتے رہتے ہیں، کا ازالہ کر لیا جائے اور وہ ہے شفاعت کا غلط تصور۔ بلاشبہ ہم انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے بہت سے معتقدات ایسے رکھتے ہیں جو ہمیں خوش گمان رکھ سکیں۔انہیں میں ایک شفاعت کا غلط تصوّر بھی ہے جس کے تحت انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس خوش گمانی میں مبتلا رہتی ہے کہ چاہے وہ جو کچھ بھی کرتی رہے اللہ کے کچھ مقرب بندے، جن کو وہ مختلف طریقوں سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اسے اللہ کے غضب اور سزا سے بچا لیں گے۔انسان کے اندر شفاعت کا جب یہ تصوّر مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ کو راضی اور خوش کرنے والے تمام کاموں کو چھوڑ کر غلط کاموں میں پڑ جاتا ہے۔جو کچھ بھی اس کے دل اور مرضی میں آتا ہے کرتا پھرتا ہے اور آخر میں زندہ یا مردہ انسانوں کی بارگاہ میں حاضری دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے یہ مقرب اور بزرگ بندے اللہ کے دربار میں اس کی سفارش کر کے اسے اس کے غلط کاموں کی پاداش میں ملنے والی سزا اور عذاب سے بچا لیں گے اور یہی نہیں وہ ان کی سفارش کی وجہ سے جنت میں اعلیٰ مقام بھی حاصل کر سکے گا۔

اسلام شفاعت کے اس غلط تصوّر کی نفی کرتا ہے۔آخرت کی زندگی میں کسے جنت ملنی چاہیے اور کس کا مقدر جہنم ہے اس کا پورا پورا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔اللہ کے علاوہ اس معاملے میں کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔اللہ تعالیٰ کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ(الحج: 56)

ترجمہ: بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی۔یعنی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

عقلی طور پر بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب کائنات کی ایک ایک چیز کا مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے تو اس کے فیصلوں میں کسی کو بھی کوئی اختیار نہیں مل سکتا۔اسی طرح چونکہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کے ایک ایک عمل اور بات کی خبر ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے اس لیے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں وہ کسی کی سفارش یا شہادت (گواہی) کا محتاج نہیں ہے۔پھر کوئی انسان جو کہ اپنے بارے میں بھی پورا

پورا علم نہیں رکھتا، اس کے دربار میں کسی دوسرے شخص کی سفارش کیوں کرے گا۔ جو خود ہی محتاج ہو وہ کسی دوسرے کی حاجت روائی کیسے کر سکتا ہے۔ توحید کے باب میں ہم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہیں کہ اللہ عادل ہے۔ وہ ہر حال میں عدل کرنے والا ہے، اس لیے کسی سفارش پر وہ کیوں کر کچھ لوگوں کو بخش سکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے عدل کے خلاف ہوگی کہ وہ کچھ ایسے لوگوں کی مغفرت کر دے جو اپنے ایمان اور عمل کے لحاظ سے مغفرت کے مستحق نہ ہوں۔ یہ تو ظلم ہو جائے گا اور اللہ ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی کی امید ایمان اور عمل صالح کے بعد ہی کرنی چاہیے۔ کسی بھی بندہ کی خوشنودی یا سفارش انسان کو آخرت میں اللہ کے محاسبے سے نہیں بچا سکتی وہاں نہ کوئی لین دین کام آئے گا، نہ کوئی دوستی کارگر ہوگی اور نہ ہی کسی طرح کی سفارش ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی سفارش کی تردید کر دی ہے' اس کا ارشاد ہے:

مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلاَ خُلَّةٌ وَلاَ شَفَاعَةٌ (البقرة : 254)

ترجمہ: اس دن کے آنے سے پہلے، جس دن کہ نہ کوئی لین دین ہوگا، نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔

عمل سے بے پروا ہو کر بزرگوں اور اللہ کے مقرب بندوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ آخرت میں انہیں اللہ کے عقاب و عذاب سے بچا لیں گے، شفاعت کا غلط اور مشرکانہ تصور ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا کچھ لوگ ہیں جو خدا کی خدائی میں شریک ہیں اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اللہ کا کوئی بھی مومن بندہ ایسے خیالات کا حامل نہیں ہو سکتا۔

لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شفاعت کا مطلب کیا ہے؟ کیا آخرت میں شفاعت نام کی کوئی چیز ہوگی ہی نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شفاعت ایک حقیقت ہے۔ آخرت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے کچھ مخصوص بندوں کی شفاعت کچھ لوگوں کے حق میں قبول کرے گا البتہ ان کی یہ شفاعت اس طرح کی شفاعت نہیں ہوگی جس کا ذکر کہ درج بالا سطور میں کیا گیا ہے اور جس کی تردید قرآن وحدیث میں بار بار کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخرت میں اللہ کے کچھ مخصوص بندے کچھ لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ البتہ یہ شفاعت بنیادی طور پر ایک مختلف طرح کی شفاعت ہوگی۔ یہ شفاعت ایسی ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ کی عدل، حکم اور ملک وغیرہ صفات اور ان کے لازمی تقاضوں پر کسی طرح کی کوئی ضرب نہیں پڑتی ہوگی۔ اس سے نہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی فرق پڑتا ہوگا نہ اس کی حاکمیت اور مالک ہونے پر کوئی سوال اٹھتا ہوگا۔ مطلب یہ کہ یہ شفاعت بالکل عام اور بے قید نہ ہوگی بلکہ خاص اور محدود ہوگی۔ کچھ شرطوں کے ساتھ ہوگی اور شفاعت کرنے والے کچھ اصول اور ضابطوں کے پابند ہوں گے۔ یہ شفاعت کس طرح کی ہوگی قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بہت کھول کر بیان کر دی گئی ہیں یہاں ہم انہیں بالترتیب نقل کرتے ہیں۔

1. شفاعت کا معاملہ پورے کا پورا اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور جو کچھ بھی ہوگا اس کی مرضی اور حکم کے مطابق ہوگا۔ اس کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے:

   قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعاً (الزمر: 44)

   ترجمہ: کہہ دو کہ شفاعت تمام کی تمام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

2. شفاعت صرف وہی انسان یا اللہ کا مقرب بندہ کر سکے گا جس کو اللہ تعالی شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔ اللہ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی بھی انسان شفاعت کے لیے زبان نہیں کھول سکے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

مَن ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (البقرہ: 255)

ترجمہ: کون ہے جو (اللہ) اس کے پاس شفاعت کر سکے مگر اس کی اجازت سے۔ یعنی کوئی بھی شخص اللہ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی کی کوئی سفارش نہیں کر سکے گا۔

3. جو بھی شفاعت کرے گا یا اللہ تعالی جس کو بھی شفاعت کی اجازت دے گا وہ صرف اسی شخص کے لیے شفاعت کر سکے گا جس کی شفاعت کی اللہ نے اسے اجازت دی ہوگی۔ یعنی اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر نہ تو کوئی شفاعت کر سکے گا اور نہ ہی کسی کی شفاعت کی جا سکے گی۔ اللہ کا واضح ارشاد ہے:

لَا یَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَى (الا نبیاء : 28)

ترجمہ: صرف انہیں لوگوں کے لیے شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ کی مرضی ہوگی۔

4. شفاعت کی جن لوگوں کو اجازت ملے گی اور جن کے لیے ملے گی ایسا نہیں ہے کہ وہ ان کے لیے جیسی تیسی سفارش کریں بلکہ ان کے حق میں وہ وہی بات کہیں گے جو کہ بالکل درست اور صحیح ہوگی۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

لَّا یَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرحْمَنُ وَقَالَ صَوَاباً (النباء : 38)

وہ کوئی بات نہ کہیں گے مگر وہی جس کے لیے اللہ نے (رحمان نے) اسے اجازت دی ہوگی اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔

اس تفصیل سے یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ آخرت میں شفاعت ہوگی۔ اللہ تعالی اپنے کچھ مخصوص بندوں کی سفارش کو قبول کرے گا البتہ سفارش کی یہ قبولیت عام نہ ہوگی بلکہ محدود ہوگی۔ شفاعت کرنے والے اللہ کے حضور اس کی اجازت سے اس کے کچھ بندوں کے بارے میں اس کے رحم و کرم کی درخواست کریں گے۔ یہ شفاعت کرنے والے اللہ کے محبوب اور مقرب بندے ہوں گے اور جن کی شفاعت کی جائے گی ان کا معاملہ یہ ہوگا کہ ان کے ایمان و عمل میں کسی قدر کمی رہ گئی ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالی کے عام قانون کے تحت ان کی بخشش نہیں ہو پائے گی۔ اللہ کے مقرب بندے اس کمی سے درگزر کرنے کی اللہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان کی کمیوں پر پردہ ڈال دے اور انہیں محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے۔ اس شفاعت کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ ایک ایسے دن جب اللہ کی جناب میں کوئی اُف تک نہ کہہ سکے گا، اللہ کی کبریائی کے سامنے سارے انسان سہمے ہوئے خاموش کھڑے ہوں گے اللہ تعالی اپنے کچھ مقرب بندوں کو اس دن شفاعت کی نہ صرف اجازت دے گا بلکہ ان کی شفاعت کو قبول بھی کرے گا۔ اس طرح فی الحقیقت یہ شفاعت اللہ کی جانب سے اپنے مقرب بندوں کی عزت افزائی ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں اور احادیث سے یہ ثابت بھی ہے کہ محض اپنے عمل کی بنیاد پر کسی شخص کی مغفرت نہیں ہوسکتی۔ مغفرت اللہ تعالی کی خاص عنایت ہے جو وہ اپنے بندوں پر کرے گا۔ البتہ یہ مغفرت بھی اللہ تعالی کے قانون عدل کے دائرے میں ہوگی اور

جس کا ایمان وعمل جتنا بہتر ہوگا اسی قدر وہ اللہ تعالی کے کرم اور مہربانیوں کا مستحق قرار پائے گا۔اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ مغفرت کا اصل انحصار انسان کے ایمان وعمل پر ہے اور مغفرت کرنے کا اصل اختیار صرف اور صرف اللہ تعالی کی ذات کو حاصل ہے۔

3.8 عقیدہ آخرت کا اثر انسانی زندگی پر

انسانی زندگی پر عقائد میں سے جو سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں،عقیدہ آخرت ان میں انتہائی اہم ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید کی تعلیمات کے بعد سب سے زیادہ زور آخرت کے ایمان ویقین پر دیا گیا ہے۔قرآن مجید میں ایسی سورتوں اور آیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں آخرت اور اس میں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ انتہائی مؤثر انداز میں ہوا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو جواب دہ بناتا ہے۔یہ انسان میں اس بات کا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔اس سے اس کے ایک ایک عمل کی باز پرس ہوگی وہ کوئی کام---خواہ کھلے میں کرے یا ڈھکے چھپے---اس کے کام دنیا کی نظروں میں آئیں یا نہ آئیں آخرت کا عقیدہ اسے بتاتا ہے کہ اس کا ایک ایک عمل نہ صرف ریکارڈ ہورہا ہے بلکہ ایک دن ایسا آئے گا جب مرنے کے بعد اس کا خالق ومالک اسے دوبارہ اٹھائے گا اور اس نے جو کچھ بھی عمل اس دنیا میں کیا ہوگا اس کا حساب لے گا اور پھر عمل کے مطابق اسے اچھا یا برا بدلہ دے گا۔جس انسان کے اندر بھی آخرت کا یہ تصور پیدا ہوجائے وہ یقینی طور پر ذمہ دار بن جاتا ہے اور کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو اللہ کو ناپسند ہو۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو صرف جواب دہ ہی نہیں بناتا بلکہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بنے۔ایک ایسا انسان بنے جو اپنے مالک کے فرمان پر عمل کرنے والا ہو اور اس کی مخلوقات کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنے والا ہو۔گویا آخرت کا عقیدہ انسان کو اپنے مالک وخالق کا مطیع وفرماں بردار بنانے کا ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی بناتا ہے جو اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے۔اس عقیدے کو ماننے والا شخص کوئی بھی کام ایسا نہیں کرتا جو قانون کے خلاف ہو۔وہ قانون کی صرف ظاہری پابندی ہی نہیں کرتا بلکہ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکی، بظاہر اسے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ہر حال میں وہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون سے تجاوز نہیں کرتا۔وہ وہی کام کرتا ہے جن کے کرنے کا اللہ نے اسے حکم دیا ہے اور وہ ان تمام کاموں سے بچتا ہے جن سے کہ اللہ تعالی نے منع کیا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو دنیا کے خوف سے بے نیاز کردیتا ہے۔وہ دنیا میں کسی سے ڈر کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اس کے ہر کام کے پیچھے اللہ کا ڈر اور خوف کارفرما ہوتا ہے۔یعنی عقیدہ آخرت پر یقین رکھنے والا شخص دنیا اور اس کے لوگوں سے ڈرنے کے بجائے اللہ سے ڈرتا ہے اور اسی ڈر کی وجہ سے وہ دنیا کی برائیوں سے بچتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو بہادر اور حوصلہ مند بنا دیتا ہے۔آخرت کو ماننے والا شخص چونکہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوتا ہے کہ اصل جواب دہی آخرت کی جواب دہی ہے اور آخرت میں اچھے اعمال کا بدلہ جنت کی صورت میں ملے گا جہاں وہ تمام نعمتیں اسے

ملیں گی جن کا کہ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ وہاں مقام محمود میں ہوگا، اسے اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوگا یہی نہیں اس کی آنکھیں دیدار الٰہی سے بھی شرف یاب ہوں گی، تو پھر اس کے اندر اتنا حوصلہ اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں جان دینے سے بھی نہیں گھبراتا بلکہ خوشی خوشی وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو انصاف پسند اور عدل کا پیروکار بناتا ہے۔ چونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق ہے اور اسے اپنے دنیوی اعمال کے لیے آخرت میں جواب دہ ہونا ہے اس لیے وہ کسی کے ساتھ بھی ظلم و ناانصافی کے ساتھ نہیں پیش آتا بلکہ ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔

3.9 خلاصہ

آخرت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے آخرت پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے کہ توحید و رسالت پر۔ آخرت سے مراد انسان کی موت کے بعد پیش آنے والے وہ تمام مراحل، منازل اور مقامات ہیں جو موت کے بعد شروع ہوتے ہیں اور جن کا سلسلہ قبر، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنت و جہنم تک دراز ہے۔ گویا عقیدہ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن اللہ تعالی دنیا کے اس کارخانے کو ختم کر دے گا۔ اس کے بعد ایک نئی دنیا برپا ہوگی اور تمام انسان دوبارہ جی کر اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں سے دنیا میں ان کے اعمال کا حساب لے گا۔ اچھے کام کرنے والے کامیاب ہوں گے اور اللہ کے نافرمانوں کو ناکامی ہوگی۔ جن لوگوں نے اچھے کام کیے ہوں گے بخش دیے جائیں گے اور جنت ان کا مقام ہوگا اور جن لوگوں کے برے کاموں کا پلڑا بھاری ہوگا ان کو سزا ملے گی اور وہ جہنم میں جائیں گے۔ آخرت کا عقیدہ دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ تمام انبیا نے اپنے ماننے والوں کو اس عقیدے کی تعلیم دی۔ یہ عقیدہ انسان کے اندر جواب دہی کے تصور کو راسخ اور مضبوط کرتا ہے اور اسے دنیا میں ایک ذمہ دار انسان کے طور پر زندگی گزارنے پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آخرت اور اس کے مقامات و منازل کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ برزخ، قیامت، حساب کتاب اور جنت و جہنم اس کی اہم منزلیں ہیں۔ شفاعت کا تصور بھی آخرت سے متعلق ہے' البتہ اللہ تعالی کے دربار میں شفاعت وہی لوگ کریں گے جن کو کہ اللہ اس کی جازت دے گا اور انہیں لوگوں کی شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ کا حکم ہوگا۔ کوئی اپنی مرضی سے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

3.10 نمونے کے امتحانی سوالات

1. عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالیے۔
2. قیامت کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. شفاعت کے اسلامی تصور کو بیان کیجیے۔
4. انسانی زندگی پر عقیدہ آخرت کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

3.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عقیدہ اسلامی	:	علامہ محمد غزالی/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات	:	مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں	:	مولانا صدر الدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات	:	مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد	:	علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر/ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
6. سیرۃ النبی (جلد چہارم)	:	علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 4 : فرشتے اور آسمانی کتابیں

اکائی کے اجزاء

4.1 مقصد

4.2 تمہید

4.3 فرشتے

4.3.1 فرشتے معنی ومفہوم

4.3.2 دنیا کے مختلف مذاہب میں فرشتوں کا تصور

4.3.3 اسلامی تعلیمات میں فرشتوں کی حقیقت

4.3.4 فرشتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں

4.3.5 بعض فرشتوں کے نام اور ان کی ذمہ داریاں

4.3.6 فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

4.4 آسمانی کتابیں

4.4.1 معنی ومفہوم

4.4.2 کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت وضرورت

4.4.3 قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق

4.4.4 چار معلوم آسمانی کتابیں

4.4.4.1 تورات

4.4.4.2 زبور

4.4.4.3 انجیل

4.4.4.4 قرآن

4.5 عقیدہ ایمان بالکتب کا اثر انسانی سماج پر

4.6 خلاصہ

4.7 نمونے کے امتحانی سوالات

4.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

4.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی نورانی مخلوق فرشتوں اور انسانوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کو عطا کی جانے والی کتابوں کے بارے میں جانا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ فرشتے کون ہیں؟ دنیا کے مختلف مذہبوں میں فرشتوں کا کیا تصور ہے؟ وہ کون سے کام ہیں جو اللہ تعالی فرشتوں سے لیتا ہے؟مشہور فرشتے کون سے ہیں؟ اور ان پر ایمان لانے کا مقصد کیا ہے؟ اسی طرح اس اکائی میں ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ رسولوں کو دی جانے والی کتابوں کی حقیقت کیا ہے؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ معلوم آسمانی کتابیں کتنی اور کون سی ہیں؟ اور قرآن مجید اللہ کی آخری آسمانی کتاب کیوں ہے؟

4.2 تمہید

اللہ کے بعد فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے کیوں کہ فرشتے وہ نورانی ہستیاں ہیں جو انسانی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ خدا کی مخلوق ہیں اور اس کی خدائی میں کسی طرح شریک نہیں بلکہ یہ اللہ تعالی کے مطیع وفرمابردار ہیں اور ان کی اطاعت وفرماں برداری ایسی ہوتی ہیکہ اللہ کے حکم سے یہ سرمو بھی سرتابی نہیں کرسکتے۔ انہیں کوئی بھی اختیار حاصل نہیں یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کے حکم سے ہی کرتے ہیں۔ یہ نہ تو کسی کی کوئی سفارش کرسکتے ہیں نہ کسی طرح کی کوئی مدد۔ یہ ہمیشہ عبادت وبندگی میں مصروف اور مشغول رہتے ہیں اور جس ذمہ داری پر اللہ تعالیٰ نے انہیں لگا رکھا ہے اسے پوری طرح بجالاتے ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں سوائے اس کے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے ہمیں بتایا۔ اور ہم فرشتوں پر اسی لیے ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

فرشتوں کی طرح کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالی نے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے رسول اور پیغمبر بھیجے اسی طرح ان رسولوں میں سے کچھ کو اپنی ہدایات کتابوں کی صورت میں بھی دیں تاکہ ان کے گزرجانے کے بعد بھی لوگ ان ربانی ہدایات سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ لیکن جس طرح انسان رسولوں کی تعلیمات کو بھلاتا اور ان سے گریز کرتا رہا اسی طرح کتابوں میں درج ہدایات کو بھی چھوڑتا رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بہت سی وہ باتیں جو رسولوں نے نہیں کہی تھیں جس طرح ان کی جانب منسوب کرتا رہا اسی طرح کتابوں میں بھی کچھ چیزوں کا اضافہ اور کچھ کمیاں کرتا رہا۔ اللہ تعالی نے ہر قوم، علاقے اور زبان کے لوگوں میں نبی اور رسول بھیجے' اسی طرح اس نے متعدد قوموں اور علاقوں میں ان کی زبانوں میں کتابیں بھی نازل کیں لیکن جس طرح ہمیں تمام رسولوں کے بارے میں نہیں معلوم اسی طرح تمام آسمانی کتابوں کی بھی ہمیں خبر نہیں۔ جس طرح اس نے کچھ رسولوں

کے نام ہمیں بتا دیے اسی طرح کچھ آسمانی کتابوں کے نام اور جن انبیاء پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام بھی ہمیں بتائے ہیں ۔ ان کتابوں پر ان کے نام کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے ۔ بقیہ جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے ۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ؐ کو دی جانے والی کتاب قرآن مجید آخری آسمانی کتاب ہے ۔ اب جس طرح اللہ کے رسولؐ کے بعد رہتی دنیا تک کوئی نبی نہیں آئے گا اسی طرح جب تک دنیا قائم ہے انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید ہے ۔ اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان میں انسانوں نے تحریف کردی ۔ قرآن مجید انسانی تحریف سے محفوظ ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے ۔ اور اس کی حفاظت کے انتظامات بھی کیے ہیں ۔ اس لیے قرآن مجید اپنی اصل شکل و صورت اور زبان میں جیسا کہ اللہ کے رسول پر نازل ہوا تھا آج بھی موجود ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا ۔

4.3 فرشتے

فرشتہ فارسی زبان کا لفظ ہے اردو میں ہم نے یہ لفظ وہیں سے لیا ہے ۔ عربی میں اس کے لیے قرآن مجید میں ملائکہ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔

4.3.1 معنی ومفہوم

فرشتوں کے لیے عربی زبان میں ملائکہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ ملائکہ جمع ہے اور اس کا واحد ملک مِلاک اور مالک تین طرح سے استعمال ہوتا ہے ۔ لغت یا ڈکشنری میں ملائکہ کے معنی ''قاصد'' اور ''رسول'' کے ہیں ۔ اس لیے قرآن مجید میں ملائکہ کے لیے رُسُل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی قاصد اور پیغام رساں کے ہیں ۔

اصطلاح میں ملائکہ سے مراد وہ غیر مادّی مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالی کے حکم اور مرضی سے کائنات اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں ۔ فرشتے اس کائنات کے کارخانے کو اللہ تعالی کے احکام اور قوانین کے مطابق چلا رہے ہیں گویا وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کاری کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس حکم اور مرضی کو مخلوقات کے درمیان جاری اور نافذ کر دیتے ہیں ۔ یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کی یہ ہے کہ فرشتے سراپا اطاعت اور بندگی ہیں ، وہ اللہ کے حکم اور مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر نہیں کر سکتے ۔ ان کا نہ تو کوئی ذاتی ارادہ ہے اور نہ ہی انہیں اس عالم کون ومکان میں کسی طرح کا کوئی اختیار حاصل ہے ۔ اللہ تعالی نے انہیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت وفرماں برداری کریں اور اس کے حکموں کو جس طرح کہ وہ چاہتا ہے ٹھیک ٹھیک اسی طرح بجالائیں ۔

4.3.2 دنیا کے مختلف مذاہب میں فرشتوں کا تصور

دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں فرشتوں کا تصور موجود ہے ۔ یہاں تک کہ قدیم زمانے کے یونانی ومصری فلسفیانہ نظریات میں بھی ایسی ہستیوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے جو فرشتوں جیسے کام انجام دیتی ہیں یا ان سے مشابہت رکھتی ہیں ۔ مثلاً یونانی و

مصری فلسفے میں ان کو عقول عشرہ (دس عقلیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح صابی مذہب میں ستاروں اور سیاروں کو تقریباً وہی حیثیت حاصل ہے جو دیگر مذاہب میں فرشتوں کو۔

پارسی مذہب جس میں خدا کی دوئی کا تصور پایا جاتا ہے یعنی ایک خدا نیکی کا ہے اور ایک خدا بدی کا ہے، اس میں فرشتوں یا ان جیسی ہستیوں کو ''امشا سپند'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور ان کی تعداد بے شمار ہے۔ جس طرح پارسی نیکی اور بدی کے دو خداؤں کے قائل ہیں اسی طرح ان کے یہاں ''امشا سپند'' بھی دونوں طرح کے ہیں۔ نیکی کے فرشتے نیکی کے کاموں کو انجام دیتے ہیں اور نیکی کی چیزوں سے وابستہ ہیں جب کہ برائی کے فرشتے برائی کے کام انجام دیتے ہیں، وہ مصیبتوں کو لاتے اور ہلاکتوں کا سبب بنتے ہیں۔ پارسیوں کے یہاں نر اور مادہ فرشتوں کا تصور بھی موجود ہے۔ نیکی کے فرشتے اپنے خدا کی طرف سے نیکیوں سے متعلق اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے ہیں اور بدی کے فرشتے بری چیزوں کے حاکم باور کیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح نیکی اور بدی کے خدا فرشتوں کی اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ پارسی مذہب میں فرشتوں (امشا سپند) کی درجہ بندی بھی ہے۔ ان میں چھ امشا سپند سب سے زیادہ عالی مرتب خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے تحت تینتیس (33) دوسرے نسبتاً کم درجے کے امشا سپند ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت ہزاروں کی تعداد میں فرشتے (امشا سپند) ہیں۔

ہندو مذہب دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح یہاں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں نر اور مادہ فرشتوں کا تصور ہندو مذہب کی خصوصیت ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی خاص کام سے وابستہ ہے اور اسی حیثیت سے وہ اس چیز کا یا کام کا دیوی یا دیوتا کہلاتا ہے۔ چونکہ ہندوں میں دیوی اور دیوتاؤں کو کسی قدر با اختیار باور کیا جاتا ہے اس لیے نہ صرف یہ کہ انہیں حاجت روائی کے لیے پکارا جاتا ہے بلکہ ان کی پوجا اور پرستش بھی کی جاتی ہے۔ ہوا، پانی، پہاڑ، جنگل، اور دولت غرض ہر چیز کے الگ الگ دیوی دیوتا ہیں۔ کبھی وہ مخلوق کی صورت میں فرشتوں کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کبھی ان کی حیثیت خدائی کے درجے تک بلند کر دی جاتی ہے۔

یہودی مذہب میں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے اور ان کے لیے اس مذہب کی مذہبی کتابوں میں 'کروبیم' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرشتوں کو نہ صرف یہ کہ مقدس ومحترم جانا جاتا ہے بلکہ ان کی تعریف وتوصیف اس طرح کی جاتی ہے کہ کئی بار یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خدا کی حمد وتوصیف بیان کی جارہی ہے یا فرشتوں کی ثنا خوانی ہو رہی ہے۔ یہودی مذہب میں فرشتوں کی تعظیم وتکریم کی جاتی ہے، ان کے آگے جھکا جاتا ہے اور اکثر انہیں خداوند کہہ کر پکارا بھی جاتا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ فرشتوں کو بھی خدائی کے اختیارات حاصل ہیں۔ یہودیوں کے یہاں بعض فرشتوں کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً جبریل اور میکائیل وغیرہ۔

یہودی مذہب کی طرح عیسائیوں میں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے اور دونوں کی لفظیات اور دوسری چیزوں میں بڑی حد تک یکسانی اور مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ بھی فرشتوں کو جبریل اور روح القدس جیسے الفاظ سے پکارتے ہیں اور ان میں سے کچھ کو پرستش کا مقام ومرتبہ بھی حاصل ہے، مثلاً روح القدس کو خدا کا جز تسلیم کر کے اسے عیسائی تثلیث کا ایک رکن بنا دیا گیا ہے۔

عرب کے کفار ومشرکین میں بھی فرشتوں کا تصور موجود تھا، وہ ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے اور بہت سارے معاملات میں انہیں حاجت روا اور قابل پرستش بھی سمجھتے تھے۔

بہر حال فرشتے وہ غیر مادی ذی روح مخلوق اور ہستیاں ہیں جن کا تصور دنیا کے تقریباً سبھی مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک واسطہ کے طور پر خالق اور اس کی مخلوق کے درمیان اس کے حکم اور مرضی کے مطابق مفوضہ فرائض اور ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کئی بار ان کی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا جاتا ہے اور ایک مخلوق کو خدائی کے درجے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

4.3.3 اسلامی تعلیمات میں فرشتوں کی حقیقت

سب سے پہلے تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ فرشتوں اور ان کی حقیقت کے بارے میں ہمیں وہی معلوم ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں بتا دیا۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے کہ ہم فرشتوں کی حقیقت کو معلوم کر سکیں۔

فرشتوں کے بارے میں مختلف مذاہب اور اقوام میں جو تصورات پائے جاتے تھے اسلام نے آکر ان کی اصلاح کی اور یہ بتایا کہ فرشتے خدائی کی صفات سے محروم ہیں۔ ان کی پرستش اور عبادت نہیں کی جا سکتی۔ وہ بھی دنیا کی دیگر مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہیں اور اس کی عبادت و اطاعت ہی ان کا امتیاز ہے۔ وہ دن و رات اللہ تعالی کی عبادت اور اس کا حکم بجالانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کچھ بھی نہیں کرتے۔ جو بھی کرتے ہیں اللہ کی مرضی اور حکم سے کرتے ہیں۔ نہ وہ خدا کے بیٹے ہیں نہ بیٹیاں نہ دیوتا ہیں نہ دیویاں بلکہ جنس سے عاری اللہ کی مخلوق ہیں۔

قرآن مجید میں فرشتوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالی کی پیدا کی ہوئی غیر مادی ذی روح مخلوق ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی تعریف اور بڑائی بیان کرتے رہیں اور بارگاہ رب سے جو حکم بھی ان کو ملے اس کو من و عن بجالائیں، اس میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ کریں۔ وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان واسطہ اور پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ خدا کے حکم اور اس کی مرضی کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانے کو چلا رہے ہیں لیکن اس چلانے میں انہیں کسی طرح کا بھی ارادہ یا اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرشتوں کے لیے صرف مَلَک اور ''رسول'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ قاصد، پیغام رساں اور ایلچی ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ انسان کو علم میں فرشتوں سے اعلی مرتبہ دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر وہ ملائکہ (فرشتوں) کو سجدہ کرنے والا نہیں بلکہ ان کا مسجود ہے۔ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں اور اس حیثیت میں دونوں ہی اس کے سامنے یکساں طور پر عاجز و درماندہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسانوں کو مادی جسم عطا کر کے انہیں مادی اشیاء پر کسی قدر اختیار دیا گیا ہے تا کہ وہ انہیں اپنے نفع و نقصان کے لیے استعمال کر سکیں۔ اور اس ارادہ و اختیار کی جزوی آزادی کے سبب انہیں جواب دہ بھی بنایا گیا ہے جبکہ فرشتوں کو اللہ نے نورانی وجود بخشا، انہیں ارادہ و اختیار کی آزادی سے محروم رکھ کر آسمان و زمین اور اللہ کی وسیع مملکت میں اللہ کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے اور انہیں نافذ کرنے جیسے کام پر متعین کیا گیا۔ دنیا میں اسباب و علل کا جو کارخانہ قائم ہے وہ نہ تو دیوی دیوتاؤں کا کرشمہ ہے نہ ہی خود بخود جاری ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق فرشتے انہیں کام میں لگاتے ہیں۔

4.3.4 فرشتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں

گزشتہ سطور سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فرشتے نورانی (غیر مادی) ذمہ دار ہستیاں ہیں جو اللہ کی مرضی اور اس کے حکم سے کاموں کو انجام دیتے اور انہیں جاری و نافذ کرتے ہیں۔ اور ان کاموں کی انجام دہی میں ان کی ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کے حکم سے ذرا بھی نہیں ہٹتے۔ فرشتے اللہ کے حکم سے کن فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے پر مامور ہیں، ان کا قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ ذیل میں انہیں نمبروار درج کیا جاتا ہے:

1. قرآن مجید کے مطابق فرشتوں کی سب سے پہلی اور اہم ذمہ داری سفارت و پیام رسانی ہے یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا۔ البتہ اس میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے اپنی مرضی سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

   ’’خدا ہی ہے جو فرشتوں اور انسانوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے۔ بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام امور اللہ ہی کی طرف پلٹائے جاتے ہیں۔‘‘ (الحج:75۔76)

   ایک دوسری آیت میں ان کی سفارت کاری اور بے اختیاری کا ذکر اس طرح ہے:

   ’’تمام تعریف ہے اس خدا کے لیے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو، تین تین، چار چار شہپر بازوں والے پیام رساں بنانے والا ہے۔ وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ لوگوں کے لیے جو رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب دانا ہے۔‘‘ (فاطر:2)

اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کا کام پہنچا دینے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انہیں اس دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی دخل نہیں، کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

2. فرشتے وہ پاکباز ہستیاں ہیں جو اللہ تعالی کے احکامات و مرضیات کو اس جہان رنگ و بو میں جاری و نافذ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

   ’’(یاد کرو) جب تمہارا رب (پروردگار) فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ (الانفال:12)

   ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

   ’’اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں‘‘ (القدر:4)

   موت بھی اللہ کے حکم سے فرشتے دیتے ہیں:

   ’’کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر نگراں بنایا گیا ہے، تم پر موت طاری کرے گا‘‘ (السجدہ:11)

   ’’اور دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں‘‘ (الانفال:50)

3. فرشتے ہی اللہ اوراس کے رسولوں کے درمیان بھی سفارت کاری کا فریضہ انجام دیتے ہیں اوران تک ان کے پروردگار کا حکم اور ہدایات پہنچاتے ہیں۔اللہ تعالی کاارشاد ہے:

''یا خدا(آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ)اپنا ایک ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس(خدا) کی اجازت سے جو وہ(خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔''(الشوریٰ:51)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''خداروح کے ساتھ فرشتوں کواپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے''(النحل:)

''پس اس(جبریل فرشتہ)نے قرآن کوخدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا''(البقرہ:97)

4. فرشتوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ یہ لوگوں کے پاس بشارت(خوش خبری)لے کر جاتے ہیں اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں۔ اللہ تعالی کاارشاد ہے:

''ہمارے سفیر(فرشتے)ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے''

ایک دوسری جگہ حضرت مریم کی خوش خبری کے حوالے سے ارشاد ہے:

''میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں''(مریم:19)

حضرت لوط کے پاس ان کی قوم کی بربادی کی خبر بھی فرشتے لے کر آئے تھے:

''کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں''(ھود:81)

5. انسان جو کچھ بھی کرتا ہے سب کچھ اللہ کی نظر میں ہے۔لیکن اللہ تعالی انسانوں کی نگہبانی اورنگرانی کا کام فرشتوں سے بھی لیتا ہے۔وہ نہ صرف انسانوں کی نگرانی کرتے ہیں بلکہ ان کے اچھے اور برے کاموں کا ریکارڈ بھی محفوظ رکھتے ہیں اللہ تعالی کاارشاد ہے:

''بے شک تم پرنگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں،تم جو کچھ بھی کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں''۔ (الانفطار:10-12)

''کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے''(ق:18)

''تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔'' (الرعد10۔11)

''اور وہ(خدا) تم پرنگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے قاصد (فرشتے)اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے''(الانعام:61)

6. فرشتوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پرخدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ بھی بنتے ہیں:

قرآن مجید میں اللہ تعالی کے واضح ارشادات ہیں:

’’نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غم گین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔‘‘ (الانبیاء:103)

’’جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اُس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔‘‘ (حم السجدہ:30-31)

’’وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔‘‘ (الاحزاب:43)

’’ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔‘‘ (آل عمران:87)

’’جو کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔‘‘ (البقرہ:161)

7. جو لوگ اس دنیا میں اچھے کام کریں گے اس کے بدلے اللہ انہیں دوسری زندگی میں جنت دے گا اور جو برے کام کریں گے انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جنت اور جہنم کا انتظام و انصرام بھی اللہ کے حکم سے فرشتوں کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکی دار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔‘‘ (الزمر:72)

’’اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے، وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان (فرشتے) کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ (الزمر:73)

’’اور ان (جنتیوں) پر فرشتے ہر دروازے سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے۔ یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔‘‘ (الرعد:23-24)

’’اور ہم نے جہنم کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے‘‘ (المدثر:31)

8. فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں اور قیامت کے دن تختِ الٰہی کو وہی اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

’’اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف ہوں گے۔‘‘ (الزمر:75)

’’مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔‘‘ (ص:69)

’’اور فرشتے اس کے کنارے پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔‘‘ (الحاقہ:17)

’’جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔‘‘ (النبا:38)

9. فرشتے خدا سے سرکشی اور نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی بڑائی و بزرگی اور حمد و تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے جلال و قدرت سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ کے حضور میں زمین والوں کے لیے عام طور پر اور نیکی کرنے والوں کے لیے خاص طور پر

مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔لیکن اس سے یہ دھوکا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ فرشتوں کی دعا رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے بلکہ بخشش ورحمت کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالی ہے:

''اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں۔ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔''(الشوری:5)

''بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں....اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں''(الانبیاء:26۔28)

''خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''(التحریم:6)

4.3.5 بعض فرشتوں کے نام اور ان کی ذمہ داریاں

فرشتوں کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نورانی ہستیاں ہیں جو اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے مختلف کام انجام دیتے ہیں۔فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت۔اللہ تعالی نے انہیں جن کاموں پر لگا دیا ہے انہیں کاموں پر وہ لگے ہوئے ہیں۔ان کی تعداد بے شمار ہے۔البتہ ان میں سے کچھ کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے۔ان میں چار فرشتے اللہ تعالی کے نہایت مقرب ہیں اور ان کے بارے میں کچھ تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

1. حضرت جبریل

اللہ تعالی کے مقرب فرشتے ہیں۔اللہ کی جانب سے پیغمبروں تک پیغام رسانی کا کام انہیں کے ذمہ تھا۔یہ اللہ کے حکم سے وحی پیغمبروں کے پاس لاتے تھے جس میں کہ بندگان خدا کے لیے احکام و ہدایات ہوتی تھیں۔اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ کے پاس بھی وحی لے کر حضرت جبریل آتے تھے۔احادیث کی رو سے کم از کم دوبار اللہ کے رسولؐ نے حضرت جبریل کو ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے۔اسی طرح انسانوں کی شکل میں بھی حضرت جبریل رسولؐ اللہ کے پاس آیا کرتے تھے۔دنیا میں خدا کے باغیوں اور نافرمانوں پر عذاب بھی اللہ تعالی نے حضرت جبریل کے ذریعہ بھیجا ہے اور اب بھی یہ کام ان کے ذمہ ہے۔اس کے علاوہ جس طرح سارے فرشتے خدا کے ذکر و تسبیح میں ہر وقت لگے رہتے ہیں حضرت جبریل بھی ہر وقت اللہ کے ذکر و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔

2. حضرت میکائیل

قرآن مجید میں جن دو فرشتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے ان میں حضرت جبریل کے علاوہ حضرت میکائیل ہیں۔اللہ کی طرف سے حضرت میکائیل مخلوقات کو روزی پہنچانے کے کام پر مامور ہیں۔بارش کا انتظام بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔فرشتوں کی ایک جماعت ان کی ماتحتی میں مختلف کام انجام دیتی ہے۔خاص طور پر بادلوں، ہواؤں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ پر یہ فرشتے مقرر ہیں اللہ کے حکم اور مرضی کے مطابق سونپے گئے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

3. حضرت اسرافیل

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی اسے قیامت کہتے ہیں ۔ قیامت کا قیام ایک بھیانک زوردار آواز سے ہوگا اور دنیا کا یہ کارخانہ پوری طرح ختم ہو جائے گا ۔ اللہ تعالی نے دنیا کے خاتمے کے کام پر جس فرشتے کو مامور کیا ہے ان کا نام اسرافیل ہے ۔ وہ صور منہ میں لیے کان لگائے اللہ کے حکم کے منتظر ہیں ۔ جیسے ہی اللہ کا حکم ہوگا وہ صور میں پھونک ماریں گے ۔ ایک زوردار گڑگڑاہٹ والی آواز پیدا ہوگی اور یہ دنیا اور اس میں جو کچھ بھی ہے سب تہس نہس ہو جائے گا' کوئی بھی ذی روح زندہ نہ بچے گا ۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا ۔ پھر ایک عرصہ بعد حضرت اسرافیل اللہ کے حکم سے دوبارہ صور میں پھونک ماریں گے ۔ پھر ایک آواز پیدا ہوگی جسے سن کر سارے اگلے پچھلے انسان ، جو کبھی بھی دنیا میں پیدا ہوئے تھے، ایک بار پھر زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے ۔ ایک دوسرا جہاں قائم ہوگا ۔ حشر کے میدان میں سب اکٹھا ہوں گے اور پھر سب کا حساب کتاب ہوگا ۔ اعمال کے مطابق انہیں بدلہ دیا جائے گا اللہ کے فرماں بردار جنت میں جائیں گے اور نافرمانوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگی ۔

4. حضرت عزرائیل

اللہ کی طرف سے مخلوقات کی جان نکالنے پر جو فرشتہ مامور ہے اس کا نام عزرائیل ہے ۔ ان کی ماتحتی میں بے شمار فرشتے اس کام میں لگے ہوئے ہیں ۔ کچھ فرشتے ہیں جو اللہ کے نیک بندوں کی جان نکالتے ہیں اور کچھ ہیں جو نافرمانوں کی جان نکالنے پر مامور ہیں ۔

ان چار فرشتوں کے بارے میں کہا جاتا کہ اللہ تعالی کے سب سے مقرب فرشتے ہیں ۔ قرآن مجید اور احادیث میں ان چار کے علاوہ بھی بعض فرشتوں کے نام اور کاموں کا ذکر ہے مثلاً ۔

کراماً کاتبین: یعنی وہ فرشتے جو انسانوں کی ڈائری مرتب کرتے ہیں یا ان کے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں ۔ اللہ تعالی نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے لگا رکھے ہیں جو انسان کے ایک ایک اچھے برے عمل کو نوٹ کرتے اور لکھتے ہیں اور اس طرح انسان کی اچھائیوں اور برائیوں کا ریکارڈ تیار ہوتا رہتا ہے ۔ قرآن میں انہیں کراماً کاتبین (بزرگ لکھنے والے) کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔

حَفَظَہ : اللہ تعالی نے کچھ فرشتوں کو انسانوں کی آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت کے لیے مقرر کر رکھا ہے ۔ جن لوگوں کے بارے میں اللہ کا حکم اور مرضی ہوتی ہے ان کی یہ آفتوں ، مصیبتوں اور بلاؤں سے حفاظت کرتے ہیں ۔ ان کو حَفَظَہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ حفاظت کرنے کے کام پر مامور ہیں ۔

منکر نکیر: یہ وہ فرشتے ہیں جو موت کے بعد اور دوسری زندگی شروع ہونے سے پہلے عالم برزخ میں انسانوں سے سوالات کرنے پر اللہ کی جانب سے مامور ہیں ۔ مرنے کے بعد ہر انسان کے پاس دو فرشتے آتے ہیں ، جنہیں وہ پہچانتا نہیں ہوتا ہے ، اور اس سے تین سوال کرتے ہیں پہلا سوال اس کے رب کے بارے میں یعنی مَنْ رَبُّکَ ؟ تمہارا رب کون ہے یعنی کون سی ہستی ہے جو تمہیں پالتی اور پرورش و پرداخت کرتی ہے اور تم نے کسے دنیا میں خالق ، مالک ، رب اور معبود تسلیم کیا ۔ دوسرا سوال دین کے بارے میں ہوگا یعنی مادینک تمہارا دین کیا ہے ۔ تم نے کس دین اور راستے کی پیروی کی اور کس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہوئے عمر گزاری ۔ تیسرا سوال نبی کے بارے میں ہوگا یعنی اس کے سامنے اس کے نبی کو پیش کر کے پوچھا جائے گا من ھذا ؟ یہ کون ہے ؟ تم نے اس کی باتوں کو سنا تھا یا سن کر ان سنی کر دی تھی ۔ چونکہ یہ فرشتے اجنبی شکل وصورت کے ہوں گے اس لیے ان کو منکر نکیر کہا جاتا ہے ۔

جنت وجہنم کے منتظم فرشتے: اللہ تعالی نے کچھ فرشتوں کو جنت وجہنم کے انتظام پر لگا رکھا ہے اور وہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جو فرشتہ جنت کے انتظام پر مامور ہے اسے رضوان کہتے ہیں' اور جس فرشتے کے ذمہ جہنم کا انتظام ہے اسے مالک کہتے ہیں۔ یعنی جنت کا داروغہ ومنتظم رضوان اور جہنم کا داروغہ ومنتظم مالک نام کے فرشتے ہیں۔

حاملین عرش: کچھ فرشتے ہیں جو اللہ تعالی کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان فرشتوں کو حاملین عرش کہا جاتا ہے۔

عابدوذاکر فرشتے: ان گنت فرشتے ہیں جو دن رات چوبیس گھنٹے اللہ تعالی کی عبادت اور اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ ذکر اور عبادت ہی ان کا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ذمہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔

4.3.6 فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

فرشتے اللہ کی غیر مادی نورانی مخلوق ہیں۔ انسان مادی اور غیر مادی دونوں طرح کی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور جب اس کا یہ تاثر ایک خاص سطح تک پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ ان اشیاء کی بندگی اور پرستش کرنے لگتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے انہیں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے اس کی نفی کی ہے۔ مادی اشیاء ہوں یا غیر مادی انہیں کسی بھی طرح کی قدرت حاصل نہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے۔ انسان جب **لا الہ الا اللہ** کا اقرار کرتا ہے تو ان ساری مادّی وغیر مادی مخلوقات کی طاقت وقدرت کی نفی کر دیتا ہے۔ البتہ مادیت اور غیر مادیت سے پرے بھی بعض خواص ہیں جو انسانی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ کائنات کے بہت سے امور انہیں کے ذریعے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ کوئی بھی زمانہ رہا ہو انسان نے مختلف ناموں اور مظاہر کے تحت ان نہ نظر آنے والی قوتوں کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ اکثر انہیں اللہ کا شریک اور ساتھی بھی بناتا رہا ہے۔ فرشتوں پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بعد انسان کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جو بھی مادّی یا غیر مادی، جاندار و بے جان اشیاء جن کا ہم ادراک کرتے ہیں ان کی قوت نہ تو ذاتی ہے اور نہ ہی جو قوتیں ان کے پیچھے کارفرما ہیں ان کی ہے' بلکہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کے حکم اور مرضی سے ہو رہا ہے۔ زمین وآسمان اور ان کے درمیان دنیا کا جو کارخانہ چل رہا ہے اس کو چلانے والے اللہ کے حکم اور مرضی کے پابند ہیں وہ اللہ کے حکم سے ذرا بھی ہٹ نہیں سکتے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی نافرمانی کر سکیں اس لیے اللہ کو چھوڑ کر یا اللہ کے ساتھ ان کی بندگی وعبادت نہیں کی جانی چاہیے۔ چہ جائے کہ ان کی پرستش اور پوجا کی جائے وہ تو انسان کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ان کی پرستش انسانیت کی توہین ہے کیونکہ خود اللہ تعالی نے ان سے انسان کو سجدہ کرایا ہے اور اس طرح انسانیت کی تکریم کی ہے۔

ہم جب فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بہت سی قوموں اور مذاہب میں فرشتوں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا یا ان کے بارے میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ فرشتے بھی خدا کی خدائی میں شریک ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے بعد ان کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ فرشتے بھی اللہ تعالی کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ بے اختیار ہیں اپنی مرضی اور ارادے سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح فرشتوں پر ایمان لانا کلمۂ توحید کی تکمیل کرنا ہے۔

2. فرشتوں پر ایمان لانے سے دوسرا مقصد یہ حاصل ہوتا ہے کہ مادہ پرست انسان مادّی اشیاء کے خواص اور خوبیوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان کے خواص اور خوبیاں ان کی اپنی ذاتی ہیں اور اس طرح وہ خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان قوتوں کے پیچھے کچھ روحانی قوتیں کارفرما ہیں اور وہ اللہ کے حکم اور مرضی سے ان کو چلا رہی ہیں اور اس طرح مادیت کا بُت ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو جاتا ہے۔

4.4 آسمانی کتابیں

جس طرح فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔اللہ تعالی نے رسولوں کی طرح ہر زمانے میں کتابیں بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجیں۔اب یہ الگ بات ہے کہ جس طرح انسان رسولوں کی تعلیمات کو بھلاتا رہا اسی طرح اس نے کتابوں میں مذکور ہدایات کو بھی بھلا دیا یا ان کی من مانی تاویلات کیں۔سب سے آخر میں اللہ تعالی نے آخری کتاب قرآن مجید اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل کی۔اس کتاب کے الفاظ و ہدایات سب قیامت تک کے لیے محفوظ ہیں اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی یا ترمیم و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

4.4.1 معنی و مفہوم

کتب کتاب کی جمع ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل ک ت ب ہے جس کا معنی لکھنا ہے۔عربی زبان میں کتاب مکتوب (لکھا ہوا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لغوی طور پر لفظ کتاب کا اطلاق ہر لکھی ہوئی چیز پر ہوتا ہے خواہ وہ تحریر مختصر ہو یا طویل یہاں تک کہ خط اور مراسلے کے لیے بھی کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا لفظ قرآن مجید میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے البتہ قرآن میں کتاب کا جو مفہوم سب سے نمایاں ہے وہ یہ کہ کتاب اس مقدس تحریر کو کہتے ہیں جو اللہ تعالی کی وحی پر مشتمل ہو اور اللہ تعالی نے اسے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل کیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کو---جن کے پاس اللہ تعالی کی کتابیں توراۃ اور انجیل تھیں---اہل کتاب کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔اسی طرح الکتاب کی اصطلاح قرآن مجید کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

4.4.2 کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت اور ضرورت

اللہ کے فرشتوں کی طرح اللہ تعالی کی نازل کردہ کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص کتابوں پر ایمان نہیں لاتا، اس کا اسلام کا دعوی جھوٹا ہے۔اور کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں کہ آخری رسولؐ حضرت محمدؐ پر جو کتاب یعنی قرآن مجید نازل ہوئی صرف اسی پر ایمان لانا کافی ہے، بلکہ قرآن مجید کے ساتھ دیگر آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان کے نام اور جن انبیاء پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام ہمیں معلوم ہوں جیسا کہ توریت، زبور اور انجیل کے بارے میں ہم جانتے ہیں یا ان کتابوں اور جن پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام ہمیں معلوم نہ ہوں، ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالی نے دنیا کی ہر قوم، زبان اور خطے میں رسول اور کتابیں بھیجی ہیں۔

کتابوں پر ایمان لانے کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس طرح ایک مسلمان کا انسانیت کا تصور بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ سبھی انسان اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اللہ تعالی نے سب کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کو بھیجا۔ اور جب سب کے پاس رسول اور کتابیں آئیں تو اس حیثیت سے سب کی بنیادی تعلیمات ایک ہی رہی ہوں گی' یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کے ماننے والوں نے ان کتابوں میں تحریف کردی اور ان کی تعلیمات کو بھلا دیا۔

کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ رسولوں کو صرف رسول مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں وحی کا جو صحیفہ دیا گیا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ انسان جب کتاب پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس بات کا اقرار ہی نہیں کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لاتا ہے بلکہ اس پر کتاب میں مذکور ہدایات وتعلیمات پر عمل کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔ اس میں جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا کرنا اس کے لیے ضروری ہے اسی طرح جن کاموں کو کرنے سے روکا گیا ہے ان سے رک جانا بھی اس کے لیے لازم ہے۔ ایک مسلمان جب قرآن مجید کو اللہ تعالی کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو گویا وہ یہ بات بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس کتاب الٰہی میں عقائد و عبادات واعمال سے متعلق جو بھی علمی وعملی ہدایات موجود ہیں ان سب پر عمل پیرا ہونے کی یقین دہانی کرا رہا ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف قرآن مجید پر ایمان لانے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ایک مسلمان کا ایمان بالکتاب اس وقت تک مکمل ہوتا ہی نہیں جب تک کہ وہ سبھی آسمانی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس طرح ایک مسلمان اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالی کی بنیادی ہدایات وتعلیمات تمام آسمانی کتابوں میں ایک ہی ہیں۔ قرآن مجید انہیں ہدایات وتعلیمات کو آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتا ہے جو پہلے کی کتابوں میں دی گئی تھیں اور جن میں ان کے پیرووٴں نے تحریف کرڈالی۔

4.4.3 قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق:

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو پھر عمل قرآن مجید کی تعلیمات پر ہی ضروری کیوں؟ دوسری کتابوں کی تعلیمات پر عمل کر کے بھی تو نجات حاصل ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اور پہلے کی آسمانی کتابوں کی حیثیتوں میں فرق ہے۔ ہم اس فرق کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

1. سب سے پہلی بات تو یہ کہ قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے اور اس طرح وہ پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں کی ناسخ ہے' پہلی کتابوں کی صرف تصدیق ضروری ہے عمل قرآنی ہدایات پر کیا جائے گا۔
2. پہلے جو کتابیں انبیاء پر نازل ہوئیں وہ اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہیں۔ ان کے اصلی نسخے ہی غائب ہو گئے صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ترجمے اور اصل کا فرق ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید اپنی اصل صورت میں بعینہ موجود ہے۔ قرآن مجید کا جن الفاظ میں محمد عربی پر نزول ہوا تھا بعینہ انہیں الفاظ میں وہ آج بھی موجود ہے اس کا ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک شوشہ بغیر کسی تبدیلی اور تغیر کے محفوظ ہے۔

3. قرآن مجید سے پہلے کی کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں ان میں اللہ کے کلام کے ساتھ ساتھ انسانی کلام بھی ملا دیا گیا۔ کتاب ایک ہی ہے لیکن اس میں کلام الٰہی بھی ہے، قومی تاریخ بھی ہے، بزرگوں کے حالات بھی مذکور ہیں، تفسیر و تشریح بھی ہے اور شرعی مسئلوں کا بیان بھی ہے۔ ان کتابوں میں یہ سب چیزیں اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ اس میں سے کلام الٰہی کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید پوری طرح محفوظ ہے۔ وہ صرف اور صرف کلام الٰہی ہے۔ قرآن مجید میں ذرہ برابر بھی کسی دوسرے کلام کی ملاوٹ نہیں ہے۔ دیگر موضوعات پر اسلامی تاریخ میں جو کچھ بھی لکھا گیا بالکل الگ ہے یہاں تک کہ اللہ کے رسول کے کلام کو بھی حدیث کی الگ کتابوں کی شکل میں مدون کیا گیا۔ قرآن میں ایک لفظ کی بھی ملاوٹ نہیں ہوئی۔

4. قرآن مجید سے پہلے جو بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، ان کی تاریخی شہادت کوئی بھی نہیں پیش کر سکتا یعنی تاریخی طور پر ان کا ثبوت نہیں ملتا۔ تاریخی طور پر ان کے بارے میں یہ بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ جن انبیاء کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے، واقعہ میں انہیں انبیاء پر وہ نازل بھی ہوئی تھیں۔ ان میں بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا نہ تو زمانہ نزول معلوم ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ کس نبی پر وہ نازل ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید تاریخی طور پر بھی بالکل مستند کتاب ہے۔ قرآن مجید کس زمانے میں نازل ہوا اور کس نبی پر نازل ہوا اس کی تاریخی شہادتیں اتنی مضبوط ہیں کہ کسی کو اس کی نبی کی طرف نسبت اور زمانے کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کے بارے میں ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ اس کی کون سی سورہ اور آیت کب اور کہاں نازل ہوئی۔

5. قرآن مجید سے پہلے کی آسمانی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئیں، وہ سب مردہ ہو چکی ہیں۔ اب نہ تو وہ بولی جاتی ہیں نہ لکھی جاتی ہیں اور ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جو ان زبانوں کو سمجھ سکتے ہوں۔ اگر ایسی کتابیں اپنی صحیح حالت میں بھی موجود رہتیں تو ان کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے برعکس قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو ایک زندہ زبان میں ہے۔ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ اس زبان کو بولتے ہیں۔ جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا میں ہر جگہ اس کی تعلیم کا نظم ہے۔ جو بھی چاہے اس کو سیکھ سکتا ہے یا ان لوگوں سے اس کے معنی معلوم کر سکتا ہے جو براہ راست عربی زبان میں قرآن مجید کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔

6. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں کے مخاطب کسی خاص قوم یا علاقے کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ ان کی ہدایات سے لگتا ہے کہ وہ ایک خاص زمانے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے تھیں۔ کسی بھی کتاب کی ہدایات عالم گیر اہمیت کی حامل نہیں۔ اس کے برعکس قرآنی تعلیمات میں دوام اور ہمہ گیری ہے۔ اس میں بار بار خطاب انسانوں سے کیا گیا ہے، کسی خاص زمانے یا علاقے کے لوگوں کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کی تعلیمات ایسی ہیں کہ ان پر ہر زمانے میں اور ہر جگہ عمل کیا جا سکتا ہے۔

7. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں الگ الگ تعلیمات اور اخلاقی قدروں پر زور ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جسے جامع اور مکمل قرار دیا جا سکے۔ اس کے برعکس قرآن تمام خوبیوں کا جامع ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ پچھلی تمام کتابوں کی الگ الگ خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں بلکہ جو خوبیاں پچھلی کتابوں میں نہیں تھیں انہیں بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔

8. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں چونکہ انسانی کلام کی آمیزش ہو گئی ہے اس لیے ان میں بہت سی باتیں نہ صرف خلاف عقل ہیں بلکہ غیر منصفانہ بھی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید خالص اللہ کا کلام ہے اس لیے اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جو عقل و انصاف کے خلاف ہو۔

قرآن مجید اور دوسری آسمانی و مذہبی کتابوں میں یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے لوگوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تصدیق تو تمام کتابوں کی کریں لیکن عمل صرف اور صرف قرآن مجید کی ہدایات پر کریں۔ کیونکہ دنیا میں انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب کی سب قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اس لیے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب آخری اور فائنل کتاب صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔

4.4.4 چار معلوم آسمانی کتابیں

اللہ تعالی نے انسانوں کو پیدا کر کے یو ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کی ضروریات کا انتظام بھی کیا۔ جس طرح اللہ تعالی نے انسانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے کائنات کا یہ پورا کارخانہ چلا رکھا ہے اسی طرح انسانوں کی روحانی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں میں سے ہی ایسے افراد کا انتخاب کیا جو اللہ کی مرضی اور احکامات کو ان تک پہنچائیں۔ حضرت آدم سے لے کر سیدنا حضرت محمدؐ تک انبیاء و رسل کا ایک طویل سلسلہ ہے جس نے ہر دور اور ہر زمانے میں یہ ذمہ داری پوری کی ہے۔ اللہ نے انسانوں تک اپنی مرضی کی ترسیل کے لیے صرف نبی ہی نہیں بھیجے بلکہ ان کی ایک تعداد کو کتابیں بھی دیں تا کہ ان کے بعد بھی ان کتابوں سے لوگ ہدایت حاصل کرتے رہیں۔ اللہ تعالی نے کتنی کتابیں نازل کیں ہم میں سے کسی کو اس کا علم نہیں۔ زمانے اور انسانوں کی دست برد سے جو آسمانی کتابیں موجود رہ گئی ہیں اور جن کی تصدیق آخری آسمانی کتاب قرآن مجید سے ہوتی ہے وہ چار ہیں۔

1. تورات۔ یہ کتاب حضرت موسی پر نازل ہوئی۔
2. زبور۔ مناجات اور دعاؤں کا یہ مجموعہ حضرت داؤد پر نازل ہوا۔
3. انجیل۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی۔
4. قرآن مجید۔ اللہ کی یہ آخری کتاب سیدنا حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔

قرآن مجید میں ان چار کتابوں کے علاوہ حضرت ابراہیم کے صحیفوں کا بھی ذکر ہے لیکن وہ محفوظ نہیں رہے۔ بقیہ کتابیں کسی نہ کسی صورت میں باقی رہیں۔ آیندہ سطور میں ہم ان میں سے ایک ایک کا زمانی ترتیب کے اعتبار سے تعارف کرائیں گے۔ یہاں یہ ذکر بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ قرآن مجید کے علاوہ بقیہ تینوں الہامی کتابیں موجودہ بائبل یا کتاب مقدس کا حصہ ہیں۔ اس طرح بائبل ایک الہامی کتاب نہ ہو کر مختلف الہامی کتابوں کا مجموعہ ہے۔

4.4.4.1 تورات

موجودہ دور میں جو بائبل یا کتاب مقدس ہمیں دیکھنے یا پڑھنے کو ملتی ہے وہ کوئی ایک الہامی کتاب نہیں بلکہ مختلف (تین) الہامی کتابوں کا مجموعہ ہے، کتاب مقدس یا بائبل بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے ایک عہد نامہ قدیم اور دوسرا عہد نامہ جدید۔ عہد نامہ قدیم بھی تین حصوں میں تقسیم ہے:

1. تورات (قانون وشریعت Law)

2. صحائف انبیاء (Prophet`s books)

3. صحائف مقدسہ (Hagiographa) یا (Writings)

گویا تورات کے نام سے جو الہامی کتاب ہمارے پاس موجود ہے وہ نہ تو مکمل بائبل ہے اور نہ ہی پورا کا پورا عہد نامہ قدیم بلکہ یہ ان کا ایک حصہ ہے اور اس کے علاوہ بھی صحائف عہد نامہ قدیم کا حصہ ہیں اور یہودیوں کے نزدیک مقدس ہیں۔ البتہ تورات چونکہ عہد نامہ قدیم کا بڑا، اہم اور خاص حصہ ہے اس لیے تقدس اور اہمیت کی وجہ سے کبھی کبھی پورے عہد نامہ قدیم کے لیے بھی تورات کا لفظ استعمال کرلیا جاتا ہے۔

تورات کو حضرت موسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کے آغاز سے لے کر بنی اسرائیل کے زمانے تک کی تاریخ یہاں تک کہ حضرت موسی کی وفات تک کے واقعات سے بحث کی گئی ہے گویا تورات انسانی تاریخ کا حضرت موسیٰ کے زمانے تک ایک تاریخی مرقع ہے۔ البتہ اس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس تاریخی سفر میں انسانی معاشرہ جن حالات سے گزرا، ان کا تذکرہ موجود ہے۔ تورات میں معاشرتی اور مذہبی قوانین بھی درج کیے گئے ہیں اور یہی چیز اسے کتاب شریعت بناتی ہے۔

تورات اصلاً پانچ حصوں یا صحیفوں پر مشتمل ہے جنہیں صحائف خمسہ یا صحائف موسی کے نام سے جانا جاتا ہے:

1. کتاب تکوین (Genesis): یہ تورات کا وہ حصہ ہے جس میں حضرت موسی کے زمانے سے پہلے کی تاریخ کا اجمالی بیان ہے۔ اس میں حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی اہمیت نمایاں ہے اور مذہب میں اخلاق کی اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔
2. کتاب خروج (Exodus): کتاب خروج تورات کا وہ حصہ ہے جس میں حضرت موسیٰ کی ولادت سے لے کر طور سینا تک کے واقعات کا ذکر ہے جس دوران کہ حضرت موسی بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جاتے ہیں اور جہاں کہ ان سے مقدس عہد (میثاق) لیا گیا اور ان کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے۔
3. کتاب لاوی (Leviticus) یہ تورات کا تیسرا حصہ ہے اور اس حصے میں خصوصیت کے ساتھ ان احکام کا ذکر ہے جو عبادات سے متعلق ہیں۔
4. کتاب اعداد (Numbers): تورات کے اس حصے میں کتاب خروج کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل نے صحرائے سینا سے نکل کر دریائے اردن اور اس کے پار کا علاقہ فتح کیا۔ جگہ جگہ اس کتاب میں بھی احکام وقوانین درج ہیں۔
5. کتاب تثنیہ (Deuteronomy): تورات کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس میں تاریخی پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ قوانین کا ایک مجموعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تورات کا یہ حصہ حضرت موسی کی وفات کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔

تورات کی اصل زبان عبرانی ہے، آرامی و یونانی زبانوں میں اس کے ترجمے بعد میں ہوئے۔ تورات اپنی اصل زبان میں ہے تاریخی و دیگر شواہد اس کی توثیق نہیں کرتے' بلکہ تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کے اصل مقدس صحائف (تورات و دیگر) زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ پائے اور جو تورات آج موجود ہے وہ بعد کے زمانے میں تالیف و ترتیب پائی ہے اور اب یہ اپنی اصل شکل وصورت میں نہیں

ہے بلکہ بعد کے زمانوں میں اس میں تحریف بھی ہوتی رہی ہے۔اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے جس نے چودہ سو برس قبل نہ صرف یہ کہ تورات کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ اصلاً یہ اللہ کی کتاب ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی' لیکن بعد والوں نے اس میں معنوی و دیگر تحریفات کر ڈالیں۔اس کے کچھ حصے حذف کر دیے اور بعض حصوں کا اس میں اضافہ کر دیا۔اس لیے آج جو تورات یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہے وہ اصل تورات نہیں ہے بلکہ تورات کی محرف شکل ہے۔

4.4.4.2 زبور

زبور کی جمع زُبُر ہے۔ زَبُرَ یَزبُرُ کے معنی ہیں لکھنا اور زبور لکھی ہوئی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔یعنی ایسی کتاب جو جلی خط میں اور صاف صاف واضح لکھی ہوئی ہو۔ اصطلاح میں زبور اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو اللہ نے حضرت داوَدؑ پر نازل کی۔اس میں حکمت کے اقوال بیان ہوئے ہیں اور شرعی احکام موجود نہیں ہیں (اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت حضرت داوَد کے لیے بھی وہی تھی جو حضرت موسی کو ملی تھی اور جو تورات میں ہے)۔

موجودہ زبور مناجات کی ایک کتاب ہے اور اس میں پانچ دیوان شامل ہیں۔اس مجموعے میں حضرت داوَد کے علاوہ عبرانی زبان کے بعض دوسرے شعرا کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔اور اس طرح آج کی زبور میں الہامی اور غیر الہامی کلام باہم مخلوط ہو گیا ہے۔قرآن مجید میں زبور کے نام سے جس کتاب کا ذکر ہے وہ صرف وہ کتاب ہے جو حضرت داوَد پر نازل ہوئی تھی۔

جس طرح تورات میں یہودیوں نے تحریف کی اسی طرح زبور بھی تحریف سے محفوظ نہیں رہی۔اس میں بھی بہت ساری چیزیں بعد میں شامل کر دی گئیں اور بہت ساری عبارتوں کو حذف کر دیا گیا۔نتیجہ یہ ہے کہ آج جو کتاب بائبل میں زبور کے نام سے موجود ہے وہ اصل کلام الٰہی نہ ہو کر اس کی محرف شکل ہے۔

4.4.4.3 انجیل

عیسائیوں کی مقدس کتاب کا نام انجیل ہے جو حضرت عیسی پر نازل ہوئی۔انجیل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی بشارت اور خوش خبری ہے۔آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کا ایک معنی پیغامبر بھی دیا ہے۔

اور انجیل کو انجیل اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بشارتوں کی کتاب ہے یعنی اس میں ایک نبی آخر الزماں کی خوش خبری دی گئی ہے۔ جو حضور نبی کریم ہو سکتے ہیں یا پھر یہ کہ حضرت عیسی کا ظہور پرانی کتابوں کی بشارتوں کے مطابق ہوا تھا۔

تورات کی طرح انجیل بھی بائبل کا ایک حصہ ہے جو عہد نامہ جدید کے بیشتر حصّوں پر مشتمل ہے۔موجودہ دور میں عیسائیوں کے نزدیک انجیل سے مراد بنیادی طور پر وہ چار کتابیں ہیں جو حضرت عیسی کے حالات زندگی، معجزات اور تعلیمات سے متعلق مختلف وقفوں میں لکھی گئیں اور متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں اور اسی نسبت کی وجہ سے انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا کہلاتی ہیں۔البتہ جس طرح کبھی کبھی پورے عہد نامہ قدیم کے لیے تورات کا لفظ بولا جاتا ہے اس طرح کبھی کبھی عہد نامہ جدید کے لیے بھی انجیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔عیسائیت کے ابتدائی دور میں بہت سی انجیلیں موجود تھیں لیکن چوتھی صدی عیسوی (325ء) میں عیسائی مذہبی رہنماؤں کی ایک کانفرنس نے ان میں سے چار انجیلوں کو معتبر قرار دے کر لے لیا اور باقی کو مسترد کر کے ترک کر دیا۔

جیسا کہ ذکر ہوا عہد نامہ جدید میں چار انجیلوں کے علاوہ بھی چیزیں شامل ہیں۔ ان کی ترتیب اس طرح ہے۔

1. اناجیل اربعہ یعنی متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں۔
2. رسولوں کے اعمال۔
3. پولس (رسول) کے تیرہ مکتوب۔
4. عبرانیوں کے نام خط۔ جس کے لکھنے والے کا تعین نہیں ہو سکا کچھ محققین اسے پولس کا خط مانتے ہیں جب کہ دیگر محققین کے نزدیک یہ پولس کے کسی شاگرد کا خط ہے۔
5. یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے آٹھ خطوط۔
6. مکاشفہ یوحنا۔

موجودہ انجیل کی زبان یونانی ہے جس کے دنیا کی سیکڑوں زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں لیکن یونانی حضرت عیسی کی زبان نہ تھی بلکہ ان کی زبان عبرانی، آرامی یا سریانی تھی اس لیے انجیل بھی انہیں زبانوں میں سے کسی زبان میں رہی ہوگی۔ بعد میں یونانیوں کے غلبے کے دور میں اس کا صرف یونانی ترجمہ باقی رہا اصل زبان میں انجیل ضائع ہوگئی۔

انجیل کے بارے میں خود عیسائیوں میں یہ نقطہ نظر پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب تحریفات سے محفوظ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں انجیل کی تصحیح کی کوششیں بھی ہوتی رہیں لیکن ان کوششوں نے مزید تحریفات کو جنم دیا۔ اس کے چلتے انجیل کے بارے میں عیسائی دنیا میں مختلف نقاط نظر وجود میں آئے۔ ان میں سے تین کا ہم ذکر کرتے ہیں:

1. قدامت پسند عیسائیوں کا نقطہ نظر: یہ لوگ صرف انجیل کو ہی نہیں بلکہ پوری بائبل کو خدا کا بے خطا اور غلطی سے پاک کلام مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید دونوں الہامی کتابیں ہیں۔ ان کے مضامین کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی الہامی ہیں۔
2. انجیل کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر ان علما کا ہے جو جدید تحقیقات کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کے بھی پابند ہیں۔ ان کے خیال میں بائبل بھی دنیا کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے اور اس کا مطالعہ ذہنی تحفظات کے بغیر کیا جانا چاہیے۔ یہ انسان کے معتقدات اور کردار کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب ہے یہ کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین کے نزدیک الفاظ و واقعات کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت اس روح کی ہے جو اس میں کارفرما ہے۔
3. انجیل کے بارے میں عیسائی دنیا میں تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انجیل اور عہد نامہ جدید کی دیگر کتابیں بھی زیادہ تر پولس (رسول) کے خیالات کا آئینہ ہیں۔ یہ خدا یا عیسی مسیح کے الفاظ نہیں بلکہ انہیں مصنفین کی تحریریں ہیں جن کی طرف کہ یہ منسوب ہیں۔

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ وہ کتابیں جنہیں آج ہم انجیل کے نام سے جانتے ہیں یہ کتابیں وہ انجیل نہیں ہیں جو حضرت عیسی پر نازل ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی رہنمائی کے مطابق انجیل سے مراد وہ کتاب اور تعلیم ہے جو اللہ تعالی نے حضرت عیسی پر نازل کی۔ یہ انجیل زمانے اور حضرت عیسی کے پیروؤں کے ہاتھوں ضائع ہوگئی۔ اس کے کچھ حصے ہی باقی رہ گئے ہیں جو عہد نامہ جدید میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں وہ کتابیں ہیں جن میں ان مصنفین نے حضرت عیسی کے حالات اور اقوال اپنے طور پر بیان کیے ہیں لہذا ان انجیلوں کو ہم وہ انجیل نہیں کہہ سکتے جو حضرت عیسی پر نازل کی گئی تھی۔

4.4.4.4 قرآن مجید

قرآن عربی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل قَـرَأ یَـقْـرَءُ ہے۔قرآن کا لفظی معنی پڑھنا ہے البتہ عربی زبان میں مصدر کئی مرتبہ مفعول کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اس لیے قرآن مَـقْرُوءٌ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب ہے وہ کتاب جو پڑھی جائے یا بار بار پڑھی جائے۔

اصطلاح میں قرآن سے مراد اللہ تعالی کا وہ کلام ہے جو اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل کیا۔ یہ مختلف سورتوں اور آیات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح نبی سے پہلے جو بھی رسول آئے اور جتنی بھی کتابیں نازل ہوئیں ان سب کا عطر اور خلاصہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔قرآن مجید میں عبرت کے لیے پچھلے زمانوں کے قصوں واقعات اور اہم حالات وحوادث کو مناسب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، اچھے کاموں پر اجر اور برے کاموں پر سزا کا بیان بھی ہے۔قرآن مجید مختلف علوم ومعارف کا بہترین مجموعہ ہے۔

قرآن مجید کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالی نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔امام ابن جریر طبری (مشہور مفسر) کے مطابق اللہ تعالی نے قرآن مجید کے چار نام ذکر کیے ہیں۔ 1۔القرآن 2۔الفرقان 3۔الکتاب 4۔الذکر۔

قرآن مجید کو قرآن اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے اور آیتوں اور سورتوں کا مجموعہ ہے۔اس میں احکام وہدایات اور علوم وقصص کا ذکر ہے۔

قرآن مجید کو الفرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کتاب نے حق و باطل کے درمیان امتیازی لکیر کھینچ دی ہے۔

قرآن مجید کو الکتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لکھی ہوئی ہے اور اس کو لکھے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کو الذکر کے نام سے اس لیے یاد کیا گیا ہے کہ اس میں بندوں کے لیے یاددہانی ہے اور انہیں نصیحتیں کی گئی ہیں۔

ان چار ناموں کے علاوہ مفسرین نے بڑی تعداد میں قرآن کے صفاتی ناموں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی تعداد پچاس سے لے کر نناوے تک بیان کی ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تعالی نے حضرت محمدؐ پر وحی کے ذریعے نازل کیا۔ پہلی وحی آپؐ کے پاس حضرت جبریلؑ غار حرا میں لے کر آئے اس موقعے پر سورہ ''اقرأ'' کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔اس کے بعد نبیؐ پر وحی کا سلسلہ 23 برس تک جاری رہا اور اس دوران نبیؐ کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی رہی۔نبوت کے بعد کے ان 23 برسوں میں سے شروع کے تیرہ برس آپ نے مکّے میں گزارے۔اس دوران جو سورتیں اور آیتیں مکے میں نازل ہوئیں انہیں مکی سورت یا آیات کہتے ہیں۔زندگی کے آخری دس برس آپؐ کے مدینہ میں گزرے۔مدینہ میں نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو مدنی کہتے ہیں۔قرآن مجید میں کل 30 پارے، 114 سورتیں، سات منزلیں، 6218 آیتیں ہیں۔ان میں 86 سورتیں مکی ہیں اور 28 سورتیں مدنی ہیں۔قرآن مجید میں بہت سی سورتیں مکی ہیں لیکن ان میں مدنی آیات بھی ہیں اسی طرح مدنی سورتوں میں بھی بعض مکی آیات ہیں۔

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔ یہ فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے۔کوئی بھی عربی داں اسے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔جس طرح آپؐ نے اسے پڑھا اسی طرح سن کر صحابہ کرام نے بھی پڑھا اور اپنے بعد والوں تک پہنچایا۔ اس طرح جو قرآن مجید آج ہمارے سامنے ہے وہ بالکل وہی ہے جو اللہ تعالی نے حضرت جبریل امین کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا۔اس کی ترتیب بھی وہی ہے جو آپؐ نے صحابہ کرام کے ذریعہ کتابت کروائی،انہیں یاد کرایا،خود تلاوت کی اور صحابہ کرام کو بھی تلاوت کی تلقین کی۔آج جو قرآن مجید ہمارے سامنے موجود ہے اس کے الفاظ،حروف،آیات،سورتوں کی ترتیب اور طریقہ تلاوت بالکل وہی ہے جو حضورؐ کے زمانے میں تھا اس میں کہیں بھی کسی قسم کی ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔کیونکہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالی نے لیا ہے۔"ان علینا جمعه و قرآنه" (القیامۃ 17) (بلاشبہ اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ہی ذمہ ہے) آپؐ پر جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی آپؐ خود اسے یاد کرتے،اپنے صحابہ کو یاد کرواتے اور صحابہ کی وہ ٹیم جو لکھنا جانتی تھی ان میں سے کسی کو بلا کر اس کی کتابت بھی کرواتے۔اس طرح پورا قرآن مجید 23 سال میں آپؐ پر نازل ہوا اور آپؐ نے اپنی زندگی میں ہی اس کو کتابت شدہ شکل میں بھی محفوظ کرا دیا اور صحابہ کرام کے سینوں میں بھی۔آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن مجید کو سرکاری سطح پر جمع کیا گیا اور ایک مکمل و مستند نسخہ تیار کر دیا گیا تاکہ کسی کو بھی اگر قرآن مجید کی نقل تیار کرنی ہے تو اس مستند نسخے سے تیار کرے۔اس طرح قرآن مجید بغیر کسی تحریف اور تبدیلی کے قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گیا اور اب یہی انسانوں کے لیے پیغام ہدایت و رہنمائی ہے۔ایک مسلمان کے لیے تمام آسمانی کتابوں پر اس طور پر ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانوں میں آسمانی ہدایت تھیں لیکن ان کے ماننے والوں نے ان میں تحریف کردی اس لیے ان پر عمل نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ یہ بعینہ وہی کتابیں ہیں جو متعلقہ انبیائے کرام پر نازل ہوئیں جب کہ قرآن مجید آخری کتاب ہدایت کے طور پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے اور اب اس پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایات پر عمل بھی ضروری ہے۔

معلومات کی جانچ

1. آسمانی کتابوں کے نام بتایئے اور کن انبیاء پر وہ نازل ہوئیں؟
2. قرآن مجید کو قرآن میں کن ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور کیوں؟
3. انجیلیں کتنی اور کون کون سی ہیں؟

4.5 عقیدہ ایمان بالکتب کا اثر انسانی سماج پر

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک عالمی انسانی برادری کا تصور دیتا ہے۔قرآن مجید میں اکثر خطاب "یا ایھا الناس" (اے لوگو!) کے الفاظ سے ہوا ہے۔وہ دنیا بھر کے انسانوں کو مشترکہ اقدار پر اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے یعنی "تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم"۔دنیا کے دیگر تمام مذاہب من و تو کی انسانی تقسیم کا شکار ہیں۔یہودی ہوں،عیسائی ہوں،پارسی ہوں،ہندو ہوں ان سب کے ماننے والے اپنی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کا یا تو انکار کرتے ہیں یا پھر ان کے بغیر بھی نجات اور سرخروئی کے متمنی ہو سکتے ہیں۔لیکن اسلام وہ واحد مذہب ہے جس کے ماننے والوں کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے کہ اپنی الہامی کتاب قرآن مجید

پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے ساتھ دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی ایمان لائیں۔اسی طرح دیگر مذاہب میں اپنے اور غیر کی جو صرف دو تقسیمیں تھیں، جب اسلامی قانون (فقہ) کا ارتقاء ہوا تو اقوام عالم کی چار گروہوں میں قانونی تقسیم عمل میں آئی یعنی 1. مسلمان، 2. اہل کتاب، 3. شبہ اہل کتاب، اور 4. کفار و مشرکین۔اور اس کے مطابق سب کی الگ الگ قانونی حیثیتیں متعین ہوئیں۔

1. **مسلمان:** جو قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ان میں کا ہر فرد دوسرے کا بھائی ہے اور ہر اچھے بھلے میں ایک دوسرے کا شریک ہے۔ان میں آپس میں شادی بیاہ ہوسکتا ہے۔اور وہ ایک دوسرے کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں۔
2. **اہل کتاب:** جن کتابوں کا قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے ان کے پیرو اہل کتاب کہلاتے ہیں۔ان کا ذبیحہ مسلمان کھا سکتے ہیں اور ان کی عورتوں سے مسلمان مرد شادی بھی کر سکتے ہیں۔
3. **شبہ اہل کتاب:** جو قرآن اور اس میں مذکور کتابوں (تورات، زبور اور انجیل) پر تو ایمان نہیں رکھتے لیکن کسی آسمانی کتاب کے پیرو ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔مسلمان ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔
4. **کفار و مشرکین:** یہ وہ لوگ ہیں جو کسی آسمانی کتاب کے حامل نہیں، نہ اس کا دعوی رکھتے ہیں۔مسلمانوں اور ان کی شادی نہیں ہوسکتی ہے۔اور نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کھا سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں انسانی سماج کے اندر امن و امان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اسلام کا یہی وہ نظریہ تھا جس کے تحت مسلمان اپنے مذہب اور شریعت کی پابندی کرتے ہوئے اس کے اہل ہو سکے کہ دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت کریں اور ان سے میل جول رکھیں۔اور ایک ایسے زمانے میں جب گلوبلائزیشن کا کوئی تصور نہیں تھا ایک عالمی گاؤں میں مختلف مذاہب کے ماننے والے کیسے رہ سکتے ہیں، اس کے اصول دیے۔

4.6 خلاصہ

فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ یہ اقرار نہ کرلے کہ اللہ نے انسانی ضروریات سے عاری ایک غیر مادی مخلوق پیدا کی ہے جو اس کی اجازت اور حکم سے مختلف امور کو انجام دیتی اور ہمہ وقت اس کی عبادت و اطاعت میں مصروف رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے کائنات کے مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے فرشتوں کی ایک تعداد کو مقرر کر رکھا ہے جو پوری تن دہی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہیں۔ان فرشتوں کو کسی طرح کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔یہ پوری طرح مجبور ہیں اور وہی کرتے ہیں جو ان کے رب کی مرضی اور حکم ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے۔مسلمان ہونے کے لیے صرف قرآن مجید پر ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے ہر زمانے اور ہر علاقے میں اپنی ہدایت بھیجی۔ان میں سے کچھ کے بارے میں قرآن مجید سے ہمیں معلوم ہوتا ہے اور بقیہ کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔جن کتابوں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے ان کے نام کے ساتھ اور جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم ان پر عمومی طور پر ایمان لانا ضروری ہے۔قرآن مجید اللہ کی آخری الہامی کتاب ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔یہ کتاب

پوری طرح محفوظ ہے۔اس سے پہلے کی کتابوں میں تحریف کردی گئی اس لیے اب رہتی دنیا تک انسانیت کی ہدایت و رہنمائی قرآن مجید کے ذریعے ہوگی۔

4.7 نمونے کے امتحانی سوالات

1. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فرشتوں کی حقیقت بیان کیجیے۔
2. مشہور فرشتوں پر ایک مضمون لکھیے۔
3. کتاب الٰہی پر ایمان لانے کی اہمیت اور ضرورت بیان کیجیے۔
4. چار مشہور آسمانی کتابوں کا مختصر تعارف کرائیے۔

4.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عقیدہ اسلامی	:	علامہ محمد غزالی/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات	:	مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں	:	مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات	:	مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد	:	علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر/ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم)	:	علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 5 : تقدیر

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

5.2 تمہید

5.3 تقدیر: معنی ومفہوم

5.4 قرآن میں تقدیر کا بیان

5.5 تقدیر کی بابت اسلام کا موقف

5.6 تقدیر کے بارے میں مختلف نقاط نظر کا خلاصہ

5.7 عقیدہ تقدیر کا اثر انسانی زندگی پر

5.8 خلاصہ

5.9 نمونے کے امتحانی سوالات

5.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

5.1 مقصد

تقدیر پر ایمان لانا اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔قرآن مجید میں اور اللہ کے رسولؐ کی حدیثوں میں اس عقیدے کا ذکر بار بار ہوا ہے۔کوئی بھی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ منجملہ دیگر بنیادی عقائد کے تقدیر کے عقیدے پر بھی ایمان نہ لائے۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر ہوتا ہے تقدیر کے عقیدے کا ذکر بھی ضرور ہوتا ہے۔اسلامی عقائد سے متعلق اس بلاک کی آخری یعنی پانچویں اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ سب سے پہلے تقدیر کا معنی ومفہوم بیان کیا جائے۔اس کے بعد عقیدہ تقدیر کی اہمیت اور ضرورت کا مختصراً ذکر ہوگا۔بعدازاں قرآن میں تقدیر کے بیانات کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کے تقدیر کے بارے میں موقف کو بیان کیا جائے گا۔اکائی کے آخر میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ عقیدہ تقدیر کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔

5.2 تمہید

تقدیر کا عقیدہ ایمانیات وعقائد کے باب میں شامل ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا،اس کا خالق ہونے کے ناطے اللہ کو

اس کی زندگی پر ہر طرح کا اختیار و اقتدار حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق بھی بنایا اور اس ذمہ داری کی وجہ سے اسے ارادہ و اختیار کی آزادی بھی دی ہے۔ ارادہ و اختیار کی یہی آزادی ہے جو انسان کو ذمہ دار بنانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے اعمال کے لیے جزاء سزا کا مستحق بھی ٹھہراتی ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ کائنات میں اب تک جو کچھ ہوا، جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہونے والا ہے وہ سب کچھ نہ صرف یہ کہ اللہ رب العزت کے علم میں ہے بلکہ اس کے فیصلے کے مطابق ہوا، ہوتا ہے اور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم جانتے ہیں اور عقیدہ توحید کے باب میں اسے ہم اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں کہ اللہ نے کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس کائنات کا مدبر اور منتظم بھی ہے۔ اس نے اپنے علم غیب سے ہر کام کے ہونے کی جگہ اور وقت کا تعین کر رکھا ہے۔ دنیا کے تمام کام اس کے علم اور فیصلے کے مطابق ہوتے ہیں، اس نے جہاں ایک طرف انسان کو بہت سے معاملوں میں مجبور بنایا اور پیدا کیا وہیں اس نے اسے بہت ساری آزادیاں بھی دی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذمّے داری کے دائرے میں رہتے ہوئے آزاد ہے اور اپنے خالق و مالک کی فرماں بردار اس وسیع کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے اس کا غلام بھی ہے۔

5.3 تقدیر : معنی ومفہوم

قرآن مجید میں تقدیر کے عقیدے کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔

1. پہلا لفظ قدر ہے إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر:49)
(ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا)۔

2. دوسرا لفظ قضا کا استعمال کیا ہے۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضَى اَجلاً (الانعام:2)
(وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔)

قدر کا لغوی معنی اندازہ کرنا ہے اور اس کی دلالت مذکورہ بالا آیت میں موجود ہے۔ قضا کا لغوی معنی فیصلہ کرنا اور حکم دینا ہے۔ اس کی دلیل بھی سورہ انعام کی مذکورہ آیت میں موجود ہے۔

قضاوقدر کے الفاظ جب ایک اسلامی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات کو وجود بخشنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں اپنے اندازے اور تقدیر سے ہر ایک چیز کا ایک فیصلہ کر کے اسے متعین کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسی فیصلے اور تعین کے مطابق کائنات کا پورا کارخانہ جاری و ساری ہے۔ اس میں کہیں بھی ذرا سی بھی تبدیلی اور تغیر کا امکان نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے لیے بھی جو اصول متعین فرما دیے ہیں وہ انہیں اصولوں کے مطابق مکمل فرض شناسی کے ساتھ اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے، زمین، آسمان، فنا و بقا غرض تمام چیزیں اللہ کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ گویا لوگ جسے عام طور پر قانونِ قدرت کہتے ہیں فی الواقع وہی تقدیر الٰہی ہے اور اس تقدیر الٰہی سے کوئی بھی چیز ہٹتی نہیں ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اس لیے اگلی پچھلی کوئی بھی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ اسے ایک مثال سے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ طالب علموں کی ایک کلاس ہے جسے ایک ماہر استاد پڑھاتا ہے۔ کلاس میں ہر طرح کے طالب علم ہوتے ہیں کچھ بہت زیادہ پڑھنے والے کچھ اوسط درجے کے پڑھنے والے اور کچھ کھیلنے کودنے

والے، استاد اپنے تجربے سے چند ہی کلاسوں کے بعد یہ جان لیتا ہے کہ کون سا طالب علم کیسا ہے؟ اب اگر وہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں کسی طالب علم کے بارے میں یہ کہتا ہے یا کسی ڈائری میں یہ لکھ دیتا ہے کہ کلاس کا فلاں طالب علم سالانہ امتحان میں کامیاب ہوگا اور فلاں طالب علم ناکام ہو جائے گا۔ سالانہ امتحان ہوتا ہے اور نتائج آتے ہیں تو بعینہ وہی ہوتا ہے جو استاد نے کہا تھا۔ اس کا یہ مطلب کوئی نہیں نکالتا کہ طالب علموں کو کامیابی یا ناکامی استاد کے کہنے یا لکھنے کی وجہ سے ملی بلکہ کامیاب ہونے والا طالب علم اس لیے کامیاب ہوا کہ اس نے اپنی پڑھائی پر توجہ دی اور ناکام ہونے والا طالب علم اس لیے ناکام ہوا کہ وہ پڑھائی پر توجہ دینے کے بجائے پورا سال کھیل کود اور تفریح میں ضائع کرتا رہا۔ ایسا ہی معاملہ انسانوں کے حوالے سے اللہ کی تقدیر کا ہے اللہ تعالیٰ جو کہ عالم الغیب ہے اس نے اپنے علم غیب کی بنیاد پر لکھ دیا ہے کہ کون سا انسان اپنی آئندہ زندگی میں کیا کرنے والا ہے۔

5.4 قرآن میں تقدیر کا بیان

تقدیر کے باب میں قرآن مجید کی آیات کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند جملوں میں تقدیر کی حدود کو بیان کر دیا جائے کیونکہ تقدیر کے مسئلے کو لے کر مشکل اسی وقت پیش آتی ہے جب ہم ان حدود کے تعین میں ناکام ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآنی آیات کو سمجھنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔

جب ہم کائنات کے کارخانے اور انسانی زندگی کے واقعات و حادثات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں تقدیر کی دو بہت ہی واضح صورتیں نظر آتی ہیں۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تقدیر کی یہ دونوں صورتیں اپنی حدود اور دائروں میں تو الگ الگ ہیں ہی احکام و نتائج کے لحاظ سے بھی ان میں واضح فرق ہے۔

تقدیر کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان ہی نہیں پوری کائنات اللہ کی مرضی اور قدرت کے سامنے مجبور ہے۔ اس صورت میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ کی مرضی اور قدرت کا کرشمہ ہوتا ہے انسان کی پسند و ناپسند اور ارادہ و اختیار کو اس میں کسی طرح کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسے مثال کے ذریعے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک انسان کا قد و قامت کیسا ہے؟ اسے عقل اور ذہانت کس درجے کی ملی ہے؟ وہ خوب صورت ہے یا بدصورت؟ وہ خوش حال گھرانے میں پیدا ہوتا ہے یا تنگ حالی سے دوچار خاندان میں؟ صحت مند ہے یا بیمار یا اس طرح کی اور بھی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں جن کے بارے میں ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان معاملات میں انسان مجبور ہے، اس کا ارادہ و اختیار ان میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی وہ تقدیر ہے جو پورے طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جیسے چاہتا ہے اسے بناتا اور بگاڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کی اس صورت میں انسان سے کسی طرح کا نہ تو مواخذہ ہوگا اور نہ ہی حساب و کتاب یا جزا و سزا کا اس سے کوئی تعلق ہے' یعنی انسان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کسی خاندان میں کیوں پیدا ہوا یا اس کا قد چھوٹا یا بڑا کیوں ہے وغیرہ۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہے اور ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور ان چکروں میں نہ پڑتے ہوئے اپنی مفوضہ ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔

تقدیر کی دوسری صورت وہ ہے جس کا تعلق انسان کی شعوری اور عملی زندگی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تقدیر کے اس شعبے میں مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ مثال کے طور پر عقل و شعور بے دار ہو جانے کے بعد انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے، اس بارے میں

اللہ تعالیٰ نے اسے پوری آزادی دی ہے۔ ہر انسان ارادہ وعمل کی اس آزادی کو خود محسوس کرسکتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں ہوسکتی ہے کہ انسان ہدایت کے راستے پر چلے یا گمراہی کا راستہ اختیار کرے' یا اسی طرح اچھے کام کرے یا غلط کاموں میں پڑا رہے، اس کا فیصلہ انسان کو خود کرنا ہوتا ہے اور چونکہ انسان یہاں پر فیصلوں کے کرنے میں اور اپنے ارادہ واختیار میں آزاد ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ ان معاملات میں یعنی انسانی اعمال میں جن میں کہ انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی ملی ہوئی ہے، انسان سے نہ صرف سوال جواب کرے گا بلکہ ان اعمال کا حساب کتاب کرکے اچھا یا برا بدلہ بھی دے گا۔ مسئلہ تقدیر کی اسی صورت میں پیش آتا ہے جب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے تمام اعمال اللہ کے علم میں ہیں اور نوشتۂ الٰہی میں لکھے ہوئے ہیں تو پھر ارادہ وعمل کی آزادی کیا معنی رکھتی ہے؟ حالانکہ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے اگر ہم اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب جانتے ہیں تو پھر ارادہ وعمل کی آزادی اور ہمارے اعمال کے نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہونے میں کوئی تضاد باقی نہیں رہ جاتا۔ اسے ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ اس کے سامنے جو بھی چیز لائی جائے گی، اس کا عکس ویسا ہی آئینے میں نظر آئے گا۔ اگر چیز خوبصورت ہے تو آئینے میں بھی وہ چیز خوبصورت نظر آئے گی اور اگر بدصورت ہے تو آئینے میں بھی بدصورت ہی نظر آئے گی آئینہ اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کو بدل نہیں سکتا۔ نوشتۂ تقدیر یا علم الٰہی کی مثال بھی ایک آئینے کی سی ہے جس میں کہ اعمال کا صحیح عکس موجود ہے۔ تقدیر الٰہی کا آئینہ انسانی عمل کو ویسا ہی دکھاتا ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کچھ نہیں کرتا۔ بس اس آئینے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اگلے پچھلے۔ یعنی ماضی، حال اور مستقبل کے تمام عکس محفوظ ہیں اور دکھائی دیتے ہیں اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اللہ کا علم زمان ومکان کی تمام حدود کو محیط ہے۔ وہاں نہ کوئی ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل، سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

اب ہم تقدیر کی دونوں صورتوں سے متعلق آیات واحادیث کو الگ الگ نقل کرتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَىْءٌ فِى الْأَرْضِ وَلاَ فِى السَّمَاءِ هُوَ الَّذِىْ يُصَوِّرُكُمْ فِى الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لاَ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران: 5-6)

ترجمہ: زمین وآسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو رحمِ مادر میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورت گری کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ زبردست اور حکمت والا ہے''۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ وَهُوَ اللّٰهُ لاَ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (القصص: 68-70)

ترجمہ: تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے وہ منتخب کرتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ بھی اختیار نہیں حاصل۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس شرک سے جسے یہ کرتے ہیں۔ اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ علانیہ کرتے ہیں۔ وہی حقیقی معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ ساری تعریف اسی کے لیے ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹنا ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (ألفاطر: 11)

ترجمہ: اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (الحديد: 23-22)

ترجمہ: کوئی مصیبت نہیں آتی زمین میں اور نہ خود تم (زمین کے بسنے والوں) میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا تا کہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (التوبه: 51)

ترجمہ: ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی یہ آیات تقدیر کی پہلی صورت کی وضاحت کرتی ہیں جن میں انسان مجبور ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مرضی اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ آگے قرآن مجید کی ایسی آیات بیان کی جارہی ہیں جن کا تعلق تقدیر کی دوسری صورت سے ہے یعنی انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ (الكهف: 29)

ترجمہ: کہہ دو! یہ حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے تو جس کا جی چاہے مانے، جس کا جی چاہے نہ مانے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَاْ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (يونس: 108)

ترجمہ: کہہ دو اے لوگو! تمہارے پاس حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے آپ کو ہدایت یاب کرے گا۔ (یعنی اس کا ثمرہ اسی کو ملے گا) اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو اس گمراہی کا وبال اسی کے اوپر ہوگا اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔

عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (طٰهٰ: 52)

ترجمہ: ان کے سلسلے کی معلومات میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں ہیں۔ میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى وَأَنَّ سَعۡيَهُ سَوۡفَ يُرَى(النجم:39–40)

ترجمہ: اورانسان کے لیے نہیں ہے لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔

قرآن مجید کی یہ وہ آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ وعمل میں پوری طرح آزاد ہے۔ اوران کو سمجھنا آسان بھی ہے۔ البتہ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں قرآن مجید میں انسان کی ہدایت وگمراہی کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ غلط فہمی اس لیے پیش آتی ہے کہ لوگ کسی ایک آیت یا اس کے کسی ایک حصے کو پکڑ لیتے ہیں۔ نہ زبان کا اسلوب پیش نظر ہوتا ہے اور نہ ان آیات کو دیگر آیات کے وسیع تر تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذیل میں ہم ایسی چند آیتوں کو ذکر کر کے ان کا صحیح تناظر اور مفہوم جاننے کی کوشش کریں گے۔

قرآن مجید میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن میں ہدایت یا گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے مثلاً کہیں کہا گیا کہ یضل من یشاء (وہ (اللہ) جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے) اور کہیں یہ کہا گیا: یھدی من یشاء (وہ (اللہ) جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) اگر ہم ان آیتوں کو قرآن مجید کی دیگر آیتوں کی روشنی میں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ آیتوں کا مفہوم وہ نہیں ہے۔ جو ظاہر الفاظ کو دیکھ کر سامنے آتا ہے۔ اصل معنی ومفہوم کی تعیین اس طرح کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب گمراہی کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے گمراہ کردیا تو اصلاً گمراہ کرنے والی ذات اللہ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے وہ راستہ ہموار کردیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ صف میں اس کی وضاحت موجود ہے:

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمۡ وَاللَّهُ لَا يَهۡدِي الۡقَوۡمَ الۡفَاسِقِيۡنَ (الصف:5)

ترجمہ: تو جب انھوں نے کجی اختیار کی، اللہ نے ان کے دلوں کو کج کردیا۔ اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بہت واضح بیان کردیا ہے کہ گمراہی انسان خود اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے زبردستی ہدایت نہیں دیتا اس کے لیے وہی راستہ آسان کردیتا ہے جسے کہ وہ پسند کرتا ہے اور جس پر کہ وہ چلنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ارادہ واختیار کی آزادی میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔

ایک دوسری آیت میں انسان کے ارادہ واختیار کی آزادی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدَى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصۡلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتۡ مَصِيۡراً (النساء: 115)

ترجمہ: اور جو رسول کی مخالفت کرے گا جب کہ ہدایت بالکل واضح ہوچکی اور مومنین کے راستے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو جو چیز اس نے اپنے لیے پسند کی ہوگی اس چیز سے ہم اسے ہمکنار کریں گے اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

اللہ تعالیٰ گمراہ کسے کرتا ہے اس کی وضاحت اس آیت میں کھول کر کر دی ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيْثَاقِهِ(البقرہ:26–27)

ترجمہ: اور اس سے گمراہ نہیں کرتا ہے مگر فاسقوں کو جو اللہ کا عہد توڑتے ہیں اسے باندھنے کے بعد۔

اسی طرح ہدایت بھی اللہ تعالیٰ اُسی کو دیتا ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس میں اصل اہمیت انسانی ارادے کو حاصل ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّ اللّـهَ يُضِلُّ مَن يَشَاء ُوَيَهْدِىْ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد: 27–28)

ترجمہ: کہہ دو! اللہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اسے جو اس کی طرف آتا ہے' وہ لوگ جو ایمان لائے اور یادِ الٰہی سے انہیں قرار ملتا ہے، سن لو! یادِ الٰہی سے ہی دلوں کو قرار ملتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ہدایت دیتا ہے مگر اس کو جو ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انسان کے عمل اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت کی حدود کیا ہیں تو اسے اس بچے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جو اپنی پیدائش کے ابتدائی دنوں میں نہ بولنا جانتا ہے نہ چلنا جانتا ہے۔ پہلے وہ بچہ چلنے اور بولنے کی کوشش خود کرتا ہے تو اس کے والدین اسے چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں۔ بچہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے والدین اس کی مدد کر کے چلنا سکھا دیتے ہیں۔ بچہ زبان ہلاتا ہے، اس کے منہ سے بے معنی آوازیں نکلتی ہیں والدین اسے بامعنی الفاظ سکھاتے ہیں اور اس طرح دونوں کی کوششیں مل کر بارآور ہوتی ہیں۔ اللہ کی تقدیر اور انسان کے عمل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انسان عمل کا ارادہ کرتا ہے تقدیرِ الٰہی اس کے لیے راستے ہموار کرتی ہے۔

5.5 تقدیر کی بابت اسلام کا موقف

تقدیر کے بارے میں اسلام کے موقف کو جاننے اور سمجھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں دنیا کی دیگر مذہبی روایتیں کیا کہتی ہیں اسے بھی جان لیا جائے۔ کیونکہ تقدیر کا عقیدہ صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ عقیدہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور روایتوں میں بھی موجود تھا، اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے دوسری روایتوں کے اس مبہم اور موہوم عقیدہ تقدیر کو واضح اور مبرہن کر کے مکمل کر دیا۔ یہودیوں کی مقدس کتاب تورات میں جہاں آدمؑ، شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصے بیان ہوئے ہیں، ان قصوں میں عقیدہ تقدیر کے اشارات موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے خواب میں بھی اس حقیقت کی تعبیر پائی جاتی ہے۔ آسمانی کتاب زبور میں بھی تقدیر کی تعلیم موجود ہے' مثلاً زبور کا ایک ترانہ حمد اس طرح شروع ہوتا ہے:

''...خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے۔ اس نے ان کو پائیداری بخشی۔ اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔''

عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل میں بھی تقدیر کی تعلیم ''خدا کی مرضی'' کے عنوان سے موجود ہے مثلاً عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری رات میں جو دعا فرماتے ہیں اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

''میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہوتی ہے۔''(متی:26-39)

اسلام اللہ کا آخری دین ہے جسے اس نے اپنے آخری رسول سیدنا حضرت محمدؐ کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ اسلام نے جس طرح عقائد سے متعلق دیگر تعلیمات کی تکمیل کی اسی طرح اس دین نے عقیدہ تقدیر کو بھی مکمل کیا۔قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں تقدیر کے مسئلے کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے اور اس عقیدے کی حکمت اور مصلحت بھی بیان کی گئی ہے۔ایسا ایک دو بار نہیں کیا گیا بلکہ بار بار اسے دہرایا گیا تاکہ سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر جائے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی تربیت میں دنیا کے عظیم انسانوں کا جو گروہ تیار ہوا اور جسے ہم گروہ صحابہؓ کے نام سے جانتے ہیں، وہ صبر وشکر کا پیکر تھا۔دنیا کی کوئی بھی مصیبت آجائے اور چاہے کیسے ہی حالات ہو جائیں صحابہ کرامؓ بالکل گھبراتے نہ تھے اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر کے ہر طرح کے دنیوی وساوس سے آزاد ہو جاتے تھے۔اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عقیدۂ تقدیر کو محض نظری اور فلسفیانہ بحث تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا تاکہ اسلام کے ماننے والے ہر طرح کے حالات میں صبر وثبات کو اختیار کریں۔مصیبتوں میں صبر وتسلی ان کے دامن گیر رہے تو کامیابیوں میں عجز وشکران کا شیوہ ہو۔

انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان برحق ہے کہ وہ بہت ہی عجلت پسند واقع ہوا ہے۔اسے اپنی کوشش میں ذرا سی بھی کامیابی اگر ملتی ہے تو فخر وغرور کے نشے میں چور ہو جاتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ جو کامیابی بھی اسے ملی ہے وہ محض اس کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔اسی طرح کسی کام میں انسان کو اگر اک ذرا سی ناکامی ہوتی ہے تو اسے اس کا ایسا صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے اور کچھ بھی کرنے سے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگتا ہے۔یہ انسان کی وہ اخلاقی برائیاں ہیں جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اس کے نزدیک اپنے عمل کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔وہ سمجھنے لگتا ہے کہ نتائج وہی نکلیں گے جو کچھ کہ وہ کرے گا۔یہی وجہ ہے کہ کامیابی اسے مغرور بناتی ہے اور ناکامی سے وہ دل برداشتہ ہوتا ہے۔کامیابی پر خوشی سے پھول جانا اور ناکامی پر ملول ہو جانا یہ دونوں کیفیتیں کسی بھی فرد یا قوم کی تعمیر وترقی میں صحت مند علامتیں نہیں ہیں۔اسلام جو اللہ کا آخری دین ہے اور جسے رہتی دنیا تک انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کا کام کرنا ہے اس نے اس اخلاقی بیماری کا علاج عقیدۂ تقدیر کے ذریعہ کیا ہے۔یہ ایسا عقیدہ ہے جو کامیابی اور ناکامی دونوں طرح کے مواقع پر انسان کو بے لگام اور حد سے زیادہ مایوس نہیں ہونے دیتا۔یہ عقیدہ انسان کو بتاتا ہے کہ اسے جو بھی کامیابی ملتی ہے وہ براہ راست اس کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حاصل ہوتی ہے' کوشش انسان کرتا ہے۔اس لیے کامیابی پر فخر وغرور کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے انسان کو شکر کی روش پر چلنا چاہیے کہ اس نے ایک کوشش کی اور اللہ نے اسے کامیابی سے ہم کنار کیا۔اسی طرح انسان کو اگر کسی کام میں ناکامی ہاتھ آتی ہے تو اس سے بھی اسے بہت زیادہ ملول نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور ایک بار پھر عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑے ہی اچھے انداز میں کی ہے:

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِيُ الْأَرْضِ وَلَا فِيُ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِيُ كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (الحديد: 22-23)

ترجمہ: کوئی مصیبت نہیں آتی زمین میں اور نہ خود تم (اس زمین کے بسنے والوں) میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان دو آیتوں میں تقدیر کے مسئلے کو اس خوبی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سلجھا دیا ہے کہ اس کے بعد اب کسی اور تشریح و توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ صحابہ کرام ان آیات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے والے تھے اس لیے وہ نہ تو کامیابیوں پر اتراتے تھے اور نہ ہی ناکامیوں سے گھبراتے اور دل برداشتہ ہوتے تھے بلکہ وہ اللہ کی ذات پر پورا پورا یقین رکھتے تھے اور کسی حال میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مختصر سی مدت میں کامیابیوں کا جو معیار انہوں نے قائم کیا دنیا آج تک اس سے قاصر ہے۔

یہ غلط فہمی ہے کہ تقدیر کا عقیدہ تسلیم کر لینے سے انسان خود کو مجبور محض سمجھنے لگتا ہے اور عمل سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اوپر کی آیات پر اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تقدیر کا عقیدہ انسان کو بے عمل بنانے کے بجائے اس کے اندر تازہ جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اسے ناکامیوں پر مایوس نہیں ہونے دیتا اور اس کے اندر یہ حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ عمل کا سلسلہ جاری رکھے۔

5.6 تقدیر کے بارے میں مختلف نقاط نظر کا خلاصہ

تقدیر کے حوالے سے ہی عام طور پر جبر و قدر کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل اور ارادے میں مجبور محض ہے یا پھر اسے عمل اور ارادے کی کھلی آزادی حاصل ہے۔ تقدیر کے باب میں یہ وہ گرہ ہے جس کو کھولنے میں اسلام سے پہلے مذہب اور فلسفہ دونوں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے مذاہب اور نظریات کا جتنا بھی مطالعہ کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ارادہ و اختیار کی آزادی اور مجبوری کے مسئلے کو یہ حل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہندو مذہب ہو، یہودیت ہو، عیسائیت ہو یا مجوسی عقائد اور نظریات کو ماننے والے لوگ، سب نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے پیروکاروں کے درمیان افراط و تفریط پیدا کرنے کا سبب بنے ہیں۔ اور انہیں کے زیر اثر مسلمانوں کے بعض فرقے بھی ارادہ و اختیار کے مسئلے کو لے کر گمراہی کا شکار ہوئے اور امت میں افتراق و انتشار کا سبب بھی بنے۔ حالانکہ اسلام نے اپنی تعلیمات میں انسانی ارادہ و عمل کی آزادی و مجبوری یعنی جبر و قدر کو لے کر ایک متوازن اور واضح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہاں ہم ان تمام مذاہب، فلسفیانہ افکار اور فرقوں کے نقاط نظر کو الگ الگ پیش کر کے ان کا تجزیہ و تحلیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ البتہ ہماری کوشش ہے کہ جبر و قدر کے حوالے سے ان کے درمیان جو بنیادی تقسیم ہے اس کا تعارف کرانے کے بعد اسلام کے متوازن موقف کو پیش کر دیں۔

جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے انسانی سماج میں فکری و عملی افتراق و انتشار کا سبب بنتا رہا ہے اور اسے عام طور پر دو گروہوں میں تقسیم کرتا رہا ہے۔ ایک وہ جس کے تحت یہ رجحان پروان چڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوقات کی طرح انسان بھی مجبور محض ہے۔ اسے ارادہ و اختیار کی بالکل ہی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں اس کی اپنی آزادی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے، جو

کچھ اللہ نے چاہا اور جو کچھ اس نے نوشتۂ تقدیر میں لکھ دیا انسان وہی کچھ کرنے پر مجبور ہے۔ ہندومت، عیسائیت اور یہودیت جیسے مذاہب میں جبر کے اسی تصور کی جانب میلان نمایاں ہے، خود مسلمانوں میں بھی جبریہ کا فرقہ اسی سے متاثر تھا۔ جبر کے اس تصور کو مان لینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان پوری طرح بے عمل اور نکھٹو بن جاتا ہے۔ یا تو وہ کچھ کرتا ہی نہیں یا جو کچھ بھی کرتا ہے سب کچھ خدا کے کھاتے میں ڈال کر اور خود کے مجبور ہونے کا بہانہ بنا کر الگ ہو بیٹھتا ہے۔ ظلم اور بے انصافی کے فروغ کا سبب بنتا ہے اور بے حیائی و بدعملی کے راستے ہموار کرتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو قدر کی جانب میلان رکھتا ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے ہر عمل کا خالق خود ہے۔ وہ اس دنیا میں پوری طرح آزاد اور بااختیار ہے۔ جو چاہے اور جس طرح چاہے کرتا پھرے اس کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ خدا نے انسان اور کائنات کو بنا کر خود کو ان سے الگ کرلیا ہے۔ اس نے جو اصول اور ضابطے بنا دیے اور انسان کو جو آزادی دے دی اس کے آگے اب خود بھی مجبور اور بے بس ہے۔ وہ چاہے بھی تو اس میں اب کسی طرح کی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا علم غیب اور اس کی بنیاد پر نوشتۂ تقدیر کا لکھنا سب کچھ اس گروہ کے نزدیک بے معنی ہے۔ یہ خدا کے علم غیب کا انکار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ انسان اگلے لمحے کیا کرنے والا ہے اللہ کو اس کی خبر نہیں یہاں تک کہ ان کے بعض فرقوں کے نزدیک فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کو کسی طرح کا قابو اور اختیار حاصل نہیں ہے۔ قدر یعنی انسان اپنے ارادے اور عمل میں پوری طرح آزاد ہے، کو مان لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتا ہے اور ایک طرح سے خدا کا وجود یا عدم وجود اس کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام سیدنا حضرت محمدؐ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے جبر و قدر کی اس افراط و تفریط کے درمیان ایک شاہراہِ اعتدال قائم کی۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں ہے اور کائنات کا ایک ذرّہ بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے۔ اسلام ان دونوں سچائیوں کو تسلیم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ دونوں ہی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام عالم کو محیط ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی بھی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے بغیر ایک ذرّہ برابر بھی حرکت کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہ اس کے حکم کا پابند ہے۔ انسان بھی اللہ تعالیٰ کی اس مشیت کے عموم میں شامل ہے۔ انسان کے اعضاء و جوارح اور اس سے صادر ہونے والے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی مشیت سے باہر نہیں۔ وہ چاہے تو انسان بھی اس کی قدرت اور مشیت کا اسی طرح پابند اور مجبور ہو جائے جس طرح کہ کائنات کی دیگر مخلوقات ہیں۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ اللہ تعالیٰ کی ایسی قدرت کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ ایک ایسا خدا مانتا ہے جو یا تو اختیارات رکھتا ہی نہیں یا جس کے اختیارات محدود ہیں، جس کی قدرت عام نہیں بلکہ خام ہے اور جس کا اقتدار و بادشاہی ناقص اور نا تمام ہے۔

لیکن اسلام جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و مطلقہ کی تصدیق کرتا ہے وہیں یہ بات بھی تسلیم کرتا ہے کہ جس خدا کی قدرت و اختیار لامحدود اور بے پایاں ہیں اسی خدائے بزرگ و برتر نے اپنی مخلوقات میں سے ایک یعنی انسانوں کو اپنے اعمال کی انجام دہی میں ارادہ و اختیار کی آزادی بھی ایک حد تک عطا کی ہے اور اسی آزادی کے تحت انسان بہت سارے کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے۔ انسان کے لیے ارادہ و اختیار کی اس آزادی کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو انسان دنیا کی دیگر مخلوقات کی طرح مجبور

محض بن جائے گا اور اس کا دیگر مخلوقات کے ساتھ امتیاز ختم ہو جائے گا۔ اور جب وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح مجبور و پابند مخلوق قرار پائے گا تو پھر اس کے لیے شریعت، کتاب، تعلیم، انبیاء کی بعثت، خیر وشر کا تصور، حساب وکتاب اور اعمال کی جزاء سزا جیسی تمام چیزیں بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ بلکہ یہ تو اس کے خلاف سراسر ظلم و ناانصافی قرار پائے گا کہ اسے ان کاموں کی جزا و سزا ملے جن کے کرنے کا اختیار اسے حاصل ہی نہیں تھا۔

اسلام اپنے پیروؤں کو بتاتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ہی سچائیاں اپنی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار مطلق ہے، اس کی حکمرانی ذرّے ذرّے پر قائم ہے اور اس کی مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا، اسی طرح یہ بھی کہ اس مطلق ومختار خدا نے انسان کو اپنے عمل میں ارادہ واختیار کی آزادی عطا کی ہے اور اس آزادی کی وجہ سے انسان اپنے عمل کا ذمہ دار اور اس کے لیے جواب دہ قرار پاتا ہے۔ انسان کی یہی آزادی ہے جس کے سبب وہ اچھے کاموں پر تعریف اور جزا کا مستحق قرار پاتا ہے اور اسی کی وجہ سے برے کاموں پر اسے ملامت کی جاتی اور سزا دی جاتی ہے اور اسی جواب دہی اور ذمہ داری کے تقاضے کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے رسول اور کتابیں بھیجیں۔

اسلام کی کتاب ہدایت قرآن مجید اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا اسوۂ حسنہ ایک ایک کر کے پڑھتے اور ملاحظہ کرتے جائیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انسان کو عطا کردہ ارادہ واختیار کی آزادی دونوں سچائیوں کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور ایک ایسی روشن راہ اعتدال ابھر کر سامنے آتی ہے جس میں نہ تو کامل جبر ہے اور نہ اختیار کلی۔ قرآن مجید ایک طرف یہ واضح کرتا ہے کہ ''اللہ کی اجازت کے بغیر ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا'' تو دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ''ہر جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہے''۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں ہے، اس کا اختیار لامحدود ہے اور اس کی مرضی اور مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود خود اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی عطا کی ہے اور یہی آزادی دے کر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذمہ دار اور جواب دہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون وشریعت میں انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی جس میں کہ اس کا ارادہ اور نیت شامل نہ ہو۔ اللہ کے رسولؐ کا روشن ارشاد ہے ''انما الاعمال بالنیات'' (انسانی کاموں کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔ قرآن مجید کے ذریعہ دکھائی جانے والی اگر یہ روشن ہدایت نظروں میں ہو تو کوئی بھی ذہن جبر وقدر اور پھر تقدیر کی بھول بھلیوں میں نہ بھٹکے کیونکہ اس کے مطابق نہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار میں کسی قسم کی کوئی کمی آتی ہے اور نہ ہی انسان مجبور محض ہے۔ اللہ کو قدرت حاصل ہے وہ جب چاہے اپنی عطا کردہ ارادہ واختیار کی آزادی انسان سے سلب کر لے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ انسان کو عمل کی آزادی دی تاکہ وہ اپنی جنت بھی خود ہی بنائے اور جہنم میں جائے تو اپنے کرتوتوں کے بدلے جائے۔

5.7 عقیدہ تقدیر کا اثر انسانی زندگی پر

تقدیر کے حوالے سے مختلف نقاط نظر کو سمجھنے اور جان لینے کے بعد اس عقیدے کے اثرات کو انسانی زندگی پر بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا سماج اور معاشرہ جو جبر کا قائل ہو اور جس کے افراد خود کو خدا کی قدرت کے ہاتھوں مجبور محض سمجھتے ہوں۔ وہ تقدیر کا بہانہ بنا کر عمل، تخلیق اور حوصلہ مندی جیسی صلاحیتوں سے خود کو دھیرے دھیرے عاری کر لیتا ہے اور پھر وہ معاشرہ زوال کے

راستے پر ہی نہیں چل پڑتا بلکہ زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس معاشرے کے افراد کے اندر خواہ کتنی ہی اور کیسی ہی صلاحیتیں کیوں نہ موجود ہوں، رفتہ رفتہ ان میں زنگ لگ جاتا ہے۔ چونکہ ایسے سماج میں عمل کی رفتار رک جاتی ہے اور لوگ بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے اس معاشرے میں بارآوری اور تخلیق کا عمل بھی رک جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو پھر اس معاشرے سے حوصلہ مندی کی صفت بھی ختم ہو جاتی ہے اور جب حوصلہ مندی جاتی رہی تو پھر محرومی اور محکومی سے اس معاشرے کو دنیا کی کوئی بھی قوت نہیں بچا سکتی۔ اسی طرح جس معاشرے اور اس کے افراد میں قدر کا عقیدہ اپنی جڑیں گہری بنا لیتا ہے، اس کے افراد اپنے آپ کو کلی طور پر با اختیار سمجھنے لگتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اسے وہی کرتے ہیں، خدا کی ذات ایک شئ معطل ہے جس نے کائنات کے اس پورے کارخانے کو بنا کر خود کو اس سے الگ کر لیا ہے اور اب بیٹھا آرام کر رہا ہے۔ جو معاشرہ اور اس کے افراد اپنے عمل کو ہی سب کچھ سمجھنے لگیں وہ بھی زیادہ دیر کامیابی اور ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کیونکہ جن کا صرف اپنے عمل اور ظاہر اسباب پر یقین ہوتا ہے انہیں بہت معمولی ناکامی بھی بہت جلد دل برداشتہ کر دیتی ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اگر اس میں کامیابی نہیں ملتی تو دل برداشتہ اور مایوس ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ان میں خودکشی کا رجحان بھی بڑھنے لگتا ہے۔

اسلام کا پیش کردہ عقیدہ تقدیر متوازن اور مکمل ہے۔ اس میں قدرت کاملہ صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے اور اسی نے اپنی حکمت سے انسان کو ایک محدود دائرے میں ارادہ وعمل کی آزادی عطا کی ہے۔ تقدیر کا یہ عقیدہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ خدا پر چھوڑ کر نہ بیٹھ رہے بلکہ اپنی حد تک اسے عمل کی جو آزادی ملی ہوئی ہے اسے پوری طرح انجام دے اور نتیجۂ کار کو اللہ کی ذات پر چھوڑ دے۔ اس کی مثال اس کسان کی سی ہے جو کھیت میں ہل چلا کر بیج ڈال دیتا ہے اب اس بیج کو بارآور کرنا اللہ کا کام ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی سماج نہ تو بالکل معطل بیٹھ رہتا ہے اور نہ ہی مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ اس میں حوصلہ مندی ہوتی ہے وہ ناکامیوں سے گھبراتا نہیں بلکہ اگر اسے کسی کام میں ناکامی ہوتی ہے تو اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہے اور اس طرح تعمیر وترقی کا کام اس سماج میں مسلسل جاری رہتا ہے۔

5.8 خلاصہ

تقدیر ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں اللہ عالم الغیب نے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں اپنے علم کی بنیاد پر ایک فیصلہ کر دیا ہے' اب کائنات کا کارخانہ اسی فیصلے کے مطابق جاری ہے، اس فیصلے میں کسی تغیر یا تبدیلی کا امکان نہیں۔ البتہ اپنی مخلوقات میں سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرے میں ارادہ وعمل کی آزادی دی ہے اور اسی ارادہ وعمل کی آزادی کی وجہ سے اللہ نے انسان کو جواب دہ بنایا ہے اور اسی بنیاد پر انسانی عمل کا جائزہ لیا جائے گا، حساب کتاب ہوگا اور عمل کے مطابق اچھا یا برا بدلہ بھی ملے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انسان کی جواب دہی انہیں اعمال میں ہے جن کا کہ اختیار اسے حاصل ہے۔ جو کام انسان کے اختیار میں نہیں اور جن میں اس کا ارادہ شامل نہیں، ان پر جواب دہی بھی نہیں ہے۔ عقیدہ تقدیر کے حوالے سے دنیا کے مختلف مذاہب بے اعتدالی کا شکار ہوئے ہیں کچھ نے انسان کو خدا کی قدرت کاملہ کے آگے بالکل مجبور اور بے بس قرار دیا اور اس سے ارادہ وعمل کی آزادی چھین لی نتیجے میں ''جبر'' کا شکار ہوئے' جب کہ کچھ دوسرے مذاہب نے انسان کو ہی اختیار کلی عطا کر دیا اور خدا سے اختیار و اقتدار کی نفی کی یہاں تک کہ ''قدر'' کا شکار ہوئے۔ اسلام نے ایک شاہراہ اعتدال قائم کی' اس کے مطابق قدرت کاملہ اللہ کو حاصل

ہے اور اسی نے اپنی قدرت سے انسان کو ایک محدود دائرے میں ارادہ وعمل کی آزادی دی ہے۔ اب انسان اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چاہے تو اپنے لیے جنت تعمیر کرے یا خود کو جہنم کا ایندھن بنا لے۔ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے عقیدۂ تقدیر پر ایمان لانے کے لیے جس شدت کے ساتھ تلقین فرمائی ہے، اسی شدت کے ساتھ اس میں بحث ومناقشہ سے منع بھی فرمایا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم تقدیر پر ایمان لاتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرتے رہیں، کج بحثیوں میں پڑنے کے بجائے نتائج کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دیں۔ یہی حضرت محمدؐ کی تعلیم ہے اور اسی پر ایمان کی تعلیم دی گئی ہے۔

5.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1. تقدیر کے معنی ومفہوم سے بحث کیجیے۔
2. تقدیر کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کیجیے۔
3. انسانی زندگی پر عقیدہ تقدیر کے اثر کا جائزہ لیجیے۔

5.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر/ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

بلاک:2 عبادات

فہرست

اکائی نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
6.	نماز	109-131
7.	روزہ	132-147
8.	زکاۃ	148-163
9.	حج	164-179
10.	جہاد	180-190

اکائی 6 : نماز

اکائی کے اجزاء

6.1 مقصد

6.2 تمہید

6.3 نماز کا تعارف

6.3.1 نماز کی اہمیت

6.3.2 حقیقت نماز

6.3.3 نماز کی فرضیت

6.3.4 نماز کے مصالح وفوائد

6.3.5 پابندی وقت

6.3.6 فرض شناسی

6.3.7 مشکل اوقات میں ذریعہ امداد الٰہی

6.3.8 برائیوں کے خلاف ڈھال

6.3.9 نیکیوں کی قبولیت کا ذریعہ

6.4 طہارت جسمانی

6.5 اجتماعیت

6.6 روحانیت

6.7 طریقہ نماز

6.8 جمعہ

6.9 عیدین

6.10 قیام اللیل

6.11 خلاصہ

6.12 نمونے کے امتحانی سوالات

6.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

6.1 مقصد

نماز کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عماد الدین یعنی دین کا ستون کہا ہے۔ اسلام کی عمارت نماز پر قائم ہے۔ اس اکائی میں نماز کی اہمیت، معنویت اور طریقہ نماز طلبہ کو بتایا جائے گا تا کہ وہ اسلام کی اس اہم ترین عبادت سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔ اور نماز کے طریقہ اور نماز کی اقسام سے بھی ان کو آگاہی مل سکے۔ فرض، سنت اور نفل نمازوں کا فرق معلوم ہو جائے اور ہر قسم کی نماز کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں۔

6.2 تمہید

نماز اسلام کی پہلی عملی عبادت ہے جو انسان اپنے عمل سے ادا کرتا ہے دوسرے الفاظ میں نماز خالص بدنی عبادت ہے۔ نماز ایک دن اور رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے اور یہ ایسی عبادت ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہر بالغ اور عاقل مسلمان کے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اور پابندی وقت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہے۔

6.3 نماز کا تعارف

نماز کے لئے عربی زبان میں لفظ صلوٰۃ استعمال ہوا ہے، صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا کے آتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ: 103)

''اور انہیں دعائیں دیجئے کہ آپ کی دعا ان کے لئے تسکین قلب کا باعث ہو گی''

حدیث میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے۔

صلوا علیہ و سلموا تسلیما.

درود بھیجو اس پر اور سلامتی۔

بعض علماء نے اس کے اور معنی بھی بیان کئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا قرب حاصل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ اپنے لغوی معنی یعنی دعا اور اصطلاحی معنی یعنی نماز دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے، اصطلاح شریعت میں نماز ایک مخصوص طریقہ عبادت ہے جس میں قیام، رکوع اور سجود شامل ہیں۔

6.3.1 نماز کی اہمیت

اسلام میں نماز فرض ہے اور تمام فرائض میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا ہی حساب ہوگا، اور قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نماز ترک کرنا شرک کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ(الروم: 31)

''اور نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ''۔

قرآن مجید کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں واضح طور پر نماز پڑھنے، نماز کے فرض ہونے اور نماز کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے اور بہت سی آیات میں یہ بیان بھی وارد ہوا ہے کہ جن کو دنیا و آخرت میں کوئی عذاب دیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نمازوں کو چھوڑ دیا تھا، ایک آیت میں ہے۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِيْنَ (البقرة 238)

''پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی''۔

ایک آیت میں ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَاباً مَّوْقُوتاً (النساء 103)

''بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے''۔

ایک جگہ اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ، 132)

''اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس کے پابند رہو''۔

ایک جگہ دنیا میں ناکام لوگوں کے ضمن میں آیا ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم: 59)

''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشیں ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور وہ خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے''۔

ایک جگہ جہنمیوں سے یہ پوچھے جانے کا ذکر ہے کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے پہنچایا تو وہ پہلی بات یہی کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ . قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (المدثر:.43-42)

''کسی چیز نے تم کو پہنچایا جہنم میں وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے''۔

قرآن مجید میں نماز کے دنیاوی فوائد بھی بیان کئے گئے۔ایک آیت میں ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ (العنكبوت: 45)

''بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے''۔

ایک جگہ کامیابی کا وسیلہ نماز کو بتایا گیا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (اعلی 15-14)

''کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی''۔

ایک اور آیت میں ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً . إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً . وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعاً .إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ . الَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (المعارج: 23-19)

''بے شک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا اٹھتا ہے۔اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو وہ بخل کرنے لگتا ہے۔مگر وہ نمازی۔جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں''۔

ایک آیت میں نماز کو گناہوں سے پاک کرنے کا وسیلہ بتایا گیا۔

وَأَقِمِ الصَّلاَةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلذَّاكِرِيْن (سوره هود. 114)

''اے پیغمبر آپ دن کے دونوں حصوں میں اور رات گئے نماز قائم کریں کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں۔یہ ذکر خداوندی کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے''۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نماز اور صبر کو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

يا ايها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوة (البقره: 153)

''اے ایمان والو تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو''۔

احادیث میں بھی نماز کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ایک روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ایک روایت میں ہے کہ کفر اور انسان کے درمیان حد فاصل نماز ہے۔(مسلم) ایک روایت میں آیا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص نہر کے کنارے رہتا ہو اور روزانہ پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرتا ہو تو جس طرح اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہتا اسی طرح پانچ وقت کی نماز انسان کو گناہوں کے میل کچیل سے پاک کردیتی ہے۔(بخاری) ایک روایت میں آیا ہے کہ جو مسلمان دو نمازوں کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے تو وہ نمازیں درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتی ہیں۔(بخاری و مسلم) ان احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات میں نماز کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

6.3.2 حقیقت نماز

نماز دراصل عبادت کا اعلیٰ ترین مقام ہے، یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک رابطہ اور وسیلہ ہے۔ تزکیہ وطہارت کا ذریعہ ہے اور خدا کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

إِنَّنِیْ أَنَا اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِیْ (طٰہٰ : 14)

''میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو''۔

اور ایک جگہ آیا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى . وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى . (الاعلیٰ: 15-14)

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔ اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ نماز اللہ کا ذکر کرنے اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے اور قرآن پڑھنے کا نام ہے، اس لئے نماز کو مومنین کی معراج کہا گیا ہے۔ نماز گویا خدا کے ساتھ انسان کا مکالمہ ہے۔ نماز ایک دعا ہے جس میں بندہ اپنے رب کی مدد طلب کرتا ہے اور صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی دعا کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ کے فضائل میں ہے کہ بندہ جب نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ رب العزت اس کے ہر جملہ کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ گویا وہ خدا کے سامنے کھڑا ہوکر اپنی عرض داشت رکھتا ہے اور خدا کے حضور سے اس کو فوراً جواب ملتا ہے

نماز سراپا دعا ہے۔ اور دعا کی بابت حدیث شریف میں آیا ہے کہ۔ الدعاء مخ العبادۃ ۔ (ابوداؤد) (دعا عبادت کا مغز ہے) یعنی نماز کی اصل روح دعا ہے۔ اپنے تمام کاموں اور خاص طور پر ہدایت کے لئے دعا۔ اس یقین اور امید کے ساتھ کہ ہماری دعا رب العزت ضرور قبول فرمائے گا۔ وہ جو چاہتا ہے وہ ہر حال میں پورا ہوتا ہے اور جو نہ کرنا چاہے ساری کائنات مل کر بھی اس کو نہیں کرسکتی۔ اس لئے جو مانگنا ہے اسی سے مانگو چاہے اس دنیا میں سیدھے راستہ پر چلنے کی ہدایت ہو یا دنیا کی کوئی دنیاوی ضرورت، سب اس کے دربار میں پیش کرنا چاہیے' اور اس امید پر پیش کرنا چاہئے کہ انشاء اللہ ہم نے جو مانگا ہے وہ ہمارا رب ہم کو ضرور عطا فرمائے گا، چونکہ خود اسی کا فرمان ہے کہ جو کچھ تم نے مانگا ہم نے تم کو عطا کیا (ابراہیم: 34)۔

نماز دراصل زندگی کا مختصر نمونہ ہے۔ انسان کو اپنی پوری زندگی کو اس نمونہ پر ڈھالنا چاہیے جو وہ روزانہ پانچ مرتبہ ادا کرتا ہے۔ جس طرح نماز کے تمام حرکات وسکنات اور اعمال ایک خاص نظام کے تحت انجام دئے جاتے ہیں کہ کب کھڑا ہونا ہے، کب بیٹھنا ہے، کب جھکنا ہے، کب کیا کرنا ہے اور کب کیا مانگنا ہے ٹھیک اسی طرح انسان کی زندگی ہونی چاہئے۔

نماز کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ نماز خدا کا ذکر ہے۔ خدا نے نماز کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ **اقم الصلوۃ لذکری** (طٰ:14) (میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو) قرآن میں متعدد جگہ نماز کو ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں ہے:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوا إِذَا نُـودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ

(الجمعہ: 9)

اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے چلو۔

نماز ذکر الٰہی ہے اور نماز کی مشروعیت جن اوقات میں ہے ان میں بھی یہ پہلو محسوس ہوتا ہے کہ عین وقت غفلت میں نماز انسان کو خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ لذت خواب سحر کی غفلت میں فجر کی نماز، دوپہر ڈھلے تھکان اور غفلت میں ظہر کی نماز، بازار اور کاروبار حیات کی مصروف گھڑیوں میں عصر کی نماز، رات کے آغاز میں مغرب اور جب نیند کا خمار پلکوں کو بوجھل کرنے لگے اس وقت عشاء کی نماز۔ گویا ذکر الٰہی جو ہر وقت مطلوب ہے اس کا ایک طریقہ نماز ہے، نماز ہمیں عبدیت کا احساس دلاتی ہے اور اس بات کی یاددہانی کراتی ہے کہ ہم رب العالمین کے بندے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی میں اس کی اطاعت کرنی ہے۔

6.3.3 نماز کی فرضیت

نماز اسلام میں بنیادی فریضہ ہے اور یہ فریضہ اسلام سے پہلے کی امتوں پر بھی رہا ہے۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے اور قرآن مجید سے تصدیق ہوتی ہے کہ پہلے انبیاء کی امتوں پر بھی نماز فرض تھی حضرت ابراہیم کی دعا ہے کہ اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا بنا (ابراہیم 65) حضرت اسماعیل کے بارے میں ہے کہ ''وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے'' (مریم۔ 55) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ''اے میرے بیٹے نماز قائم کر'' (لقمان 17)۔ اور بہت سے انبیاء کے سلسلے میں نماز پڑھنے کا تذکرہ آیا ہے۔ احادیث و روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام بالکل شروع سے ہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ نماز پڑھنے کا طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل نے سکھایا تھا۔ (ابوداؤد) پانچ وقت کی فرض نمازوں کی باضابطہ فرضیت ہجرت نبویؐ سے دو یا تین سال قبل واقعہ معراج کے موقع پر ہوئی تھی جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی کی روایات میں واضح طور پر مذکور ہے۔

6.3.4 نماز کے مصالح و فوائد

نماز اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔ یہ ہر بالغ و عاقل مسلمان پر دن و رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ نماز کے اوقات مقرر ہیں اور ان ہی اوقات مقررہ پر نماز کا پڑھنا ضروری ہے۔ نماز کسی بھی حالت میں معاف نہیں ہے، اگر انسان کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر پڑھے، یہ بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھے۔ اگر وضو پر قدرت نہ ہو تو تیمّم کر کے پڑھے۔ لیکن نماز کسی بھی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہر حالت میں اسے ادا کرنا ضروری ہے۔

نماز کی اتنی اہمیت اور فضیلت دراصل اس لیے ہے کہ نماز وہ بنیادی رکن ہے جو انسان کی یومیہ زندگی کی عبادت ہے، اس لیے نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ نماز عبدیت کا کامل اظہار ہے اور ایک مسلمان کی زندگی کو بقیہ لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ نماز دین کا عملی اظہار ہے۔ نماز تذکیر الٰہی اور استحضار حکم خداوندی کا سب سے معتبر ذریعہ ہے۔ نماز سے انسانوں کے لئے دنیاوی فائدے بھی

بہت ہیں۔نماز سے انسان کی زندگی بامعنی ہوجاتی ہے۔نماز ایک تربیتی کورس ہے جو زندگی کو صحیح رخ پر ڈھال دیتا ہے۔نماز کے چند اہم فوائد حسب ذیل ہیں:

6.3.5 پابندی وقت

نماز پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَاباً مَّوْقُوتاً(النساء : 103)

''بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے''۔

ایک جگہ آیا ہے:

أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل: 78)

''نماز قائم کرو سورج کے زوال سے لے کررات کی تاریکی تک اور پڑھنا قرآن کا فجر کے وقت''۔

ایک آیت میں ہے:

حَافِظُواْ عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاَةِ الْوُسْطَى (البقرہ :238)

''پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی''۔

تین نمازوں کا تذکرہ قرآن مجید میں وقت کی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

مِن قَبْلِ صَلاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلاةِ الْعِشَاء ثَلاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ (النور :58)

''نماز فجر سے پہلے اور جس وقت تم گرمی کی وجہ سے اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد، یہی تین وقت تمہارے لیے پردے کے ہیں''۔

نمازوں کو وقت پر پڑھنے،نمازوں کی حفاظت کرنے اور بیچ کی نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنے سے انسان کے اندر وقت کی تنظیم کا عملی احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے کاموں کو اس طرح منظّم کرتا ہے کہ نماز کے لئے مقررہ وقت اس کے پاس بالکل فارغ ہو۔نماز انسان کو وقت کی صحیح قدرو قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور کاموں کے لئے اچھے آغاز کا سلسلہ بنتی ہے۔

6.3.6 فرض شناسی

نماز انسان کے اندر اپنے فرائض کو انجام دینے کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔انسان کے اوپر سب سے بڑا فرض نماز ہے۔جو شخص نماز میں غفلت کرے گا وہ کسی بھی ذمہ داری میں کبھی بھی غفلت یا بے پروائی کرسکتا ہے۔اور جو شخص نماز وقت پر ادا کرے گا، اس کی تربیت اس طرح ہوگی کہ وہ تمام کاموں کو ان کی مطلوبہ ترجیح کے مطابق صحیح طرح انجام دے سکے۔نماز میں کاہلی یا سستی کرنے والوں پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ منافقین کی علامت بتائی گئی ہے:

وَإِذَا قَامُواْ إِلَى الصَّلاَةِ قَامُواْ كُسَالَى(النساء : 142)

''اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی سے اٹھتے ہیں''۔

قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے:

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ (البقرہ :45)

''اور نماز بھاری چیز ہے مگران پر جو خشوع وخضوع کرتے ہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک بھاری ذمہ داری ہے، اس کو وہی شخص ادا کرے گا جس کو اپنی ذمہ داری کے ادا کرنے کا احساس اعلی درجہ کا ہوگا، گویا نماز انسان کو فرض شناس بناتی ہے۔

6.3.7 مشکل اوقات میں ذریعہ امداد الٰہی

انسان کے اوپر بسا اوقات مشکلات آجاتی ہیں اور بعض لوگ ان مشکلات میں پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ نماز ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی طرف سے انعام اور عطیہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

وَاسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ (البقرہ :45)

''اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعے اور بے شک وہ بھاری ہے مگران کے لئے جو خشوع کرتے ہیں''۔

یعنی نماز اور صبر اللہ تعالی کی مدد کا ذریعہ ہیں۔ ہر وقت کی نماز میں ہر شخص اس کا اثبات کرتا ہے کہ ہم صرف خدا سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ مشکلات میں نماز ایک ذریعہ امداد الٰہی ہے۔ اللہ کے رسول پر جب کوئی مشکل پیش آتی تو آپ ؐ نماز پڑھا کرتے تھے، قرآن مجید میں ایک اور جگہ انسان کی بشری کمزوریوں یعنی مصائب پر گھبرا جانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان مواقع پر نماز پڑھنے والے ثابت قدم رہتے ہیں۔ (المعارج:22)

6.3.8 برائیوں کے خلاف ڈھال

نماز برائیوں اور منکرات کے مقابلے میں انسان کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ (العنکبوت :45)

''اور نماز قائم کرو بے شک نماز فحش کاموں اور بری باتوں سے روکتی ہے''۔

نماز کے ذریعہ انسان کے اندر یہ صفت پیدا ہوتی ہے کہ وہ بے حیائی کے کاموں اور منکرات سے رکتا ہے۔ برے کاموں کے خلاف اس کے شعور و وجدان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بدی کے راستہ پر اس کے قدم لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ نماز انسان کے اندر نہ صرف برائیوں سے رکے رہنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے بلکہ برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دیتی ہے اور گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

6.3.9 نیکیوں کی قبولیت کا ذریعہ

نماز ایک ایسی عبادت ہے جو نہ صرف خود اہم عبادت ہے بلکہ دوسری عبادات کی قبولیت کا ذریعہ بھی ہے۔قرآن میں ہے:

وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلاَّ أَنَّهُمْ كَفَرُواْ بِاللّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلاَ يَأْتُونَ الصَّلاَةَ إِلاَّ وَهُمْ كُسَالَى وَلاَ يُنفِقُونَ إِلاَّ وَهُمْ كَارِهُونَ (التوبہ :54)

''ان کی خیر وخیرات کے مقبول ہونے سے اور کوئی چیز بجز اس کے مانع نہیں ہوئی کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ شرک کیا اور نماز نہیں پڑھتے مگر کاہلی سے اور نیک کام میں خرچ نہیں کرتے مگر گرانی سے''۔

نماز کے اور بھی بہت سے فوائد و مصالح ہیں۔نماز انسان کو صحت مند بناتی ہے۔اس کو سحر خیز بناتی ہے،انسان کے اندر اچھے خصائل پیدا کرتی ہے،عبدیت کا احساس زندہ رکھتی ہے۔اور نماز قرب خداوندی کا ذریعہ ہے جو انسان کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ استوار کرتی ہے اور آخرت کی مشکل ترین منزل میں انسان کے لیے سب سے اہم مددگار ہوتی ہے۔

6.4 طہارت جسمانی

نماز میں بندہ خدائے ذوالجلال کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔خدا کے دربار میں حاضری کے کچھ آداب وشرائط ہیں۔نماز سے پہلے ان کی تکمیل ضروری ہے۔اگر وہ شرائط پوری نہیں ہوں گی تو نماز ہی ادا نہیں ہوگی۔ان شرائط میں سب سے اہم چیز طہارت ہے۔طہارت مجموعی طور پر اسلام میں مطلوب ہے،لباس کی طہارت،جگہ کی طہارت،بدن کی طہارت اور قلب ونظر کی طہارت،لیکن ظاہری طہارت چونکہ آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے اس لئے اس کو نماز کے بنیادی ارکان میں شامل کیا گیا ہے۔

طہارت کا مطلب ہے بدن کا نجاستون سے پاک ہونا۔نجاست دوطرح کی ہوتی ہے۔ایک نجاست حقیقی دوسری نجاست حکمی۔نجاست حقیقی وہ ناپاکی ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے اور نجاست حکمی وہ ناپاکی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن شریعت نے اس کو نجاست قرار دیا ہے۔یعنی حالت جنابت یا حیض یا نفاس والی عورت۔نماز سے قبل دونوں طرح کی نجاست سے بدن کا پاک ہونا ضروری ہے۔

ناپاکی کے درجات کے اعتبار سے بھی اس کی دوقسمیں کی جاتی ہیں۔ایک حدث اصغر دوسری حدث اکبر۔حدث اصغر وہ ناپاکی ہے جس سے پاک ہونے کے لئے وضو کیا جاتا ہے۔اور حدث اکبر وہ ناپاکی ہے جو وضو سے دور نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے غسل کرنا ضروری ہے۔حدث اکبر مردوں اور عورتوں کے لئے حالت جنابت ہے اسی طرح عورتوں کے لئے حیض ونفاس سے پاک ہونے کے لئے بھی غسل کرنا ضروری ہے۔

حدث اصغر ہو تو اس کے لئے وضو کرنا ضروری ہے۔قرآن مجید میں نماز سے قبل وضو کرنے کا حکم واضح الفاظ میں دیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ(المائدہ: 6)

''اے ایمان والو، جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔''

حدث اکبر سے پاکی کے لئے غسل ضروری ہونے کا حکم بھی قرآن مجید میں واضح طور پر موجود ہے۔

وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُواْ (المائدہ: 6)

''اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کرلو''۔

حکمی نجاست کے علاوہ اگر بدن پر کوئی حقیقی نجاست ہو چاہے غلیظہ (گاڑھی) جیسے پاخانہ، پیشاب وغیرہ ہو یا خفیفہ (ہلکی) ہو جیسے حلال جانوروں کا پیشاب وغیرہ تو اس کا بدن سے دھونا، اور اگر کپڑوں پر ہو تو کپڑے کا دھونا بھی ضروری ہے۔جسم یا کپڑے کی نجاست بغیر پانی کے پاک نہیں ہوسکتی۔اس لئے پانی کے ذریعہ اس نجاست کا دھونا یا زائل کرنا ضروری ہے۔

نماز کے لئے وضو شرط ہے، وضو کا طریقہ اوپر مذکور آیت میں موجود ہے، اس میں وضو کے چار فرائض بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: 1. پورا چہرہ دھونا، 2. دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا، 3. سر کا مسح کرنا، 4. دونوں پیروں کو ٹخنوں تک دھونا۔ان کے علاوہ وضو میں 15 سنتیں ہیں۔

1. وضو کی نیت کرنا، 2. بسم اللہ کہنا، 3. دونوں ہاتھوں کا گٹوں تک دھونا، 4. کلی کرنا، 5. مسواک کرنا، 6. ناک میں پانی ڈالنا، 7. داڑھی میں خلال کرنا، 8. ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنا، 9. ہر عضو کو تین تین بار دھونا، 10. پورے سر کا مسح کرنا، 11. وضو میں بیان کردہ ترتیب کو قائم رکھنا، 12. دونوں کانوں کا مسح کرنا 13. تمام اعضاء کو پے در پے دھونا یعنی ایک عضو کے خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھولیا جائے، 14. پہلے دایاں پھر بایاں عضو دھونا، 15. ہر عضو کو دھوتے وقت ملنا۔

وضو کرنے کے بعد انسان اللہ کے دربار میں حاضری کے لائق ہوجاتا ہے، لیکن اگر وضو ٹوٹ جائے تو پھر دوبارہ وضو کرنا ضروری ہے۔وضو ٹوٹنے کے اسباب میں پاخانہ یا پیشاب کرنا یا ریح خارج ہونا، خون بہنا، چت لیٹ کر سونا، قے کرنا یا بحالت نماز زور سے ہنسنا شامل ہیں۔اگر ان میں سے کوئی عمل ہوگیا تو وضو ٹوٹ گیا، اب اس کو نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا ضروری ہے۔وضو نماز کے لئے اتنا ضروری ہے کہ اگر عین حالت نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو اس کے ساتھ ہی نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔اس لئے وضو کر کے اس نماز کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

جن باتوں سے وضو نہیں ٹوٹتا لیکن کسی کو شک ہوسکتا ہے کہ شاید ٹوٹ گیا ان میں سے بیٹھے بیٹھے جھپکی آجانا، بحالت نماز نیند کا جھونکا آجانا، بچے کو دودھ پلانا، آئینہ دیکھنا، کھانا کھلانا وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان سے فارغ ہوکر عبادت کی جاسکتی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔اور ایک وضو سے کسی وقت کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

وضوطہارت کا آسان اور مختصر ذریعہ ہے۔اگر حدث اکبر نہ ہوتو وہ اعضا جونماز میں سامنے ہوتے ہیں، ان کے دھونے کا نام وضو ہے۔وضو دراصل دربارِ خداوندی میں حاضری کی تیاری ہے، اللہ کے دربار میں پاک فرشتے ہوتے ہیں ان کے جلو میں اگر کوئی انسان خدا کے دربار میں حاضری دے رہا ہے تو اس کو ظاہری طور پر پاک فرشتوں سے کچھ مشابہت اختیار کرنا ضروری ہے۔اس لئے نماز کے لئے وضو کو فرض قرار دیا گیا تا کہ انسان اس احکم الحاکمین کے دربار میں جائے تو تیاری کر کے جائے۔اس کا بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، پاک جگہ کھڑا ہو، اور ہاتھ، منہ اور پیروں کو دھو کر جائے۔

طہارت کے لیے وضو اور غسل کے قائم مقام تیمّم ہے۔اگر پانی دستیاب نہ ہو یا کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، تو ایسی حالت میں طہارت حاصل کرنے کے لیے تیمّم ضروری ہے۔تیمّم کے لفظی معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔اور قرآن مجید میں تیمّم کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے۔

> وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مِّنكُم مِّن الْغَآئِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاء فَتَيَمَّمُواْ صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا (النساء: 43)
>
> (اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی اپنی ضرورت پوری کر کے آیا یا عورتوں سے صحبت کی ہو اور اس حالت میں تم کو پانی نہ ملے تو پھر پاک مٹی سے تیمّم کر لیا کرو۔(اس کا طریقہ یہ ہے) اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو مل لو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔)

تیمّم میں تین فرائض ہیں۔1. نیت کرنا، 2. دونوں ہاتھوں کو پاک مٹی پر مار کر اچھی طرح منہ پر پھیرنا اور 3. دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر دونوں ہاتھوں پر کہنیوں سمیت پھیرنا۔تیمّم مٹی یا مٹی کے قبیل کی کسی بھی چیز سے کیا جا سکتا ہے اور جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے، ساتھ ہی پانی پر قدرت حاصل ہو جانے سے بھی تیمّم ٹوٹ جاتا ہے۔وضو اور غسل دونوں کے تیمّم کا طریقہ ایک ہے۔

6.5 اجتماعیت

اسلام ایک معاشرتی مذہب ہے۔اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔دنیا سے کٹ جانے، غاروں اور جنگلوں میں ذکر و فکر کے اندر زندگی گزارنے کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔اسلام ایک اچھے انسانی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے، اس کے لئے لوگوں کا معاشرتی زندگی سے وابستہ رہنا اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اور معاشرے میں اچھائیوں کے فروغ کے لئے ہمہ وقت فکرمند رہنا اسلام میں پسندیدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کا پورا نظام معاشرتی بنیادوں پر استوار ہے۔نماز جو ایک عبادت ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کا تعلق ہے اسلام نے اس کو بھی معاشرتی زندگی سے وابستہ کیا ہے۔

اسلام میں ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، آیات کائنات میں غور وفکر اور تنہائی میں اپنے رب کے حضور مناجات کو پسند کیا گیا ہے، لیکن فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان نمازوں کے لئے باضابطہ ایک نظام اور ضابطہ بنایا گیا ہے، اور نمازوں کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز پڑھنا اور نماز قائم کرنا دونوں میں جوہری نوعیت کا فرق ہے نماز کا قیام معاشرتی عمل ہے، اس لئے نمازوں کے لئے مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، مساجد میں اذان واقامت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسلام میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز قائم کروں، ایک شخص کو امام بنادوں اور پھر کچھ لوگوں کو لے کر جنگل جاؤں، وہاں سے لکڑیاں لاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو جلادوں جو جماعت میں شریک نہیں ہوئے (بخاری)۔ ایک اور روایت میں جماعت کی فضیلت اس طرح آئی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں ستائیس گنا زیادہ ہے (بخاری)۔

حدیث شریف میں ایک جگہ آیا ہے کہ اپنی صفوں کو سیدھا اور برابر کرو، چونکہ صفوں کو سیدھا اور برابر کرنا اقامت صلوٰۃ کا جزء ہے (بخاری) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اگر کسی مقام پر تین آدمی ہوں اور جماعت کا اہتمام نہ ہوتا ہو تو شیطان ان پر قابو پالیتا ہے، اس لئے تم جماعت کا اہتمام کرو، کیونکہ بھیڑ یا اسی بھیڑ کو کھاتا ہے جو گلے سے دور ہو (ابوداؤد)۔

اوپر مذکور روایات سے بھی نماز باجماعت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، اور اس کے علاوہ یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ نماز کا باجماعت ادا کرنا ہی دراصل اقامت صلوٰۃ ہے۔ تنہا نماز پڑھی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی، لیکن نماز ایک اجتماعی عبادت ہے اس کے حقیقی فوائد اسی وقت حاصل ہوں گے جب وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق باجماعت ادا کی جائے گی، تنہا پڑھنے سے فرض کی تکمیل تو شاید ہو جائے گی لیکن اجتماعیت کے فوائد حاصل نہیں ہوں گے۔

نماز کی باجماعت تنظیم سے دراصل ایک پورا معاشرہ وجود میں آتا ہے، مؤذن کی اذان پر نماز کی تیاری شروع کی جاتی ہے، مکبر کی تکبیر پر لوگ اپنی صفوں کو درست کرنے لگتے ہیں، امام کے تکبیر تحریمہ کہنے پر نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں اور امام کے اتباع میں ارکان نماز ادا کر کے اپنے دائیں بائیں والوں کو سلامتی کی دعاء دیتے ہوئے نماز سے باہر آجاتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں نظم وضبط کا جو نمونہ نماز باجماعت کی شکل میں سامنے آتا ہے وہ بے مثال ہے۔ اگر اس کی روح اس معاشرے میں بیدار ہو جائے تو کسی بھی معاشرے کو وہ سربلندیاں یقیناً حاصل ہوں گی جو اس طریقہ پر عمل کر کے عربوں کو حاصل ہوئی تھیں۔

معاشرتی ضروریات اور تقاضوں کا اسلام نے نماز کے سلسلے میں بھی پورا اہتمام کیا ہے۔ اسی لئے جماعت کو واجب تو قرار دیا۔ لیکن اگر مرد اور عورت دونوں کے لئے نماز باجماعت ہوتی تو اس سے معاشرتی زندگی میں بعض دوسرے مسائل کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے مردوں کے لئے جماعت کا اہتمام کرنا واجب قرار دیا ہے اور عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ نمازیں مسجد میں جا کر ادا کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں، ورنہ وہ گھر میں ادا کریں ان کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

جماعت کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کرنا پورے معاشرے کو باہم متحد کر دیتا ہے لوگ روزانہ پانچ مرتبہ ملتے ہیں، مسجد جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے محلے کے احوال سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ضرورت مند ہو یا بیمار ہو تو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے، ایک دوسرے کی غمگساری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ آپس میں اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اپنے پڑوسی سے واقف

ہوجاتے ہیں۔ ورنہ آج کا متمدن معاشرہ چاہے انٹرنیٹ کے ذریعہ پوری دنیا سے جڑ گیا ہو لیکن پس دیوار کون بسا ہے اس کی خبر بھی نہیں رکھتا۔ ایسے معاشرے کے لئے نماز باجماعت کا اہتمام کسی تریاق سے کم نہیں۔

پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ ہفتہ میں ایک ایسی نماز یعنی جمعہ ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ شہر کی بڑی مسجد یا اگر شہر بڑا ہو تو چند مساجد میں ادا کی جاتی ہے اور اس میں ایک تقریر یا خطبہ نماز کا حصہ ہے۔ خطبہ اس لئے رکھا گیا تھا کہ شہر کی سب سے ذمہ دار شخصیت اس موقعہ پر مسلمانوں کو ایسی نصیحت کرے جو ان کی معاشرتی زندگی کو مضبوط اور بہتر بنانے میں معاون ہو، جمعہ کا دن مسلم معاشرہ میں اجتماعیت کے مظاہرہ کا ایک اعلی نمونہ ہے۔ جمعہ کے علاوہ عیدین کی نماز بھی اسلام کے اجتماعیت پسند مزاج کی بڑی نمائندگی کرتی ہیں۔

6.6 روحانیت

نماز ایک جامع عبادت ہے جس میں انسان کے تمام تقاضوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نماز ایک اجتماعی عبادت بھی ہے جس میں جماعت کو واجب قرار دیا ہے اور مساجد کے نظام کے ذریعہ اس کو قائم کیا گیا ہے، اور یہ انفرادی عبادت بھی ہے جو آخر شب کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور مناجات اور اذکار کی شکل میں راز و نیاز اور سرگوشی کے جلو میں ادا کی جاتی ہے۔ اس طرح نماز انسانوں کے تمام جسمانی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل ہے۔ وہ انسان کے اندر اجتماعیت کی روح بھی پیدا کرتی ہے اور انسان کے اندر روحانیت، للّٰہیت اور قلب ونظر کی بالیدگی بھی پیدا کرتی ہے۔ خاص طور پر نفل نمازوں کی پابندی انسان کی روحانی ترقی اور اس کے قلب ونظر کی بالیدگی کو پروان چڑھانے میں معاون ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس کے خلاف میری طرف سے اعلان جنگ ہے، میرا بندا میرا تقرب کسی دیگر عمل کے ذریعہ جو پسند ہو اتنا حاصل نہیں کرسکتا جتنا اس عمل سے حاصل کرسکتا ہے جو میں نے اس پر فرض کیا ہے، اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں گا اگر وہ میری پناہ میں آنا چاہے تو میں اسے اپنی پناہ میں لے لوں گا''۔ (بخاری)

حدیث میں نماز کے روحانی فوائد متعدد جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک روایت میں قیام لیل کے بارے میں آیا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ تم رات میں اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت ضرور کرو کیونکہ یہ تم سے پہلے کے صالحین کا طریقہ ہے اور تمہارے لئے قربت خداوندی کا ذریعہ ہے۔ برائیوں کے اثرات مٹانے والی ہے اور گناہ سے روکنے والی چیز ہے۔ (ترمذی)

دراصل نماز بندے کے اندر کامل عبدیت کا احساس پیدا کرتی ہے اور اس کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ استوار کرتی ہے۔ نماز کے بارے میں بعض احادیث میں آیا ہے کہ نماز مومنین کی معراج ہے۔ یعنی نماز کی حالت میں بندہ گویا خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز خدا اور بندے کے درمیان ایک مکالماتی کیفیت ہے۔ حدیث شریف میں ہے، حضرت

ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نماز نصف نصف تقسیم ہے۔ نصف نماز میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور میرے بندے کو وہی ملے گا جو وہ مانگے گا۔ جب بندہ الحمدلله رب العالمين کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی، اور جب وہ الرحمن الرحيم کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی، اور جب بندہ مالک يوم الدين کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، اور جب بندہ کہتا ہے اياک نعبد و اياک نستعين، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ میرے بندے کو وہ ملے گا جس کی اس نے درخواست کی ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے اهدِنَا الصِّرَاطَ الـمُستَقِيمَ. صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمْ غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِمْ وَلاَ الضَّالِّينَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور اس کو وہ چیز ملے گی جس کی اس نے درخواست کی۔ (مسلم)

اس لیے نماز کے لازمی اجزا کے طور پر خشوع وخضوع اور گریہ وزاری کو بیان کیا گیا ہے۔ جس نماز میں خشوع نہ ہو، جس میں قلب خدا کی طرف متوجہ نہ ہو، وہ نماز ناقص ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

قد افلح المومنون الذين هم فی صلاتهم خاشعون (مومنون : 20)

وہ مومن کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

نماز میں خشوع وخضوع کا تذکرہ قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ اور احادیث میں بکثرت آیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ جب شب کی تنہائیوں میں نماز ادا فرماتے تو رقت اور خضوع کی وجہ سے آپؐ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے کوئی ہانڈی ابل رہی ہو۔ خشوع وخضوع قلب وروح کا عمل ہے، اعضاء وجوارح کا نہیں ہے۔ نماز کے ارکان کی ادائیگی اس کے لیے جسم کا درجہ رکھتی ہے اور وہ روح کا۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''نماز دو دو رکعات کر کے ہے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے، خشوع و خضوع ہے، عاجزی ومسکنت ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔ (ابوداؤد)

نماز اس احکم الحاکمین کے دربار کی حاضری ہے۔ اگرچہ تمام عبادتوں کے لیے حکم یہی ہے کہ عبادت اس طرح کرنی چاہیے گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے اس لیے کہ اگر بندہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بندہ کو دیکھ رہا ہے۔ (بخاری) نماز کی یہ روحانی کیفیت انسان کے اندر وہ مطلوبہ صفات پیدا کرے گی جن کا تذکرہ قرآن میں نماز کے ساتھ وابستہ ہے اور روایات میں بھی ان کا تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً نماز کے ذریعہ انسان کا تزکیہ ہوتا ہے۔ (فاطر: 18) نماز سے انسان کے اندر جلد بازی کی عادت ختم ہوجاتی ہے۔ بخل سے نجات ملتی ہے۔ اور عزم وحوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ (معارج: 23-19) نماز برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتی ہے۔ (ہود: 110) نماز فحش ومنکرات سے روکتی ہے۔ (عنکبوت: 54) ایک روایت میں آتا ہے کہ اگر کسی کی نماز اس کو فواحش ومنکرات سے نہ روکے تو اس کی نماز ہوتی ہی نہیں۔ اس لیے کہ نماز کی جو مطلوب روحانی کیفیت ہے اس کی تکمیل کے بغیر محض ظاہری رسوم کی پابندی کافی نہیں ہے۔ بلکہ نماز ایک عمل ہے جو انسان کی زندگی میں اسی طرح زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے جس طرح جسم انسانی میں روح زندگی پیدا کرتی ہے۔ حیات انسانی کی دلیل اس کی روح ہے اور حیات دین کی روح نماز ہے۔

بعض دوسری روایات بھی ہیں جن میں نماز کو مناجات اور رب اور بندے کے درمیان سرگوشی بتایا گیا ہے۔ دراصل نماز کا روحانی پہلو یہ ہے کہ نماز کے اندر بندہ خدا کے قریب ہوکر براہ راست اس سے امداد طلب کرتا ہے۔ پاکیزگی کے ذریعہ اپنے آپ کو منزہ اور پاکیزہ بناتا ہے اور وہ ایسے محفوظ حصار کی پناہ میں آجاتا ہے جہاں اس پر شیطان کا کوئی زور نہیں چلتا۔

6.7 طریقہ نماز

نماز ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے اور پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ یعنی دن ورات میں پانچ اوقات ہیں جن میں نماز پڑھنا فرض ہے اور ان اوقات کے نام پر ہی ان نمازوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ فجر کی نماز جس کا وقت صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ہے اس میں دو رکعت نماز فرض ہے۔ ظہر کی نماز جس کا وقت سورج کے ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے اور ہر چیز کے سایہ کے دوگنے ہونے تک رہتا ہے اس میں چار رکعات فرض ہیں۔ اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہوتا ہے جو غروب آفتاب تک رہتا ہے اس میں بھی چار رکعت فرض ہیں۔ غروب آفتاب سے لے شفق کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت رہتا ہے۔ اس میں تین رکعات فرض ہیں۔ اور ایک پہر رات گزرنے کے بعد سے عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے جو صبح صادق تک رہتا ہے اس میں چار رکعات فرض ہیں اور اس میں تین رکعات واجب بھی ہیں یعنی وتر۔ ان پانچوں اوقات میں فرض نمازوں کے علاوہ سنت ونوافل بھی ہیں جو کچھ نمازوں میں فرض سے پہلے اور کچھ نمازوں میں فرض کے پہلے اور بعد پڑھے جاتے ہیں۔

نماز پڑھنے کے لئے اسلام میں کچھ شرائط ہیں، کچھ شرائط کا تعلق نماز کی تیاری سے ہے اور کچھ کا تعلق نماز کی ادائیگی سے ہے۔ نماز کی تیاری سے متعلق 7 شرائط ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔

1. بدن کا پاک ہونا 2. لباس کا پاک ہونا 3. جگہ کا پاک ہونا 4. نماز کا وقت ہونا 5. قبلہ کی طرف رخ کرنا 6. ستر کا چھپانا 7. نیت کرنا

ان کے علاوہ 6 فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق نماز کی ادائیگی سے ہے۔

1. تکبیر تحریمہ کہنا 2. قرآن کا کوئی حصہ پڑھنا 3. قیام کرنا 4. رکوع کرنا 5. سجدہ کرنا 6. آخری قعدہ میں بیٹھ کر تشہد پڑھنا

نماز میں ان فرائض کے علاوہ کچھ واجبات ہیں اور کچھ سنن ومستحبات ہیں۔ اگر فرائض میں سے کوئی فرض چھوٹ گیا تو نماز دوہرانی پڑے گی۔ البتہ اگر کوئی واجب چھوٹ جاتا ہے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز مکمل ہو جائے گی، نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

نماز کا طریقہ یہ ہے کہ جب نماز سے پہلے کی شرائط مکمل ہو جائیں۔ تو اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں کی لو تک اٹھائیں پھر ہاتھ باندھ لیں۔ گویا یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دنیا کی تمام مصروفیات کو ترک کر کے دست بستہ رب العالمین کے حضور کھڑے ہیں۔ اس کے بعد ثناء پڑھیں۔

سبحنک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الٰہ غیرک

اے اللہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری تعریف کے ساتھ اور تیرا نام بڑی برکت والا ہے اور تیری بزرگی سب سے بلند و بالا ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

پھر تعوذ پڑھیں :اَعُوذُ با اللّٰہ من الشیطٰنِ الرّجیم ۔خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود سے ۔ پھر بسملہ پڑھیں : بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جونہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔ پھر حمد سورہ فاتحہ پڑھیں :اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ساری تعریف خدا کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۔الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔نہایت رحمت والا بڑا مہربان ہے ۔مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ بدلے کے دن کا مالک ہے ۔(جس میں اعمال کا فیصلہ کیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پھل ملے گا)۔اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں ۔اھدِنَا الصِّرَاطَ الْمُستَقِیْمَ ۔ہم کو سیدھا راستہ دکھا ۔صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمتَ عَلَیْھِمْ ۔ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا اور انعام فرمایا ۔غَیْرِ المَغضُوبِ عَلَیْھِمْ وَلاَ الضَّالِّیْنَ ۔جن پر تیرا غضب نازل نہیں ہوا اور جو بھٹکے ہوئے لوگ نہیں ہیں ۔

پھر امام اور مقتدی کہیں ۔ آمین ۔خدایا ایسا ہی ہو ۔ مالک ہماری اس دعا کو قبول فرما ۔

اس کے بعد قرآن کی چند آیتیں یا کوئی سورہ پڑھی جاتی ہے ۔

اس کے بعد رکوع کریں اور اللہ اکبر کہتے ہوئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے مالک کے آگے جھکیں اور یہ تسبیح تین مرتبہ پڑھیں :

سبحانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ ۔ پاک ہے میرا پروردگار جو بڑا بزرگ ہے ۔

اس کے بعد سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے کہیں ۔سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ ۔اللہ نے سن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف بیان کی ۔

اس کے بعد سجدہ کریں یعنی اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں جائیں اور تین مرتبہ یہ تسبیح پڑھیں ۔

سبحان رَبِّیَ الْاَعْلٰی ۔ پاک ہے میرا پروردگار جو سب سے بالا و برتر ہے ۔

سجدے دو ہیں پہلے سجدے کی تسبیح کے بعد اللہ اکبر کہہ کر بیٹھ جائیں اور کچھ وقفہ کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے دوبارہ سجدے میں جائیں اور تسبیح پڑھیں ۔

پہلی رکعت کے دو سجدوں کے بعد کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسری رکعت میں دو سجدوں کے بعد التحیات پڑھتے ہیں ۔

التحیات یہ ہے :

التحیات للہ والصلوات والطیبات ، السلام علیک ایھا النبی ورحمة الله و برکاته ، السلام علینا و علی عباد الله الصالحین ، اشھد ان لا اله الا الله و اشھد ان محمدا عبده و رسوله.

ہماری سلامیاں ، ہماری نمازیں اور ساری پاکیزہ باتیں اللہ کے لیے ہیں ۔ سلام آپ پر اے نبیؐ اور اللہ کی رحمت اور برکتیں ۔سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں ۔

یہ شہادت دیتے وقت شہادت کی انگلی اٹھائی جاتی ہے ۔

آخری رکعت میں اس کے بعد درود شریف پڑھی جاتی ہے۔

درود شریف یہ ہے:

اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید. اللھم بارک علی محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید.

خدایا رحمت فرما محمدؐ اوران کی آل پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر۔ یقیناً تو بہترین صفات والا اور بزرگ ہے۔ اور خدایا برکت نازل فرما محمدؐ اوران کی آل پر جس طرح تو نے برکت نازل فرمائی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر، یقیناً تو بہترین صفات والا اور بزرگ ہے۔

یہ درود پڑھنے کے بعد اللہ سے دعا کی جاتی ہے۔ روایات میں متعدد دعائیں منقول ہیں، ایک دعا یہ ہے۔

اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا و لا یغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرۃ من عندک و ارحمنی انک انت الغفور الرحیم.

اے اللہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کر سکے۔ پس تو مجھ کو معاف کر دے خالص اپنی طرف سے اور مجھ پر رحم فرما بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسری معروف دعا یہ ہے:

اللھم انی اعوذبک من عذاب جھنم، و اعوذبک من عذاب القبر و اعوذبک من فتنۃ المسیح الدجال و اعوذبک من فتنۃ المحیا و الممات و اعوذبک من المأثم و المغرم.

خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں اس گمراہ کرنے والے دجال کے فتنے سے جو زمین پر چھا جانے والا ہے اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے۔ خدایا، میں تیری پناہ مانگتا ہوں برے اعمال کی ذمہ داری اور قرض داری سے۔

اس کے بعد سلام ہے۔ یعنی یہ دعا پڑھنے کے بعد نماز پوری ہوگئی اب اپنے مالک کے دربار سے واپس ہوکر پہلا کام یہ ہے کہ دائیں اور بائیں مڑ کر تمام حاضرین اور دنیا کی ہر چیز کے لیے سلامتی اور رحمت کی دعا کریں:

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ سلامتی ہو تم پر اور اللہ کی رحمت۔

فرض اور سنت سب طرح کی نمازوں کے پڑھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ فرض نمازوں کی تعداد اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ سنت نمازوں میں سب سے اہم نمازیں وہ ہیں جو سنت مؤکدہ کہلاتی ہیں، یعنی وہ نمازیں جن کا اہتمام حضورؐ نے ساری زندگی کیا۔ ان میں

دو رکعتیں فجر کی نماز سے قبل، چار رکعت ظہر کی نماز کے پہلے اور دو رکعت بعد میں۔ دو رکعت مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد، سنت مؤکدہ ہیں۔ دو رکعت ظہر کے بعد چار رکعت عصر سے پہلے اور چار رکعت عشاء سے پہلے سنت غیر مؤکدہ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نمازیں نفل ہیں۔ نفل نمازوں میں سب سے اہم تہجد کی نماز ہے۔ تہجد کی تاکید اور فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے اور نفل نمازوں میں سب سے زیادہ درجہ تہجد کی نماز کا ہے، رمضان المبارک میں تراویح بھی حضورؐ سے ثابت ہے اور چوں کہ تراویح کے ساتھ قرآن مجید سننے اور سنانے کی سنت بھی وابستہ ہے اس لیے تراویح کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، تراویح کی تعداد رکعات میں اختلاف ہے، مسجد نبوی اور بیت اللہ میں بیس رکعات پڑھائی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی اکثر مساجد میں بھی بیس رکعات پڑھائی جاتی ہیں اور بعض حضرات آٹھ پڑھتے ہیں۔

6.8 جمعہ

اسلام میں جمعہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگوں نے اپنے لئے مخصوص ایام مقرر کئے ہیں اور ان ایام میں مخصوص عبادتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلام میں ہفتہ کے دنوں میں سے جمعہ کا دن مخصوص عبادت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس دن بقیہ نمازیں تو بدستور رہتی ہیں، صرف ظہر کی نماز میں ایک تبدیلی ہے۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ ظہر کی چار رکعات جمعہ کی دو رکعات ہو جاتی ہیں اور نماز سے قبل خطبہ جمعہ واجب ہوتا ہے جس کا سننا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (جمعہ 9)

اے ایمان والو، جب تمہیں جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے بڑھو اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سکو۔

جمعہ کی نماز کا خصوصی اہتمام کرنا ضروری ہے، ایک مشہور روایت ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے۔ اسی طرح خوشبو لگانا صاف ستھرے کپڑے پہننا اور اپنے یومیہ کاموں کو اس طرح ترتیب دینا ضروری ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد سارا وقت عبادت اور ذکر کے لئے مخصوص ہو جائے۔

اسلام میں جمعہ کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

اللہ کے نزدیک سب سے عظیم دن یعنی سید الایام جمعہ کا دن ہے۔ اللہ کے نزدیک جمعہ کا دن یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے بھی بڑا ہے۔ اس کی پانچ خوبیاں ہیں۔ اس دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا اس دن اللہ نے ان کو زمین پر اتارا اور اس دن ان کو وفات دی۔ اس دن ایک ایسا وقت بھی ہے کہ اس میں بندہ مسلم، اللہ سے جو چیز مانگتا ہے اللہ تعالی اسے عطا کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ حرام شئی نہ ہو۔ اسی دن قیامت آئے گی، مقرب فرشتے، ہوائیں، دریا، پہاڑ اور شجر سب اس دن سے خائف رہتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

جمعہ کے خطبہ کو اہتمام کے ساتھ سننا واجب ہے۔حتی کہ یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ آدمی کسی دوسرے کو خاموش رہنے کی تلقین کرے، دراصل خطبہ کے وقت پوری توجہ خطیب کے الفاظ سننے کی طرف ہونی چاہئے۔خطیب کے الفاظ کو اللہ نے خود ذکر کہا ہے، چونکہ اس وقت جو خطبہ دیا جارہا ہے وہ دراصل اللہ کے ذکر کے لئے دیا جارہا ہے، اس لئے اس کا سننا ضروری ہے۔خطبہ جمعہ دراصل ایک ہدایت نامہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کے لئے صلاح وتقوی کی روش اختیار کرنے اور دین پر جمے رہنے کی تلقین کے علاوہ اس وقت کی کسی ضروری دینی ضرورت کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔

جمعہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا ایک اہم مظہر ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک شہر کے لوگ ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک جگہ جمع ہوں، اللہ کا ذکر کریں، دینی ذمہ داریوں کی تذکیر کریں اور شہر کے حالات میں جس اہم دینی پہلو سے بے توجہی ہو رہی ہو امام اس پر بھی لوگوں کو نصیحت کرے، اور من جملہ دینی باتیں بتائے، جمعہ کی نماز اس لئے صرف شہروں میں واجب ہے۔ چونکہ شہر اجتماع کی جگہ ہوتے ہیں۔لیکن موجودہ دور میں گاؤں کی حیثیت بھی چھوٹے شہروں کی سی ہوگئی ہے اس لئے گاؤں میں بھی جمعہ پڑھنے کی اجازت ہے۔شہروں کا عالم یہ ہوگیا ہے کہ بہت سے شہر بعض ملکوں کی آبادی سے بڑے ہو گئے ہیں۔اس لئے ایک شہر میں بھی متعدد جگہ جمعہ کی نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

جمعہ دراصل مسلمانوں کی ایک چھوٹی عید ہے، خطبہ جمعہ نماز کا حصہ ہے، اس کا سننا ضروری ہے، اگر خطبہ نہیں سنا تو جمعہ کی نماز تو ادا ہو جائے گی لیکن ناقص ادا ہوگی۔

6.9 عیدین

جس طرح جمعہ کا دن ہفتہ کی عید ہے اسی طرح سال میں دو عیدیں اور بھی ہیں۔ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ۔عید الفطر وہ عید ہے جو رمضان المبارک کے مہینہ کی تکمیل کے بعد بطور شکرانہ اور خوشی کے منائی جاتی ہے۔اس کو عید الفطر اسی لیے کہتے ہیں کہ اب رمضان مکمل ہو گئے اور افطار کرنے کا مہینہ شروع ہو گیا۔اضحیٰ کے معنی قربانی کے آتے ہیں۔اس عید کو اس لیے عید الاضحیٰ کہتے ہیں کہ یہ قربانی کی عید ہے، یعنی وہ عظیم قربانی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی کی شکل میں خدا کی راہ میں پیش کر کے دی تھی، اس عظیم قربانی کی یاد میں عید الاضحیٰ منائی جاتی ہے۔

عیدین کی نماز واجب ہے، امام اور مقتدی اس دن حسب استطاعت تیاری کر کے اپنے گھروں سے نکلیں اور ممکن ہو تو شہر کے باہر کسی مقررہ جگہ پر جائیں جس کو عیدگاہ کہتے ہیں اور دو رکعت نماز ادا کریں۔ یہ نماز جہری ہے، اور اس میں عام معمول کی تکبیروں کے علاوہ چھ زائد تکبیریں بھی ہیں۔ یہ تکبیرات واجب ہیں۔اگر چھوٹ جائیں تو سجدہ سہو کرنا ہوگا۔دو رکعات نماز ادا کرنے کے بعد امام جمعہ کی طرح خطبہ دے گا۔خطبہ سننے کے بعد نماز مکمل ہوگئی۔ جمعہ اور عیدین میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ نماز سے قبل دیا جاتا ہے اور عیدین کا خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا ہے۔

عیدین کے دن ذکر وتسبیح کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی کی کبریائی کو بیان کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے۔اس کے لیے مسنون ہے کہ عید الفطر میں آہستہ اور عید الاضحیٰ میں بآواز بلند تکبیرات تشریق پڑھی جائیں۔عید کی نماز کے لیے ایک راستہ سے جائیں اور واپس

دوسرے راستہ سے آئیں تا کہ اللہ کے ذکر سے ہر گلی کوچہ اور ہر بام و در معطر ہو جائے اور اسلام کی شان وشوکت کا اظہار رہو۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے:

ہر ملت کے لیے ایک مظاہرہ اور اجتماع ضروری ہوتا ہے جس میں اس کے ماننے والے جمع ہوں تا کہ ان کی کثرت تعداد اور شان وشوکت کا اظہار ہو۔اس لیے عیدین میں تمام اہل ایمان حتی کہ عورتوں اور بچوں کا نکلنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحب قرار دیا ہے۔اور اس لیے یہ فرمایا ہے کہ عیدگاہ ایک راستہ سے جائیں تو دوسرے راستہ سے واپس آئیں تا کہ اسلام کی شان وشوکت لوگوں کے سامنے چلتی پھرتی شکل میں نظر آئے۔(حجۃ اللہ البالغہ)

عید کے دن خصوصی اہتمام کرنا چاہیے اور ہر مسلمان کو نماز پڑھنے کے لیے نکلنا چاہیے۔عید کے دن نہانا خوشبو لگانا، اچھے کپڑے پہننا، عیدالفطر میں نماز سے قبل کچھ کھا کر جانا اور عیدالاضحیٰ میں بغیر کچھ کھائے ہوئے نماز پڑھنے جانا پسندیدہ ہے۔حضرت ام عطیہ انصاری روایت کرتی ہیں کہ ''ہم کو عید کے دن نکلنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ باکرہ لڑکیاں بھی نکلتیں۔اس سے بڑھ کر حائضہ عورتیں بھی نکلتیں اور لوگوں کے پیچھے کھڑی رہتیں اور تکبیر اور دعا میں اس دن کی برکت کی امید کرتے ہوئے شامل ہو جاتیں۔(بخاری و مسلم)۔دوسری روایت میں ہے کہ ایک عورت نے دریافت کیا! اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہیں رہتی۔ آپ نے فرمایا: اسکی بہن اس کو اپنی چادر میں لے لے(بخاری)۔

عیدین کی نماز میں اذان واقامت نہیں ہے۔بخاری و مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نمازوں میں اذان واقامت نہیں ہے۔

عید کا دن اللہ کی پاکی بیان کرنے ،اس کی کبریائی اور اسکی عظمت کے بیان کا دن ہوتا ہے۔اس دن خوشی کا اظہار ہر جائز طریقے سے کرنا چاہیے۔ یہ ایام کھانے اور پینے کے ہیں۔ان ایام میں روزہ رکھنا بھی حرام ہے۔ایک دن عیدالفطر کا اور تین دن عیدالاضحیٰ کے کل چار ایام کھانے پینے کے ہیں۔یہ گویا رب العالمین کی طرف سے بندوں کی ضیافت کے دن ہیں۔

عیدالفطر میں غریبوں کو شریک کرنے کے لیے صدقۃ الفطر دینا واجب ہے۔اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ غریب آدمی بھی عید کی اس خوشی سے محروم نہ رہے،اور عیدالاضحیٰ میں غریب آدمی کو قربانی کا گوشت کھلانے کا حکم قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان ایام میں کوئی رنجیدہ نہ رہے اور نہ بھوکا رہے۔

6.10 قیام لیل

قیام لیل یعنی تہجد کی نماز اسلام کی نظر میں اہم ترین عبادت ہے۔نفل نمازوں میں سب سے بڑا درجہ اس نماز کا ہے۔اسلام میں پانچ وقت فرائض کے علاوہ سب سے اہم نفل نماز یہی تہجد کی ہے۔تہجد اللہ کے رسولؐ کی سنت ہے، بلکہ انبیاء سابقین کی بھی سنت ہے۔اس کا اہتمام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی کیا۔یعنی آپؐ نے ہمیشہ تہجد کی پابندی کی۔تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم اللہ نے قرآن میں دیا ہے۔

سورہ مزمل میں ہے۔''اے چادر اوڑھنے والے رات کو کھڑے رہا کرو نماز کے لئے سوائے تھوڑے حصہ کے۔ یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردو، یا اس سے کچھ زیادہ۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ (مزمل)

ایک اور آیت میں تہجد کی نماز کا ذکر اس طرح آیا ہے۔''رات میں وہ کم سوتے تھے اور فجر کے وقت وہ استغفار کرتے تھے(الذاریات:18-17)

ایک اور آیت میں ہے:''بے شک قرآن مجید فجر کے وقت مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے نفل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کردے''۔(بنی اسرائیل:79-78)

ایک اور آیت میں ہے:''ان کے پہلو خواب گاہوں سے علاحدہ ہوتے ہیں اور اس طور پر وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔ اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے غیب کے خزانے میں موجود ہے۔ یہ ان کے ان اعمال کا صلہ ہے جو اعمال وہ کرتے تھے۔''(السجدہ)

احادیث میں بھی تہجد کی فضیلت متعدد مقامات پر آئی ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کے بعد افضل روزے محرم کے ہیں اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز تہجد کی ہے۔(مسلم)

ترمذی کی ایک روایت میں ہے۔ اے لوگو سلام کو پھیلاؤ اور ضرورتمندوں کو کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو، رات کو اس وقت نماز پڑھو جب سب لوگ سوتے ہوں۔ تم جنت میں سلامتی سے داخل ہوجاؤ گے۔(ترمذی) ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت ہے کہ جو شخص رات کو خود بھی بیدار رہا اور اہل خانہ کو بھی بیدار کرے، پھر دونوں کھڑے ہوکر دو رکعت ادا کریں تو یہ لوگ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مردوں اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتوں میں شمار ہوں گے۔

تہجد کی جو فضیلت قرآن وحدیث میں ہے خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مومن جو اللہ تعالی کی قربت چاہتا ہو، جس کو اپنے رب سے ملنے کا اشتیاق ہو، جو فرماں برداروں میں شمار ہونا چاہتا ہو، وہ تہجد کا اہتمام کرے۔

تہجد کی نماز 8 رکعات مسنون ہے۔ تاہم اس میں کمی بیشی حسب صلاحیت اور حسب وقت کی جاسکتی ہے۔

تہجد کی اس فضیلت اور اہمیت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تمام فرض عبادات خاص طور پر نمازوں کے اوقات ایسے ہیں جن میں لوگ عام طور پر بیدار ہوتے ہیں اور اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر دکھاوا کا شائبہ بھی ہو، مسجد میں نماز کو پڑھتے ہوئے دیکھنے والے بہت ہوتے ہیں، لیکن تہجد کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں شاذ ونادر ہی کوئی دوسرا اس کو دیکھے گا۔ اس وقت کی عبادت میں جو خلوص اور للٰہیت ہوگی وہ کیفیت شاید دوسری عبادت میں نہ ہو، اس لیے قیام لیل کی فضیلت اس اہتمام سے بیان کی گئی ہے۔

قیام لیل میں ایک اہم بات یہ ہے کہ بقیہ نمازوں میں ایک ماحول بنا ہوتا ہے اور انسان معمولی کوشش سے نمازوں کا اہتمام کرسکتا ہے، لیکن تہجد کی نماز کا معاملہ بالکل الگ ہے یہ بالکل انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تہجد پڑھنے والے کو کوئی دوسرا دیکھ سکے۔ اس نماز کا وقت ایسا ہے کہ رات بھر جاگنے والے بھی اس وقت نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

سوتے ہوئے کا اٹھنا تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں محض اللہ تعالی کی خوشنودی کے لیے کوئی شخص اپنی نیند سے بیدار ہو اور بارگاہ رب العزت میں سر بسجدہ ہو تو اس کی فضیلت بھی ایسی ہی ہوگی۔

ایک حدیث میں ہے کہ رات میں تہجد کے وقت حق سبحانہ وتعالی سماء دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور جب رات کا آخری حصہ ہوتا ہے تو اعلان فرماتے ہیں کہ کون ہے جو مجھ کو پکارے تو میں اس کی پکار سنوں۔ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اس کو دوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو میں اس کی مغفرت کروں۔ (بخاری ومسلم)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ رب العزت بندے کے سب سے قریب رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو ان لمحات میں اللہ کے سب سے قریب کھڑے ہونیوالے بندوں میں سے ہو جاؤ۔ (ترمذی، حسن صحیح)

قیام لیل بھی اہم عبادت ہے اور قرآن وحدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں جب پرندے اپنا منہ زیرِ منقار کئے اپنی پناہ گاہوں میں سو رہے ہوتے ہیں۔ اور لوگ اپنی عشرت گاہوں میں لطف زندگانی کی لذت سے شادکام ہو رہے ہوتے ہیں، ایسے وقت میں اگر کوئی طالب صادق اپنے رب کے حضور جبین نیاز خم کرے تو یہ بڑی فضیلت کی بات ہے، یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ہر چیز اس کے پاس ہوتی ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوتی ہے، تو جن کو خدا سے محبت ہے وہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

6.11 خلاصہ

اس اکائی میں بتایا گیا ہے کہ نماز کے لیے عربی زبان میں لفظ صلوۃ استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی دعا کے آتے ہیں۔ اصطلاح میں ایک مخصوص عبادت کو جس میں قیام، رکوع، سجدہ اور تلاوت قرآن شامل ہے صلوۃ یا نماز کہتے ہیں۔ اسلام میں نماز کی بڑی اہمیت ہے۔ نماز کے اوپر پورا دین قائم ہے۔ حدیث میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ نماز خدا اور بندے کے درمیان مناجات اور تعلق ہے۔ اس لیے نماز کو معراج المومنین بھی کہا گیا ہے۔ نماز پہلی امتوں پر بھی فرض تھی اور مسلمانوں پر بھی فرض ہے۔ دن اور رات میں پانچ وقت کی نماز پڑھنا ضروری ہے۔ نماز جس طرح انسان کو خدا سے وابستہ کرتی ہے اسی طرح نماز کے سماجی فوائد بھی بہت ہیں۔ مثلاً نماز برائیوں سے اور منکرات سے روکتی ہے۔ نماز چوں کہ خدا اور بندے کا ایک قریبی تعلق ہے اس لئے ذریعہ امداد الٰہی بھی ہے۔ نماز کے ذریعہ انسان پابند وقت اور فرض شناس ہو جاتا ہے۔ نماز آدمی کو سحر خیز بنا دیتی ہے۔ نماز بیماریوں سے انسان کی حفاظت کرتی ہے، صاف ستھرا اور پاک وطاہر رکھتی ہے۔ نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔ ناپاکی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو نظر آنے والی ناپاکی جیسے پاخانہ، پیشاب، خون وغیرہ۔ دوسری نجاست حکمیہ جیسے جنابت اور حیض ونفاس وغیرہ۔ نماز کے لئے انسان کا دونوں طرح کی نجاست سے پاک ہونا ضروری ہے۔ جنابت اور حیض ونفاس کے لیے غسل کرنا ضروری ہے، اور اگر غسل واجب نہ ہو تو نماز سے قبل وضو کرنا ضروری ہے۔ غسل و وضو کے لیے پاک پانی ضروری ہے۔ اگر پانی دستیاب نہ ہو تو تیمّم کی اجازت ہے۔

نماز انسانی معاشرہ میں اجتماعیت کی روح بیدار کرتی ہے۔ اور انسان کے اندر روحانی ارتقاء کی تکمیل کرتی ہے۔ نماز انسان کے لئے حیات کا مژدہ ہے اور ترک نماز موت ہے۔ نماز انسان کو زندگی کا مقصد عطا کرتی ہے اور اس کے مالک کے ساتھ استوار کرتی ہے۔ اس لیے نماز ایسی عبادت ہے جو کسی حال میں معاف نہیں ہے اور جس کا پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے۔

چوبیس گھنٹے میں پانچ وقت کی فرض نمازوں کے علاوہ سنت و نوافل ہیں اور ان کے علاوہ بھی کچھ نمازیں ہیں۔ ایک جمعہ کی نماز ہے جو جمعہ کے دن ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ اور دو نمازیں عید کی ہیں، ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ۔ یہ نماز سال میں ایک ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہیں۔ عیدین کی نماز کا وقت دن چڑھے سے لے کر زوال تک رہتا ہے اور یہ دونوں نمازیں واجب ہیں۔

6.12 نمونے کے امتحانی سوالات

1. اسلام میں نماز کی کیا اہمیت ہے؟
2. نماز کے لیے طہارت کی کیا اہمیت ہے؟
3. نماز کا طریقہ کیا ہے؟
4. نماز کے روحانی فوائد کیا ہیں؟

6.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ارکان اربعہ — مولانا ابوالحسن علی ندوی
2. اسلامی عبادات — الطاف احمد اعظمی
3. سیرۃ النبی — سید سلیمان ندوی
4. خطبات — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
5. اسلام ایک نظر میں — مولانا صدر الدین اصلاحی
6. اسلامی فقہ — مولانا مجیب اللہ ندوی

اکائی 7: روزہ

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

7.2 تمہید

7.3 تعارف اور مصالح

7.3.1 شب قدر

7.3.2 اعتکاف

7.3.3 تراویح

7.3.4 صدقۃ الفطر

7.4 روزہ کے مقاصد

7.4.1 تقوی کی آبیاری

7.4.2 صبر و برداشت کی مشق

7.4.3 جھوٹ سے بچنے کی مشق

7.4.4 ایمان واحتساب

7.4.5 گناہوں کے مقابلے میں ڈھال

7.4.6 ہمدردی اور غمخواری

7.5 طریقہ واحکام

7.6 اقسام

7.7 خلاصہ

7.8 نمونے کے امتحانی سوالات

7.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

7.1 مقصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ اسلام میں روزہ کی اہمیت اور مقام کیا ہے۔ روزہ کے احکام اور مصالح کیا ہیں، اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

7.2 تمہید

روزہ کے لئے عربی زبان میں لفظ صوم استعمال ہوتا ہے۔صوم کے لفظی معنی رکنے کے آتے ہیں۔ روزے کی حالت میں انسان کھانے پینے سے رکا رہتا ہے اس لئے روزے کو صوم کہتے ہیں۔روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے، اس کے لئے مخصوص احکام ہیں اور روزہ کے ساتھ کئی مصالح وابستہ ہیں۔ذیل میں ان سب پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

7.3 تعارف اور مصالح

صوم عربی زبان کا لفظ ہے اس کا ترجمہ روزہ کیا جاتا ہے۔لفظ صوم کے لغوی معنی رک جانے کے ہیں، اصطلاح شریعت میں صوم صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے رکے رہنے کا نام ہے۔

اسلام کی نظر میں روزے کی بڑی اہمیت ہے۔روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔اور ہر شخص پر رمضان المبارک کے روزے رکھنا فرض ہے۔اسلام سے قبل بھی روزے کی روایت تھی۔عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں بھی روزے رکھا کرتے تھے۔اسلام نے ایک پورے مہینے یعنی رمضان المبارک کے روزے فرض کئے، اور اس طرح سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ کو عبادت الٰہی کے لئے مخصوص کر دیا، رمضان المبارک کو روزوں کے لئے مخصوص کرنے کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن مجید رمضان المبارک کے مہینہ میں نازل ہوا، قرآن جو اسلام میں دستور حیات اور کتاب زندگی ہے جو انسانیت کے لئے رب العالمین کا آخری پیغام ہے وہ اس ماہ مبارک میں نازل ہوا۔اس لئے اس مہینہ کو اور بھی بہت سی برکات سے وابستہ کیا گیا اور اس مہینہ کے روزے فرض کئے گئے، اس مہینہ میں عبادتوں کا اجر وثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔اور اس مہینہ میں ایک ایسی رات مقرر کی گئی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

قرآن مجید میں روزے کی فرضیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ(البقرہ: 183)

''اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیزگار بنو''۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ(البقرہ: 185)

''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور کھلی نشانیاں راستہ کی اور حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے''۔

رمضان المبارک خاص عبادات کا مہینہ ہے۔اس مہینہ کو عبادت سے خاص مناسبت ہے اور چونکہ انسانیت کا نسخہ کیمیا اسی ماہ مبارک میں نازل ہوا تھا اس لئے اس کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔اللہ تعالی اس مناسبت سے اپنے بندوں کی آسانی کے لئے سرکش شیاطین کو قید کر دیتا ہے تا کہ بندے آسانی کے ساتھ عبادت و بندگی میں مصروف رہ سکیں، رمضان المبارک کی فضیلت کو احادیث میں بھی مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ایک حدیث میں آیا ہے۔حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔اور جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام اللیل کرے اس کے بھی پچھلے گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں اور جو شخص شب قدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کرے اس کے بھی پچھلے گناہ سب معاف کر دیئے جاتے ہیں۔(بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ابن آدم کے ہر عمل کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھا دیا جاتا ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے کہ روزے اس سے مستثنی ہیں کیونکہ روزے میرے لئے ہیں اور میں ہی اس کا اجر دونگا، انسان میری خاطر اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہشات نفس کو چھوڑ دیتا ہے، روزہ دار کے لئے دو مسرتیں ہیں ایک مسرت افطار کے وقت اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے اور روزہ ڈھال ہے، جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ فحش باتیں کرے، اور نہ شور و شغب اور دنگا فساد کرے اور اگر اسے کوئی گالی دے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں (بخاری و مسلم)

احادیث میں روزے کی فضیلت اور اس کے احکام بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔احادیث کی کتابوں میں روزے کے بیان پر ایک مستقل حصہ ہوتا ہے جس میں ان روایات کو جمع کیا گیا ہے جو روزے کی فضیلت اور احکام سے متعلق ہیں۔

روزہ دراصل ایک تربیتی نصاب ہے جو انسان کے نفس و روح کی تطہیر اور اس کے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے۔روزہ کا تعلق دینی فضائل سے بہت گہرا ہے۔اسلام میں تقوی کی جو اہمیت ہے اس سے سب واقف ہیں۔تقوی دراصل مذہب کی روح ہے۔روزہ کی فرضیت کا ایک مقصد قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کے اندر تقویٰ کی آبیاری ہوتی ہے۔اسی طرح انسان کی زندگی میں صبر کی جو اہمیت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، دنیاوی زندگی کے تمام کاموں میں صبر ایک روح کی مانند ہے، صبر کے ذریعہ انسان بڑے بڑے معرکے سر کرسکتا ہے۔اور صبر کے ذریعہ اللہ تعالی کی مدد حاصل کی جاتی ہے، روزہ صبر کی صلاحیت کو پروان چڑھانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ روزہ نصف صبر ہے (ترمذی) گویا صبر کی تربیت کے لئے روزہ کی بڑی اہمیت ہے ایک حدیث میں آتا ہے جیسا کہ اوپر گذرا کہ جو شخص روزہ رکھے وہ کسی

سے جھگڑا نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں ۔یعنی میں جھگڑا نہیں کروں گا،اس طرح روزہ انسان کے اندر صبر کی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے اور تقوی کی آبیاری کرتا ہے۔

روزے کے مختلف مصالح یا تو قرآن وسنت میں واضح طور پر مذکور ہیں یا ان کی روشنی میں سمجھے جا سکتے ہیں۔روزے کی ایک مصلحت یہ ہے کہ روزہ انبیاء کی اتباع میں رکھا جاتا ہے۔ پہلے کے انبیاء کی اتباع میں ان کی قومیں روزہ رکھتی تھیں۔ یہودی حضرت موسیٰ کی اتباع میں روزہ رکھتے تھے،عیسائی بھی حضرت عیسیٰ کی اتباع میں روزے رکھتے تھے، بلکہ حضرت موسیٰ کی اتباع میں تو عرب میں بھی روزہ رکھا جاتا تھا، یوم عاشوراء کا روزہ حضرت موسیٰ کی باقیات میں ہے۔رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے سارے مسلمان عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے اور ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ہم موسی علیہ السلام کی اتباع کے یہودیوں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہیں۔اس لئے آپ یوم عاشوراء کا روزہ تو رکھتے رہے اس کے ساتھ ایک روزہ اور رکھنے کا ارادہ فرمایا یعنی عاشورہ کے دن سے پہلے یا بعد ایک اور روزہ رکھ کر ان کو دو کر لینا۔اسلام میں رمضان المبارک کے روزے بھی رسولﷺ کی اتباع ہے۔آپؐ نے بھی یہ روزے رکھے اور امت بھی ان روزوں کا اہتمام کرتی ہے۔

روزے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اسلام کے ماننے والے اسلام کی سابقہ روایات یعنی گذشتہ انبیاء کی روایات سے بھی وابستہ ہو جائیں۔ چونکہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو سابقہ امتوں پر بھی فرض تھی۔اس لئے قرآن مجید میں روزے کی فرضیت کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ روزے تمہارے اوپر اسی طرح فرض ہیں جیسے تم سے پہلے کی امتوں پر فرض تھے،(البقرہ 183)،اس طرح اسلام اور مسلمان دراصل اسی دین کا تسلسل قرار پاتے ہیں جو اول دن سے اللہ تعالی نے انسان کو عطا فرمایا تھا،قرآن میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ بھی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئے رسول نہیں ہیں اور یہ کہ اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔

روزہ کی ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ رمضان کے روزے رب العالمین کی شکر گزاری کا ایک ذریعہ ہیں۔اللہ تعالی نے قرآن نازل کر کے انسانوں پر جو عظیم احسان کیا ہے اس کی شکر گذاری کا تقاضا ہے کہ وہ ماہ مبارک جس میں یہ عظیم انعام انسانیت کو ملا اہتمام کے ساتھ گزارا جائے، وہ کتاب الہی ،جس پر انسان کی دونوں جہانوں کی کامیابی وکامرانی کا انحصار ہے،اور جس نے انسان کو کفر وگمراہی کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی نورانی فضاء میں پہنچایا، وہ کتاب اسی ماہ مبارک میں نازل ہوئی،اس لئے شکر گذاری اور احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ اس ماہ کو خاص اہتمام کے ساتھ گذارا جائے ،قرآن مجید میں خود بھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے۔

> وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (البقرہ: 185)
>
> ’’اور (یہ رمضان کے روزے اس لئے فرض ہوئے) کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو‘‘۔

رمضان المبارک کے ساتھ شکر وامتنان کے یہ جذبات تقاضا کرتے ہیں کہ اس دن کو اور اس ماہ کو ایک یادگار کے طور پر بنایا جائے۔اس لئے اس پورے مہینہ کے روزے جذبہ شکر کا اظہار ہیں۔

رمضان المبارک کے روزوں کی ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ سال کے گیارہ مہینوں میں مختلف دنیاوی مشغولیات ومسائل کی وجہ سے انسان کے قلب وروح پر ایک زنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس کیفیت کو دور کرنے کے لئے ایک مہینہ کا تربیتی نصاب ہے جو رمضان المبارک کے روزوں کی شکل میں انجام دیا جاتا ہے۔ رمضان کے روزے رکھ کر انسان اپنی ایسی تربیت کرتا ہے جو باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس کے لئے مہمیز اور انابت الی اللہ کے لئے محرک ثابت ہوتی ہے، ایک مہینہ کا تربیتی نصاب انسان کی زندگی کو پھر انہی خطوط پر گامزن کر دیتا ہے جن پر ان کا ثبات وقیام مطلوب ہے اور جو دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضمانت ہیں۔

رمضان المبارک میں روزے رکھنے کے بہت سے سماجی مصالح اور فوائد بھی ہیں۔ روزے رکھ کر انسان کو بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ کے محروم ونادار لوگوں کی مجبوری کو اپنے تجربہ سے جان لیتا ہے، اس لئے اس کے اندر سماجی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کو ’شہرالمواساۃ‘ یعنی غم خواری کا مہینہ بھی کہا ہے کہ اس مہینہ کے اندر انسانی ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ رمضان میں روزہ کھلوانے کا بڑا ثواب ہے، اور صدقۃ الفطر نکال کر غریبوں کو دینا واجب ہے۔ ان سب کے ذریعہ انسان کو معاشرہ سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

7.3.1 شب قدر

رمضان المبارک کے حوالے سے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اس میں اللہ نے انسانوں پر جو احسانات کئے ہیں ان میں سے ایک شب قدر بھی ہے۔ یہ وہ رات ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ اس رات کی فضیلت میں ایک پوری سورہ قرآن میں نازل ہوئی اور دوسرے مقامات پر بھی اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس کی فضیلت میں جو سورہ نازل ہوئی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

> ’’ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں، اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں ہر حکم لے کر، وہ رات سراسر سلامتی ہے صبح نکلنے تک‘‘۔ (سورہ القدر)

شب قدر کا تذکرہ سورہ دخان میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

> ’’قسم ہے اس واضح کتاب کی، ہم نے اس کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے، بے شک ہم آگاہ کرنے والے تھے، اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے ہمارے حکم سے۔ بے شک ہم تھے بھیجنے والے تیرے رب کی رحمت سے، وہی سننے والا اور جاننے والا ہے‘‘۔ (الدخان: 6-2)

یہ مبارک رات جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر آیا ہے ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس رات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہ مبارک رات متعین طور پر تو نہیں بتائی گئی، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات شب قدر ہے۔ اس رات کو جاگنا، اللہ کی عبادت کرنا، اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنا بڑی فضیلت کا عمل ہے۔

حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو میں کیا کروں، یعنی کیا مانگوں۔ حضور نے فرمایا کہ کہو **اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی** (اے اللہ تو بے شک معاف کرنے والا ہے یہ اور پسند کرتا ہے معاف کرنے کو پس معاف فرما دے مجھ سے بھی)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے روایت بیان کی کہ جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے عبادت کے لیے کھڑا ہو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (بخاری)

7.3.2 اعتکاف

اعتکاف بھی رمضان المبارک کے مہینہ سے وابستہ ہے۔ اعتکاف کا مطلب ہے اللہ کے لیے گوشہ گیر ہونا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف مسجد کے اندر کرنا ضروری ہے۔ یہ اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ یعنی بستی میں سے اگر علامتی طور پر کوئی ایک شخص بھی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو سب کی طرف سے کفایت ہو جائے گی۔ ورنہ ہر شخص گناہگار ہوگا۔ اعتکاف کا مسجد میں کرنا ضروری ہے۔ اور اعتکاف کے دوران بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلق منع ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَلاَ تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِيْ الْمَسَاجِدِ (البقرۃ: 187)

''اور تم ان سے مباشرت مت کرو جب تم مساجد میں معتکف ہو''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ آپؐ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ایک رمضان میں پورے رمضان کا اعتکاف کیا۔

اعتکاف دراصل خدا کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر یکسو کر لینے کا نام ہے۔ جب انسان کاروبار حیات اور زندگی کی مشغولیتوں سے اپنے آپ کو کامل طور پر یکسو کر کے خدا کے لئے ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کو خصوصی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کا عبادت کرنا تو کارثواب ہے ہی۔ اس کا سونا، اس کا جاگنا، اور اٹھنا بیٹھنا سب عبادت بن جاتا ہے۔ ابن ماجہ کی ایک روایت ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لئے اتنی نیکیاں لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ اعتکاف کے ذریعہ خدا اور بندے کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔ اعتکاف انسان کو کاروبار حیات کی مشغولی میں ایسے لمحات میسر کرتا ہے جن میں انسان خالص اپنے رب کے حضور مناجات اور دعا و استغفار کرتا ہے۔ تیز گام زندگانی کا سفر کبھی آرام نہ کرنے والا سفر ہے۔ انسان اپنے آپ کو جتنا اس میں مشغول کرے گا اتنا ہی مشغول ہوتا جائے گا۔ لیکن جو شخص اپنی مشغولیات کو مؤخر کر کے اپنے وقت کی تنظیم کر کے اور مصروفیات کے دام سے اپنے کو بچا کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگا، اس کے لیے گوشہ گیر ہوگا اور اپنی دن ورات کی فکر آخرت کو بنائے گا، زندگی کی کشمکش اس سے ہار جائے گی اور وقت کی مفروضہ مصروفیات کی حقیقت اس کے سامنے کھل جائے گی۔ اس کو یہ بھی پتہ چلے گا کہ اس کے پاس وقت کی تنگی کی شکایت کا موقع نہیں ہے۔ دراصل اس نے وقت کی تنظیم نہیں کی تھی اس لیے زیادہ مصروفیت تھی۔ اگر وہ چاہے تو اس کو بقدر ضرورت اضافی وقت ملے گا۔ اعتکاف یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ انسان اپنی واقعی مصروفیت اور غیر حقیقی مصروفیت میں فرق کر سکے۔ اعتکاف انسان کو یہ بھی بتائے گا کہ وقت کو مٹھی میں بند کر کے کیسے خرچ کیا جاتا ہے۔

اعتکاف کی تین قسمیں کی جاتی ہیں :۔ واجب ،سنت اور مستحب ۔ واجب اعتکاف نذر کا ہوتا ہے۔کسی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے گا تو میں اعتکاف کروں گا۔سنت اعتکاف رمضان کے آخری عشرے کا ہے ۔اور مستحب اعتکاف کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔اعتکاف کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ ایک دن سے کم کا اعتکاف جائز نہیں ہے۔البتہ امام محمد اور دیگر ائمہ کے نزدیک ایک دن سے کم کا اعتکاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

اعتکاف کے اندر مسجد سے نکلنا منع ہے۔صرف فطری تقاضوں کے لئے باہر نکلا جا سکتا ہے۔مثلاً پیشاب، پاخانہ وغیرہ یا جمعہ کی نماز اگر مسجد میں نہ ہوتی ہو تو اس کے لئے بھی باہر نکلا جا سکتا ہے۔ بلاضرورت مسجد سے باہر آنے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور پھر اس کی قضا کرنی ہوگی۔اگر رمضان کا اعتکاف ٹوٹ گیا تو قضاء کے وقت روزہ رکھنا ضروری ہے۔البتہ جتنے دن کا اعتکاف ٹوٹا ہے اتنے دن کی ہی قضا ضروری ہے۔اعتکاف جس طرح مردوں کے لئے ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہے۔عورتوں کا اعتکاف گھر میں ہوگا۔مردوں کا مسجد میں۔باقی احکام یکساں ہیں۔

7.3.4 تراویح

تراویح کی نماز رمضان المبارک کی راتوں میں پڑھی جاتی ہے۔تراویح کا مطلب ہے وقفہ یا آرام۔چوں کہ تراویح کی نماز میں درمیان میں وقفہ کیا جاتا ہے،اس لئے ان کو تراویح کہا جاتا ہے۔تراویح پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی تھی۔حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت بخاری شریف میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے کہ ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ رات گئے گھر سے نکلے اور مسجد میں آکر نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت نے بھی نماز پڑھی۔جب صبح ہوئی تو صحابہ کے درمیان اس نماز کا تذکرہ ہوا۔دوسرے دن بھی جب آپ نے رات کو نماز پڑھی تو اس کا ذکر بہت زیادہ ہوا۔تیسرے دن نمازیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف نہیں لائے۔فجر کی نماز کے بعد آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم لوگوں کی موجودگی مجھ سے مخفی نہیں تھی لیکن مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے اور پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔اور معاملہ ایسا ہی رہا۔(بخاری ومسلم)

حضرت ابوذرؓ کی روایت میں یہ وضاحت ہے کہ یہ تین دن باجماعت نماز آخری عشرے میں پڑھی گئی تھی۔(ابوداؤد) اور بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام کو تطوع (نفل) قرار دیا ہے۔(بخاری) ان روایات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں نوافل کی کثرت سنت ہے۔ان کا باجماعت اہتمام حضورؐ کے زمانے میں صرف تین دن ہوا تھا۔لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے سے ان کی باقاعدہ جماعت ہونے لگی۔ یہ نوافل تہجد کے علاوہ تھے۔بعض حضرات نے حضرت عائشہ کی روایت کی بنیاد پر تراویح کو تہجد کی نماز قرار دیا ہے۔حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔(بخاری) لیکن یہ روایت تہجد سے متعلق ہے۔ اس لئے محدثین نے اس کو رمضان کے بجائے تہجد کے ابواب میں نقل کیا ہے۔تراویح کی نماز اس کے علاوہ ہے جو آپؐ نے باجماعت صرف تین دن پڑھی تھی۔اس لئے صحابہ کرام نے آپ کی وفات

کے بعد تراویح بیس رکعت پڑھنی شروع کی ،اور حرمین کی مساجد میں آج تک مسلسل بیس رکعات ہی پڑھی جاتی ہیں ۔تراویح کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے،بعض علماء نے آٹھ رکعات لکھی ہیں ۔علامہ ابن تیمیہ نے مختلف روایات کا محاکمہ کر کے لکھا ہے:

یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔لہذا بہت سارے علماء اسی کو سنت قرار دیتے ہیں کیوں کہ ابی بن کعب نے انصار اور مہاجرین کی موجودگی میں بیس رکعت پڑھائی اور کسی نے انکار نہیں کیا۔(فتاوی ابن تیمیہ،ص 112/23)

تراویح کی نماز کے ساتھ دو اور سنتیں بھی شامل ہوگئی ہیں جو سنت متواترہ ہیں۔ایک قرآن سننا اور دوسری قرآن سنانا۔ تراویح کا اتنا زیادہ اہتمام اسی لیے کیا جاتا ہے، چوں کہ یہ تین سنتوں کی اجتماعی شکل بن گئی ہے ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں قرآن سنتے بھی تھے اور سناتے بھی تھے۔تراویح اس سنت کی ایک عملی صورت ہے۔

تروایح میں قرآن سننے یا سنانے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔یہ کوئی کاروبار نہیں ہے بلکہ عبادت ہے اس لئے اس کا اجر اللہ سے مانگنا چاہیے۔تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا بہتر ہے، البتہ تنہا بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر کسی کی تراویح چھوٹ جائے تو ان کی قضا نہیں ہے۔

7.3.4 صدقۃ الفطر

رمضان المبارک میں صدقۃ الفطر بھی واجب ہے۔صدقۃ الفطر کے دو مقاصد ہیں۔ایک یہ ہے کہ یہ صدقہ روزہ دار کے لیے کفارہ ہے۔دوسرے اس کے ذریعہ غریب و نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔صدقۃ الفطر کا عید سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے لیکن اگر کوئی عید سے پہلے ادا نہ کر سکے تب بھی یہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ بعد میں دینا ضروری ہے۔

صدقۃ الفطر میں غلہ بھی دیا جا سکتا ہے اور روپیہ بھی دئے جاسکتے ہیں۔صدقۃ الفطر میں زیادہ سے زیادہ دینے کا جذبہ ہونا چاہیے تا کہ غریبوں کا زیادہ فائدہ ہو۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کو لازم ٹھہرایا ہے۔ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، یہ صدقہ ہر مسلمان پر غلام ہو یا آزاد، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا سب پر واجب ہے۔اور اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ صدقۃ الفطر نماز کے لئے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔(بخاری)

بعض اور روایات میں پنیر اور کشمش کا بھی ذکر ہے۔دراصل حضور کے زمانے میں یہ غذائی اجناس تھیں اس لئے ان میں سے صدقہ نکالنے کا حکم دیا تا کہ ضرورت مندوں کی فوری کفالت کا انتظام ہو سکے۔علماء نے وضاحت کی ہے کہ غلہ کی جگہ نقدی بھی دی جاسکتی ہے یعنی ایک صاع کی جو مروجہ قیمت ہو وہ قیمت ضرورت مند کو دی جاسکتی ہے۔

صدقۃ الفطر مالدار مسلمانوں پر واجب ہے۔یعنی جو شخص عید کے دن صاحب نصاب ہو یعنی اس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا اس کی مالیت کا روپیہ ہو اس پر صدقۃ الفطر واجب ہے۔اور جو امیر نہ ہو وہ اس کا مستحق ہے۔ صدقۃ الفطر کو مساجد کی تعمیر میں دینا جائز نہیں۔ یہ صرف غریبوں کا حق ہے ان کو ہی دیا جائے گا تب ہی ادا ہوگا۔البتہ صدقۃ الفطر کسی غیر مسلم غریب کو بھی دیا جاسکتا ہے۔

7.4 روزہ کے مقاصد

رمضان المبارک کے روزے کے ذریعہ انسان کی تربیت مقصود ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ انسان کے اندر کچھ متعینہ خوبیاں پیدا ہو جائیں اور انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت اس طرح ہو کہ وہ دین پر پورے طور پر چلنے والا بن جائے، قرآن و حدیث میں روزے کے جو مقاصد بیان ہوئے ہیں۔ ان میں چند اہم نکات یہ ہیں۔

7.4.1 تقویٰ کی آبیاری

روزہ تقویٰ کی پرورش اور آبیاری کا ذریعہ ہے۔ تقویٰ پوری انسانی زندگی میں مطلوب ہے، اس لئے تقویٰ کا اعلیٰ ترین معیار مطلوب حاصل کرنا انسان کا مقصد حیات ہونا چاہئے۔ روزے کی فرضیت کے ساتھ ہی روزے کا یہ مقصد بھی قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان روزے رکھنے سے متقی بنتا ہے اس لئے شعوری طور پر روزے کے ذریعہ اپنے تقویٰ کو معیار بلند تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ روزے کے ذریعہ انسان کو فراغت اور یکسوئی ملتی ہے۔ وہ کھانے، پینے اور دوسرے بہت سے یومیہ عوارض و ضروریات سے یکسو ہو جاتا ہے۔ عبادت و تلاوت کے ذریعہ قرب خداوندی کو تلاش کرتا ہے۔ اس کے پاس اپنے رب سے مناجات اور اپنی زندگی پر غور و فکر کرنے اور اپنے ماہ و ایام کی گزرگاہ پر نظر ڈالنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اگر انسان اپنا احتساب کرے اور اپنے اوقات اور ماہ و ایام کے گزرنے کو دیکھے تو اس کو اپنی کمیوں اور خامیوں کا احساس ہوگا اور وہ ان کو دور کرنے کی شعوری کوشش کرے گا۔ اس طرح اس کے تقویٰ کا معیار بلند ہوگا، جو روزہ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

7.4.2 صبر و برداشت کی مشق

روزہ کے ذریعہ انسان کی ایک اہم ترین انسانی صفت صبر کی پرورش ہوتی ہے۔ روزہ کی اصل روح صبر و برداشت ہے۔ اس لئے حدیث میں آتا ہے کہ نصف صوم صبر ہے۔ یعنی روزے کا آدھا حصہ تو صبر ہی ہے۔ انسان کے پاس کھانے کو سامان موجود ہے، پینے کو پانی فراہم ہے۔ زندگی کی بقیہ ضروریات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہے۔ لیکن وہ محض اللہ کے حکم سے بھوک کی شدت اور پیاس کی سختی برداشت کرتا ہے، دوسری دنیاوی لذات و خواہشات سے رکا رہتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات انسان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ بھی لے سکتا ہے لیکن وہ محض اس لئے جھگڑا کرنے سے باز رہتا ہے کہ اس کو خیال رہتا ہے کہ روزہ کی حالت میں جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ بسا اوقات انسان اپنے بے تکلف احباب کی محفل میں ہوتا ہے اور محفل کا رنگ اس کو زبان و بیان کی لغزش کی طرف کھینچتا ہے لیکن وہ یاوہ گوئی سے محض اس لئے رکا رہتا ہے کہ ایسا کرنے سے اس کے روزے کا اجر و ثواب اکارت جائے گا۔ انسانی زندگی میں یہی وہ مواقع ہیں جہاں وہ عزم و حوصلہ سیکھتا ہے اور ضبط نفس اور مشکلات پر صبر کرنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اس کو اپنے نفس پر قابو پانے کی مشق ہوتی ہے اور اگر یہ صلاحیت انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ قوی سے قوی تر اور زیادہ عقلمند اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ عقلمندی کیا ہے۔ عقلمندی دوراندیشی کا نام ہے اور صبر و ضبط کے ذریعہ انسان فوری اشتعال پر قابو پانا سیکھتا ہے اس کے اندر دوراندیشی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ دوراندیش وہ ہے جو اپنی آخرت کی فکر کرے، حدیث میں آتا ہے۔ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت۔ (عقلمند وہ ہے وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور مرنے کے بعد کے لئے عمل کرے)

7.4.3 جھوٹ سے بچنے کی مشق

انسانی زندگی میں جھوٹ ایسی برائی ہے جو انسان کا سماجی اعتبار کھودیتی ہے اور اپنے انجام وعواقب کے اعتبار سے انسان کو بڑی مشکلات میں مبتلا کردیتی ہے۔ روزہ کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ اور اس کی متعلقہ بیماریوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ جھوٹ بالعموم کم حوصلہ اور دوں ہمت لوگ بولتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی فوری پریشانی سے بچانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ پھر یہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔ اور وہ موقعہ بموقعہ جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔ روزہ انسان کے حوصلے بلند کرتا ہے اور اس کو اولوالعزم بناتا ہے جب انسان اولوالعزم ہوجاتا ہے تو جھوٹ بولنے کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے اور امید ہے کہ حوصلہ مند شخص اپنے آپ کو دروغ گوئی سے بچالے گا۔ عزم وحوصلہ کی آبیاری کے ساتھ روزے کے آداب میں ہے کہ انسان جھوٹ اور دروغ سے بچارہے ورنہ اس کا روزہ ضائع ہوجائے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، یعنی روزہ صرف کھانا پینا چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اور بھی برائیاں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے ورنہ روزے کا ثواب نہیں ملے گا۔ اسی بات کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ بھوک پیاس کے علاوہ ان کو کچھ نہیں ملتا اور کتنے ہی شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو رات جگنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (ابن ماجہ) یہ روایات اس بات کو اور مضبوط کرتی ہیں کہ روزہ کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت بھی مطلوب ہے کہ وہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے باز رہے۔

7.4.4 ایمان واحتساب

روزہ کے ذریعہ انسان کے دل میں مخفی ایمان اور للّٰہیت کی بھی تقویت ہوتی ہے۔ روزہ ایسی عبادت ہے جو مخفی ہوتی ہے۔ روزہ کا حال سوائے رب العالمین اور روزہ دار کے کسی پر نہیں کھلتا۔ جو شخص محض اللہ کے لئے روزے رکھے اور جس طرح وہ اپنے ایمان اور للّٰہیت میں سچا ہو اسی صداقت کے ساتھ روزے رکھے تو اس کے ایمان واحتساب میں اضافہ ہوگا اور خلوص وللّٰہیت کے حقیقی ثمرات اس کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی روزہ کا بدلہ دوں گا (بخاری ومسلم)۔

7.4.5 گناہوں کے مقابلے میں ڈھال

روزہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا میں جہاں چاروں طرف لذات دنیا بکھری پڑی ہیں اور شیطان ان کو مزید خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے انسان کبھی کبھی اس ظاہری چمک دمک میں بہہ جاتا ہے اور دنیا اس کو اپنی طرف لبھالیتی ہے اس کے قدم جادہ مستقیم پر لغزش کھانے لگتے ہیں۔ فوری نفع اس کو گناہ کے نقصان سے غافل کرنے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کو ایک مضبوط سہارے اور وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان ان حملوں کا دفاع کرسکے۔ روزہ اس کے لئے ایک ڈھال کی مانند ہے جو کارزار حیات میں شیطان اور گناہوں کے خلاف ایک رکاوٹ اور آڑ کا کام کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روزہ ڈھال ہے (مسلم)۔ روزہ ایک طرف تو مومن کے لئے ڈھال کا کام کرتا ہے دوسری طرف اس کے گناہوں کی مغفرت کا بھی ذریعہ ہے۔

7.4.6 ہمدردی اور غم خواری

روزہ کے اہم مقاصد میں ہمدردی اور غمگساری کی تربیت بھی ہے۔ روزہ رکھنا ایک عبادت ہے لیکن اس کے سماجی فوائد بھی بے شمار ہیں۔ روزہ کے ذریعہ انسان کے اندر ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ غمگساری اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ کو شہر المواساۃ کہا ہے ،یعنی ایسا مہینہ جس میں ہمدردی کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ جس میں معاشرے کے نادار اور ضرورت مند لوگوں کی خبر گیری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

روزہ شعوری طور پر بالارادہ بھوکے پیاسے رہنے کا نام ہے۔ محض اللہ کے حکم سے بھوک و پیاس کی شدت کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اس طرح وہ انسان جس نے اپنے وسائل حیات کی فراوانی کی بنا پر کبھی بھوک کی سختی کو نہیں جھیلا، جس نے کبھی پیاس کی شدت کو محسوس نہیں کیا، جس کے پاس بھوک لگنے سے پہلے انواع واقسام کی لذیذ غذائیں موجود ہیں، جس کے پاس پیاس کی شدت سے پہلے ٹھنڈے شدوبات فراہم ہیں وہ معاشرہ کے ان نادار افراد کی محرومی اور مجبوری کو محسوس نہیں کرسکتا جو نان شبینہ سے محروم ہیں۔ روزہ کی حالت میں انسان کو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہوجاتا ہے، اور نادار و محروم افراد کی پریشانیوں کا شعوری طور پر خود تجربہ کرلیتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے دل میں اپنے بھائیوں کی محرومی کا احساس پوری طرح سامنے آجاتا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور ان کے حوائج کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوجاتا ہے۔

رمضان المبارک میں عبادات اور خیرات کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی صاحب ثروت لوگ اس ماہ مبارک میں خاص طور پر صدقہ و خیرات کرتے ہیں تاکہ ضرورت مند اور نادار لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہوسکے اور معاشرے کے محروم افراد بھی اسباب خورد ونوش کا فراوانی سے استعمال کرسکیں۔ رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داد و دہش اور صدقہ و خیرات کی روش میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو آپؐ کی داد و دہش اور سخاوت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گویا تیز آندھی آگئی ہے۔ یعنی آپؐ کثرت سے سخاوت کرتے تھے۔ اس میں بھی امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ رمضان المبارک میں سخاوت کا ہاتھ اور زیادہ کشادگی سے کھولیں۔

رمضان المبارک میں روزہ کھلوانے کا ثواب روزہ رکھنے کے برابر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے لئے گناہوں سے بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑوانے کا ذریعہ ہوگا وار اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملتا ہے، اور دونوں کے اجر وثواب کی وجہ سے کسی کے اجر وثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

رمضان المبارک میں صدقۃ الفطر ہر صاحب حیثیت مسلمان پر واجب ہے۔ صدقۃ الفطر بھی دراصل اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں پوری طرح شریک ہوسکیں، اور عید الفطر کے دن کھانے اور لباس کی تنگی کی وجہ سے ان کے چہروں کی شگفتگی ناداری کے غم سے اضمحلال کا شکار نہ ہوجائے۔ اس طرح رمضان المبارک کے مہینہ میں انسان کی ہمدردی وغمخواری کے جذبات کی پرورش کی جاتی ہے تاکہ صاحب حیثیت لوگ اپنے آپ کو پورے معاشرے سے وابستہ رکھیں اور معاشرے کے ضرورت مند اور نادار لوگوں کی خبر گیری کو بھی اپنا دینی فریضہ اور مذہبی شعار تصور کریں۔ ان کو اپنی خوشیوں

میں شریک کرنا، ان کی محرومیوں کو دور کرنا اوران کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا اپنا دینی فریضہ تصور کریں۔شہرالمواساۃ یعنی ہمدردی کا مہینہ ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ہرانسان اپنے آپ کو معاشرہ کا ایک فرد اورایک جزء سمجھ کر پورے معاشرے کی آبیاری کی کوشش کرے۔

7.5 طریقہ واحکام

اللہ نے ماہ رمضان المبارک کے روزے فرض کئے ہیں۔رمضان المبارک ہجری کلینڈر کے اعتبار سے نواں مہینہ ہے۔اس مہینہ میں ہی قرآن نازل ہوا تھا، اس لئے اس مہینہ کے روزے فرض کئے گئے، روزہ کی فرضیت 2 رہجری میں ہوئی۔اس سے قبل مسلمان عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد رمضان کے روزے رکھنے لگے۔

ہجری کلینڈر قمری تقویم سے چلتا ہے، یعنی چاند دیکھ کر مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔اس لئے رمضان کے مہینہ میں بھی چاند دیکھ کر ہی مہینہ کا آغاز ہوگا اوراگلے مہینہ کا چاند دیکھ کر روزوں کی تکمیل ہوگی۔چاند کو خود دیکھنا ضروری ہے، اگر خود نہ دیکھ سکے تو کسی صحیح خبر کی بنیاد پر رمضان کا آغاز کرنا چاہئے۔چونکہ کبھی کبھی مطلع ابر آلود ہوتا ہے اور چاند نظر نہیں آتا ایسی حالت میں آس پاس کے شہروں سے صحیح خبر آجائے تو اس کی بنیاد پر روزے شروع ہوجائیں گے، آج کل اس کام کو منظم کرنے کے لئے ہر شہر میں رویت ہلال کمیٹی بنی ہوئی ہے، وہ اپنے طور پر تحقیق کر کے اگر چاند کا اعلان کردے تو روزے شروع ہوجائیں گے۔

روزہ کا طریقہ یہ ہے کہ نصف شب کے بعد اور طلوع صبح صادق سے پہلے پہلے کھانا کھالیا جائے۔اس کے بعد روزے کی نیت کرلی جائے۔نیت میں زبان سے وہ الفاظ بھی ادا کئے جاسکتے ہیں جو روایات میں مروی ہیں کہ **بصوم غدٍ نویت من شهر رمضان** وغیرہ تاہم نیت کا زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے۔اس کے بعد فجر کی اذان ونماز ہوگی، پھر دن بھر نہ کچھ کھایا جائے، نہ پیا جائے، اور نہ میاں بیوی آپس میں مقاربت کریں، شام کے وقت غروب آفتاب کے وقت روزہ افطار کرلیا جائے۔روزہ افطار کے وقت کی دعائیں احادیث میں موجود ہیں اور افطار کے بعد کی دعائیں بھی مروی ہیں۔ان کا اہتمام کرنا چاہئے۔اس طرح ایک روزہ مکمل ہوجاتا ہے۔اسی طرح تمام روزے رکھنے چاہئیں۔روزے کی حالت میں کھانا، پینا اور جنسی مقاربت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔لیکن روزے کے پورے اجر وثواب اوراس کے پورے فائدے کے لئے ضروری ہے کہ روزے میں جو دوسری چیزیں لازمی ہیں ان کا بھی اہتمام کیا جائے۔جیسے نمازوں کی اپنے وقت پر ادائے گی، ذکر وتلاوت اوراپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا۔اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے رکا جائے جیسے جھگڑا اور فحش باتیں وغیرہ۔

روزہ کے لئے نیت کرنا ضروری ہے۔اگر نیت نہیں کی تو روزہ نہیں ہوگا۔البتہ زبان سے نیت کا اظہار ضروری نہیں ہے۔سحری کھانا بھی نیت کے قائم مقام ہے اگر رمضان میں روزہ رکھنا ہو۔اگر نفل روزہ ہے تو اس کے لئے نیت کرنا ضروری ہے۔رمضان کے روزے ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہیں، بلا عذر روزہ چھوڑنا بڑا گناہ ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ بلا عذر چھوڑ دے تو پھر چاہے ساری زندگی روزہ رکھتا رہے اس کے ثواب کی تکمیل نہیں ہوگی۔البتہ عذر کی بنیاد پر روزے چھوڑے جاسکتے ہیں اوران کی قضا غیر رمضان میں کرنی ہوگی۔عذر میں سفر، بیماری، ضعیفی، حیض، نفاس اور دودھ پلانے والی عورت شامل

ہے۔ان کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ یہ لوگ بعد میں جب سہولت ہوا پنے روزوں کی قضا کرلیں۔ضعیف حضرات جو روزہ نہ رکھ سکتے ہوں ان کے لئے اسلام میں فدیہ کی گنجائش ہے،یعنی وہ اپنے ایک روزے کے لئے ایک مسکین کو دو وقت بھر پیٹ کھانا کھلا دیں تو یہ ان کی طرف سے روزے کا قائم مقام ہوگا۔لیکن اس کی اجازت جب ہے جب روزہ رکھنے پر قدرت نہ ہو، فدیہ کو روزہ چھوڑ دینے کا بہانا نہیں بنانا چاہیے۔رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضاء غیر رمضان میں ہی کی جاسکتی ہے،قضاء کے روزے لگاتار بھی رکھے جاسکتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے بھی رکھے جاسکتے ہیں،حسب سہولت اس کی اجازت ہے۔

سال میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔اس طرح چار دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنا گناہ ہے۔ایک عیدالفطر کے دن اور تین ایام قربانی کے۔ان ایام کے علاوہ میں روزہ رکھنا ناجائز ہے۔اسی طرح باقی دنوں میں نفل روزے سال میں کسی بھی دن رکھے جاسکتے ہیں۔

روزہ اگر کسی عذر کی بنا پر چھوڑا ہے تو اس کی قضا کرنی ضروری ہے،لیکن اگر روزہ بلا عذر توڑ دیا تو اس کے لئے صرف قضا کافی نہیں ہے، بلکہ کفارہ بھی دینا ہوگا۔روزے کا کفارہ یہ ہے کہ جو روزہ توڑا ہے اس کی قضا کرے اور مزید دو مہینے لگاتار روزے رکھے، اگر بیچ میں ایک بھی ناغہ ہوگیا تو پھر دوبارہ ساٹھ روزوں کی گنتی پوری کرے۔البتہ اگر روزہ رکھنے کی قوت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ایک مسکین کو ساٹھ دن تک کھانا کھلائے تب کفارہ ادا ہوگا۔

روزے کی حالت میں کھانے، پینے، مباشرت کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔اسی طرح ایسی دوا سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ عین دوا معدہ تک پہنچ جائے یا ناک وغیرہ کے ذریعہ اگر کوئی غذا یا پانی یا اور کوئی چیز حلق سے اتر جائے تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔اسی طرح یہ سمجھ کر کہ ابھی سحر کا وقت باقی ہے کھانا کھا لینے یا یہ سمجھ کر کہ افطار کا وقت ہوگیا ہے اور افطار کا وقت واقع میں نہ ہوا افطار کر لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔مسواک کرنے،سرمہ لگانے تیل لگانے وغیرہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزہ کے سلسلے میں دو بنیادی باتیں ہیں۔ایک یہ کہ جان بوجھ کر روزہ توڑا جائے،دوسرا یہ کہ کسی غلطی سے روزہ ٹوٹ جائے، مثلاً قے ہوئی اور یہ سمجھ کر کہ اب روزہ ٹوٹ گیا کھا پی لیا یا افطار کا وقت سمجھ کر روزہ کھول لیا۔ان سب صورتوں میں روزہ کی قضا ہے۔ اور پہلی صورت یعنی جان بوجھ کر روزہ توڑنے میں قضا اور کفارہ دونوں لازم ہیں۔لیکن ایک رمضان میں اگر ایک سے زائد مرتبہ کفارہ لازم ہوگیا تو ایک ہی کفارہ ادا کرنا ہوگا۔البتہ روزے جتنے ٹوٹ گئے ان سب کی قضا کرنی ہوگی۔سب کے لیے الگ الگ کفارہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

7.6 اقسام

روزے کی پانچ بنیادی قسمیں ہیں۔

1. فرض،2. سنت،3. نفل،4. مکروہ،5. ناجائز

فرض روزے صرف رمضان المبارک کے ہیں۔رمضان کا مہینہ جس کو مل جائے اس کو رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے رمضان میں روزے نہ رکھ سکے تو رمضان کے بعد ان روزوں کی قضا کرنا ضروری ہے۔

سنت روزوں میں ایک تو یوم عاشوراء کا روزہ ہے۔ یہ روزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی رکھا۔ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی- اس لئے یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا سنت روزوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذی الحجہ کے ابتدائی 9 دنوں کے روزے بھی رکھنے چاہیے۔ خاص طور پر غیر حاجیوں کے لیے 9 ذی الحجہ یعنی یوم عرفہ کے روزے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ شوال کے مہینہ میں چھ روزے رکھنے کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ اس لیے شوال کے چھ روزے رکھنا بھی سنت ہے۔

سال کے تمام بقیہ ایام کے روزے نفل ہیں۔ حسب حیثیت اور حسب سہولت پورے سال روزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ سال کے ان روزوں کے لیے کچھ نبوی ہدایات ہیں ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً ہر قمری مہینہ کے ایام میں 14، 15، اور 16 تاریخ کے روزے رکھے جائیں۔ پیر یا جمعرات کو روزے رکھے جائیں۔ یا پھر شعبان میں بالعموم کثرت سے روزے رکھے جائیں۔ اسی طرح اشہرحرم یعنی رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں روزے رکھنا بھی پسندیدہ ہیں۔

صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا یا صرف ہفتہ کے دن روزہ رکھنا، یا ہمیشہ روزے رکھنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، روایت میں ان کی ممانعت آئی ہے، اس لئے اس طرح روزے رکھنا مکروہ ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، عیدالفطر کے دن اور عیدالاضحیٰ کے تین ایام میں روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی ضیافت کے ایام ہیں۔ ان میں کھانا پینا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہئے، روزہ رکھنا گناہ ہے۔

دوسری تمام عبادات کی طرح روزوں کی بھی اصل روح اطاعت الٰہی ہے۔ جن ایام میں روزے رکھنے کا حکم ہے ان میں ہر حال میں روزہ رکھنا اور جن ایام روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے ان میں ہر حال میں روزہ رکھنے سے پرہیز کرنا اور کھانا پینا عین دینداری اور ثواب کا عمل ہے۔ روزہ رکھنا اسی وقت ثواب کا کام ہے جب اطاعت الٰہی میں کیا جائے، اگر ہوائے نفس یا تقشّف یا تعذیب نفس کے لئے ہو تو روزہ رکھنا ثواب کا عمل نہیں رہ جاتا۔ ایک بات اور ہے کہ اللہ کی مقررہ کردہ ترجیحات کو تبدیل کرنا بھی گناہ ہے۔ خدا نے رمضان کے روزے فرض کئے ایک شخص بیماری کا عذر بنا کر رمضان کے روزے کا فدیہ دیتا ہے، لیکن وہی یوم عاشورہ یا ۱۴ر شعبان کو روزہ رکھتا ہے تو گویا اس نے خدا کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کی اور اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ترجیحات کو بدل دیا۔ اس طرح کے عمل سے بچنا ضروری ہے۔

7.7 خلاصہ

روزہ کے لئے عربی زبان میں لفظ صوم استعمال ہوتا ہے۔ صوم کے معنی رکنے اور باز رہنے کے آتے ہیں۔ اصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور مباشرت سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے۔ روزہ کی حالت میں دیگر اخلاقی برائیوں جھوٹ، غیبت، بدگوئی، جھگڑا فساد وغیرہ سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو روزہ مکمل تو ہو جائے گا لیکن ثواب اکارت جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص ان برائیوں سے باز نہ رہے اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

روزہ بڑی فضیلت کا عمل ہے۔ ایمان واحتساب کے ساتھ روزہ رکھنے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ایک روایت میں آتا ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کے پچھلے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے فرض ہیں۔ یہ ایک مہینہ کا تربیتی نصاب ہے جو انسان کی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔اس کے معائب اور برے خصائل کو دور کرتا ہے۔انسان کے اندر صبر وضبط اور برداشت کی صفت پیدا کرتا ہے۔تقویٰ کی آبیاری کرتا ہے،انسان اللہ کے حکم سے باوجود قدرت کے کھانے، پینے،شہوات کی تکمیل کرنے ،لڑنے جھگڑنے، گالی گلوچ، جھوٹ وغیبت سے باز رہتا ہے۔اس تربیتی نصاب کے ذریعہ اس کو اپنے نفس پر قابو آجاتا ہے اور وہ معاشرہ کا ایک بہترین فرد بن جاتا ہے۔رمضان المبارک کا مہینہ ایک ریفریشر کورس کی طرح ہے جس میں دینی فضائل کی آبیاری ہوتی ہے۔صدقہ وخیرات اور صدقۃ الفطر کے ذریعہ انسان کے دل کی تنگی دور کی جاتی ہے اور بھوک و پیاس اور صبر و برداشت کا براہ راست تجربہ کرایا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں روزے رکھنا اللہ رب العزت کا شکرادا کرنا بھی ہے۔ چوں کہ اس ماہ میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ وہ نسخہ کیمیا جس پر انسان کی دنیاوآخرت کی کامیابی کا انحصار ہے وہ اسی مبارک مہینہ میں نازل ہوا۔اس لیے انسانوں کی طرف سے یہ جذبہ تشکر کا بھی اظہار ہے۔

رمضان المبارک کی راتوں میں جاگنا اور عبادت کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔اس میں ایک رات ایسی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔وہ رات آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک ہے۔اس کا تذکرہ اور فضیلت قرآن مجید میں بھی آئی ہے اور احادیث میں بھی اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

رمضان میں اعتکاف کرنا سنت ہے۔اعتکاف مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سنت ہے۔اعتکاف کا مطلب ہے خدا کے لیے کسی گوشے یا کونے میں بیٹھ جانا اور اپنے اوقات کو عبادت اور اطاعت کے لیے مخصوص کر لینا۔

رمضان المبارک میں مالدار مسلمانوں پر صدقۃ الفطر نکالنا واجب ہوتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر روزہ دار سے روزہ رکھنے میں کوئی کمی یا کوتاہی ہوگئی ہوتو اس کا کفارہ ہو جائے، اور معاشرہ کے غریب اور نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوجائیں۔

روزہ کی حالت میں کھانے، پینے، مباشرت کرنے یا ایسی دوا وغیرہ لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ عین دوا معدہ تک پہنچ جائے۔مسواک کرنے، سرمہ لگانے، خوشبو لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ عاشوراء، یوم عرفہ اور شوال کے چھ روزے سنت ہیں اور عید الفطر کے ایک دن اور عید الاضحیٰ کے تین دنوں کے روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ باقی ایام میں دین کی مطلوبہ ترجیحات کے مطابق نفل روزے رکھے جاسکتے ہیں۔

7.8 نمونے کے امتحانی سوالات

1. روزہ کے احکام کیا ہیں؟

2. روزہ کے مصالح کیا ہیں؟

3. کن باتوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

5. روزہ کی اقسام بیان کیجیے۔

7.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرۃ النبی	علامہ سید سلیمان ندوی
2. اسلامی فقہ	مولانا مجیب اللہ ندوی
3. اسلامی عبادات	حکیم الطاف احمد اعظمی
4. خطبات	ابوالاعلیٰ مودودی
5. کلام نبوت	مولانا فاروق خاں صاحب
6. رمضان کے شرعی احکام	مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی

اکائی 8 : زکوۃ

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

8.2 تمہید

8.3 تعارف اور مصالح

8.4 نصاب زکوۃ

8.5 مصارف زکوۃ

8.5.1 فقراء و مساکین

8.5.2 عاملین زکوۃ

8.5.3 مؤلفۃ القلوب

8.5.4 غلاموں کی آزادی

8.5.5 مقروض

8.5.6 فی سبیل اللہ

8.5.7 ابن السبیل (مسافر)

8.6 طریقہ زکوۃ

8.7 خلاصہ

8.8 نمونے کے امتحانی سوالات

8.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

8.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اسلام میں زکاۃ کا مفہوم اور اس کی اہمیت کو سمجھ لیں، آپ اس بات سے بھی آگاہ ہو جائیں گے کے زکاۃ کا نصاب کیا ہے، زکاۃ کن لوگوں پر واجب ہے اور زکاۃ کہاں خرچ کی جائے گی، نیز زکاۃ کے مصالح کیا ہیں؟

8.2 تمہید

اسلامی زندگی میں زکوۃ کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اسلام کے اقتصادی نظام میں زکوۃ ایک روح کی مانند ہے۔ موجودہ دور کے معاشی و اقتصادی بحران کے حل میں زکوۃ کا اہم کردار ہوسکتا ہے۔ زکوۃ کے معنی پاک کرنے اور اضافہ کرنے کے آتے ہیں۔ آدمی اپنے مال میں سے زکوۃ نکال کے اس کو پاک کرتا ہے اور اللہ تعالی اپنے فضل و کرم سے اس مال کی پرورش فرماتا ہے جس میں سے زکوۃ نکالی گئی ہے۔ اور جو مال زکوۃ میں دیا گیا، اس میں بھی حسب نیت اضافہ کرتا رہتا ہے۔ زکوۃ ایک فریضہ ہے، جو نماز و روزہ کی طرح انسان کے اوپر فرض ہے۔ اس اکائی میں طلبہ کو زکوۃ کے معنی و مفہوم اور اسکی اہمیت و معنویت کے ساتھ زکوۃ کے مستحقین اور تقسیم زکوۃ کے طریق کار کو بیان کیا جائے گا۔ نیز زکوۃ کے احکام و مسائل پر روشنی ڈالی جائے گی۔

8.3 تعارف اور مصالح

اسلام کی پانچ بنیادوں میں سے ایک زکوۃ ہے، زکوۃ کے لئے ایک دوسرا لفظ صدقہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحی لفظ زکوۃ ہے اور ایک خاص مفہوم میں زکوۃ ہی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ صدقہ کے دوسرے مفاہیم ہیں۔

زکوۃ کے لفظی معنی دو آتے ہیں: پاک کرنا اور بڑھنا۔ قرآن مجید میں دونوں معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مریم میں ہے۔

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيّاً. وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيّاً (مریم: 13-12)

''اور ہم نے اس کو بچپن میں ہی فیصلہ کی قوت عطا کی تھی اور اپنے پاس سے نرم دلی اور پاکیزگی، اور وہ نہایت پرہیزگار تھا''۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (توبہ. 103)

''تم ان کے مالوں میں سے صدقہ قبول کرو، اس سے تم ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ اور ان کے لئے دعا کرو''۔

صدقہ کے لفظی معنی صداقت اور سچائی کے آتے ہیں، لیکن اس کا بکثرت استعمال خیرات وعطیات کے لئے ہوتا ہے، جیسے قرآن میں ہے۔

وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللّهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ: 75)

''ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے بہت سا مال عطا فرمایا تو ہم خوب خیرات کریں گے''۔

قرآن مجید میں اپنے اموال میں سے صدقات اور زکوۃ دونوں کے نکالنے کا حکم ہے۔ صدقات کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک فرض یعنی زکوۃ جو صرف امیروں پر فرض ہے۔ دوسرے واجب جو صدقۃ الفطر ہے یہ بھی صرف امیروں پر واجب ہے اور رمضان میں دیا جاتا ہے۔ تیسرے نفل صدقات جو کوئی بھی آدمی اپنی حیثیت کے مطابق غریبوں کی امداد کرتا ہے۔ فرض صدقہ یعنی زکوۃ کے علاوہ بھی اسلام میں صدقہ کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے اور بسا اوقات زکوۃ کے علاوہ دیگر نفل صدقات واجب بھی ہوجاتے ہیں۔ قرآن نے ایک طرف تو صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ دوسری طرف صدقہ کرنے والوں کی تعریف وتوصیف کی ہے اور صدقہ کرنے کو ایمان و عمل صالح سے جوڑا ہے۔ تیسری طرف مال و دولت کی بے انتہا محبت کی مذمت کی ہے۔ اس طرح مختلف پہلوؤں کے ذریعہ لوگوں کو صدقہ وخیرات کی طرف متوجہ کیا ہے۔

زکوۃ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ جس طرح نماز انسان کی بدنی عبادت ہے، اسی طرح زکوۃ مالی عبادت ہے۔ نماز کے ذریعہ بندہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کی جان رب العالمین کا عطیہ ہے اور وہ پوری طرح اپنے رب کا تابع فرمان ہے۔ اسی طرح زکوۃ کے ذریعہ بندہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کا مال بھی اللہ کا عطیہ ہے اور وہ اپنے مال کو حکم خداوندی سے ہر جگہ خرچ کرنے کو تیار ہے۔

اسلام کی نظر میں صدقہ کرنا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا اتنا اہم ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً بیاسی (82) مقامات پر نماز اور مال کا تذکرہ ایک ساتھ آیا ہے، مثلاً:

> وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ:5)
>
> ''ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی کریں بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ اور یہی دین ہے بالکل درست''۔

ایک جگہ فرمایا گیا:

> فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ فَخَلُّواْ سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ(توبہ:5)
>
> ''اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

احادیث میں بھی کثرت سے زکوۃ دینے کا حکم وارد ہوا ہے۔ رسول اللہ جس کسی کو بیعت کرتے تو اس سے زکوۃ ادا کرنے کی بابت بھی عہد لیا کرتے تھے۔ حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے میں نے صرف تین چیزوں کے بارے میں بیعت کی، نماز پڑھنے، زکوۃ دینے اور ہر معاملے میں مسلمانوں کی خیرخواہی کرنے کی (بخاری) اسلام میں نماز اور زکوۃ دونوں عبادتیں، بالعموم ایک ساتھ ذکر کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اول کے زمانے میں جب کچھ قبائل نے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو خلیفہ اول حضرت ابوبکر نے ان کے ساتھ جنگ کی۔ حضرت ابوبکر کا استدلال یہی تھا کہ قرآن میں نماز و زکوۃ کا حکم ایک ساتھ ہے، لہٰذا جو شخص ان دونوں کے درمیان تفریق کرے گا میں اس کے ساتھ جنگ کرونگا۔

جس طرح نماز انسان کے اوپر خدا کا حق ہے، اسی طرح زکوۃ انسان کے اوپر معاشرہ کا حق ہے۔ انسانی معاشرے میں سب طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ صاحب ثروت بھی ہوتے ہیں اور نادار و مفلس بھی ہوتے ہیں۔ امیروں کی دولت تنہا ان کی نہیں ہوتی بلکہ امیر و غریب مل کر جو معاشرہ بناتے ہیں دولت بنیادی طور پر اس معاشرہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ معاشرہ کے اندر کاروبار اور ضروریات زندگی کی کفالت ایک ایسا سلسلہ ہے جو پورے معاشرے کو باہم مربوط رکھتا ہے اور یہی ربط باہمی ہے جس کے لئے روپے پیسے درمیانی واسطہ کا کام کرتے ہیں، مال و دولت گویا ایک دھاگا ہے جو پوری سوسائٹی کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ معاشی سرگرمی قائم رہتی ہے ورنہ صرف امیروں کی دولت ان کے کسی کام کی نہیں ہے۔ اگر انتہائی دولت مند آدمی ریگستان میں اپنی تمام دولت کے ساتھ ہو تو اس کو سب سے عزیز دولت روپیہ پیسے نہیں ہوں گے بلکہ کھانا اور پانی ہوگا۔ چونکہ معاشی سرگرمیوں کے جاری رہنے میں غریبوں اور ناداروں کا بھی اہم حصہ ہوتا ہے اس لئے ان کے حقوق بھی امیروں کی دولت میں ثابت ہیں، اور معاشرے کے امیر لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کمزور لوگوں کا نہ صرف خیال رکھیں، ان کی ضروریات کی تکمیل کریں بلکہ اس کی بھی کوشش کریں کہ وہ بھی معاشی طور پر خود کفیل ہو جائیں۔ امیروں کی اس ذمہ داری کا کم سے کم درجہ زکوۃ ہے کہ وہ اپنے فاضل اور ضرورت سے زیادہ مال میں سے ڈھائی فیصد ان غریبوں کو بھی دیں، تاکہ ان کی معاشی کفالت بھی ہو سکے۔ اسلام کی نظر میں دولت کے حوالے سے اصولی بات یہ ہے کہ دولت کو صرف امیروں کے درمیان گردش نہیں کرنا چاہئے، سورہ حشر میں ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاء مِنكُمْ (الحشر:7)

''تا کہ وہ تمہارے امیروں کے درمیان ہی گردش نہ کر کے رہ جائے''۔

اسلام میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا بڑی نیکیوں میں سے ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی فضیلت وارد ہوئی ہے، مثلاً ایک جگہ ہے:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ (مزمل:20)

''اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور اللہ کو قرض دو، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس پاؤ گے''۔

اس آیت میں زکوۃ دینے کا بھی حکم ہے اور زکوۃ کے علاوہ بھی مال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اور اس خرچ کو اللہ تعالی نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے لئے قرض فرمایا ہے۔

ایک آیت میں یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الأَرْضِ (البقرہ267)

''اے مسلمانوں اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں اس میں سے کچھ خیرات دو۔''

ایک آیت میں فرمایا گیا۔

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ . وَالَّذِیْنَ فِیْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ . لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ (معارج: 23-20)

''جو اپنی نمازوں کو ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کا حصہ مقرر ہے''۔

معاشرہ کے ضرورت مند لوگوں کی خبر گیری اسلام کی نظر میں عبادت ہے۔ زکوۃ کی فرضیت سے پہلے بھی خیرات کرنے اور ناداروں کی مدد کا حکم موجود تھا، جیسے:

وَمَا أَدْرَاکَ مَا الْعَقَبَةُ .فَکُّ رَقَبَةٍ . أَوْ إِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ .یَتِیْماً ذَا مَقْرَبَةٍ .أَوْ مِسْکِیْناً ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: 16-12)

''اور تو کیا سمجھا وہ گھاٹی کیا ہے (کسی قرض دار، یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچے کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا''۔

ایک اور جگہ ہے:

فَذَلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ .وَلَا یَحُضُّ عَلَی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ . (ماعون:2۔3)

''وہی ہے جو یتیم بچے کو دھتکارتا ہے اور غریب کے کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا''۔

اچھے مسلمانوں کی خوبیوں میں ایک بات یہ بتائی کہ وہ ضرورت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

وَیُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَی حُبِّهِ مِسْکِیْناً وَیَتِیْماً وَأَسِیْراً .إِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِیْدُ مِنکُمْ جَزَاء وَلَا شُکُوراً . (الدھر:8۔9)

''اور وہ محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم تم کو صرف خدا کے لئے کھلاتے ہیں۔تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ''۔

احادیث میں بھی مال خرچ کرنے کا تذکرہ کثرت سے آیا ہے۔ اور بالکل شروع اسلام سے مال خرچ کرنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے، بعثت نبوی کے چھٹے سال مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی وہاں حضرت جعفر نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ بھی تھے ''اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور روزے رکھیں اور زکوۃ دیں''۔ اور اوپر مذکور آیات مبارکہ بھی مکہ کے شروع کے زمانے کی ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کی تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ کثرت سے مال خرچ کریں اور مال کی محبت ان کے اور ان کے فرائض کے درمیان حائل نہ ہوجائے۔

خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین ہر مذہب میں ہے، خواہ یہودیت، عیسائیت، ہندو مذھب، بدھ مت، جین مت، سکھ مت ہو غرض یہ کہ ہر مذھب میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اپنے مال میں سے غریبوں کا حق نکالنے کا حکم موجود ہے البتہ مال

کو غریبوں تک پہنچانے کا معاملہ بالعموم افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے کہیں سب کچھ خرچ کرنے کی بات ہے، کہیں دان کرنے کے لئے ایک قوم مخصوص ہے، کہیں دوسرے امور ہیں، جن کی وجہ سے خدا کی راہ میں نکالے گئے مال کا راست فائدہ غریبوں اور ضرورت مندوں کو نہیں ہوتا، بلکہ اکثر انہی کو ہوتا ہے جو خود صاحب حیثیت ہیں۔ یا پھر غریبوں کے حق میں صرف نان شبینہ آتی ہے۔ وہ پیٹ تو بھر لیتے ہیں لیکن معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہو پاتے۔

اسلام نے مال خرچ کرنے کے پورے نظام میں کچھ اصلاحات کیں تاکہ ان کا فائدہ غریبوں کو ملے اور پورا پورا فائدہ ملے نیز اس کے فوائد پائیدار اثرات مرتب کریں۔

اسلام نے صدقہ وخیرات کے سلسلہ میں پہلی اصلاح تو یہ فرمائی کہ صدقہ وخیرات کو عبادت کا درجہ دیا۔ اور جس طرح انسان کے اوپر نماز فرض ہے اسی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو بھی فرض قرار دیا، جیسا کہ اوپر متعدد آیات اور احادیث کے حوالے سے گذر چکا ہے، غریبوں کی مدد محتاجوں کی خبر گیری اور بیماروں کی تیمارداری کو خالص عبادت کا درجہ عطا فرمایا۔ اس سلسلہ کی اور بھی روایات ہیں جن میں سماجی خدمات کی اس تعبدی صفت کو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اے ابن آدم، میں بیمار ہو گیا تھا تو نے میری عیادت نہ کی، بندہ عرض کرے گا اے رب میں بھلا تیری عیادت کیسے کرتا۔ تو تو سب کا پالنے والا ہے۔ اللہ تعالی فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا لیکن تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی عیادت کو آتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا اے رب میں تجھ کو کیونکر کھانا کھلاتا، تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ اللہ تعالی فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے رب میں تجھے پانی کیونکر پلاتا تو تو رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا: میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا، اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم)

یہ مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس میں خالص سماجی معاملات کی اتنی اہمیت بیان کی گئی ہے گویا وہ خالص تعبدی امور ہوں، اس طرح اسلام خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بندوں کی خبر گیری کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے، یتیموں کی کفالت کرنے مقروضوں اور قیدیوں کو رہا کرانے میں انسان کی کوششوں کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔

صدقہ وزکوۃ کے لئے اسلام کی دوسری اصلاح یہ ہے کہ زکوۃ لینا، یا صدقہ پر منحصر رہنا اسلام کی نظر میں نیکی نہیں ہے، بلکہ عیب ہے اور انسان کو چاہئے کہ اس عیب کو دور کرے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ لیکن ایک جگہ بھی امداد قبول کرنے کی بات نہیں کہی گئی ہے، مال ودولت کی ذخیرہ اندوزی کی تو مذمت ہے لیکن محنت کرنے یا مال کھانے کی مذمت نہیں ہے۔ بلکہ بعض عبادات کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالی مال ودولت بھی فراوانی سے عطا فرمائے گا، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً . يُرْسِلِ السَّمَاء عَلَيْكُم مِّدْرَاراً .وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَاراً (نوح:12-10)

''پس میں نے کہالوگوا پنے رب سے استغفار کرو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے، وہ تم پرآسمان سے خوب بارش برسائے گا اور تمہارے مال واولاد میں اضافہ کرے گا اور تمہارے لئے باغات پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا''۔

اس سورہ میں آگے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ منکرین نے حضرت نوح کی پیروی تو کی نہیں بلکہ غیروں کی اتباع کی جس نے ان کے مال واولاد میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

اللہ کے رسولؐ نے بھی لوگوں کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور خود سوال نہ کرنے کی تلقین فرمائی، ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص (بلاضرورت) سوال کرتا رہے گا وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن اس طرح ملے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا، (بخاری)، ایک روایت میں ہے کہ سوال کرنا مالدار آدمی کے لئے جائز نہیں ہے اور نہ توانا و تندرست آدمی کے لئے جائز ہے۔ البتہ ایسے شخص کے لئے جائز ہے جس کے افلاس نے اس کو زمین پر گرادیا ہو یا جو تاوان یا قرض کے بوجھ سے دب گیا ہو، اور جو شخص اپنے مال کو بڑھانے کے لئے لوگوں سے سوال کرے تو یہ سوال قیامت کے روز اس کے چہرے پر ایک زخم ہوگا، اور جہنم کا گرم پتھر ہوگا جس کو وہ کھائے گا۔ (ابوداؤد)۔

اسلام نے نہ صرف سوال سے بچنے کی تلقین کی ہے بلکہ آگے بڑھ کر ضرورت مندوں کی امداد واعانت کا حکم دیا ہے، بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے ذمہ صدقہ دینا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر کسی کے پاس دینے کو نہ ہو تو کیا کرے، رسول اللہؐ نے فرمایا محنت کر کے کمائے اس طرح خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا یہ بھی نہ کر سکے، آپ نے فرمایا تو کسی غمزدہ ضرورت مند کی مدد کرے، لوگوں نے کہا، اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے، آپؐ نے فرمایا لوگوں کو نیکی کا حکم کرے، لوگوں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کر سکے تو آپ نے فرمایا اپنے آپ کو برائی اور شر سے بچائے کہ یہ بھی صدقہ ہے۔ (بخاری، مسلم)

اسلام نے اس طرح ایک معاشرہ تعمیر کیا جس میں مانگنا باعث ذلت ٹھہرا اور دینا باعث عزت۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (الیدالعلیا خیر من الید السفلیٰ)

اسلام نے زکوۃ کے معاملے میں تیسری بڑی اصلاح یہ کی کہ زکوۃ اور صدقات کے مصارف میں سے اس طبقہ کو بیک بنی و دوگوش باہر نکال دیا جو تاریخ کے پورے دورانیہ میں عطیات وخیرات کا یکا وتنہا مالک بنا رہا ہے۔ یعنی مذہبی طبقہ، اور واضح طور پر فرما دیا کہ یہ اموال غریبوں کا حق ہیں لہذا ان کے مستحق صرف غریب لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا تا کہ مذھبی طبقہ وجود میں ہی نہ آئے۔ آپؐ نے فرمایا صدقہ ہمارے لئے جائز نہیں ہے، اس طرح اسلام نے اس کو یقینی بنایا کہ زکوۃ اس کے مستحقین یعنی غریبوں تک پہنچ جائے۔

اسلام نے زکوۃ وصدقات کی اہمیت کے ساتھ اس کے آداب بھی بتائے، قدیم اقوام میں جو خیرات کے طریقہ تھے ان کی اصلاح کی اور زکوۃ کے واجب ہونے کے مصالح بھی بیان کئے۔ زکوۃ کے مصالح اور فوائد میں عبادت کا جو پہلو ہے اور خدا کے حکم کو پورا کرنے کا جو ثواب ہے، اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی جو فضیلت ہے ان سب کے علاوہ زکوۃ کے انسانی زندگی پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرہ زکوۃ کے نظام سے مضبوط معاشی بنیادوں پر استوار ہو جاتا ہے۔ زکوۃ کے اس دینی اور اخروی مصالح کا تذکرہ عصر حاضر کے دو بڑے اہل علم کے حوالے سے کیا جاتا ہے، مولانا علی میاں نے زکوۃ کے اخروی فائدوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہت سے معاصر اہل قلم اور اہل فکر جو جدید معاشی فلسفوں اور علم الاقتصاد کی غیر معمولی اہمیت اور ہمہ گیری سے کم وبیش متاثر اور ذہنی طور پر مرعوب ہیں سارا زور زکوۃ کے اقتصادی مصالح اور منافع پر دیتے ہیں اور اس کو صرف ایک عادلانہ ٹیکس قرار دیتے ہیں یا زیادہ محتاط الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تحریروں کو پڑھنے والا کم از کم یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کی رائے زکوۃ کے بارے میں یہ ہے کہ دنیا کے معاشی نظاموں نے اب تک جتنے ٹیکس انسانی سوسائٹی پر عائد کئے ہیں، یہ اسلامی ٹیکس ان سب سے زیادہ حکیمانہ، منصفانہ اور متوازن ہے، اس لحاظ سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ زکوۃ اشتراکیت کی نہایت مستحکم بنیاد بن سکتی ہے جسے اسلام نے اپنی ترقی اور عروج کے بہترین زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، وہ (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) زکوۃ کی اس حقیقی روح کو فراموش کر جاتے ہیں جو اس کے پورے نظام میں جاری وساری ہے۔ یہ روح ہے عبادت اور تقرب الہی کی۔ اسی طرح وہ اس کے بنیادی مقصد اور اصل حکمت ومصلحت کو نظر انداز کر دیتے ہیں یعنی نفس کو بخل، خودغرضی، انانیت اور فقراء کی حق تلفی اور قلب کو قساوت سے پاک وصاف کرنا۔ اللہ تعالی کی قبولیت ورضا حاصل کرنے اور فقراء وضعفاء کی دلداری اور ہمدردی کے نتیجے میں مال میں پاکی اور نورانیت اور خیر وبرکت کا ظہور۔'' (ارکان اربعہ ص 141)

زکوۃ کے معاشرتی اور سماجی نیز معاشی فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا ہے:

''یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے، یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے، یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لئے بے کاروں کا سرمایہ اعانت ہے۔ یہ ان کے لئے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعہ معاش ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادہ اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو، کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا ہوگا، مر گئے تو بیوی کا کیا حشر ہوگا۔ کوئی آفت ناگہانی آپڑی بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آگیا، دیوالیہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے خلاصی کی کیا سبیل ہوگی۔ سفر میں پیسہ پاس نہ ہو تو کیونکر گذر بسر ہوگی، ان سب فکروں سے صرف زکوۃ تم کو ہمیشہ کے لئے بے نیاز کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی

فیصد دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرالو،اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔کل جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہو گی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے زیادہ تم کو واپس مل جائیگا۔''(اسلام اور جدید معاشی نظریات ص 156-157)

زکوۃ ایک عبادت ہے اس کی تعبدی اہمیت اپنی جگہ ہے اور اصل وہی ہے لیکن اگر کسی عبادت کے دیگر فوائد نص میں مذکور ہوں یا ان کو عقل و بداہت سے سمجھا جا سکے تو ان فوائد کو ملحوظ خاطر رکھنا غلط نہیں ہے۔اوپر دونوں طرح کی رائیں دی گئی ہیں ایک میں زکوۃ کے اخروی اور اخلاقی فوائد کا تذکرہ ہے اور دوسری میں زکوۃ کے معاشی فوائد کا بیان ہے۔ دونوں قسم کے فوائد کی اہمیت ہے اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے، زکوۃ کے اخلاقی فوائد بھی ہیں اور زکوۃ معاشرہ کے ضرورت مند افراد کی خبر گیری کا ذریعہ بھی ہے، زکوۃ کے مصارف کا بیان خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی معاشی اہمیت بھی بہت ہے۔مصارف زکوۃ میں انفرادی اور اجتماعی ضرورت کے جتنے مواقع ہیں سب کا احاطہ کر لیا گیا ہے، اس میں غریب، محتاج، مسافر، مقروض، قیدی اور فی سبیل اللہ کی مدات ہیں اور ان مدات کی اہمیت سراسر معاشی ہے۔عصر حاضر کے ایک اور بڑے عالم حکیم الطاف احمد اعظمی نے ان آراء میں مزید توازن پیدا کرتے ہوئے مصالح زکوۃ کے باب میں لکھا ہے:

''اسلام نے جتنی عبادات فرض کی ہیں ان کا اصلی مقصد تو تقوی پیدا کرنا ہے یعنی نفس کی مخالفت اور خدا کی برضا و رغبت فرماں برداری۔لیکن حکیم مطلق نے اپنے بندوں کی فلاح کے خیال سے ان عبادات کے لئے جو ضابطہ عمل مقرر کیا اس میں روحانی منافع کے ساتھ ساتھ دنیاوی مصالح و منافع کی بڑی حکیمانہ رعایت رکھی ہے، مثلاً نماز کو لیں، اس کا مقصد خدا کا ذکر ہے، اور اس ذکر کے ذریعہ اس سے حسّی اور جذباتی طور پر جڑنا ہے۔اس ذکر کا روحانی فائدہ یہ ہے کہ نمازی اس کے ذریعہ فواحش و منکرات سے محفوظ رہتا ہے۔(سورہ عنکبوت 45) ٹھیک یہی معاملہ زکوۃ کا ہے اس کا بنیادی مقصد نفس کا تزکیہ ہے۔یعنی حرص و بخل کی آلائشوں سے نفس کو پاک کرنا، تاکہ بندہ حب مال کی بندش سے آزاد ہو جائے کہ یہ چیز خدا کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن اس غرض کے حصول کے لئے جو طریقہ بتایا گیا اور اس کے لئے جو قوانین وضع کئے گئے ان میں بندوں کے معاشی مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مصارف زکوۃ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔''(اسلامی عبادات ص 252-353)

8.4 نصاب زکوۃ

زکوۃ اور صدقات کے لئے اسلام میں تحریض و تشویق زیادہ کی گئی ہے قواعد و ضوابط کم بیان کئے گئے ہیں۔اصل چیز مال خرچ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے اس لئے اس کو صرف ایک حد تک ہی اصول و ضابطوں کا پابند بنایا ہے۔اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آدمی اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرے چاہے امیر ہو یا غریب ہر حال میں مال خرچ کرے، اس کے پاس جو ضرورت سے فاضل ہو اس کو خرچ کر دے، اگر کچھ بھی نہیں ہے تو کما کر خرچ کرے لیکن راہ خداوندی میں مال ضرور خرچ کرے۔

فرض زکوۃ کے لئے اسلام نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے کہ وہ امیروں پر فرض ہے، غریبوں پر نہیں، لیکن زکوۃ کی فرضیت کے لئے امیر ہونے کے ساتھ اور بھی شرائط ہیں۔ سب سے پہلی شرط تو امیر ہونا ہے۔ شریعت کی نظر میں ہر وہ شخص امیر ہے جس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات سے فاضل مال اتنا ہو کہ اس کی مالیت ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر ہو جائے، یا اس کے پاس بالفعل کم از کم اتنا سونا یا چاندی موجود ہو۔ اس کو اسلام کی اصطلاح میں امیر کہتے ہیں۔ اور اس مقدار کو نصاب کہتے ہیں، جس آدمی کے پاس اتنی مالیت ہو وہ امیر ہے۔ اور امیر پر ہی زکوۃ فرض ہوگی۔

وجوب زکوۃ کی دوسری شرط یہ ہے کہ یہ مال نامی ہو۔ یعنی اس کے منافع آمدنی کی شکل میں انسان کو حاصل ہوتے ہوں۔ جس مال سے آمدنی نہ ہو یا اس کی آمدنی سے براہ راست استفادہ کا موقع نہ ہو اس پر زکوۃ نہیں ہے۔ مثلاً رہائشی مکان، کاشت کی زمین وغیرہ، ان چیزوں کی مالیت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو وہ زکوۃ میں شامل نہیں ہوں گی۔ وجوب زکوۃ کی تیسری شرط مال پر بالفعل تصرف کا اختیار رہنا ہے۔ جس مال پر کسی ایک شخص کی ملکیت تامہ یعنی پوری ملکیت ثابت ہو، اور وہ اس کو خرچ کر سکتا ہو، اس مال پر زکوۃ واجب ہوگی۔ پراویڈنٹ فنڈ یا قرض میں پھنسی ہوئی رقم وغیرہ پر زکوۃ نہیں ہے۔ اس لئے رفاہی ادارے، تعلیمی مراکز، ٹرسٹ، موقوفہ املاک یا مساجد وغیرہ پر زکوۃ عائد نہیں ہوتی۔

وجوب زکوۃ کے لئے چوتھی اور آخری شرط حولان حول ہے۔ یعنی جب کوئی مالدار شخص شرعی اصطلاح کے مطابق نصاب زکوۃ کا مالک ہو جائے تو اس پر اس وقت زکوۃ واجب نہیں ہوتی، وہ زکوۃ ادا کرنے کے لائق اس وقت ہوگا جب یہ امیری پائیدار ہو، لمحاتی نہ ہو۔ اس کا معیار اسلام نے یہ رکھا ہے کہ اس کے پاس بقدر نصاب مالیت ایک سال تک باقی بھی رہے، تب زکوۃ واجب ہوگی، اگر ایک سال سے قبل وہ پھر غریب ہو گیا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

کسانوں پر ان کی فصلوں میں اور مویشی پالنے والوں پر ان کے مویشیوں میں بھی زکوۃ ہے۔ اور اسلام نے اس کی بھی کم سے کم مقدار متعین کی ہے۔ زمینی پیداوار میں اسلام نے ایک فرق اور کیا ہے کہ جس زمین کی سینچائی کسان نے خود کی ہو اس میں سے زکوۃ کم لی جائے گی اور جس کی سینچائی آسمانی پانی سے ہوئی ہو اس کی زکوۃ زیادہ لی جائے گی۔

نقد یا مال تجارت میں زکوۃ کی مقدار ڈھائی فیصد ہے۔ اور زرعی پیداوار اور مویشیوں میں زکوۃ کی مقدار آگے دیئے چارٹ میں واضح کی گئی ہے۔

نام	مقدار نصاب	زکوۃ کی شرح
سونا	ساڑھے سات تولہ	ڈھائی فیصد
چاندی	ساڑھے باون تولہ	ڈھائی فیصد
نقدی	سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر	ڈھائی فیصد
زرعی پیداوار (اگر آب پاشی خود کی ہے)	حنفیہ کے نزدیک پیداوار کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، باقی ائمہ 5 وسق (تقریباً۔ چھ کوئنٹل ایک من اور تیرہ کلو) سے زائد پر ہی زکاۃ کے قائل ہیں۔	بیسواں حصہ

زکوۃ کی شرح	مقدار نصاب	نام
دسواں حصہ	,,	زرعی پیداوار (اگر بارش کے پانی سے سینچائی ہوئی ہے)
ہر پانچ پر ایک بکری	5 سے زیادہ 24 تک	اونٹ
ایک عدد ایک سالہ اونٹنی	25 سے 35 تک	,,
دو سالہ اونٹنی (ایک)	36 سے 45 تک	,,
تین سالہ اونٹنی (ایک)	46 سے 60 تک	,,
چار سالہ اونٹنی (ایک)	61 سے 75 تک	,,
دو سالہ اونٹنی (دو عدد)	76 سے 90 تک	,,
تین سالہ اونٹنی (دو عدد)	91 سے 120 تک	,,
ہر چالیس پر دو سالہ اور ہر پچاس پر تین سالہ اونٹنی۔	120 سے زائد	,,
ہر تیس گایوں پر دو سالہ ایک بچھڑا اور ہر چالیس گایوں پر تین سالہ ایک بچھڑا۔	30 عدد	گائے بھینس
ایک بکری	40 سے زیادہ 120 تک	بکری
دو بکریاں	121 سے زیادہ 200 تک	,,
تین بکریاں	201 سے زیادہ 399	,,
ہر 100 پر ایک بکری	400 سے زائد	,,
کل سامان تجارت کی مالیت کا ڈھائی فیصد	نصاب کے لئے سونے چاندی کا اعتبار ہوگا۔	سامان تجارت
ڈھائی فیصد۔	آمدنی پر زکوۃ ہوگی، کارخانہ یا مشینوں پر نہیں ہوگی	کارخانہ
	ان سب میں کوئی زکوۃ نہیں۔	ہیرے، جواہرات، قیمتی کپڑے، سواری، سامان، فرنیچر وغیرہ۔

8.5 مصارف زکوۃ

اسلام میں صدقات وخیرات کا مصرف کوئی مخصوص طبقہ نہیں ہے بلکہ ضرورت مند ہیں۔ اورصدقات نافلہ کے لئے اسلام نے کوئی پابندی بھی نہیں لگائی ہے، جس کو چاہے صدقہ دے لیکن فرض صدقہ یعنی زکوۃ میں مصرف کی پابندی ہے، اگر ان مصارف میں زکوۃ دی گئی تب ہی زکاۃ ادا ہوگی، ان کے علاوہ اگرکسی اورکو زکوۃ دے دی تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ اس لئے زکوۃ کا مصرف میں دینا ضروری ہے، اوردینا بھی ایسا کہ مصرف یعنی جس کو زکوۃ دی گئی ہے وہ اس مال زکوۃ کا مالک ہو جائے اوراس پر تصرف کا مکمل اختیار مل جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مصارف زکوۃ کا معاملہ نہ نبی کے اوپر چھوڑا اورنہ کسی اور پر بلکہ ان کا فیصلہ خود فرما دیا، چنانچہ اس کی آٹھ مدات مقرر کیں۔ (ابوداؤد)

زکوۃ غریبوں اورمسکینوں کا حق ہے، اس کے باوجود اسلام میں زکوۃ کی آٹھ مدات مقرر کی گئیں۔ یہ دراصل زکوۃ کے وسیع نظام اور وسیع تر فوائد کے لئے ہے کیوں کہ بسا اوقات صرف غریب ہی ضرورت مند نہیں ہوتے بلکہ امیر بھی ضرورت مند ہو جاتے ہیں، تو اگر زکوۃ صرف غریبوں کے لئے ہوتی تو ضرورت مند امیر بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں وہ ایک بڑی آسانی سے محروم ہو جاتے۔ اس لئے اسلام نے زکوۃ کے مصرف کے طور پر اصل بنیاد حاجت کو قرار دیا ہے۔ حاجت یا ضرورت چاہے یک گونہ دائمی ہو یا وقتی، یک گونہ دائمی حاجت فقیر ومسکین کی ہوتی ہے۔ اوروقتی حاجت مسافر ومقروض وغیرہ کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں مصارف زکوۃ کا بیان اس طرح آیا ہے۔

> إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ(توبه: 16)
>
> ''صدقات تو دراصل فقراء مساکین، عاملین زکوۃ، تالیف قلب کے مستحقین، نیز اس لئے ہیں کہ گردنوں کو چھڑانے، قرض داروں کے (قرض ادا کرنے) فی سبیل اللہ اور مسافروں کی امداد میں خرچ کئے جائیں''۔

اس آیت میں مذکور مصارف زکوۃ کی تفصیل یہ ہے۔

8.5.1 فقراء ومساکین

زکوۃ کا اولین مصرف فقراء ومساکین ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقراء ومساکین کون ہیں، علما نے ان دونوں مصارف کا ذکر کرتے ہوئے دو باتیں بیان کی ہیں ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ فقراء ومساکین مترادف الفاظ ہیں، اور دونوں سے مراد حاجت منداور ضرورت مند لوگ ہیں۔ اور الفاظ کی تکرار احتیاج کو بیان کرنے کے لئے ہوئی ہے ورنہ مفہوم کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔

زیادہ تر علماء دونوں کو الگ الگ بتاتے ہیں، اور فقیر ومسکین کی تعریف الگ الگ کرتے ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک فقیر وہ ہے جو صاحب نصاب نہ ہو یعنی اس کے پاس ملکیت تو ہو لیکن اتنی ملکیت نہ ہو کہ وہ صاحب نصاب ہو جائے اور مسکین اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی ملکیت ہی نہ ہو۔

قرآن وحدیث کے نصوص سے ایک بات کا عندیہ ملتا ہے کہ وہ نادار جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا وہ فقیر ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت 273 میں مذکور ہے۔ اور مسکین وہ ہے جو سوال کرتا ہے۔ مسکنت میں ذلت کا پہلو ہے اور اسلام میں سوال ایک ذلت ہی ہے اس لئے مسکین اس کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور فقیر وہ ہے جو سوال نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے برعکس بھی استعمال ہوا ہے اس طرح حاجت مندوں کی دو قسمیں ہوگئیں۔ اور اس لئے قرآن میں فقیر اور مسکین کو دو الگ الگ زمرے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان دونوں زمروں کے تعین میں اور بھی گفتگو کی گئی ہے۔ خلاصہ سب کا یہی ہے کہ غریب آدمی جس کے پاس بقدر نصاب مال نہ ہو یا اس کی آمدنی کے ذرائع اتنے ہوں کہ اس کے اور اس کے زیر کفالت لوگوں کے اخراجات پورے طور پر ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہوں، ایسے لوگوں کو زکوۃ دی جانی چاہئے یہ زکوۃ کے اولین مصارف ہیں۔

8.5.2 عاملین زکوۃ

زکوۃ کا دوسرا مصرف وہ لوگ ہیں جو زکوۃ کی وصولیابی اور تقسیم کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر امیر ہوں اور خود صاحب نصاب ہوں تب بھی وہ زکوۃ لے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں۔ زکوۃ کی اس مد سے ایک اور نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ زکوۃ کا نظام اجتماعی ہونا چاہئے انفرادی نہیں۔ چوں کہ عاملین زکوۃ کا ایک پورا محکمہ ہوگا جس کے تحت لوگ مختلف قسم کی زکوۃ وصول کریں گے اور پھر اس کو مستحقین تک پہنچائیں گے یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے اجتماعی نظام ضروری ہے۔ لیکن جیسا کہ دوسری نصوص میں صراحت ہے، اگر کوئی شخص انفرادی طور پر اپنے مال کی زکوۃ نکال دے تو یہ بھی جائز ہے۔

8.5.3 مؤلفۃ القلوب

ترتیب کے لحاظ سے مؤلفۃ القلوب زکوۃ کا چوتھا مصرف ہے۔ مؤلفۃ القلوب میں غیر مسلم یا جدید الاسلام لوگ شامل ہیں جن کی تالیف قلب کے ذریعہ ان کو اسلام کی طرف ترغیب دی جاتی ہے، رسول اللہؐ نے ایک غیر مسلم صفوان بن امیہ کو زکوۃ کے مال میں سے مدد دی تھی۔ اس لئے تالیف قلب کے مقصد سے غیر مسلم کو بھی زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ ورنہ زکوۃ صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

بعض علماء کے نزدیک یہ مد یعنی مؤلفۃ القلوب اب منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس مد کے بارے میں فرمایا تھا کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوۃ جب دی جاتی تھی جب اسلام کمزور تھا اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

8.5.4 غلاموں کی آزادی

زکوۃ کا پانچواں مصرف غلاموں کو آزاد کرانا ہے، یہ مد اب بدلے ہوئے حالات میں باقی نہیں رہی۔

8.5.5 مقروض

زکوۃ کا چھٹا مصرف غارم یعنی مقروض ہیں۔ ایک شخص چاہے عام حالات میں زکوۃ کا مستحق نہ ہو لیکن اگر وہ کسی وجہ سے مقروض ہو جائے تو اس کی قرض کی ادائیگی زکوۃ کی مد سے بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن مقروض کے سلسلہ میں فقہاء نے بعض شرائط لکھی ہیں۔ جیسے قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس کو ذلت کا سامنا ہو، قرض کسی معصیت کے لئے نہ لیا ہو، نمود و نمائش یا تقریب وغیرہ میں اسراف کے

لئے بھی مقروض نہ ہوا ہو وغیرہ۔ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے مقروض ہوا ہے تو اس کے قرض کی ادائے گی زکوۃ کے مال سے کی جاسکتی ہے۔

8.5.6 فی سبیل اللہ

زکوۃ کا ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ فی سبیل اللہ میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں جہاد، ہجرت، اشاعت اسلام اور موجودہ زمانے میں مدارس اسلامیہ اور دعوتی لٹریچر کی تیاری وغیرہ آتے ہیں۔ زکوۃ کی مد سے ان تمام امور میں امداد کی جاسکتی ہے۔ بعض علماء فی سبیل اللہ کی مد کو جہاد تک محدود رکھتے ہیں۔

8.5.7 ابن السبیل (مسافر)

زکوۃ کا آٹھواں مصرف ابن السبیل ہے یعنی مسافر، مسافر حالت سفر میں ایک غریب ہی کے مانند ہو جاتا ہے چونکہ مسافر اپنے گھر پہ چاہے امیر ہو لیکن اس کی دولت اس سے دور ہے اس لئے مسافروں کی امداد بھی زکوۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض سہولیات ایسی فراہم ہوگئی ہیں کہ تصرفات مالیہ کے لیے بھی فاصلے بے معنی ہو گئے، وہیں اے ٹی ایم کی سہولت نے انسان کو ہر جگہ یہ موقعہ فراہم کر دیا ہے کہ وہ اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نکال سکتا ہے اس لیے ابن السبیل کی مد کا استعمال بھی شاذ و نادر ہی ہوگا۔

8.6 طریقہ زکوۃ

زکوۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب حولان حول ہو جائے یعنی نصاب پر ایک سال گذر جائے تو فوراً زکوۃ ادا کر دی جائے، اور اگر غلہ یا اجناس کی قسم ہو تو جیسے ہی فصل تیار ہو کر گھر آجائے فوراً عشر یا نصف عشر نکال دیا جائے، اگر مویشی ہوں تو جیسے ہی مویشیوں کی تعداد نصاب کو پہنچ جائے تو فوراً ادا کر دی جائے۔ زکوۃ کی ادائے گی میں تاخیر گناہ کا سبب ہے۔ البتہ تعجیل کی جاسکتی ہے، مثلاً کسی کے اوپر شوال کے مہینہ میں زکوۃ واجب ہوتی ہے لیکن وہ رمضان میں نکالنا چاہے تو رمضان میں زکوۃ نکال سکتا ہے اس کی شوال تک کی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوۃ فرض ہوتے ہی ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ زکوۃ کے روپیہ یا عشر کا غلہ الگ کر کے رکھ لیا جائے اور اس کو حسب سہولت خرچ کیا جائے تو جائز ہے۔

زکوۃ چونکہ فرض ہے اس لئے زکوۃ نکالنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے مستحق زکوۃ تک پہنچائے، اگر زکوۃ مستحق تک نہیں پہنچی تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ البتہ جہاں زکوۃ کا اجتماعی نظام ہے تو نظام پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ زکوۃ کی رقم کو زکوۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ تحفہ یا بغیر کسی نام کے دی جاسکتی ہے۔ البتہ دینے والے کی نیت زکوۃ کی ہونی چاہیے۔ زکوۃ دینے والے کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ مال زکوۃ میں سے دیا جارہا ہے۔

زکوۃ ان لوگوں کو نہیں دی جاسکتی جن کی کفالت زکوۃ دینے والے کے ذمہ واجب ہے۔ ان کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے، بلکہ پسندیدہ ہے کہ اگر زکوۃ انفرادی طور پر نکالی جارہی ہو تو اپنے قریبی رشتہ داروں کو دی جائے۔

زکوۃ میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اگر ممکن ہو تو مستحق زکوۃ کی اس طرح امداد کی جائے کہ آگے چل کہ وہ خود زکوۃ دینے والا ہو جائے۔ یعنی زکوۃ بھیک نہیں ہے معاشی سرگرمی ہے۔

قرض اور ادھار کی بھی زکوۃ واجب ہوتی ہے۔اس کی صورت یہ ہے کہ قرض جب ادا ہو تو اس وقت اس کی زکوۃ ادا کی جائے، مثلاً اگر دو سال کے بعد قرض ادا ہو تو ایک ساتھ دو سال کی زکوۃ ادا کی جائے گی اور تین سال بعد قرض ادا ہو تو تین سال کی زکوۃ واجب ہوگی۔قرض کے معاملے کی آدمی اپنے طور پر بھی تنظیم کر سکتا ہے مثلاً اپنے پاس سے قرض کی زکوۃ ادا کرتا رہے جب قرض وصول ہو جائے گا تو اس میں سے زکوۃ دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔اسی طرح تھوڑا تھوڑا وصول ہوتا رہے تو اس کی زکوۃ ادا کرتا رہے۔

قرض کی کئی قسمیں ہیں۔قرض کی ایک قسم دین ضعیف ہے۔ وہ ایسا قرض ہوتا ہے جس پر انسان کو ابھی تک مالکانہ حق حاصل ہی نہیں ہوئے تھے لیکن اس کا حق ثابت ہو گیا ایسے مال میں سے قرض کی وصولی کے فوراً بعد زکوۃ نکالنا ضروری نہیں ہے بلکہ مال کے قبضہ میں آنے کے بعد اس پر سال گذرنا ضروری ہے تب زکوۃ واجب ہوگی،اس لئے کہ مال کی وصولیابی کے بعد ہی اس پر ملکیت اور تصرف کا حق اس کو ملا تھا۔مثلاً مہر کی رقم اسی طرح پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ جب وہ مال ملے گا تب اس پر ملکیت ثابت ہوگی اور اس کے بعد اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ بینک میں جمع شدہ رقم یا فکس ڈپازٹ وغیرہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نصاب زکوۃ میں شامل ہوگی،البتہ بینک سے جو سود ملتا ہے وہ حرام مال ہے وہ مال زکوۃ کے قابل نہیں ہے۔اس کو بلا نیت ثواب کسی کو دینا ضروری ہے۔

زکوۃ کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ زکوۃ جس علاقے سے وصول کی جائے گی اصلاً اس کے مستحق اسی علاقے کے غرباء و مساکین ہیں۔دوسری جگہ صرف کی جائے تو جائز ہے،بہتر یہی ہے کہ جہاں سے زکوۃ وصول ہوئی ہے اسی علاقے میں صرف کی جائے۔

8.7 خلاصہ

زکوۃ کے لفظی معنی پاک کرنے اور بڑھنے کے آتے ہیں۔ زکوۃ کے ذریعہ انسان اپنے مال کو پاک کرتا ہے۔اس لیے اس کو زکوۃ کہا جاتا ہے اور اللہ اموال میں اضافہ فرماتا ہے،ان کو بڑھاتا ہے اس لئے بھی زکوۃ کہا جاتا ہے۔ زکوۃ اسلام میں ایک بنیادی رکن ہے۔قرآن مجید میں نماز اور زکوۃ دونوں کے ادا کرنے کا حکم کثرت سے ایک ساتھ آیا ہے۔اس لئے نماز اور زکوۃ دونوں کو ایک درجہ کا فریضہ مانا جاتا ہے،زکوۃ دراصل مالی عبادت ہے اور نماز بدنی عبادت ہے۔ایک عبادت انسان کو دربار خداوندی میں پہنچاتی ہے اور دوسری عبادات تزکیہ کر کے اس کو پاک کرتی ہے۔

اسلام کی نظر میں غریبوں کی امداد واعانت بہت بنیادی ذمہ داری ہے اور غربت وافلاس ایک طرح کی ذلت وخواری ہے۔اس لئے اسلام میں سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے اور غربت وافلاس کی پستی سے نکل کر جود وسخا کی بلندی تک پہنچنے کو پسند فرمایا گیا ہے۔

اسلام نے مال خرچ کرنے میں کچھ بنیادی اصلاحات بھی کی ہیں۔مثلاً جو مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کے مستحق صرف غریب لوگ ہیں۔کوئی مخصوص نسل، یا طبقہ، یا قوم نہیں ہے اور زکوۃ کا ایک مقصد معاشرے سے غربت کا خاتمہ کرنا ہے۔یعنی معاشی سرگرمیوں میں اضافہ کرنا۔

زکوۃ صرف امیروں پر فرض ہے اور اسلام کی نظر میں امیر وہ ہے جو صاحب نصاب ہو یعنی اس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات (مکان، سواری، لباس، فرنیچر اور زمین جائداد) کے علاوہ ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی مالیت کا روپیہ ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے اس کو اصطلاح میں حولان حول کہتے ہیں۔

زکوۃ جس طرح سونا و چاندی میں ہے اسی طرح زمینی پیداوار اور مویشیوں میں بھی ہے۔سونا چاندی میں زکوۃ ڈھائی فیصد ہے اور زمینی پیداوار کی سینچائی اگر بارش کے پانی سے ہوئی ہے تو دسواں حصہ اور اگر خود سنچائی کی ہے تو بیسواں حصہ نکالنا ضروری ہے۔

قرآن مجید کی رو سے مصارف زکوۃ آٹھ ہیں۔فقراء و مساکین، عاملین زکوۃ، مؤلفۃ القلوب، مقروض، غلام، مسافر اور ان کے علاوہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔یعنی فی سبیل اللہ بھی ایک باضابطہ مد ہے۔

زکوۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب حولان حول ہو جائے تو فوراً زکوۃ نکال دی جائے۔اگر فوری طور پر کوئی مستحق زکوۃ نہ ملے تب بھی زکوۃ کا نکالنا ضروری ہے یعنی اس کو الگ کر کے رکھ لے اور حسب سہولت مصرف زکوۃ کو دے دے، زکوۃ وقت سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔البتہ وقت ہو جانے کے بعد زکوۃ کے مال کو متعین کر کے رکھ دینا ضروری ہے۔

زکوۃ صرف ان لوگوں کو نہیں دی جاسکتی جن کی کفالت انسان کے ذمہ واجب ہے۔ان کے علاوہ ہر ایک غریب کو دی جاسکتی ہے اس لئے اگر انفرادی طور پر زکوۃ نکالے تو پسندیدہ ہے کہ اگر اس کے اقرباء و اعزاء غریب ہوں تو پہلے ان کو زکوۃ دے، زکوۃ کو ہدیہ یا تحفہ کے نام سے بھی دیا جاسکتا ہے، لفظ زکوۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں ہے۔

8.8 نمونے کے امتحانی سوالات

1. انسانی معاشرہ پر زکوۃ کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟
2. صاحب نصاب ہونے کا کیا مطلب ہے؟
3. زکوۃ کے مصارف کون کون سے ہیں؟

8.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرۃ النبی — سید سلیمان ندوی
2. اسلامی فقہ — مولانا مجیب اللہ ندوی
3. اسلامی عبادات — الطاف احمد اعظمی
4. اسلام ایک نظر میں — مولانا صدرالدین اصلاحی
5. اسلامی عبادات — عفیف عبدالفتاح طیارہ

اکائی 9 : حج

اکائی کے اجزاء

9.1 مقصد

9.2 تمہید

9.3 تعارف اور مصالح

9.3.1 عظمت خداوندی کا اظہار

9.3.2 توحید کا عملی اظہار

9.3.3 خراج عقیدت

9.4 ارکان ومناسک

9.5 اجتماعیت

9.6 مساوات

9.7 باہمی تعارف

9.8 خلاصہ

9.9 نمونے کے امتحانی سوالات

9.10 مطالعے کے لئے معاون کتابیں

9.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ اسلام میں حج کا کیا مطلب ہے، حج کی عبادت کس طرح اور کب ادا کی جاتی ہے، آپ یہ بھی جان لیں گے حج کے مصالح اور فوائد کیا ہیں اور اس کے ارکان اور مناسک کس طرح ادا کئے جاتے ہیں۔

9.2 تمہید

حج ایک اہم عبادت ہے جو صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہوتی ہے، فرض ہو جانے کے بعد حج

کا وہی مقام ہوتا ہے جو روزہ اور نماز کا ہے۔ حج فرض ہو جانے کے بعد حج نہ کرنے والا شخص گنہگار ہوگا، حج کی فرضیت، شرائط، ارکان، واجبات اور طریقہ نیز حج کے فوائد کا جان لینا ضروری ہے تاکہ اسلامی عبادات میں حج کی صحیح حیثیت متعین کی جا سکے۔ اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ حج کیا ہے۔ اس کے بنیادی اجزاء کیا ہیں۔ حج کی اہم اصطلاحات کیا ہیں۔ حج کیوں فرض کیا گیا۔ اس کے روحانی اور سماجی فوائد و مصالح کیا ہیں۔

9.3 تعارف اور مصالح

حج کا لفظی ترجمہ زیارت کے ارادے سے نکلنا ہے۔ شریعت میں حج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایام حج میں بیت اللہ کی زیارت کے ارادہ سے نکلنا اور وہاں حج کے ارکان ادا کرنا۔ حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ اور صاحب استطاعت افراد پر حج ادا کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز وروزے کا ادا کرنا فرض ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں پر اللہ کے رسولؐ نے سخت وعید فرمائی ہے۔

حج کی فرضیت کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت میں ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَیْہِ سَبِیْلاً وَمَن کَفَرَ فَإِنَّ الله غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ
(آل عمران 97)

’’لوگوں کے ذمے یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ حج کرے
اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے‘‘۔

احادیث میں بھی حج کی فرضیت کا ذکر آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو کسی بیماری نے یا واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمراں نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی ہو کر (سنن بیہقی)

ایک اور روایت میں آیا ہے حضرت ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ایک دن تقریر کی اور فرمایا کہ اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے اس لئے تم حج کرو (بخاری و مسلم)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہے (مسلم) ایک دوسری روایت میں حج کی فضیلت اس طرح وارد ہوئی ہے کہ جو شخص اس گھر یعنی بیت اللہ کا حج کرے اور اس دوران وہ نہ تو کوئی شہوانی حرکت کرے، نہ کسی معصیت کا ارتکاب کرے تو جب وہ حج کر کے لوٹے گا تو ایسا پاک وصاف ہوگا جیسا کہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو پیدا کیا تھا (بخاری)

حج کی اس اہمیت وفضیلت اور فرضیت کے پیچھے دراصل ایک پوری تاریخ ہے۔ خدا کے راستہ میں قربانی ایمان باللہ اور اللہ کے لئے مشکلات ومصائب کو خندان پیشانی سے برداشت کرنے کی ایک روشن تاریخ۔ کس طرح اللہ کا گھر تعمیر کیا گیا۔ کس طرح اس

کے لئے قربانیاں دی گئیں اور کس طرح ایمان کا عملی مظاہرہ کیا گیا ان سب کی تاریخ کے بغیر حج کی حقیقت اور اس کی اہمیت واضح نہیں ہوسکتی۔

حج مکہ میں واقع بیت اللہ کی زیارت اور وہاں مخصوص ارکان کی ادائے گی کا نام ہے۔جس مقام پر اب کعبہ موجود ہے یہاں اب سے تقریباً اکتالیس سو سال پہلے ایک بے آب و گیاہ میدان تھا، اور دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ چاروں طرف خشک چٹانیں یا ریتیلا میدان تھا، اس میں حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنے اکلوتے شیر خوار بچے اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہؓ کو اس میدان میں چھوڑ دیا، صابر بیوی نے جو اللہ کے لئے حضرت ابراہیم کی قربانیوں سے اور حضرت ابراہیم کے ایمان سے واقف تھی اس سرزمین پر رہنا قبول کرلیا اور خدا کے بھروسے معمولی زادراہ کے ساتھ یہاں سکونت اختیار کر لی۔

یہاں نہ پانی تھا نہ غذا۔اس لئے ماں نے پانی کی تلاش میں بچے کو چٹان کے سایہ میں لٹا دیا اور دو پہاڑیوں کے درمیان پانی کی تلاش میں سرگرداں پھری اور ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کے درمیان سات چکر لگائے۔خدا کو یہ قربانی پسند آئی اور اس بے آب و گیاہ میدان میں زمزم کا لازوال چشمہ جاری کر دیا۔حیات بخش پانی کی خبر پرندوں کی آمد ورفت سے قریب سے گذرنے والے قافلوں کو ہوئی اور یہاں ایک عارضی بستی وجود میں آ گئی۔دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے اور آخر وہ بچہ بڑا ہو گیا۔باپ کی آمد ورفت رہتی تھی۔ایک موقعہ پر ایک بڑا امتحان اور آ گیا۔خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ بچے کو خدا کی راہ میں قربان کر دو۔یہ ایک بڑی آزمائش تھی لیکن حضرت ابراھیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اترے اور انہوں نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا ارادہ کرلیا۔قرآن مجید میں اس کا تذکرہ یوں ہے۔

فَلَـمَّـا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ . وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيْمُ . قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِئُ الْمُحْسِنِيْنَ(صافات 104.103)

''جب ان (ابراہیم واسماعیل) دونوں نے فرماں برداری کی اور اس کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اس کو آواز دی اے ابراھیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یوں ہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں''۔

اس بڑی آزمائش میں ثابت قدم رہنے کے بعد اللہ نے ان کو بطور انعام دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا، اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح آیا ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً (البقرة. 124)

''اور جب ابراھیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کو آزمایا پھر اس نے ان کو پورا کر دیا تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں''۔

اس کے بعد اللہ نے حضرت ابراھیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ وہ خدا کی عبادت کے لئے ایک گھر تعمیر کریں تاکہ اس میں صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئاً وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (حج :26)

اور جب ہم نے ابراھیم کے لئے اس گھر کی جگہ کوٹھکانہ بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو ساجھی نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کوطواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اوررکوع وسجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا۔

اللہ نے اس گھر کوامن کی جگہ قرار دیا:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (البقرة:125)

یاد کرو جب ہم نے اس گھر کومرکز اورامن قرار دیا اورحکم دیا کہ مقام ابراہیم کوسجدہ کی جگہ اورنماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔

بیت اللہ کا یہ گھر دراصل خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا گیا پہلا گھر تھا اور ہدایت کا عالمی مرکز تھا۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ. فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (آل عمران: 96)

یقیناً پہلا گھر جولوگوں کے لئے مرکز عبادت بنایا گیا وہی ہے جومکہ میں ہے۔ وہ برکتوں والا ہےاور سارے جہانوں کے لئے ہدایت ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے جواس میں داخل ہوگا وہ مامون ہے۔

عظیم قربانی اورخدائے واحد کی عبادت کے لئے اس سے پہلے گھر کی تعمیر کے بعدحضرت ابراھیم علیہ السلام نے کچھ دعائیں مانگیں اوراللہ تعالی نے ان دعاؤں کواپنے فضل وکرم سے قبول فرمایا،ان میں سےایک دعا یہ تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ . رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرة: 127)

’’خدایا ہمارے اس عمل کوقبول فرما۔ یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے، مالک ہمیں اپنا فرما نبردار بنا اور ہماری اولادمیں سےایک گروہ پیدا فرمایا جوتیرا فرمانبردار ہواورہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا،ہم پرکرم کی نظرفرما تو بےشک نظرکرم کرنے والا ہے‘‘۔

ایک دعا یہ مانگی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ(البقرة: 129)

اے ہمارے پروردگاران کے اندرانہی میں سےایک ایسا رسول پیدا فرما جوانہیں تیری آیتیں پڑھ کرسنائے، تیرے احکام بتائے، حکمت سمجھائے اوران کا تزکیہ کرے۔

اللہ نے حضرت ابراھیم اور حضرت اسماعیل کی اولاد میں امت وسط برپا فرمائی اور ان کی اولاد میں آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام مقدس پر اور بھی دعائیں مانگی تھیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے بیت اللہ کو مرکز قرار دے کر حج کی منادی کرائی۔اور اس دن سے برابر لوگ جوق در جوق اس مقام محمود کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔آئینہ ماہ و ایام گواہ ہے کہ اس گھر کی زیارت کرنے والوں کی تعداد میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہا اور آخر ایک وقت وہ آیا کہ حج کا انتظام کرنے والے مجبور ہوئے کہ حج کے لئے آنے والے لوگوں کی تعداد کو محدود کریں کہ اس تعداد سے زیادہ لوگوں کو ایک سال میں حج کے لئے آنے کی اجازت نہیں ہے ورنہ انتظام میں خلل واقع ہو جائے گا۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالاً وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ . لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ . ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ . ذَلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ(حج 30.26)

''لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستوں سے آئیں گے تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور رزق میں دیے ہیں (ان کی قربانی) چند معلوم دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ،اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے ان کے رب کے پاس بہتر ہے''۔

یہ ہے کہ حج کا پس منظر۔خدا نے اپنی عبادت کے لئے اپنے بنائے ہوئے پہلے گھر میں حج کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد سے وہاں لگا تار حج کیا جاتا ہے،حج صرف ایک عبادت نہیں ہے،یہ ایک عظیم یادگار ہے،ان عظیم لوگوں کی یادگار جنہوں نے اپنے رب کی خوشنودی کے لئے جان و مال،وطن اور گھر کو بھی قربان کیا،جنہوں نے خدا پر یقین کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی مظاہرہ نہیں ہوسکتا۔حج تاریخ سے وابستہ ہے،عبادت ہے،خدا کے تین بندوں کی یادگار ہے یعنی حضرت ابراہیم،حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہم السلام۔انہوں نے اپنے رب پر ایمان کی جو مثال قائم کی وہ رہتی دنیا تک کے لئے مثال ہے،اور انہوں نے جو قربانی دی وہ رہتی دنیا تک نمونہ ہے۔ حج کرنا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی راہ میں اگر اس عظیم قربانی کی ضرورت پیش آجائے تو ہم آج بھی اس قربانی کو پیش کریں گے۔(انشاءاللہ)

حج اسلام کی عالمگیریت کا بھی مظہر ہے اور اسلام کے عالمی مذہب ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔حج توحید کا عملی سبق ہے،حج دنیا کی بے ثباتی کا عملی اظہار ہے۔حج کے دوسرے بہت سے فوائد اور مصالح ہیں جو ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

9.3.1 عظمت خداوندی کا اظہار

حج اللہ کی عظمت اور بڑائی کے اظہار کا اعلی نمونہ ہے۔ حج میں بندہ اپنے گھر بار، دوست واحباب، وطن اور گھر کے عیش و آرام کو چھوڑ کر رب العزت کے دربار میں حاضر ہوتا ہے اوراس کی عظمت و کبریائی کو بیان کرتا ہے۔خدا کے دربار میں وہ اس طرح حاضر ہوتا ہے کہ اس کے بدن پرصرف دو بغیر سلے ہوئے کپڑے ہوتے ہیں، یعنی اپنے حشم وخدم اور جاہ وجلال کو خاک میں ملا کر اس کے دربار میں حاضری دیتا ہے، اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، پکار پکار کر اللہ کی بڑائی بیان کرتا ہے۔اس کے حکم سے اس کے نام پر قربانیاں کرتا ہے۔اس کے گھر کا طواف کرتا ہے۔انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس ایک گھر کی عظمت کے گرد پروانہ وار گھومتا ہے۔ یہ دراصل اللہ کی عظمت کا انسانوں کے درمیان ایک عملی اظہار ہے، اور خدا واحد و برتر کی عظمت کے اعتراف میں انسانی کاوشوں کا اعلی معیار بھی ہے۔

9.3.2 توحید کا عملی اظہار

حج توحید الہی کا قولی اقرار اور عملی اظہار بھی ہے، بندہ صرف ایک خدا کی عظمت کے اظہار و اقرار کے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس گھر کی زیارت کے لئے جاتا ہے جو صرف ایک خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا، اس لئے جب حاجی اس گھر کا طواف کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف کرتے جاتے ہیں کہ لاشریک لک (تیرا کوئی شریک نہیں ہے) ملک ونعمت سب تیرے لئے ہیں۔ یہ دراصل توحید الہی کے عقیدے کا عملی اظہار ہے۔

9.3.3 خراج عقیدت

حج بیت اللہ مسلمانوں کی طرف سے ان عظیم ہستیوں کے لئے خراج عقیدت بھی ہے جنھوں نے اپنے رب کی عبادت اور اپنے رب کی فرمانبرداری کا حق ادا کر دیا۔اس لئے قرآن میں کہا گیا ہے۔

فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّـنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (آل عمران: 96)

اس میں واضح نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے۔اور جو اس تحو میں داخل ہوا وہ محفوظ ہوتا۔

یعنی اس مقام پر واضح نشانیاں ہیں جن کے اوپر یہ بات ثبت ہے کہ رب العزت کے ایسے بندے بھی گذرے ہیں جنھوں نے عملی طور پر خدا کے حکم کے سامنے ہر ضرورت کو پس انداز کر دیا۔حج کے ذریعہ ان کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جاتا ہے اور ان کے عمل کی پیروی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صفا ومروہ کے درمیان سعی، رمی جمرات، وقوف عرفہ اور مقام ابراھیم کی زیارت الہی نشانیوں اور عظمتوں کی زیارت اور ان سے اپنی زندگی کے لئے سبق لینے سے عبارت ہے۔

حج کی اہمیت صرف عبادت کی نہیں ہے، اس کے سماجی مصالح اور فوائد بھی بے شمار ہیں، حج نے مکہ کو ایک بڑا تجارتی مرکز اور ایام حج کو اہم تجارتی ایام بنا دیا ہے۔جس میں لوگوں کو اپنے منافع دیکھنے یعنی حاصل کرنے کی پوری اجازت ہے۔ قرآن میں ہے:

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن رَّبِّکُمْ (البقرۃ:198)

''تمہارے لیے یہ گناہ نہیں ہے کہ حج کے ایام میں فضل الٰہی یعنی تجارت تلاش کرو''۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

ولا آمین البیت الحرام یتبغون فضلا من ربھم و رضوانا (مائدہ:2)

''اور نہ ان کو ستاؤ جو اس ادب والے گھر کے ارادے سے جا رہے ہوں۔ اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے''۔

حج کے تاریخی اجتماع نے یہاں ایک بڑا شہر آباد کر دیا جو اہم تجارتی مرکز بھی تھا اور یہاں کی تجارت دراصل اسی دینی اجتماع کی مرہون منت تھی جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

حج کا ایک اہم پہلو اس کی تاریخیت بھی ہے۔ حج اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ایک سچا مذھب ہے خدا کا دیا ہوا مذھب ہے، یہ کسی دنیا بے زار، متقشف کا وھم نہیں ہے اور نہ ہی کسی بلند فکر فلسفی کا سوچا ہوا منصوبہ، بلکہ یہ خدائے واحد کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ حج کی شکل میں چار ہزار سال کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ پیغام جو چار ہزار برس قبل انسانوں کو دیا گیا آج بھی وہی ہے، اس میں نہ کوئی تبدیلی ہے اور نہ تغیر۔ حج کی تاریخ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے۔

حج کی وجہ سے بیت اللہ ایک عالمی مرکز بن گیا اور یہاں ہر طرف سے ہر قسم کے لوگ آنے لگے۔ یہ تجارتی مرکز ہے۔ تجارتی قافلے یہاں فروکش ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ علمی مرکز بھی ہے۔ یہاں علم و دانش کے اساطین ہر سال اپنے رب کی عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور تشنگان علم ان کے چشمہ صافی سے سیرابی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے مکہ علم حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے سب سے بڑا مرکز رہا ہے اور ایام حج میں بے شمار طالبان علم یہاں اس مقصد سے جمع ہوتے رہے ہیں کہ حج پر آنے والے علماء کرام سے حدیث سنیں۔

9.4 ارکان و مناسک

حج کی تین قسمیں ہیں۔

1. اِفراد 2. تمتع 3. قِران

اگر کوئی شخص صرف حج کا احرام باندھتا ہے، تو اس کو حج افراد کہتے ہیں۔ اور احرام باندھنے والے کو مفرد کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حج کے ایام میں حج کے لئے احرام باندھتا ہے۔ پھر حج کرنے کے بعد احرام کھول دیتا ہے اور دوبارہ احرام باندھ کر عمرہ کرتا ہے تو اس کو حج تمتع کہتے ہیں اور اس طرح حج کرنے والے کو متمتع کہتے ہیں۔ تمتع کا مطلب ہے فائدہ اٹھانا۔ اس طریقہ حج میں حاجی ایک احرام باندھ کر حج کرتا ہے پھر احرام کھول دیتا ہے اور اس کے لئے وہ چیزیں حلال ہو جاتی ہیں جن کو حالت احرام میں نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کو حج تمتع کہتے ہیں۔ یعنی اس میں حاجی کچھ ایام سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس طرح احرام باندھے کہ حج اور عمرہ دونوں کی نیت ہو تو ایسے حج کو حج قران کہتے ہیں اور اس طرح حج کرنے والے کو مقرن کہتے ہیں۔ قران کے معنی ہیں ملانا، اس طریقہ میں حج اور عمرہ دونوں کو ملایا جاتا ہے اس لئے اس کو قران کہتے ہیں۔

حج کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے، اپنی ساری تیاریوں کے بعد سفر شروع کرتا ہے اور مکہ سے کافی پہلے ایک مقام جس کو اصطلاح میں میقات کہتے ہیں اس پر پہنچ کر یا اس سے پہلے احرام باندھ لیتا ہے۔ احرام کا طریقہ یہ ہے کہ غسل کر کے عام استعمال کے کپڑے اتار دیتا ہے اور بغیر سلے ہوئے دو کپڑے زیب تن کرتا ہے، ایک تہ بند اور دوسری چادر۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔ اور باضابطہ حج کی نیت کا اعلان کرتا ہے اس کے بعد اپنے رب کو ان الفاظ میں پکارتا ہے۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک

''حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں کوئی شک نہیں کہ حمد تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، بادشاہی تیری ہے، کوئی تیرا شریک نہیں''۔

احرام باندھنے کے بعد اوپر مذکور کلمات کا کثرت سے ورد کرنا چاہئے۔ ہر نماز کے بعد، ہر صبح بیدار ہونے کے بعد، کسی سے ملتے ہوئے، جدا ہوتے ہوئے، بلندی پر چڑھتے ہوئے اور نشیب میں اترتے ہوئے ان کلمات کا ورد کرتے رہنا چاہئے ان کلمات کو اصطلاح میں تلبیہ کہتے ہیں۔ حج کا اہم ترین ذکر تلبیہ ہے۔

احرام باندھنے کے بعد انسان پر بہت سی وہ چیزیں جو عام حالات میں جائز ہوتی ہیں ناجائز قرار پاتی ہیں۔ زیب وزینت، عیش وعشرت، جنسی مقاربت حتی کہ جنسی گفت وشنید بھی ممنوع ہو جاتی ہے، خوشبو اور رنگ ممنوع ہو جاتے ہیں، شکار کرنا یا شکار میں کسی کی مدد کرنا منع ہو جاتا ہے۔ ناخن تراشنا، درخت کا ٹنا حتی کہ گھاس کے تنکے بھی توڑنا منع ہو جاتا ہے۔ سر ڈھکنا منہ چھپانا منع ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے رب کی طرف قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے۔ جیسے ہی بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے اللہ اکبر کہتا ہے، تہلیل کرتا ہے، تلبیہ پڑھتا ہے۔ قریب پہنچنے کے بعد حجر اسود کا استلام کرتا ہے پھر طواف کرتا ہے، بیت اللہ کے چاروں طرف سات چکر لگا کر اپنے قلب وذھن میں رچی بسی توحید کا عملی اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد صفا اور مروہ نام کے پہاڑوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ تسبیح و تہلیل اور دعا ومناجات کرتا ہے اور مکہ میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے اس کو جو توفیق ہوتی ہے اس کے مطابق طواف، نماز، ذکر اور تلاوت نیز دعا ومناجات کرتا رہتا ہے۔

ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ سے باقاعدہ حج کا آغاز ہوتا ہے، سارے حاجی مسجد حرام میں جمع ہوتے ہیں، امیر الحج لوگوں کے سامنے خطبہ پڑھتا ہے، حج کے احکام بتاتا ہے، حج کے موقعہ پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا بیان کرتا ہے۔ آٹھ ذی الحجہ کو لوگ منی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور اگلے دن صبح تک وہیں رہتے ہیں، پھر عرفات کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ عرفات کا میدان مکہ سے بارہ میل دور واقع ہے، سارے لوگ اس میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دن ڈھلنے پر امام خطبہ دیتا ہے اس کے بعد ظہر اور عصر کی نماز جمع کر کے پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد امام جبل الرحمۃ کے پاس قبلہ رو ہو کر دعا کرتا ہے۔ لوگ اس دعا میں شریک ہوتے ہیں، امام لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتا ہے۔ دن چھپنے کے بعد سارے لوگ مزدلفہ نام کے مقام کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں اپنا پڑاؤ

ڈالتے ہیں۔ امام جبل قزح کے پاس ٹھہرتا ہے۔عشاء کے وقت مغرب اور عشاء دونوں وقت کی نماز جمع کر کے پڑھی جاتی ہے۔ رات یہیں بسر ہوتی ہے، دسویں ذی الحجہ کی صبح اول وقت میں فجر کی نماز پڑھ لی جاتی ہے۔اس کے بعد ہر شخص ذکر واستغفار میں مشغول ہو جاتا ہے اور تلبیہ پڑھتا رہتا ہے، جب روشنی پھیل جاتی ہے تو وہاں سے چل کر منیٰ میں آتے ہیں، یہاں رمی جمرات ہوتا ہے یعنی جمرۃ العقبہ کو سات مرتبہ کنکریوں سے مارتے ہیں، ہر دفعہ اللہ اکبر کہتے ہیں اور تلبیہ پڑھتے جاتے ہیں۔اس کے بعد حج کے اعمال کی تکمیل کے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں، تلبیہ بھی بند ہو جاتا ہے۔لوگ قربانیاں کرتے ہیں اور حلق کراتے ہیں۔اب حج مکمل ہو گیا۔اس کے بعد بھی لوگ تین دن تک منیٰ میں مقیم رہتے ہیں۔تینوں دن رمی جمرہ کرتے ہیں۔اپنے اوقات کو نماز، تلاوت، ذکر، استغفار، اور مناجات میں گذارتے ہیں، حجر اسود اور باب کعبہ کا درمیانی حصہ جو ملتزم کہلاتا ہے اس سے اپنا چہرہ اور سینہ ملتے ہیں، غلاف کعبہ کو پکڑ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر آخری طواف کر کے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔حج کا یہ چند دن کا تربیتی نصاب انسان کو رب العالمین کے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اور توحید کی عملی مشق اس کی زندگی کو اس طرح ڈھال دیتی ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں وہ جو کام بھی کرے گا اس میں رب العالمین کے حکم کی اتباع کرے گا۔حج کے سلسلہ میں اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ حج کا ثواب یا بدلا سوائے جنت کے اور کچھ نہیں ہے۔

حج کے اندر تین چیزیں فرض ہیں:

1. احرام باندھنا 2. میدان عرفات میں قیام کرنا 3. طواف زیارت

ان فرائض کے علاوہ کچھ شرائط بھی ہیں ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔پہلی شرط ہے فرائض حج میں ترتیب کا قائم رکھنا، اگر ترتیب قائم نہیں رہی تو حج نہیں ہوگا۔دوسری شرط یہ ہے کہ حج صرف ایام حج میں ہی ہوسکتا ہے کسی اور وقت میں نہیں ہوسکتا، اور فرائض کے لئے جو وقت مقرر ہے ان کو ان کے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے، مثلاً 9 ذی الحجہ کو وقوف عرفہ 10 ذی الحجہ کو مزدلفہ میں جانا اور رمی جمرات کرنا اور آخر میں طواف زیارت کرنا۔

فرائض وشرائط کے علاوہ حج میں کچھ واجبات بھی ہیں۔حج میں پانچ چیزیں واجب ہیں۔1. دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ میں قیام کرنا، 2. رمی جمرہ کرنا، 3. سعی کے دوران دوڑنا، 4. حلق کرانا یا بال کٹوانا مردوں کے لئے اور عورتوں کے لئے تھوڑے سے بال کتروالینا، 5. طواف صدر، یعنی مکہ کے باہر سے آنے والوں کے لئے جب مکہ سے جانے لگیں تو طواف کرنا۔اس کو طواف وداع بھی کہتے ہیں یعنی رخصت ہونے کا طواف۔

حج اور عمرہ کے لئے احرام باندھنے کے بعد درج ذیل چیزیں منع ہو جاتی ہیں۔ان میں کچھ چیزیں پہلے سے منع ہیں لیکن حج کے ایام میں ان کی شناعت بڑھ جاتی ہے۔

1. غیبت کرنا، 2. تہمت لگانا، 3. جھوٹ بولنا، 4. لڑائی جھگڑا کرنا، 5. گالی دینا یا فحش گوئی کرنا وغیرہ۔

جو چیزیں خاص حالت احرام میں منع ہیں وہ یہ ہیں 1. خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا، 2. بدن کے کسی بھی حصے کے بال مونڈنا، 3. ناخن کاٹنا، 4. موزے پہننا، 5. عمامہ باندھنا یا ٹوپی پہنا، 6. سلے ہوئے کپڑے پہننا، 7. خوشبو یا تیل لگانا، 8. جنسی

تلذذ کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا۔ یہ چیزیں چاہے بھول سے سرزد ہوں یا جان بوجھ کر، ان کے کرنے پر انسان کے اوپر دم واجب ہو جاتا ہے یعنی اس کو ایک یا دو اضافی قربانی کرنی ہوگی۔

احرام کے سلسلے میں یہ احتیاط ہے کہ مردوں کا احرام دو بغیر سلے ہوئے کپڑے ہیں اور عورتوں کا احرام ان کے عام لباس کی طرح ہی ہے۔ البتہ چہرہ، ہاتھ اور پیروں کے پنجے کھلا رکھنا ضروری ہے۔ چہرہ چھپانے کی اجازت نہیں، البتہ شرم وحیاء کے غلبہ میں اجنبی مردوں کے سامنے چہرہ آڑ میں کیا جاسکتا ہے۔

حج کے فرض ہونے کے لئے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ حج اس پر فرض ہوگا جس کے پاس سفر کے لئے سفر خرچ ہو، دوران سفر کا خرچ ہو اور واپس آنے کا بھی خرچ ہو اور اپنی عدم موجودگی میں اپنے زیر کفالت لوگوں کا خرچ بھی چھوڑ کر جائے۔ صحت وغیرہ بھی ایسی ہو کہ سفر کر سکے، سفر کے لئے سواری کا انتظام ہو، راستہ پر امن ہو، کوئی ظاہری رکاوٹ نہ ہو۔ اور انسان کے اپنے حالات ایسے ہوں کہ سفر بھی کر سکتا ہو، یعنی اس کی عدم موجودگی میں اس کے اہل وعیال اور زیر کفالت لوگوں میں کسی بڑے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، یہ شرائط پوری ہو جائیں تو سفر حج فرض ہو جاتا ہے، اس میں تاخیر گناہ ہے۔

حج کی خاص دعاؤں میں تلبیہ ہے جس کا اوپر ذکر آیا، اس کے علاوہ ملتزم کی دعا بھی بہت اہم ہے، وہ دعا یہ ہے۔

يا واجد يا ماجد لا تزل عني نعمة انعمتها علي.

''اے قدرت والے، اے عزت والے مجھ سے اپنی وہ نعمت نہ چھیننا جو تو نے عطا فرمائی ہے''۔

اس طرح میزاب رحمت کی دعا بھی اہم ہے، وہ دعا یہ ہے۔

الهم انی اسئلک ایمانا لایزول و یقیناً لاینفد و مرافقة نبیک محمد صلی الله علیه وسلم اللهم اظلنی تحت ظل عرشک یوم لاظل الا ظل عرشک و اسقنی بکاس محمد صلی الله علیه وسلم شربة لا ظماء بعد ها ابداً.

''اے اللہ میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جو مجھ سے کبھی جدا نہ ہو اور ایسا یقین مانگتا ہوں جو کبھی ختم نہ ہو اور قیامت میں تیرے نبی محمد ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں، اے اللہ مجھے قیامت کے دن اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے، اس دن تیرے عرش کے علاوہ اور کہیں سایہ نہ ہوگا، اور محمد ﷺ کے حوض کوثر سے ایسا پیالہ پلا کہ پھر اس کے بعد پیاس نہ ہو''۔

مقام ابراہیم پر یہ دعا مانگنی چاہئے:

اللهم هذا مقام ابراهيم العائذ الائذ بک من النار حرم لحومنا و بشر تنا علی النار

اے اللہ یہ تیرے خلیل حضرت ابراہیم کا مقام ہے جنہوں نے اس وقت تیری پناہ ڈھونڈی اور تیرا سہارا لیا جب کافروں نے انہیں آگ میں ڈالا، پس جس طرح تو نے انھیں آگ سے بچایا ہمارے گوشت و پوست کو بھی دوزخ کی آگ سے بچا۔

ذیل میں حج کی چند اصطلاحات کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے۔

طواف : خانہ کعبہ کے چاروں طرف چکر لگانے کو طواف کہتے ہیں۔

شوط : کعبہ کے گرد ایک چکر لگانے یا صفاو مروہ کے درمیان ایک چکر لگانے کو شوط کہتے ہیں۔

استلام : حجراسود کا بوسہ دینے، چھونے یا دونوں ہتھیلیوں کو اس کی طرف کرنے کو استلام کہتے ہیں۔

وقوف : عرفات کے میدان اور مزدلفہ میں پہنچ کر کچھ دیر ٹھہرنے کو وقوف کہتے ہیں۔

رمی : رمی کے معنی ہیں پھینکنا، جمرہ پر کنکری پھینکنے کو رمی کہتے ہیں یہ تین ہیں جمرہ اولی، جمرہ وسطی اور جمرہ عقبہ۔

رمل : رمل کے معنی اکڑ کر یا باز و ہلا کر چلنا طواف کے پہلے تین چکروں میں باز و ہلا کر اور ذرا اکڑ کر چلنے کو رمل کہتے ہیں۔

سعی : صفا اور مروہ کے درمیان تیز چلنے اور دوڑنے کو سعی کہتے ہیں۔

اضطباع : طواف شروع کرنے سے پہلے مردوں کو چاہیے کہ اپنی چادر کے داہنے حصے کو داہنی بغل سے نکال کر کندھے پر ڈال لیں۔ ایسا کرنا عورتوں کے لیے مکروہ ہے۔

تحلیق : حلق کے معنی بال مونڈنے کے آتے ہیں۔ حج کے بعض ارکان کی تکمیل کے بعد مردوں کو اپنے بال منڈوانے چاہیئے۔

تقصیر : قصر کے معنی چھوٹا کرنے کے آتے ہیں جو اپنے بال نہ مونڈے تو وہ تقصیر کرالے یہ بھی تحلیق کے قائم مقام ہوگا۔

حطیم : خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو اب خانہ کعبہ سے باہر ہے حطیم کہلاتا ہے۔

حجراسود : حجراسود یعنی کالا پتھر، یہ پتھر کعبہ کے مشرقی کونے پر نصب ہے۔ جہاں یہ پتھر نصب ہے اس کو رکن یمانی کہتے ہیں۔ اس کا استلام کر کے طواف شروع کیا جاتا ہے۔

صفاومروہ : دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔

میلین اخضرین: سعی کرتے وقت دو مقام ملتے ہیں ان پر سبز نشان بنے ہوئے ہیں اس لیے ان کو میلین اخضرین کہتے ہیں۔

عرفات : ایک میدان ہے جس کا رقبہ تقریباً 12 مربع میل ہے۔ حج کے دوران وقوف عرفات فرض ہے۔ اس کے وسط میں ایک پہاڑ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں۔

منی : مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک آبادی ہے۔

مزدلفہ : منی اور عرفات کے درمیان ایک جگہ ہے وقوف عرفات کے بعد لوگ یہاں آتے ہیں۔

9.5 اجتماعیت

حج مسلمانوں کا ایک عالمی اور بین الاقوامی اجتماع ہے۔ مسلمانوں کی ایک عالمی مرکزیت کا داعی اور نقیب ہے۔ اس کی عالمیت کا تصور مسلمانوں کے دلوں میں روز اول سے ہی موجود تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اسے عالمی مرکز ہونا ہی چاہئے۔ جس طرح سے کہ مسلمان وہاں سال کے سال جمع ہوتے ہیں مختلف ملکوں کے رہنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رنگوں کے لوگ، مختلف نسلوں کے لوگ مختلف تمدنوں کے لوگ، جس طرح اپنے تمام طبعی اختلافات کو مٹا کر ایک ہی لباس میں ایک ہی شہر میں ایک ہی وقت

میں جمع ہوتے ہیں۔ایک ہی کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ایک ہی زبان بولتے ہیں۔وہاں سارے ظاہری فروق ختم ہو جاتے ہیں اور ایسا روح پرور اجتماع ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عالمی مرکزیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔گویا ساری دنیا کے مسلمانوں کا واحد مرکز بیت اللہ ہے۔ہر جگہ اور ملک سے مسلمان اس کی طرف آتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔نماز میں بھی اپنا رخ اس طرف رکھتے ہیں۔اسی طرح عالمی پیمانے پر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ بیت اللہ واقعی ایک بین الاقوامی مرکز ہے اور نماز وطواف اور سعی وغیرہ اس کا عملی ظہور ہیں۔

اسلام سے پہلے بھی حج ہوتا تھا،اسلام نے سابقہ طریقہ حج کو باقی رکھا اور اس میں جو عملی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں رسول اللہؐ نے ان کی اصلاح فرما دی۔اور بقیہ حج کو سنت ابراہیم علیہ السلام کے مطابق جاری رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی مرکزیت کو مزید مستحکم کرنے کے لئے بعض خصوصی احکام بھی صادر کیے۔مثلاً جانوروں کا شکار نہ کرنا،گھاس نہ کاٹنا اور ہتھیاروں کے لے کر جانے کی ممانعت وغیرہ۔رسول اللہؐ کی ان تعلیمات کے نتیجہ میں بیت اللہ کا حج عالم اسلام کا نقطہ اجتماع بن گیا۔حج کے موقعہ پر سال بہ سال جس طرح مسلمانوں کا وہاں اجتماع ہوتا ہے وہ ایک غیر معمولی اور بے مثال واقعہ ہے۔حج کا یہ تصور عہد نبوی میں بہت واضح ہوگیا تھا۔اس کی حیثیت ایک عالمی منشور گاہ کی بن گئی تھی۔حج بیت اللہ کے موقعہ پر اجتماع کو سیاسی اہمیت رکھنے والے اعلانات کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔چنانچہ مشرکین سے برأت کا اعلان حج کے موقع پر کیا گیا،اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے عالمی انداز کی ہدایات جاری فرمائیں۔انسانوں میں مساوات، سود اور خونی انتقام کی حرمت، بیت اللہ کی حرمت،لوگوں کے انسانی حقوق وغیرہ کا اعلان اسی حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا۔

امت مسلمہ پر اللہ تعالی کے بے شمار احسانات میں سے ایک خاص احسان دین کی تکمیل کا تصور ہے۔دین کی تکمیل کی آیت حج کے اجتماع کے موقع پر نازل ہوئی اور اسی موقع پر اس کا اعلان کیا گیا۔یہ اتنا اہم اعلان تھا کہ ایک یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ کہا کہ قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر ہمارے مذہب میں ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید بنا لیتے (بخاری)۔

حج کی اس اجتماعیت اور مرکزیت کا ادراک واحساس ہر زمانے کے لوگ کرتے رہے۔بلکہ لوگ حیرت زدہ ہیں کہ آخر کیسی مرکزیت ہے جو ایک طرف تو دل میں ہے اور اسی کا اظہار عمل سے ہو رہا ہے،اور ایک نکتہ پر ساری امت متحد ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں اسلام کی عطا کردہ وحدت کی اس اہم بنیاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت ووطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی۔لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان کی ایجاد کی کوشش میں مصروف ہیں،مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلے نے آل ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے،لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے،ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم،تمدن، مذہب اور اخلاق کی

وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومیں (ہیگ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلے کو کسی طاقت سے منوانہیں سکتیں، لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس عدالت کا حقیقی کرسی نشیں خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔" (سیرۃ النبی ص 5/258)

عصر حاضر کا ایک اور مصنف فلپ کے حتی نے حج کی اس عالمگیر اجتماعیت کے بارے میں لکھا ہے:

"صدیوں سے حج کا طریقہ اسلامی دنیا کی وحدت کا سب سے قوی سبب رہا ہے اور مختلف مسلمانوں کا مشترکہ رشتہ ہے یہ ہر صاحب حیثیت مسلمان کو طوعاً وکرہاً زندگی میں ایک بار سیاح ضرور بنا دیتا ہے۔ دنیا کے بعید ترین گوشوں سے برادران دین کا اس طرح جمع ہونا، میل جول بڑھانے کا ایسا ذریعہ ہے کہ اس کے تمدنی اثرات کو جتنا زیادہ سمجھا جائے کم ہے۔ اس نے حبشی، بربر، چینی، ایرانی، ترک، شامی، امیر، غریب ہر قسم کے مسلمانوں کو ایک دین کے میدان میں لانے اور مواخات بڑھانے کا موقع فراہم کیا، دنیا کے جملہ مذاہب میں بظاہر اسلام نے نسل و رنگ ملک و قوم کی دیواریں توڑنے میں سب مذہبوں سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اس میں فرقہ بندی کی لکیر صرف مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کھینچی گئی ہے۔ ورنہ ملت اسلامی کے اندر سب انسان یکساں ہیں۔ بلاشبہ اس کی کامیابی میں حج کی اجتماعیت کا بڑا حصہ ہے۔" (تاریخ العرب)

حج نے مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت اور عالمگیریت کی ایسی روح بیدار کی کہ مشرق و مغرب اور جنوب و شمال ہر جگہ کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہونے لگے، اور کعبۃ اللہ نے دراصل مسلمانوں کے لئے نکتہ اتحاد یا مرکز اتحاد کا کام کیا۔

9.6 مساوات

حج نے مسلمانوں کے اندر مساوات کی روح کو بھی پوری طرح جاگزیں کر دیا، دنیا ہمیشہ سے رنگ و نسل، زبان اور علاقائیت کی تفریق میں مبتلا رہی ہے، اور مختلف تراشے ہوئے لات و منات کا نام لے کر لوگ ہمیشہ ایک کی برتری اور دوسرے کی کم تری کے قائل رہے۔ انسان کی تاریخ اونچ نیچ کے اس تصور سے بھری پڑی ہے۔ اسلام نے چودہ سو سال قبل مسلمانوں کی عالمی منشور گاہ یعنی میدان عرفات سے اس نسلی تفریق کو مٹانے کی دعوت دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حج کے عالمی اجتماع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ کسی گورے کو کالے پر یا کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سارے لوگ ایک خدا کے بندے ہیں۔ اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مساوات انسانی کی یہ آواز اجنبی تو نہیں تھی، اسلام کی دعوت ہمیشہ سے یہی رہی ہے لیکن اس آخری دعوت نے مساوات کے لئے عملی بنیادیں ایسی فراہم کر دیں کہ باوجود کوشش کے مساوات کا یہ عملی سبق مسلمانوں کے درمیان سے مٹایا نہیں جا سکا اور ملت اسلامیہ مساوات کے تصور اور اس کے عملی مظاہر کے ذریعہ اس پیغام پر خود بھی عمل کرتی رہی اور اس کا عملی مظاہرہ بھی پیش کرتی رہی۔

اسلام نے خانہ کعبہ کو ایسا مرکز توحید بنایا کہ یہاں سب اپنے لسانی، جغرافیائی، رنگ و نسل کے فروق کو مٹا کر ایک ہی انداز کی عبادت کرتے ہیں۔ ایک ہی خدا کو پکارتے ہیں۔ ایک ہی لباس پہنتے ہیں۔ ایک ہی طریقہ سے عبادت کرتے ہیں اس طرح سب

کے درمیان حقیقی مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالی نے اس عملی مساوات کو اصول بنا کر مسلمانوں کو اس نکتہ پر مرتکز فرما دیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

سَوَاءِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (الحج:25)

وہاں سارے انسان برابر ہیں چاہے کوئی مسافر ہو یا مقیم۔

یعنی مکہ میں تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں وہاں اگر کوئی غیر عرب ہے تو اس کو بھی وہی مراعات حاصل ہوں گی جو عرب کو ہیں، وہاں اگر کوئی مسافر ہے تو اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مقیم کو ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ مکة مناخ لمن سبق (جو شخص اس شہر یعنی مکہ میں کسی جگہ اتر جائے وہ جگہ اس کی ہے) اس طرح حج نے مسلمانوں کے اندر مساوات کی وہ روح پیدا کی اور اس کا عملی مظاہرہ کیا جو انسانوں کے درمیان مطلوب ہے۔ توحید کعبہ نے یہ مساوات ہر جگہ قائم کر دی، ہر مسجد میں سارے مسلمان ایک ساتھ کھڑے ہو کر ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور سب کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے، اور حج نے اس مساوات کو عالمگیریت بخشی، ہر جگہ کے مسلمان ایک ہی لباس میں ایک جگہ جمع ہو کر ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

9.7 باہمی تعارف

حج کے من جملہ فوائد میں سے ایک یہ بھی کہ یہاں دنیا بھر کے مسلمان جمع ہوتے ہیں، افریقی، ہندی، ترکی، چینی، ایشیائی، یوروپ امریکہ اور دور دراز اور نزدیک وقریب کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک ہی عبادت انجام دیتے ہیں۔ اس طرح مختلف رنگوں و نسلوں کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک ہی عبادت کرتے ہیں تو مسلمانوں کے اندر باہمی تعارف اور ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ وہاں اس کا پورا موقع ہوتا ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے سے واقف ہوں اور قومی و نسلی دوریاں کم ہوں، ہندوستان کے مسلمان یہ جانیں کہ افریقہ کے مسلمان بھی اسی طرح عبادت کرتے ہیں جیسے ترک و چین کے لوگ کرتے ہیں۔ یوروپ میں بھی مسلمان اسی طرح ہیں جیسے مشرق بعید کے ممالک میں ہیں۔ اور کالے مسلمانوں کا بھی وہی مذہب ہے جو گورے مسلمانوں کا ہے۔

البتہ حج ایک اعتبار سے خاص تعارف کا ذریعہ بھی رہا ہے حج کے موقع پر دنیا بھر کے اہل علم وہاں جمع ہوتے رہے ہیں اور طالب علم ان سے خاص ایام حج میں بھی علم سیکھتے رہے ہیں۔ خاص طور پر علم حدیث کی نشر و اشاعت میں حج کا اہم کردار رہا ہے۔

9.8 خلاصہ

حج کے معنی ارادہ کرنے کے آتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں حج بیت اللہ کی زیارت کرنے کا ارادہ کرنے اور وہاں جا کر کچھ اعمال و ارکان کے ادا کرنے کا نام ہے۔ حج صرف ایام حج میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ حج بھی اسلام کا بنیادی رکن ہے اور نہایت اہم عبادت ہے۔ حج بدنی و مالی عبادتوں کا مجموعہ بھی ہے اور اس میں سفر بھی ضروری ہے۔ حج زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے اور ایسے پر فرض ہوتا ہے جو آسانی سے حج کے لئے جا سکے۔ حج کی فرضیت میں اتنا مال ہونا ضروری ہے کہ سفر کے اخراجات، آمد و رفت کے مصارف، اور زیر کفالت لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہو جائے اور صحت بھی سفر کی اجازت دیتی ہو نیز راستہ بھی محفوظ ہو۔

حج سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت اوران کی یادگار ہے۔ حج کی بڑی فضیلت ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ جوشخص صاحب استطاعت ہواور حج نہ کرے تووہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی مرے۔اس لئے صاحب استطاعت کوحج کرنا ضروری ہے۔

حج کے ذریعہ حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہم السلام کی عظیم قربانی کو یاد کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ حج توحید ربانی کا عملی اظہار ہے،اورعظمت خداوندی کے اظہار کا ذریعہ۔حج کے ذریعہ مسلمانوں میں باہم اجتماعیت اور مساوات کا عملی درس ملتا ہے۔ حج کے ایام میں مختلف قومیتوں اور رنگوں اورنسلوں کے لوگ جس طرح ایک ساتھ ایک ہی عبادت کرتے ہیں وہ مسلمانوں کی عالمی اجتماعیت اور باہمی مساوات کا ایک بڑا مظاہرہ ہے۔

حج کے اندرتین فرائض ہیں۔احرام باندھنا،وقوف عرفہ اورطواف زیارت۔اور کچھ شرائط ہیں جیسے ایام حج کا ہونا اور حج کے ارکان میں ترتیب قائم رکھنا۔اگر فرائض یا شرائط میں سے کوئی چیز چھوٹ گئی توحج ادانہیں ہوگا۔حج میں کچھ اعمال واجبات ہیں جیسے دسویں ذی الحجہ کومزدلفہ میں قیام کرنا،رمی جمرہ کرنا،سعی کے دوران دوڑنا،حلق کرنا اورطواف صدر،ان میں سے کوئی عمل چھوٹ جائے توحج تو ہوجائے گا لیکن اس کے لئے دم دینا ہوگا یعنی قربانی کرنی پڑے گی۔

حج کی تین قسمیں ہیں۔تمتع ،قران اورافراد۔افراد کا مطلب ہے صرف حج کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ایسا شخص حج سے فارغ ہوتے ہی احرام کھول دے۔قران کا مطلب ہوتا ہے حج اورعمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھنا،ایسا شخص حج کے بعد عمرہ کرے پھر احرام کھولے۔اورتمتع کا مطلب ہوتا ہے فائدہ اٹھانا یعنی حج کے ایام میں حج کا احرام باندھے اور حج پورا کرکے احرام کھول دے پھر دوبارہ احرام باندھ کرعمرہ کرے۔

حالت احرام میں انسان کے اوپر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ ان کے لئے بھی دم دینا ہوگا۔

حج عبادت واطاعت کے لئے ہے۔حج کے ایام میں غیبت،جھوٹ جھگڑا وفساد،اسی طرح عورتوں سے مباشرت اور کسی چیز کو نقصان پہنچانا حتی کہ شکار کرنا،بال مونڈنا،گھاس وغیرہ کوتوڑنا بھی منع ہوجاتا ہے۔یہ فطرت کے ساتھ کامل آہنگی اور دربار الٰہی کی کامل حضوری ہے۔اس میں اس کے آداب کی رعایت ضروری ہے۔اس کے ساتھ دعا،استغفاراورانابت الی اللہ ہے۔اس لئے حج میں اپنے اوقات کوزیادہ سے زیادہ دعا وانابت میں صرف کرنا ضروری ہے۔

9.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1. حج کے فرائض وواجبات کیا ہیں؟

2. حج کے فرض ہونے کی شرائط کیا ہیں؟

3. حج کے ذریعہ مسلمانوں میں عالمگیریت اوراتحاد کیسے پیدا ہوتا ہے؟

9.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1.	اسلامی فقہ	مولانا مجیب اللہ ندوی
2.	ارکان اربعہ	مولانا ابوالحسن علی ندوی
3.	خطبات	مولانا ابوالاعلی مودودی
4.	سیرت النبی	سید سلیمان ندوی
5.	اسلامی عبادات	عفیف عبدالفتاح طیارہ

اکائی 10 : جہاد

اکائی کے اجزاء

10.1 مقصد

10.2 تمہید

10.3 تعارف اور حقیقت

10.4 خلاصہ

10.5 نمونے کے امتحانی سوالات

10.6 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

10.1 مقصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ جہاد کا معنی ومفہوم کیا ہے، وہ جہاد کی اقسام اور جہاد کے شرائط سے بھی واقفیت حاصل کرلیں گے اور یہ پتہ چل جائے گا کہ اسلام کی نظر میں کن کن مقامات پر طاقت کے استعمال کی اجازت ہے اور کہاں صرف صبر کی طاقت استعمال کی جائے گی، اور ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

10.2 تمہید

جہاد کا مطلب جنگ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ مشہور کرتے ہیں۔ بلکہ جہاد کا مطلب ہے اپنی انتہائی کوشش کرنا، جہد وعمل کے ذریعہ کسی بھی کام میں اپنی صلاحیت صرف کرنا، چاہے یہ نفس کی اصلاح ہو یا اشاعت دین کا راستہ ہو، صبر وضبط کی پرورش ہو یا جنگ کا میدان، ہر جگہ اپنی کوشش اور صلاحیت کے لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ اس اکائی میں جہاد کی ان جملہ اقسام کا بیان کیا جائے گا۔

10.3 تعارف اور حقیقت

جہاد عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کوشش کرنا، جد وجہد کرنا، عام طور پر انتہائی کوشش کا مفہوم اس میں شامل ہے، کسی بھی کام کے لیے جو انتہائی کوشش یا محنت کی جاتی ہے اس کو جہاد کہا جاتا ہے جیسا کہ عربی لغت کی کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔ قرآن وحدیث میں اطاعت وعبادات میں جہاد، قرآن کے ذریعے جہاد، ماں باپ کی خدمت میں جہاد وغیرہ احکام اس کی دلیل ہیں کہ اسلام کی نظر میں جہاد جنگ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ مثلاً کوئی عبادت وریاضت میں محنت کرتا ہے تو اس کو مجاہدہ کرنا کہتے ہیں۔

جہاد اپنے مدلول کے اعتبار سے جنگ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ جنگ جہاد کی ایک قسم ہے۔لیکن موجودہ دور کے مخصوص سیاسی احوال میں یا صحافتی زبان میں جہاد صرف قتال کے لئے استعمال ہورہا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے قتال جہاد کا صرف ایک حصہ ہے،کل جہاد نہیں ہے۔

جہاد عمل کا نام ہے اور ترک جہاد بے عملی کا نام ہے۔ اسلام کے مطابق انسان کو مہلتِ عمر بہت تھوڑی ملی ہے اور کار جہاں دراز ہیں۔اس مختصر مہلت میں اس کو ایسی زندگی کی تعمیر کرنی ہے جو ابدالآباد تک باقی رہنے والی زندگی ہے۔ جہاں موت نہیں ہے اور اس زندگی کی تعمیر کلیۃً اسی مختصر وقفہ حیات پر منحصر ہے جو ہر زندہ انسان کو عارضی طور پر ملا ہوا ہے۔اگلی زندگی میں صرف وہی چیز کام آئے گی جو اس حیات میں جمع کر لی۔اگر اس زندگی کو بے معنی انداز میں گزار دیا یا سستی و کاہلی کی نظر کر دیا تو ہمیشہ کی زندگی میں صرف کف افسوس ملنا رہ جائے گا۔ایک لمحہ کی غفلت بسا اوقات صدیوں کا سفر بن جاتی ہے جہاد دراصل اسی مصروفیت کے ادراک کا نام ہے۔اس حقیقت کی طرف سورہ نساء کی اس آیت سے واضح اشارہ ملتا ہے۔

> لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُوْلِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُـلاًّ وَعَدَ اللّهُ الْحُسْنَى وَفَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْراً عَظِيماً(النساء: 95)
>
> ’’مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور وہ پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہیں برابر نہیں۔اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے‘‘۔

اس آیت میں بیٹھنے والوں کے مقابلے میں جہاد کرنے والوں کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد سستی، کاہلی اور آرام کے مقابلے میں ہے، اور اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ جہاد کوئی بسیط تصور نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف اقسام ہیں،خود اسی آیت میں جہاد کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

1. جہاد بالنفس 2. جہاد بالمال

جہاد کا مفہوم کوشش اور جدوجہد ہے۔ چونکہ جنگ بھی ایک کوشش اور محنت ہوتی ہے اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ ورنہ سب سے بڑا جہاد تو وہ ہے، زندگی کے ہر لمحہ میں بغیر ہتھیار کے لڑا جاتا ہے۔آٹھ پہر کی جنگ سب سے بڑا جہاد ہے یہ جنگ بنا ہتھیار کی جنگ ہے اس میں کوئی جائے قرار اور راہ فرار نہیں۔اگر اس جنگ میں راہ فرار اختیار کی تو دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جاتی ہیں۔ ایک روایت میں اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے آئے تھے فرمایا کہ تمہارا آنا مبارک ہو تم چھوٹے جہاد (الجہاد الاصغر) سے بڑے جہاد (الجہاد الاکبر) کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔اس مفہوم کی اور بھی روایات ہیں لیکن محدثین نے ان روایات کی صحت کے بارے میں کلام کیا ہے۔یعنی اپنی سند کے اعتبار سے وہ اس پایہ استناد کو نہیں پہنچتی جو حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے، لیکن ان احادیث کا

مفہوم پورے طور پر درست ہے۔ چونکہ قرآن مجید میں ایسے ہی مفہوم کی ایک آیت موجود ہے جس میں غیر جنگ کی ایک حالت کو جہاد کبیر کہا گیا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَاداً كَبِيْراً (فرقان: 52)

''پس کافروں کی اتباع مت کرو اور ان کے ساتھ اس (قرآن کریم) کے ذریعہ جہاد کرو، بڑا جہاد''۔

اس طرح کی اور بھی آیات قرآن مجید میں ہیں جن میں اسلام کی راہ میں محنت، جدوجہد، کوشش اور اپنی صلاحیتوں کے لگا دینے کو جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا(عنکبوت: 69)

''اور جنہوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا ہم ان کو اپنا راستہ دکھائیں گے''۔

انبیاء سابقین کی دعوت کے حوالے سے کہا ہے:

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ(عنکوبت: 6)

''اور جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنے لیے ہی جہاد کرتا ہے۔ اللہ تعالی دنیا والوں سے بے نیاز ہے''۔

خدا کی راہ میں محنت اور جدوجہد کرنے والوں کو دئے جانے والے انعام کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوا فِيْ اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ (حج: 78)

''اور محنت کرو اللہ کی راہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین''۔

اللہ کے راستہ میں محنت جدوجہد، اس کے دین کی اشاعت کے لیے سعی بلیغ کرنا، اس کے دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے محنت کرنا ایک بڑا جہاد ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس جہاد کا تذکرہ ہے، اور ظاہر ہے یہ جہاد بالسیف یا جنگ نہیں ہے۔ اس جہاد کا تذکرہ صحیح ابن حبان کی ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ **المجاهد من جاهد لنفسه** (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے)۔ اور دوسری بہت سی روایات میں اس جہاد کا تذکرہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی اور دس سالہ مدنی زندگی کے زیادہ تر ایام اسی جہاد کا عملی اسوہ ہیں جس میں آپ نے ایک طرف تو خود عبادت واطاعت الٰہی کا اسوہ قائم کیا اور دوسری طرف صحابہ کرام کی ایسی جماعت تیار کی جو اس جہاد کا عملی پیکر تھی۔

جہاد کی ایک اور قسم ہے جہاد بالعلم۔ یعنی لوگوں کے دلوں کو علم کے ہتھیار سے فتح کرنا اور لوگوں کو دین اسلام کا پیغام اور قرآن کی تعلیم کے پہنچانے کے لئے جدوجہد کرنا، تاکہ کفر وگمراہی کی اندھیریوں میں پڑے ہوئے لوگ نور ایمان کی رشنی میں راہ ہدایت اختیار کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس جہاد کا تذکرہ کئی جگہ موجود ہے۔ ایک آیت جس کا تذکرہ اوپر بھی آیا ہے، سورہ فرقان کی

ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ کفار سے جہاد کبیر کرو۔ متعدد مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جہاد بالقرآن جس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال سے بھی بڑھ کر ہے۔ چونکہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے اثرات میں وہ وسعت نہیں ہے جو جہاد بالقرآن میں ہے اور جہاد بالقرآن کا موقعہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا جہاد ہے جو ہمہ وقت جاری وساری رہتا ہے۔

جہاد کی ایک قسم جہاد بالمال ہے یعنی راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنا، حق کی حمایت میں اپنی دولت نثار کرنا، قرآن مجید میں اس جہاد کا بھی تذکرہ ہے۔ سورہ انفال میں ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ(انفال: 72)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

متعدد اور بھی آیات میں جہاد بالمال کا تذکرہ آیا ہے جن میں سے بعض آیات کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ ایک اور آیت سورہ حجرات میں ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات: 15)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں۔

جہاد کی ایک قسم کلمۂ حق کا اعلان ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا بڑا جہاد ہے۔ (افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر) (ترمذی) اس کے علاوہ بھی جہاد کی اور اقسام ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کا جہاد حج ہے۔ (بخاری) وغیرہ

جہاد کی وہ قسم جس کو جہاد بالسیف یا جنگ یا قتال کہتے ہیں اسلام نے اس کی بھی پوری گنجائش رکھی ہے۔ جہاں طاقت کے استعمال کی ضرورت ہو وہاں طاقت کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ لیکن طاقت کا یہ استعمال صرف بقائے امن یا قیام امن کے لیے ہوگا اور ہر کسی کو خود ساختہ جہادی بننے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے اصول وآداب اور شرائط ہیں۔ ان شرائط کے بغیر جہاد بمعنی جنگ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاد اگر جنگ کے معنی میں ہو تو وہ جہاد ہے جو اس کی شرائط کو پوری کرتا ہو، اگر جہاد کے شرائط پورے نہ ہوں تو پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں بلکہ فساد ہے۔

جہاد کے ان درجات یا قسموں کا تذکرہ ایک حدیث میں بہت واضح انداز میں آیا ہیکہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے اللہ تعالی نے جس نبی کو مبعوث فرمایا اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کئے رہتے اور اسکی ہدایتوں کا اتباع کرتے رہتے۔ پھر ان کی جگہ ان کے بعد ایسے ناخلف آئے کہ جن کا حال یہ ہوتا کہ

جو کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کرتے جس کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا، پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے'' ۔(مسلم)

جہاد بالسیف یا قتال بھی اسلام میں بہت مہتم بالشان عمل ہے ۔اس کے حدود و آداب اور طریقہ کار کی بابت اسلام میں تفصیلی ہدایات ہیں ۔فرد، معاشرہ اور حکومت کے ذریعہ قوت کے استعمال کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات کا مطالعہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر سامنے آجائے ۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں آیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ . تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ (صف: 11)

اے ایمان والو کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں آخرت کے دردناک عذاب سے بچالے، وہ یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کرو۔

ایک اور آیت ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُواْ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُواْ مِن دُونِ اللّهِ وَلاَ رَسُولِهِ وَلاَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (التوبہ: 16)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں سے اندرونی تعلق رکھا۔

ایک آیت میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِهِ صَفّاً كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ (صف: 4)

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

قرآن میں اور بھی متعدد مقامات پر جہاد، قتال اور قتال میں شہید ہونے والے لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی جہاد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ایک روایت میں ہے۔ایک شب و روز کی سرحدوں کی نگرانی ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔(مسلم) ایک اور روایت میں ہے: قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے، اور راہ خدا میں دشمن کے مقابلے میں جم کر ٹھہرا رہنا گھر کی ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔(ترمذی)

متعدد دیگر احادیث میں جہاد کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ جہاد راہ خدا میں دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد ہے، اس کے ہر ہر حصے کی فضیلت ایسی ہے اور خاص طور پر قتال کے فضائل کا بیان اس لئے بھی ہوا کہ اول تو انسان کا گھر سے نکلنا خاص طور پر دینی ضرورت کے لیے گھر سے نکلنا دشوار ہوتا ہے، اس میں بھی محض دینی کام کے لیے نکلنا جس کا فائدہ بعد میں ظاہر ہونے والا ہے بڑا دشوار ہوتا ہے۔ ایسا سفر جس میں جان کی بازی لگانی ہو وہ تو اور بھی مشکل ہوگا ان دنیاوی دشواریوں کی وجہ سے جہاد بالسیف کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ انتہائی دشوار گزار کام ہے، بڑے حوصلے اور دل گردے کے لوگ ہی ان مشکلات میں ثابت قدم رہ پاتے ہیں۔ اس لئے ان کے فضائل کو روایات میں تفصیل سے بیان کیا گیا اور راہ خدا میں جہاد نہ کرنے کی مذمت بھی احادیث میں بکثرت آئی ہے۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ جہاد کی اہمیت سب لوگوں کو معلوم رہے اور جہاد کے لئے نکلنے کی ضرورت ہو تو وہ لوگ جہاد سے جی نہ چرائیں۔

اسلام میں جہاد کی عملی طور پر صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ جہاد کے نام پر وہی جنگ جائز ہوگی جس میں درج ذیل شرائط پورے ہوں۔

1. جنگ ایک ایسے امیر کی قیادت میں لڑی جائے، جس کو اپنی جماعت پر اقتدار حاصل ہو اور جس کا حکم عملاً نافذ ہو۔ یعنی وہ باضابطہ حکمراں ہو۔ حدیث شریف میں ہے: **انما الامام جنة ، يقاتل من ورائه و يتقى به** (البخاری) بلاشبہ امام ڈھال ہے، اس کی قیادت میں جنگ ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔

2. دوسری شرط یہ ہے کہ جہاد صرف فی سبیل اللہ کیا جائے، اس میں محض قومی و علاقائی تعصب یا دولت و اقتدار کا حصول پیش نظر نہ ہو۔ حدیث میں ہے:

من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا فهو فى سبيل الله. (بخاری)

جو شخص اس لیے جہاد کرے کہ اللہ تعالی کا کلمہ سربلند ہو تو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

ليس منا من قاتل على عصبية و ليس منا من مات على عصبية (ابوداؤد)

وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی عصبیت کے لئے جنگ کرے اور وہ ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنا پر جان دے۔

3. تیسری شرط یہ ہے کہ جہاد بامقصد ہو۔ بامقصد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جن مقاصد کے لیے جہاد کی اجازت دی ہے صرف انہیں کے تحت کیا جائے اور جب تک کے لیے اجازت دی ہے اسی وقت تک کیا جائے۔ قرآن میں ہے:

وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ (البقرہ: 190)

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو''۔

4. چوتھی شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

5. پانچویں شرط یہ ہے کہ کامیابی کا یقین ہو، اگر ناکامی کا قوی اندیشہ ہو تو جہاد جائز نہیں، بلکہ ایسی صورت میں اپنی اپنی قوتوں کو محفوظ کر کے ان کو بڑھانا ضروری ہے۔ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

ان شرائط کے ساتھ مسلمان ظلم و جارحیت کے جواب میں، مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے اور قبول حق کی راہ میں مزاحم قوتوں کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔

اسلام میں جنگ پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ جنگ ایک ناگزیر عمل ہے۔ اسلام کی نظر میں پسندیدہ عمل صبر ہے، اسلام نے کشادگی کے انتظار کو عبادت قرار دیا ہے۔ (ترمذی) اس لئے جنگ کی اجازت شرط کے ساتھ دی گئی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ . الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ(الحج: 40-39)

''اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔ صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے''۔

کوئی ظالم یا جارح قوت مسلمانوں پر حملہ آور ہو تو یہ بھی اپنے دفاع کی شکل ہے قرآن مجید میں ہے:

وَقَاتِلُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ (البقرہ: 190)

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو''۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں جہاد کی دو صورتیں قرار پاتی ہیں۔ اور قرآن پاک کی صراحت کے مطابق ان دونوں شکلوں میں جہاد کرنا جائز ہے۔ لیکن اس میں برابر کا بدلہ لیا جا سکتا ہے، کسی ظلم و تعدی کی اجازت نہیں، اس لیے کہ اوپر مذکورہ آیت میں و لا تعتدوا کی قید موجود ہے۔ اور اسطرح کی دیگر آیات میں بھی قید موجود ہے۔ اس لیے تعدی مطلقاً ناجائز ہے صرف بدلہ جائز ہے۔

یہ دونوں صورتیں دفاعی جنگ کی ہیں۔ جارحیت خواہ انسان کی آزادی کے خلاف ہو یا اس کے عقیدہ و مذہب کے خلاف، دونوں شکلوں میں جرم ہے اور اسکا دفاع انسان کا فطری حق ہے۔

اگرچہ ان دونوں صورتوں میں جہاد کی اجازت ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں جہاد کیا ہی جائے، اگر بغیر جنگ و جدال کے مقصد حل ہو سکتا ہے اور مظلوم کا حق دلایا جا سکتا ہے تو بہتر ہوگا کہ جنگ سے احتراز کیا جائے۔

جہاد کی یہ دونوں شکلیں دفاع کی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہیں مسلمان کمزور ہوں، اپنے عقیدہ و مذہب کی وجہ سے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہوں، اور کسی ظالم قوم نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہو تو ایسے حالات میں اسلامی حکومت پر واجب ہوگا کہ ان کی مدد کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا(النساء: 75)

’’آخر کیا وجہ یہ کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہوں اور فریاد کر رہے ہوں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال، جس کے باشندے ظالم ہیں‘‘۔

لیکن ان مظلوم مسلمانوں کی مدد بھی صرف اس قوم کے خلاف کی جائے گی، جس قوم سے کوئی معاہدہ نہ ہو۔ اگر معاہدہ ہوگا تو ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ بلکہ جب تک معاہدہ باقی ہے اس کا احترام کیا جائے گا۔

اس شرط کی صراحت قرآن پاک نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِيْ الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ (الانفال: 72)

’’اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرص ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے‘‘۔

یہاں ایک بات اور ملحوظ رہنی چاہیے کہ موجودہ زمانے میں بعض نام نہاد سیکولر طاقتیں آزادی دلانے، جمہوریت قائم کرنے یا خواتین کو آزادی دلانے کے نام پر ظلم و بربریت کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں ان کے مقاصد دوسرے ہیں، نعرے دوسرے ہیں۔ اسلام میں اسطرح کی دہری پالیسی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ظالم قوتیں اپنے زیر اثر لوگوں پر یہ پابندی عائد کردیں کہ وہ راہ حق کو قبول نہیں کرسکتے۔ اس پابندی کے ازالے اور قبول حق کے انسانی حق کو بحال کرنے کے لیے بھی اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

جہاد (جنگ) صرف اس وقت تک جائز ہے جب تک باطل قوتوں کا فتنہ موجود ہے۔ فتنے کی آگ فرو ہوجانے کے بعد جنگ ختم ہوجاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِيْنَ(البقرہ: 193)

’’تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے‘‘۔

استیصال فتنہ یا جارحین کے آمادہ صلح ہوجانے کے بعد بھی جنگ ختم ہوجاتی ہے۔اس سلسلے میں چند آیتیں یہ ہیں:

حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد: 4)

تا آں کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔

وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا(انفال: 61)

اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوتو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْاْ إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلاً(النساء: 90)

لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

اسلام محض ناگزیر صورت حال میں جنگ یا جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ وہ صورت حال ختم ہو جانے کے بعد جنگ کی اجازت ختم ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ہمیشہ جنگ پر عدم جنگ کو ترجیح دی ہے۔ آپ ہمیشہ جنگ سے اجتناب کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

لاتتمنوا لقاء العدو. (بخاری) (دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو)

صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صلح حدیبیہ ایسی صلح ہے جو محض جنگ سے اعراض اور امن کے قیام کے لیے دشمن کی ہر خواہش کو تسلیم کر کے عمل میں آئی۔ دشمنوں نے طرح طرح سے امن کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، نہایت اہانت آمیز اور مشکل شرائط پر یہ معاہدہ مکمل ہوا۔ ایک مسلمان ابوجندل جو مشرکین کے ظلم وستم کا شکار تھے آگئے اور خود کو مکہ سے نکالنے کی درخواست کی، اہل مکہ نے معاہدہ کی رو سے اس کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کے لیے یہ جذباتی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے ان کو ایک مرتبہ پھر صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑا، لیکن امن کے قیام کے لیے مسلمانوں نے یہ بھاری قیمت بھی ادا کی اور بعد میں پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس قیمت کا بدل بلکہ نعم البدل ان کو عطا ہوا۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا کیا مقام ہے، اور جہاد بمعنی جنگ کن حالات میں یا کن شرائط کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ بات آتی ہے کہ اسلام کے نام پر اور خلوص نیت کے ساتھ جو جنگ ہو رہی ہے اسے جہاد کیوں نہ کہا جائے۔

لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام میں جنگ کے کچھ اصول وضوابط اور حدود وآداب ہیں۔ ان کی رعایت کے بغیر کوئی جنگ جہاد نہیں ہوگی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی متاع تجارت کو دریا برد کر کے نفع کی توقع رکھے اور اسے تجارت کہے اور کہے کہ میری نیت درست ہے اس لیے مجھے اس تجارت میں نفع ملنا چاہیے۔ جنگ ایک غیر معمولی صورت حال ہے اس کی اجازت غیر معمولی حالات میں دی جا سکتی ہے۔ عام حالات میں جنگ نہیں ہے۔ امن ہے، امن ایک پائیدار اور تعمیری قوت کا نام ہے۔ اپنے اثرات کے لحاظ سے امن کی طاقت تلوار کی طاقت سے بہت زیادہ ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو اس طرح کہا گیا ہے:

و لا تستوی الحسنة و لا السیئة ادفع بالتی هی احسن فا ذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم و ما یلقها الا الذین صبروا و مایلقها الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ: 35-34)

''نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی۔ برائی کو اچھی بات سے ٹالئے آپ دیکھیں گے کہ وہ شخص جس کے ساتھ آپ کی دشمنی تھی وہ آپ کا جگری دوست ہو جائے گا''۔

آخری بات یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں جنگ شجر ممنوعہ نہیں ہے، بلکہ بڑی فضیلت کا عمل ہے، لیکن خود ساختہ جہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، صرف شرعی حکومت جنگ کی تعیین کرسکتی ہے۔ اور مطلوبہ مقاصد جن کا اوپر ذکر ہوا ان کے لئے ہی جنگ ہوسکتی ہے، کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔ جب تک جنگ کے لئے ایسے حالات پیدا نہ ہوں جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ جہاد کی دوسری صورتیں موجود ہیں۔ ان صورتوں پر عمل کرنا ہمہ وقت مطلوب ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے۔

الجهاد ماض الی یوم القیامه (جہاد قیامت تک جاری رہے گا)

اس کا مطلب وہی جہاد ہے جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرتا ہے اور اطاعت و عبادت کے لئے کرتا ہے۔ چوں کہ متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت سے قبل ایسا زمانہ بھی آئے گا جب سارے لوگ حق کے متبع ہوں گے۔ اس لئے اس وقت جنگ تو نہیں ہوسکتی اس لئے اس روایت میں جہاد سے مراد جہاد نفس ہے نہ کہ جہاد سیف۔

10.4 خلاصہ

جہاد کے لفظی معنی محنت اور جدوجہد کرنے کے آتے ہیں۔ کسی کام میں اپنی طاقت لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ جہاد زندگانی کا ایک اہم اصول ہے۔ جہاد ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسلام کی نظر میں جہاد عمل کا نام ہے اور ترک جہاد کاہلی و سستی ہے۔ جہاد کی متعدد اقسام ہیں۔ جہاد بالنفس، جہاد بالمال، جہاد بالقرآن اور جہاد بالسیف یعنی جنگ وغیرہ۔ اسلام نے ہر قسم کے جہاد کی اجازت دی ہے، لیکن جہاد بالسیف یا جنگ کی اجازت مشروط ہے۔ اس کے لئے اسلام نے پانچ بنیادی شرطیں مقرر کی ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری ہوں گی تو جنگ کرنے کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

1. جنگ کسی امام کی ماتحتی میں لڑی جائے گی یعنی باضابطہ حکومت کو ہی جنگ کرنے کا اختیار ہوگا۔
2. جہاد فی سبیل اللہ وہ ہے جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہو۔
3. جہاد با مقصد ہو۔
4. کامیابی کا ظن غالب ہو۔
5. جہاد میں صرف جائز طریقے اختیار کئے گئے ہوں۔

جس صورت حال میں اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے دنیا کا ہر معاشرہ اس سے بھی کم میں جنگ کرنے کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس لئے اسلام میں جنگ کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت ہے۔ یعنی جب انسان کی حق تلفی ایک حد تک پہنچ جائے اور من جملہ دوسرے اسباب موجود ہوں تو جنگ کی اجازت ہے۔

جنگ کی اسلام میں تین قسمیں ہیں:

1. دفاعی 2. اقدامی 3. امدادی

تینوں قسموں کے اپنے حدود و شرائط ہیں۔ ان کا پاس رکھنا لازمی ہے۔ جنگ کی اجازت کے باوجود اسلام میں احسن طریقے کو پسند کیا گیا ہے۔ جہاں جنگ کے بغیر امن کی طاقت سے مسائل حل ہوتے ہوں یا دشمن مصالحت پر آمادہ ہو جائے تو امن کو ترجیح دینا چاہیے۔

10.5 نمونے کے امتحانی سوالات

1. جہاد کی کتنی قسمیں ہیں؟
2. جہاد بالسیف کے کیا شرائط ہیں؟
3. جہاد کے معنی و مفہوم بیان کیجیے؟

10.6 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الجہاد فی الاسلام — مولانا ابوالاعلی مودودی
2. سیرۃ النبی — علامہ سید سلیمان ندوی
3. اسلام ایک نظر میں — مولانا صدرالدین اصلاحی
4. آثار الحرب فی الاسلام — وہبہ زحیلی
5. دہشت گردی اور اسلامی تعلیمات — مفتی محمد مشتاق تجاروی

بلاک:3 معاملات

فہرست

اکائی نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
11.	حقوق اللہ	193-216
12.	حقوق العباد	217-249
13.	آداب زندگی	250-275

اکائی 11 : حقوق اللہ

اکائی کے اجزاء

11.1 مقصد

11.2 تمہید

11.3 حقوق اللہ

11.4 توحید

11.5 شرک سے اجتناب

11.6 عبادت

11.7 تعظیم

11.8 دعاء

11.9 خلاصہ

11.10 نمونے کے امتحانی سوالات

11.11 فرہنگ

11.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

11.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ ''حقوق اللہ'' کا مفہوم کیا ہے؟ توحید کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں، اللہ کے اسماء حسنٰی کیا ہیں؟ ان کی نوعیت کیا ہے؟ اسی طرح آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شرک کی حقیقت کیا ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس سے بچنا کیوں ضروری ہے؟ نیز آپ اللہ کی عبادت اور اللہ کی تعظیم کے مفہوم، ان کی اقسام اور ان کی اہمیت کو بھی سمجھ سکیں گے، اخیر میں دعاء کی حقیقت، اس کی اقسام، اس کے فضائل وآداب سے بھی آپ کو واقف کرایا جائے گا اور عقیدہ کی رو سے بھی اس کی اہمیت اجاگر کی جائے گی۔

11.2 تمہید

اللہ تعالٰی نے انسان کو پیدا کیا اور آسمان وزمین کی تمام چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا، اس کی خدمت میں لگادیا، دنیا کی

زندگی میں انسان ان سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسان اللہ کے اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا اور نہ اللہ کو اس کی ضرورت ہے، دنیا کی ہر چیز ہر وقت اس کی تسبیح بیان کر رہی ہے؛ لیکن یہ خود انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کریم اور رحیم ذات کے اس احسان کی قدر کرتے ہوئے اس کو دریافت کرے، اس کو پہچانے، اس کی تعظیم کرے اور اس کی تعظیم کے اظہار کے لئے اس کی عبادت کرے، اپنی ضرورت کے لئے اس سے دعاء کرے، انسان اپنے طور پر اللہ کی تعظیم کا حق ادا کرنا چاہتا تو صحیح طریقہ پر نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے اسی فطری جذبہ کی تسکین کی رہنمائی فرمادی اور اپنی کتابوں بالخصوص آخری کتاب قرآن مجید میں تفصیل سے اس کی وضاحت فرمادی اور بندوں پر اس کو ضروری قرار دے دیا، جو شخص اس سے روشنی حاصل کئے بغیر اپنے فطری جذبہ کی تسکین کے لئے مالک کے سامنے جھکنا اور اس کے لئے عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہے، وہ صحیح راستہ سے ہٹ جاتا ہے اور بسا اوقات اس تعظیم میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کر لیتا ہے، یہی شرک ہے، اس اکائی میں اللہ تعالیٰ کے چند حقوق توحید، شرک سے اجتناب، عبادت، تعظیم اور دعاء سے متعلق ضروری تفصیلات ذکر کی جائیں گی۔

11.3 حقوق اللہ

حقوق کا لفظ حق کی جمع ہے، حقوق اللہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں، ان میں سے کوئی حق اللہ کے سوا کسی بندہ کو نہیں دیا جائے گا، اور جن کی ادائیگی خالص اللہ کے لئے بندوں پر ضروری ہیں' ان حقوق کی وضاحت پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں آئی ہے چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا:

> ''اے معاذ! کیا تم جانتے ہو اللہ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ وہ ان بندوں کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں'' [بخاری، حدیث نمبر:2856]

اس حدیث سے اللہ کا حق بھی معلوم ہو رہا ہے اور اس کا اجر وثواب بھی واضح ہو رہا ہے، عبادت میں اللہ کو پہچاننا، اس کو ایک ماننا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور صرف اسی کی عبادت کرنا، اسی سے مانگنا اور اس کے لئے تعظیم کے جو طریقے خاص ہیں ان کو دوسروں کے لئے اختیار نہ کرنا، یہ ساری باتیں شامل ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ﴾[الذاریات :56]

(میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری ہی عبادت کریں)

مشہور مفسر مجاہد کہتے ہیں: اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مجھے پہچانیں ایک دوسرے مفسر کلبی کہتے ہیں: تاکہ وہ میری توحید کے قائل ہوں اور مجھے ایک تسلیم کریں۔ اللہ کے بندوں پر بے شمار حقوق ہیں، جن میں اہم یہ ہیں: توحید، شرک سے اجتناب، عبادت، تعظیم اور دعاء ذیل کی سطروں میں ان پانچ حقوق کو بیان کیا جائے گا۔

11.4 توحید

11.4.1 لغوی واصطلاحی معنی

لغوی اعتبار سے توحید کا لفظ عربی کے وزن ''تفعیل'' پر ہے' اور عربی لفظ ہے، اس کا لفظی معنی ہے کسی چیز یا کسی شخص کو ایک بنانا یا ایک ماننا، یہ لفظ ''واحد'' سے بنا ہے، جس کے معنی ''ایک'' کے آتے ہیں۔

جہاں تک توحید کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ عبادت کو صرف ایک معبود حقیقی کے ساتھ اس اعتقاد کے لئے خاص کرنا کہ وہ اپنی ذات وصفات اور افعال میں یکتا ہے، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی سلطنت، اشیاء کی تخلیق اور کائنات کی تدبیر میں اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ تنہا عبادت کا مستحق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں، اس کی ذات، صفات اور اس کے اسماءِ حسنیٰ میں اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں، وہ ہمیشہ سے اپنی خصوصیات کے ساتھ ہے، اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا۔

11.4.2 توحید کی اقسام

1. توحید الربوبیہ یعنی ربوبیت میں توحید
2. توحید الالوہیہ یعنی الوہیت میں توحید
3. توحید الاسماء والصفات یعنی اسماء اور صفات میں توحید

11.4.2.1 توحید ربوبیت

توحید ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ یہ ایمان رکھے کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا ہے وہ کائنات کے ہر ذرہ کا علم رکھنے والا ہے، آسمان، زمین اور دونوں کے درمیان جو کچھ ہے سب اس نے پیدا کیا، جن وانس کو اس نے پیدا کیا اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، قرآن میں ہے:

''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ'' [الزمر:62] (اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے)

عقلی طور پر ہر ''حادث'' (وجود میں آنے والی چیز) کا کوئی ''محدث'' (وجود میں لانے والا) ضرور ہوگا، یہ کائنات اور اس میں جو چیزیں ہیں خود سے وجود میں نہیں آئیں، یہ بھی ممکن نہیں کہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پیدا کیا ہو، چونکہ کوئی چیز خود اپنے وجود کی خالق نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَیْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ''[الطّور:35]

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ نہ یہ لوگ بغیر خالق کے پیدا ہوئے نہ خود انہوں نے اپنے آپ کو پیدا کیا؛ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ ان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اس توحید کو مکہ کے مشرکین بھی مانتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

'' وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ ليقولن الله '' [الزخرف : 87]

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے ان کو پیدا کیا وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے)

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا: (مشرکین سے) کہیے: تمہیں آسمان وزمین سے کون رزق دیتا ہے، یا کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے، کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور کون مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور ہر کام کی تدبیر کون کرتا ہے تو وہ عنقریب کہیں گے: اللہ)۔ [یونس: 31]

یہ آیتیں بتارہی ہیں کہ مشرکین بھی اللہ کے بارے میں اتنی باتیں مانتے تھے؛ لیکن وہ عبادت صرف ایک اللہ کی نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر اس کے اسماء حسنی اور صفات قدسیہ کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے تھے، اس لئے وہ اسلام کے دائرہ میں نہیں آ سکے۔

11.4.2.2 توحید الوہیت

توحید الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی ہو۔ لا إلہ إلا اللہ کے یہی معنی ہیں، یعنی ''لا معبود حقٌّ إلا الله'' (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'' ذٰلِکَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ'' [الحج: 62]

(یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ تعالیٰ کے سوا یہ لوگ عبادت کررہے ہیں وہ بالکل ہی لچر ہیں)

ایک دوسری جگہ فرمایا: ''فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ'' [الزمر:2]

(سو آپ خالص اعتقاد کرکے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیے)

''إِيَّاکَ نَعْبُدُ وإِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ'' [الفاتحة: 5]

(ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں)

اس میں بھی توحید کا اعتراف بندہ کی زبان سے کرایا گیا ہے، توحید ربوبیت کے ساتھ اس توحید کا ماننا بھی ضروری ہے، انبیاء کرام اس کی دعوت دیتے تھے، اور مشرکین اسی کا انکار کرتے تھے، جب کہ قرآن کی تاکید یہ ہے:

''فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ '' [محمد: 19]

(تو آپ اس کا یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہئے)

11.4.2.3 اسماء اور صفات میں توحید

توحید کی تیسری قسم اللہ تعالیٰ پر ان تمام اسماء وصفات کے ساتھ ایمان لانا ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے بتائے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی اس کے ساتھ خاص ہیں، اس کا ہمسر، اس کا برابر اور اس کے مشابہ کوئی نہیں، اللہ کمال کی تمام صفات سے متصف ہے، اور نقص وتشبیہ کی تمام صفات سے وہ پاک ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا'' [الأعراف:180]

(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارو)

اوران صفات میں اللہ کا کوئی شریک نہیں: ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ'' [الشوریٰ:11]
(کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا اور دیکھنے والا ہے)

11.4.3 اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ

ابھی آپ نے توحید کی اقسام کا مطالعہ کیا، اب آپ کو اللہ کے مخصوص اسماء حسنی سے واقف کرایا جائے گا؛ تاکہ ان کے ذریعہ توحید کی معنویت اور زیادہ واضح ہوسکے، علماء نے اسماء حسنیٰ سے واقفیت کو توحید کی بنیاد قرار دیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ''اسماء حسنیٰ'' ہیں، حسنی کا لفظ احسن کی تانیث ہے جس کا معنی ہے، یعنی سب سے بہتر نام، اسماء حسنی یہ اللہ کے صفاتی نام ہیں، ان میں صرف لفظ ''اللہ'' نام قرآن مجید میں عَلَم کے طور پر استعمال ہوا ہے، بعض حضرات نے ''الرحمٰن'' کو بھی علم ثابت کیا ہے، جیسے قرآنی آیت "الرحمن ، علم القرآن" میں ہے، قرآن وحدیث میں اللہ کے سو سے زائد نام ملتے ہیں؛ لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ننانوے نام ہیں، سو میں ایک کم، جو ان کو یاد کرے یا شمار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ صحیح حدیثوں میں ان ناموں کی وضاحت نہیں ملتی، بعض حدیثوں میں ان ننانوے ناموں کو شمار بھی کرایا گیا ہے؛ لیکن وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ راویوں نے قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کے ذریعہ ان ننانوے ناموں کو خود دریافت کیا ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، بعض وہ ہیں جن کی دعاؤں میں آپ ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے، یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ اکثر ائمہ ومحدثین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات انہیں ننانوے ناموں میں محدود نہیں یعنی ان کے علاوہ بھی نام قرآن وحدیث میں آئے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ایک سوال ذہن میں یہ آسکتا ہے کہ یہ نام مکمل سو کیوں نہیں ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ طاق ہے اور وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، اس سے توحید کی صفت اور کھل کر سامنے آتی ہے، دوسرے ناموں کے درمیان ان ناموں کی حیثیت فضیلت میں اس طرح بڑھی ہوئی ہے کہ ان کو یاد کرنے یا شمار کرنے پر جنت میں داخلہ کی ضمانت دی گئی ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ قرآن وحدیث میں اللہ کے جو نام آئے ہیں وہ توقیفی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے اللہ کے کسی فعل کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی صفت کا استعمال نہیں کرسکتے، بعض علماء مثلاً امام غزالی اور امام رازی وغیرہ نے اس شرط کے ساتھ اللہ کے لئے قرآن وحدیث میں مذکور اسماء کے علاوہ دوسرے ناموں کے استعمال کی اجازت دی ہے کہ اس لفظ سے کوئی ایسے معنی نکلتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہوں۔

11.4.4 اسماء حسنیٰ، ان کی اقسام اور ان پر ایمان کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنی یہ ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لاَ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں

(۱)اَلرَّحْمٰنُ	(۲)اَلرَّحِیْمُ	(۳)اَلْمَلِکُ	(۴)اَلْقُدُّوْسُ
بے حد رحم کرنے والا	بڑا مہربان	حقیقی بادشاہ	برائیوں سے پاک
(۵)اَلسَّلَامُ	(۶)اَلْمُؤْمِنُ	(۷)اَلْمُھَیْمِنُ	(۸)اَلْعَزِیْزُ
بے عیب ذات	امن دینے والا	نگہباں	سب پر غالب
(۹)اَلْجَبَّارُ	(۱۰)اَلْمُتَکَبِّرُ	(۱۱)اَلْخَالِقُ	(۱۲)اَلْبَارِئُ
سب سے زبردست	بڑائی اور بزرگی والا	پیدا کرنے والا	جان ڈالنے والا
(۱۳)اَلْمُصَوِّرُ	(۱۴)اَلْغَفَّارُ	(۱۵)اَلْقَھَّارُ	(۱۶)اَلْوَھَّابُ
صورت دینے والا	درگذر کرنے والا	اپنے قابو میں رکھنے والا	عطا کرنے والا
(۱۷)اَلرَّزَّاقُ	(۱۸)اَلْفَتَّاحُ	(۱۹)اَلْعَلِیْمُ	(۲۰)اَلْقَابِضُ
رزق دینے والا	مشکل کشا	وسیع علم والا	روزی تنگ کرنے والا
(۲۱)اَلْبَاسِطُ	(۲۲)اَلْخَافِضُ	(۲۳)اَلرَّافِعُ	(۲۴)اَلْمُعِزُّ
روزی فراخ کرنے والا	پست کرنے والا	بلند کرنے والا	عزت دینے والا
(۲۵)اَلْمُذِلُّ	(۲۶)اَلسَّمِیْعُ	(۲۷)اَلْبَصِیْرُ	(۲۸)اَلْحَکَمُ
ذلت دینے والا	سب کچھ سننے والا	سب کچھ دیکھنے والا	حاکم مطلق
(۲۹)اَلْعَدْلُ	(۳۰)اَللَّطِیْفُ	(۳۱)اَلْخَبِیْرُ	(۳۲)اَلْحَلِیْمُ
سراپا انصاف	بہت نرمی کرنے والا	سب کچھ جاننے والا	بڑا بردبار
(۳۳)اَلْعَظِیْمُ	(۳۴)اَلْغَفُوْرُ	(۳۵)اَلشَّکُوْرُ	(۳۶)اَلْعَلِیُّ
بڑا بزرگ	بہت بخشنے والا	قدردان	بہت بلند و برتر
(۳۷)اَلْکَبِیْرُ	(۳۸)اَلْحَفِیْظُ	(۳۹)اَلْمُقِیْتُ	(۴۰)اَلْحَسِیْبُ
بہت بڑا	سب کا محافظ	توانائی دینے والا	کفایت کرنے والا
(۴۱)اَلْجَلِیْلُ	(۴۲)اَلْکَرِیْمُ	(۴۳)اَلرَّقِیْبُ	(۴۴)اَلْمُجِیْبُ
بلند مرتبہ والا	بہت کرم کرنے والا	بڑا نگہبان	دعا قبول کرنے والا
(۴۵)اَلْوَاسِعُ	(۴۶)اَلْحَکِیْمُ	(۴۷)اَلْوَدُوْدُ	(۴۸)اَلْمَجِیْدُ

وسعت دینے والا	بڑی حکمتوں والا	بہت محبت کرنے والا	بڑا بزرگ
(۴۹) اَلْبَاعِثُ	(۵۰) اَلشَّهِيْدُ	(۵۱) اَلْحَقُّ	(۵۲) اَلْوَكِيْلُ
مردوں کو زندہ کرنے والا	حاضر وناظر	برحق و برقرار	بڑا کارساز
(۵۳) اَلْقَوِيُّ	(۵۴) اَلْمَتِيْنُ	(۵۵) اَلْوَلِيُّ	(۵۶) اَلْحَمِيْدُ
بڑی طاقت والا	شدید قوت والا	مددگار وحمایتی	لائق تعریف
(۵۷) اَلْمُحْصِيُ	(۵۸) اَلْمُبْدِئُ	(۵۹) اَلْمُعِيْدُ	(۶۰) اَلْمُحْيِيُ
شمار میں رکھنے والا	پہلی بار پیدا کرنے والا	دوبارہ پیدا کرنے والا	زندگی دینے والا
(۶۱) اَلْمُمِيْتُ	(۶۲) اَلْحَيُّ	(۶۳) اَلْقَيُّوْمُ	(۶۴) اَلْوَاجِدُ
موت دینے والا	ہمیشہ زندہ رہنے والا	ہمیشہ قائم رکھنے والا	ہر چیز کو پانے والا
(۶۵) اَلْمَاجِدُ	(۶۶) اَلْوَاحِدُ	(۶۷) اَلْأَحَدُ	(۶۸) اَلصَّمَدُ
بزرگی اور بڑائی والا	اکیلا	تنہا	بے نیاز
(۶۹) اَلْقَادِرُ	(۷۰) اَلْمُقْتَدِرُ	(۷۱) اَلْمُقَدِّمُ	(۷۲) اَلْمُؤَخِّرُ
قدرت والا	پوری مقدرت رکھنے والا	پہلے اور آگے کرنے والا	پیچھے اور بعد میں رکھنے والا
(۷۳) اَلْأَوَّلُ	(۷۴) اَلْآخِرُ	(۷۵) اَلظَّاهِرُ	(۷۶) اَلْبَاطِنُ
سب سے پہلے	سب کے بعد	ظاہر وآشکارہ	پوشیدہ و پنہاں
(۷۷) اَلْوَالِيُ	(۷۸) اَلْمُتَعَالِيُ	(۷۹) اَلْبَرُّ	(۸۰) اَلتَّوَّابُ
متولی اور متصرف	سب سے بلند اور برتر	بڑا اچھا سلوک کرنے والا	توبہ قبول کرنے والا
(۸۱) اَلْمُنْتَقِمُ	(۸۲) اَلْعَفُوُّ	(۸۳) اَلرَّؤُوْفُ	(۸۴) مَالِكُ الْمُلْكِ
بدلہ لینے والا	معاف کرنے والا	بہت بڑا مشفق	سلطنت کا مالک
(۸۵) ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ		(۸۶) اَلْمُقْسِطُ	(۸۷) اَلْجَامِعُ
عظمت وجلال اور انعام واکرام والا		عدل وانصاف کرنے والا	سب کو جمع کرنے والا
(۸۸) اَلْغَنِيُّ	(۸۹) اَلْمُغْنِيُ	(۹۰) اَلْمَانِعُ	(۹۱) اَلضَّارُّ
بڑا بے نیاز	بے نیاز و غنی بنا دینے والا	روک دینے والا	نقصان پہنچانے والا

(۹۲) اَلنَّافِعُ	(۹۳) اَلنُّوْرُ	(۹۴) اَلْهَادِيْ	(۹۵) اَلْبَدِيْعُ
نفع پہنچانے والا	سراپا نور	سیدھا راستہ دکھانے والا	ایجاد کرنے والا
(۹۶) اَلْبَاقِيْ	(۹۷) اَلْوَارِثُ	(۹۸) اَلرَّشِيْدُ	(۹۹) اَلصَّبُوْرُ
ہمیشہ باقی رہنے والا	سب کے بعد موجود رہنے والا	بڑا نیک	بہت زیادہ صبر وتحمل والا

ان میں کچھ صفات وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور محبت کا اظہار ہوتا ہے، کچھ صفات وہ ہیں جن سے خدا کی بڑائی اور کبریائی کا اظہار ہوتا ہے، اور کچھ وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح یہ اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

غالبًا سب سے پہلے حضرت امام جعفر صادقؒ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء قرآن کریم سے اخذ کئے، ان کے بعد سفیان بن عیینہ اور ابو زید بغوی نے قرآن کریم سے ان ناموں کی تخریج کی، اوپر ذکر کئے گئے اسماء حسنیٰ ترمذی کی ایک روایت (حدیث نمبر: 3849) میں ہیں، اور ان حضرات کے قرآن وحدیث سے ننانوے ناموں کے انتخاب میں جزوی فرق بھی پایا جاتا ہے۔

قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان پر بغیر کسی تشبیہ وتمثیل اور تکییف (مشابہت، مثالی اور کیفیت) کے ایمان لانا واجب ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ خوب سننے اور جاننے والا ہے، یہ سننا اور جاننا انسان کے سننے اور جاننے سے اپنی نوعیت، اپنی وسعت اور اپنے مرتبہ میں بہت بلند ہے، اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو انسان میں پائی جانے والی صفات سے تشبیہ دینا جائز نہیں، اسی طرح مثلاً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور انگلیوں وغیرہ کا تذکرہ بھی قرآن وحدیث میں آیا ہے، ان پر بغیر تشبیہ وتمثیل کے ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا (قریبی آسمان) پر نزول فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس نزول پر کیفیت کی تلاش وجستجو کے بغیر ایمان لانا ضروری ہے۔

11.5 شرک سے اجتناب

اللہ تعالیٰ کا بندوں پر دوسرا حق یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، شرک سے اجتناب بھی حقوق الٰہی میں شامل ہے۔

11.5.1 لغوی واصطلاحی معنی

شرک کے لغوی معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی چیز دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان مشترک ہو، ان میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص نہ ہو، شریعت میں ''شرک'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی ذات، اس کے اسماء حسنیٰ، اس کی عبادت اور اس کے دوسرے حقوق میں کسی غیر کو اس کا شریک قرار دینا، یعنی مخلوق کی عبادت یا مخلوق کی تعظیم اس طرح کرنا جیسے اللہ کی تعظیم واجب ہے، یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اوصاف اور حقوق خاص ہیں، ان کو کسی بندے کے لئے ماننا شرک ہے، شاہ اسماعیل شہید دہلوی فرماتے ہیں:

''شرک صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ بلا کسی فرق کے انسان کسی کو اللہ کے برابر کردے؛ بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ انسان وہ مخصوص اعمال اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے انجام دے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کے لئے خاص کئے ہیں، اور جن کو بندوں کے لئے بندگی کی علامت قرار دیا ہے''۔

قرآن و حدیث میں شرک اور کفر دونوں ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور فرق کے ساتھ بھی، دونوں میں فرق یہ ہے کہ کفر کے معنی اللہ کی ناشکری یا اللہ کا انکار کرنے کے ہیں جب کہ شرک کے معنی اللہ تعالیٰ کو ماننے کے ساتھ ساتھ کسی اور کو اس کی کسی خاص صفت میں شریک کر لینا ہے۔

11.5.2 شرک کی قسمیں

11.5.2.1 شرک اکبر یا شرک جلی

شرک کی پہلی قسم شرک اکبر یا شرک جلی ہے، یعنی بڑا شرک یا نمایاں شرک جیسے کسی کو اللہ کی ذات میں شریک کرنا مثلاً خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا کے جوہر سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے، یا حضرت مریم خدا کی ماں ہیں، یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے ازلی اور ابدی ہونے اور ان تمام صفات کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رو سے لازم ہے۔ یا کسی کو اللہ کی صفات میں شریک کرنا یعنی جو صفات کمال خدا کے لئے مخصوص ہیں، مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم، حکمت وغیرہ ان میں کسی کو خدا کا ساجھی قرار دینا؛ لیکن ان میں سے بہت سی صفات کے ساتھ یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لئے مستعمل ہیں، ان میں ساجھی قرار دینا، چونکہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لئے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے جو اس کے شایان شان ہوتا ہے۔ اور جب ان کو انسانوں کے لئے بولتے ہیں تو خدائی مفہوم سے ان کو بالکل الگ کر کے بولتے ہیں، مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لئے بولتے ہیں، لیکن جب اس کو خدا کے لئے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے، اگر انسان کے لئے بھی اس صفت کو اسی مفہوم میں بول دیں جس مفہوم میں خدا کے لئے بولتے ہیں تو یہ صفات میں شرک قرار دیا جائے گا۔ یا اللہ کے حقوق میں کسی کو شریک کیا جائے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا مثلاً خدا خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم اور انتظام بھی اس کا نافذ ہو، اب اگر کوئی یہ مانے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہے؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لے کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ بھی شرک ہے۔

11.5.2.2 علم غیب

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں اوروں میں تسلیم کئے جائیں، ان میں سے ایک صفت علم غیب ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ کے واقعات کی پیشن گوئیاں کیا کرتے تھے، کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ

ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔حضور ﷺ نے نہایت تاکید کے ساتھ اس خیال کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل قرار دیں، قرآن مجید میں بے شمار آیتیں نازل ہوئیں جن میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو براہِ راست علم غیب ہونے کی نفی کی گئی ہے، ایک آیت میں فرمایا گیا:

''اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا'' [الأنعام:95]

حضور ﷺ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی:

''پانچ چیزیں ایسی ہیں جو مفاتیح غیب (غیب کی کنجیاں) ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا (1) کل کیا ہوگا (2) مادر رحم میں جو کمی بیشی ہوتی ہے ،لڑکا ہے یا لڑکی (3) بارش کب ہوگی (4) کس جگہ موت آئے گی (5) قیامت کب آئے گی (بخاری: 4697)

علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں؛ لیکن زیادہ تر لوگ علم غیب کا دعوی کرنے والوں سے انہیں باتوں کو جاننا چاہتے تھے، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر حضور ﷺ تشریف فرما تھے، انصار کی بچیاں گا رہی تھیں، اسی درمیان انہوں نے یہ گانا شروع کیا: ''وَفِينَـا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدِ ''(اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے) حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں (بخاری: 6551)، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ:

''کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں'' (الانعام: 50)

11.5.2.3 غیر اللہ کی قسمیں کھانا

شرک کی ایک نہایت باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر اللہ کی قسمیں کھاتے تھے، قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں ،جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کی وجہ سے بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتاؤں لات وعزی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا؛ لیکن رواج اور عادت کی وجہ سے مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان بتوں کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جس شخص کی زبان سے لات وعُزّٰی کی قسمیں نکل جائے وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ لے'' (ابن حبان: 5705)

یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ اور ماں کی قسمیں کھانے کا رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، کعبہ کی قسم کھانے سے بھی منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور فرمایا کہ:

''غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر کیا'' (مستدرک حاکم: 169)

تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا ممنوع ہے، حنابلہ اس کو حرام سمجھتے ہیں، احناف مکروہ تحریمی، مالکیہ اور شوافع مکروہ تنزیہی، لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانے میں اللہ کی سی تعظیم مقصود نہ ہو، گو کہ اس کے باوجود بھی ایمان وعقیدہ کے لئے نقصان دہ ہے، اور اس سے بچنا ضروری ہے، لیکن اگر غیر اللہ کو اللہ کا درجہ دے کر اس کی قسم کھائی جائے تو یہ شرک ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں، حضور اکرم ﷺ کے سامنے جب کسی نے کہا:

''جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، اور یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ ہو؛ بلکہ ثم (پھر) کا لفظ بولا جائے'' (نسائی: 4696)

تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

11.5.2.4 شرک کے بعض دیگر ذرائع

کائنات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن غیبی اسباب اور علتوں یعنی جادو، طلسم، جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت اور تصرف کا عقیدہ لوگوں میں عام تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کے ناموں کی دہائی دی جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی، حضور اکرم ﷺ نے ان سے بھی منع فرمایا تاکہ اللہ کے سوا کسی اور پوشیدہ طاقت کا ڈر دل میں نہ رہ جائے اور دعاء اور قرآنی آیات کے علاوہ ہر قسم کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ گنڈے، ٹوٹکے جن میں کسی غیر اللہ سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو، آپ نے اس کو شرک قرار دیا (مستدرک حاکم: 7513)، اسی طرح ان اوہام وخرافات کو بھی مؤثر حقیقی سمجھنے سے روک دیا جن کے بارے میں یہ غلط عقیدہ رائج تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

''نہ چھوت ہے، نہ بدفالی، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے'' [بخاری: 5707]

چوں کہ یہ چیزیں شرک تک پہنچانے والی ہیں، آپ ﷺ نے ان سے بھی منع فرمایا، ایک روایت میں فرمایا:

''پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے''

اسی طرح جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا ان سے بھی آپ نے بالکل منع فرمادیا، عبد کے معنی بندے اور غلام کے ہوتے ہیں، شمس کے معنی سورج کے، آپ نے عبدالشمس نام رکھنے سے منع فرمایا کہ اس سے شرک کی بو آتی ہے، کسی کو شہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہنے سے روک دیا کہ اس میں بھی شرک کا احتمال تھا، اسلام میں قبر پرستی اور یادگار پرستی سے بھی اس لئے منع فرمایا گیا کہ یہاں سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے، وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، میں تم کو منع کرتا ہوں، قبروں کو مسجد نہ بنانا'' (مسلم:1216)

عین وفات سے پہلے چادر چہرہ سے الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاری پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا (مسند احمد 26932)۔

11.5.2.5 شرک خفی یا شرک اصغر

اسلام میں توحید کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ کافی ہے کہ جس طرح ایسے اعمال سے منع کر دیا گیا جو شرک ہیں، ایسی نیتوں سے بھی روک دیا گیا جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے کی گئی ہوں، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا'' (مسند احمد:17140)

حضرت محمود بن لبید انصاری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم انہیں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے دنیا میں کام کیا کرتے تھے'' (شعب الایمان للبیہقی :6412)

11.5.3 شرک کی مذمت

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ذات وصفات میں یکتا سمجھنا بندوں پر اللہ کا پہلا حق ہے، جو چیز بھی اس عقیدہ کو ٹھیس پہنچانے والی ہو وہ قابل مذمت ہوگی، اس لئے قرآن مجید میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا (لقمان:١٣) اللہ تعالیٰ نے شرک کرنے والے کے لئے ہمیشہ کی جہنم لکھ دی ہے، اور جنت کو اس پر حرام قرار دیا ہے، انسان بڑے سے بڑے گناہ کے بعد بغیر توبہ کے اس دنیا سے چلا جائے تو اللہ کی رحمت سے اس کی معافی کی امید کی جا سکتی ہے؛ لیکن شرک ایک ایسا گناہ عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرما دیا:

"إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ"[النساء :48]

(اللہ تعالیٰ یہ معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو چاہے گا معاف فرما دے گا)۔

معلومات کی جانچ

1. توحید کے لغوی و اصطلاحی معنی بیان کیجئے۔
2. توحید ربوبیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
3. شرک اکبر یا شرک جلی کی تشریح کیجئے۔

11.6 عبادت

11.6.1 لغوی واصطلاحی معنی

لغوی معنی : "عبــادة'' عَبَـدَ يَـعْبُدُ کا مصدر ہے،اس کے معنی ہے:تعظیم کی نیت اورارادہ سے کسی کے سامنے جھکنااور پست ہونا،یہ عمل صرف اللہ کے لئے جائز ہے، یہ لفظ اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے،اہل عرب ایسے اونٹ کو بَعِیْرٌ مُعَبَّدٌ کہتے ہیں جو سواری کے لئے پوری طرح قابو میں آ گیا ہواور''طَرِيْقٌ مُعَبّدٌ ''اس راستہ کو کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہوکر ہموار بن گیا ہو۔

اصطلاحی معنی: اس کی کئی تعریف کی گئی ہے،ان میں چند یہ ہیں :

(1) اللہ کے لئے جھکاؤاور عاجزی کا سب سے اعلی درجہ۔

(2) مکلّف کا اپنے نفس کے تقاضہ کے خلاف اپنے رب کی تعظیم میں کوئی کام کرنا۔

(3) ایسا کام کرنا جس سے صرف اللہ کی تعظیم مقصود ہواوراللہ تعالیٰ نے اس کا حکم بھی دیا ہو۔

(4) ہروہ قول اور قلبی وجسمانی عمل جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جس سے خوش ہوتا ہے عبادت ہے۔

(5) وہ عمل جس کے کرنے پر ثواب ہو،اوراس کا صحیح ہونا نیت پر موقوف ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ہر وہ قول وعمل جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو،خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی عبادت ہے،مثلاً نماز، زکوۃ، روزہ، حج، سچ بولنا، امانت کا پاس ولحاظ کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، وعدہ کو پورا کرنا، بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا،حق کے غلبہ کے لئے ہر طرح کی جدو جہد، پڑوسیوں، یتیموں، مسافروں، غلاموں اور جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک، ذکرو دعاء، قرآن کی تلاوت، اللہ کی محبت، اس کا خوف، اس کی طرف رجوع، اخلاص،شکر وصبر، تقدیر پر راضی رہنا،توکل اور اللہ کی رحمت کی امیداوران جیسے تمام کام عبادت میں داخل ہیں۔

11.6.2 عبادت کی اقسام

قلبی اعمال: وہ اعمال جن کا تعلق دل سے ہے، جیسے توکل یعنی صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرنا،''رجاء''صرف اللہ سے ہی اچھی امید رکھنا، ''خوف''صرف اللہ سے ڈرنا،''انابت''صرف اللہ سے رجوع ہونا،حضور ﷺ نے فرمایا:''اچھا گمان کرنا بھی بہترین عبادت ہے'' (مسند احمد:7956) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے افضل عبادت مصیبت کے ختم ہونے کا انتظار ہے'' (ترمذی :3919)

تعبّدی اعمال: وہ مخصوص اعمال جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی بندگی کی علامت قرار پاگئے،ان کی تین قسمیں ہیں: بدنی عبادتیں جیسے نماز اور روزہ، مالی عبادتیں جیسے زکوۃ، بدنی اور مالی دونوں خصوصیت رکھنے والی عبادت جیسے حج۔ جب مطلق ''عبادت''یا''عبادات'' کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے تو ان سے یہی عبادتیں مراد ہوتی ہیں،ان کو عبادات خاص طور سے اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اخروی اعمال ہیں، جب تک ان کو بجالانے کا مقصد دنیاطلبی نہ ہوان پر آخرت کا ثواب اور جزاء کا وعدہ ہے، اگرچہ ہماری عقلیں ان کی مصلحتوں اورفوائد کو نہ سمجھ سکیں۔

ایسے تمام اعمال کو جن کے کرنے یا نہ کرنے پر ثواب کا وعدہ ہے، بجالانا، یا ان سے بچنا بھی عبادت ہے، اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان میں اللہ سے قریب ہونے کی نیت ہو، ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''اے ابو ہریرہ! ورِع (پرہیزگار) بن جاؤ سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے'' (ابن ماجہ: 4217)

ورع یا متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو حرام و مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچنے والا ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عبادت کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے، حتی کہ ہر وہ عمل جس سے معاشرہ کو فائدہ پہنچے اسلام میں عبادت کے زمرہ میں داخل ہے شرط یہ ہے کہ اس کام کو کرنے والے کی نیت صرف شہرت حاصل کرنا اور لوگوں سے تعریفیں سننا نہ ہو، حضور ﷺ نے دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان صلح کرانے کے بارے میں فرمایا کہ روزہ، نماز اور صدقہ سے بہتر ہے (الأدب المفرد :1391) روزہ، نماز اور صدقہ وغیرہ خالص عبادتیں ہیں، لیکن ایک شخص اگر نفل نمازوں، روزے اور صدقے کی ادائیگی کے بجائے دلوں کو ملانے کا کام انجام دیتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے، اور اس کا ثواب بسا اوقات ان سے بڑھ کر ہے، مریض کی عیادت کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''جو کسی مریض کی عیادت کے لئے نکلتا ہے آسمان سے ایک آواز دینے والا یہ آواز دے کر کہتا ہے کہ تم پاکیزہ، تمہارا چلنا مبارک، تم نے جنت میں ایک ٹھکانہ بنا لیا (ابن ماجہ: 1443)

اسلام ان اعمال کو صرف پسند نہیں کرتا بلکہ ان کی ترغیب بھی دیتا ہے، ان کا حکم دیتا ہے، اور ان کو ایک مسلمان کی یومیہ ذمہ داری قرار دیتا ہے، بلکہ اسلام نے ان کی اہمیت اس قدر بڑھا دی ہے کہ کہیں ان کو ''صدقہ'' اور کہیں ''صلاۃ'' کے لفظ سے یاد کیا، ایک حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے، ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، اگر وہ دو لوگوں کے درمیان انصاف کرتا ہے تو یہ صدقہ ہے، کسی کی مدد اس کے جانور کے سلسلے میں کر دیتا ہے، اس کو اس پر سوار کر دیتا ہے یا اس پر اس کا سامان رکھ دیتا ہے تو یہ صدقہ ہے، بھلی بات کہنا بھی صدقہ ہے، نماز کے لئے چل کر جاتا ہے تو اس کا ہر ہر قدم صدقہ ہے، راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹاتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے'' (بخاری: 2989)

صدقہ اصلاً اللہ کی رضا کے لئے کسی غریب کی مالی مدد کو کہتے ہیں، اور یہ خالص عبادت ہے؛ لیکن ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا؛ چنانچہ اسلام نے بھلائی کے تمام کاموں کو صدقہ قرار دے دیا، اور اس طرح ان کو بھی عبادت میں شامل کر دیا، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

''انسان کے ہر جوڑ پر ہر دن نماز ہے، ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو بہت مشکل ہے، آپ نے فرمایا: بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، کمزور کی مدد کرنا، اور ہر وہ قدم جو تم میں سے کوئی نماز کے لئے اٹھاتا ہے نماز ہے'' (المعجم الکبیر للطبرانی: 11791)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خالص دنیوی کاموں کو جو انسان اپنی گذر بسر کے لئے کرتا ہے عبادت قرار دیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ کام اسلام کی نظر میں درست ہو، اس میں اچھی نیت شامل ہو، اس میں اللہ کے حدود کا لحاظ رکھا گیا ہو،

دوسروں کی حق تلفی، خیانت اور دھوکہ سے اپنے معاملہ کو محفوظ رکھا گیا ہو، اور دنیوی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے دینی فرائض وواجبات سے غفلت نہ ہونے پائے، اگرایک مسلمان ان امور کی رعایت کرتا ہے تو وہ اپنی دنیوی مشغولیتوں میں بھی عبادت گذارشمار ہوگا گو کہ وہ مسجد میں نہ ہو۔اسی طرح خالص وہ امور جو انسان اپنی فطری خواہشات کی تکمیل کے لئے کرتا ہے نیت کی درستگی سے عبادت بن جاتے ہیں، جیسے کھانا پینا، بیوی سے مباشرت وغیرہ، اس کی سب سے بڑی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

"تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہمبستری کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے، صحابہ نے کہا: ایک شخص اپنی شہوت پوری کرتا ہے، کیا اس پر بھی وہ اجر وثواب کا مستحق ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تم غور کرو کہ اگر وہ اپنی خواہش کسی حرام ذریعہ سے پوری کرتا تو اس پر گناہ نہ ہوتا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: اسی طرح جب وہ حلال ذریعہ سے اپنی خواہش پوری کرر ہا ہے تو وہ ثواب کا مستحق ہے"(ابن حبان:4167)

حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے انتہا رحمت کی بات ہے کہ وہ فطری خواہش کی تکمیل کو بھی عبادت بنا دیتا ہے، اوراس پر ثواب عطا فرماتا ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی اور شرمگاہ کی حفاظت کی نیت کی جائے۔

اسلام کی ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادت صرف مخصوص اعمال سے مربوط نہیں بلکہ اس کا رشتہ پوری زندگی سے ہے، اسی لئے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"وَأَرْجُوْ فِيْ نَوْمَتِيْ مَا أَرْجُوْ فِيْ قَوْمَتِيْ"

(جس طرح میں تہجد میں اجروثواب کی امید رکھتا ہوں سونے میں بھی اجروثواب کی امید رکھتا ہوں)۔

11.6.3 عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق

اسلام میں معبود صرف ایک ذات برحق کو قرار دیا گیا ہے، جو خالق ہے، اور تمام بندوں کی حیثیت عابد (عبادت کرنے والے) کی ہے، عبادت کے مختلف طریقے ہیں، کچھ وہ ہیں جن کے لئے عبادت کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور کچھ وہ ہیں جو نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں، اور عبادت اپنی تمام شکلوں کے ساتھ مخلوق پر خالق کا حق ہے اور عقلی طور پر بھی یہی بات قرین انصاف ہے کہ جس ذات نے اپنے بندوں کو وجود بخشا اور ان کو ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتوں سے ہر وقت نواز رہا ہے صرف اسی کی عبادت کی جائے، یہ اس کا لازمی حق ہے، اس کا یہ حق کسی اور کو دینا یا اس کے کسی حصہ میں شریک کرنا ظلم ہے، اسلام سے پہلے لوگ طرح طرح کے شرک میں مبتلا تھے، اور مختلف قومیں اپنے اپنے خیالات کے مطابق جس چیز میں کوئی غیر معمولی بڑائی دیکھتی اس کے سامنے جھکنا شروع کر دیتی تھیں، اسلام نے واضح کیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسی نے سب کو پیدا کیا ہے، اور وہی عبادت کے لائق ہے، اور "لاالٰہ الا اللّٰہ" کو اسلام کا کلمہ قرار دیا، قرآن کریم اسلام کا دستور ہے، پورے قرآن کریم کا نچوڑ سورہ فاتحہ ہے، اور سورہ فاتحہ کا نچوڑ اس کی آیت "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" یعنی ہم آپ کے علاوہ نہ کسی چیز کی عبادت کرتے ہیں نہ کسی ذات کی، اور آپ کے علاوہ کسی سے مدد نہیں مانگتے، جب بھی کوئی شخص اسلام لاتا حضور ﷺ اس کو اولین ہدایت یہ دیتے کہ ایک

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی ہے، ہر ایک نے اللہ کی عبادت کا حکم دیا اور طاغوت کی عبادت سے روکا۔

11.7 تعظیم

11.7.1 لغوی واصطلاحی معنی

لغت میں تعظیم کے معنی کسی کو بزرگ و برتر سمجھنے اور ماننے کے ہیں، یہ عربی میں **عَـظَّمَ يُعَظِّمُ** سے مصدر ہے، اور یہ مصدر (ع، ظ، م) کے مادہ سے ماخوذ ہے، اور اس مادہ سے بڑائی اور قوت کے الفاظ نکلتے ہیں، اسی سے لفظ ''عظیم'' بنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے، بندہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''**سُبْـحَـانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم**'' جب اللہ تعالیٰ کے لئے عظیم کی صفت استعمال کی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات جو بہت بلند و بالا ہے اور عقل انسانی کی حدود سے برتر ہے، عقل انسانی اس کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی، حضور ﷺ نے فرمایا: ''رکوع میں رب کی عظمت بیان کرو'' (نسائی:1120)، رب کی عظمت کی کوئی کیفیت یا حد نہیں بیان کی جاسکتی اور کسی شئے سے اس کی مثال بھی نہیں دی جاسکتی، وہ اسی طرح عظیم ہے جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے، اس کی کوئی کیفیت یا حد بندی نہیں کی جاسکتی، بڑوں کا احترام بھی ان کی تعظیم ہے، لیکن وہ تعظیم جس میں آخری درجہ تذلل ہو اور اس میں عبادت کا تصور بھی شامل ہو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

11.7.2 اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا مفہوم

تعظیم اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق ہے، اس کی تعظیم یہ ہے کہ صرف اسی کو خدائے واحد مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، اس کے اسمائے حسنی کے ساتھ اس پر ایمان لایا جائے، اس کو ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک سمجھا جائے، اس کے بارے میں کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکالا جائے جو اس کی شان عالی کے خلاف ہو، تعظیم میں شعائر اللہ کی تعظیم، حرمات اللہ کی تعظیم، رسول اللہ کی تعظیم، کتاب اللہ کی تعظیم اور اللہ کے اوامر ونواہی کی تعظیم سب داخل ہیں۔

11.7.3 شعائر اللہ کی تعظیم

شعائر شَعِيرةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی نشان وعلامت کے ہیں، یعنی وہ اعمال جن سے اللہ تعالیٰ کے دین، دین کے اَعلام اور کام جن سے اسلام کی پہچان ہو، اور یہ معلوم ہو کہ یہ وہ کام ہے جس کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے، جیسے اذان، نماز، اور مسجد وغیرہ، مناسک حج یعنی حج سے متعلق مقامات واعمال وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بے شک صفا و مروہ اللہ کے شعائر (نشانیوں) میں سے ہیں'' [البقرۃ:158]

ایک جگہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

''**ذٰلِکَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ**''[الحج:32]

(یہ ہے اصل معاملہ اسے سمجھ لو اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقوی سے ہے)

اور ایک جگہ اس کی بے حرمتی سے منع کیا گیا:

(اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو! اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو)[المائدة:2]۔

شعائر اللہ دو طرح کے ہیں:

(1) مناسک حج، جیسے احرام، طواف، سعی، عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ کا قیام، قربانی کا جانور اور دیگر اعمال حج۔

(2) حج کے اعمال کے علاوہ شعائر مثلاً اذان، اقامت، نماز باجماعت، جمعہ، عیدین وغیرہ۔

بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں پر شعائر اللہ کا اہتمام کرنا اوران کا اظہار کرنا واجب ہے، وہ شعائر فرائض میں سے ہوں۔

11.7.4 حرمات اللہ کی تعظیم

حرمات لفظ حرمة کی جمع ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کے احترام کا حکم دیا گیا، اور اس کے کہنے یا کرنے سے روک دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ“[الحج: 30]

(اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے)

یہ آیت مناسک حج کے بیان میں آئی ہے اس لئے زیادہ تر علماء نے ان سے اولاً مناسک حج کو مراد لیا ہے، اس کے بعد دوسرے گناہوں کو، مثلاً مجاہد کا قول ہے، حرمات اللہ سے مراد مکہ، حج، عمرہ اور وہ تمام گناہ کے کام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے۔

تعظیم حرمات کے تین درجات ہیں:

1) اللہ کے اوامر و نواہی کی تعظیم، اور وہ اس طرح کہ کسی حکم میں غیر ضروری رخصت سے بھی اجتناب ہو اور کسی حکم میں غلو سے بھی بچا جائے۔

2) اللہ کے حکم کی تعظیم ہر حال میں ہو، وہ بات عقل میں آئے یا نہ آئے، اس کی مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو، اس میں کوئی کجی نکالنا، اپنے ناقص علم کی بنیاد پر اس کی تردید کرنا، یا دنیا کے کسی عوض پر اس کو تبدیل کرنے پر راضی ہو جانا اس کی توہین ہے۔

3) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعظیم اور وہ اس لئے کہ حکم اسی کا ہے، اور یہ یقین ہو کہ وہ اپنے اس حکم کو نافذ کرنے میں کسی کا محتاج نہیں، اور اس کے اس اختیار کو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا، اور جب حاکم قابل تعظیم ہے تو اس کا حکم بھی قابل تعظیم ہوگا۔

11.7.5 کتاب اللہ کی تعظیم

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، اس نسبت سے اس کی تعظیم بھی ایمان کا جزو ہے، اور اس کی تعظیم گویا خود اللہ کی تعظیم ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: ”قرآن مجید کی تعظیم، اس کو ہر نقص سے پاک سمجھنے اور اس کی حفاظت کے واجب ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے“ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: جس نے قرآن مجید یا اس مصحف کو جس میں قرآن لکھا ہوا ہے، یا اس کے کسی جزو کا بھی مذاق اڑایا یا اسے ہلکا سمجھا تو اس کے کافر ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

اس کی تعظیم کا حق یہ ہے کہ اس کی تلاوت کی جائے، اس کے مضامین کی تصدیق کی جائے، اس کے حروف اور حدود کی حفاظت کی جائے، اور اس کی بتائی ہوئی شاہراہ پر چلا جائے، اس کی تعظیم کا حق یہ بھی ہے کہ اس کو بغیر طہارت کے ہاتھ نہ لگایا جائے، حضور ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم کو خط لکھ کر نصیحت کی اور اس میں یہ بھی لکھا کہ قرآن کو وہی ہاتھ لگائے جو طاہر ہو (موطا)۔ قرآن کی آیت "لا یمسہ إلّا المطھرون" [الواقعة:79] (جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا) سے بھی عطاءؒ، سالمؒ اور محمد باقرؒ وغیرہ نے یہ مفہوم نکالا ہے، اور زیادہ تر علماء نے اس آیت سے قرآن کے چھونے کے لئے وضو کے واجب ہونے پر استدلال نہیں کیا، بلکہ "مطھرون" سے مراد فرشتوں کو لیا ہے، لیکن احادیث صحیحہ کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سعید بن زید رضی اللہ عنہ، عطاء، زہریؒ، نخعیؒ، ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ سب کا یہی مسلک ہے کہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے لئے ظاہری نجاست سے ہاتھ کا پاک ہونا، باوضو ہونا، حالت جنابت میں نہ ہونا سب شرط ہے، اس کے خلاف کرنا گناہ ہے۔

11.7.6 رسول اللہ ﷺ کی تعظیم

اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس پر ایمان لانے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندہ اور رسول حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لایا جائے اور آپ کی تعظیم کی جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعظیم کا حکم فرمایا ہے: "وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ" [الفتح:9] (تاکہ اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو) اسی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو عام انسانوں کی طرح مخاطب کرنے سے منع فرمایا گیا:

"لَا تَجْعَلُوْا دُعَاء الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا" [النور:63]

(مسلمانو! اپنے درمیان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو)

اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی اور محبوب بندہ کو یہ عزت دی کہ ان کو قرآن میں کہیں "یا محمد" کہہ کر نہیں پکارا، جب کہ بہت سے انبیاء کو نام لے کر پکارا۔ آپ کا ذکر اسلام کے کلمۂ شہادت میں ہے، اذان اور نماز میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت اونچے مقام سے نوازا، آپ کی تعظیم یہ بھی ہے کہ آپ پر درود وسلام بھیجا جائے، آپ کی احادیث کا احترام کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے، امام دارمیؒ نے اپنی "السنن" میں متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں یہ دکھایا ہے کہ جس نے حضور ﷺ سے ثابت شدہ احادیث کی تعظیم نہیں کی وہ مستحق سزا ہے، اور ان پر یہ عنوان قائم کیا ہے، "**باب تعجیل عقوبة من بلغه عن النبی حدیث فلم یعظمه ولم یوقره**" (ایسے شخص کی سزا کا بیان جس کے پاس حضور ﷺ کی کوئی حدیث پہنچی تو اس نے اس کی تعظیم وتکریم نہیں کی) ہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کو عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرنا آپ کی توہین ہے اور ایسا کرنے والا ایمان سے محروم ہو جاتا ہے، اسی طرح آپ کی تعظیم میں اس طرح غلو کرنا کہ آپ کو مقام الوہیت تک پہنچا دیا جائے یہ بھی ممنوع ہے۔

معلومات کی جانچ

1. عبادت کے لغوی واصطلاحی معنی پر روشنی ڈالئے
2. شعائر اللہ کی تعظیم سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
3. اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی اہمیت کو واضح کیجئے۔

11.8 دعاء

11.8.1 لغوی وشرعی معنی

دُعَــاء کالفظ دَعَـا یَـدْعو ً کا مصدر ہے، اس کے مصدری معنیٰ مانگنے اور پکارنے کے ہیں؛ لیکن یہ اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ الفاظ جن کے ذریعہ اللہ سے مانگا جائے۔

جہاں تک اس کے شرعی معنی کا تعلق ہے، خطّابی فرماتے ہیں: دعاء کے معنی بندہ کا اپنے رب کی توجہ چاہنا، اور اس سے مدد طلب کرنا ہے، اور اس کی حقیقت اللہ کے سامنے عاجزی کا اظہار اور اس کے علاوہ ہر دوسری طاقت سے براءت کا اظہار کرنا ہے، امام شوکانی فرماتے ہیں: حقیقۃً اور شرعاً دونوں اعتبار سے دعاء کے معنی طلب اور سوال کے ہیں۔

11.8.2 دعاء کی اقسام

(1) **دعاءِ عبادت:** وہ دعاء جس میں اللہ کی حمد وثناء بیان کی جائے، اور اس میں اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف بھی شامل ہو۔

(2) **دعاءِ سوال:** ایسی دعاء جس میں دعاء مانگنے والا اپنے کسی فائدہ کا سوال کر رہا ہو، یا اپنی کسی مصیبت سے یا کسی نقصان دینے والی چیز سے پناہ مانگ رہا ہے۔

(3) قرآن مجید میں کبھی لفظ دعاء پہلے معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، کبھی دوسرے معنی کے لئے، کبھی دونوں کے لئے، مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''أُجِیبُ دَعْـوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ''[البقرة:186] (پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں) اس آیت میں دعاء کی دونوں قسمیں داخل ہیں، اور آیت کی تفسیر میں دونوں باتیں کہی گئی ہیں، میں اس کو دیتا ہوں جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے، اور میں اس کو ثواب عطا کرتا ہوں جب وہ میری عبادت کرتا ہے، ایک آیت میں فرمایا: ''**فَـادْعُوا اللّٰهَ مُـخْـلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ**''[غافر:14] (پس اے رجوع کرنے والو) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے)؛ لیکن اس کے برخلاف: ''**وَقِیْلَ ادْعُوْا شُرَکَاءَ کُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ**'' [القصص:64] (پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو۔ یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے) میں سوال مراد ہے، اللہ تعالیٰ ان کو عار دلا رہا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں سے مانگو، وہ مانگیں گے لیکن وہ ان کی دعاء قبول نہیں کر سکیں گے، یہاں عبادت کے معنی میں نہیں ہے۔

11.8.3 دعاء کے آداب

دعاء کے متعدد آداب ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

(1) دعاء مانگنے والے کو چاہیے کہ مناسب اوقات کا انتخاب کرے جن میں دعاء کی قبولیت کا وعدہ ہو، مثلاً سال میں عرفہ کا دن، مہینوں میں رمضان، ہفتہ میں جمعہ کا دن، رات کی ساعت میں سحر کا وقت وغیرہ۔

(2) مناسب احوال کا انتخاب کرے، مثلاً بارش کے وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، افطار کے وقت، سجدہ میں، سفر میں، وغیرہ۔

(3) قبلہ رخ ہوکر دعاء مانگے، ہاتھ سینے تک اٹھائے، اور ہاتھوں کو پہلوؤں سے الگ رکھے، آواز پست رکھے، دعاء میں تکلف اور ہم وزن جملوں کے استعمال سے پرہیز کرے، چونکہ دعاء مانگنے والے کو عاجزی اختیار کرنا چاہیے، تکلف اس حالت میں مناسب نہیں۔

(4) دعاء میں اخلاص ہو، خشوع ہو، گریہ وزاری ہو، خوف اور امید کے درمیان کی کیفیت ہو، دعاء یقین کے الفاظ کے ساتھ مانگے، شک کے الفاظ سے نہیں، اور قبولیت کا یقین رکھے۔

(5) دعاء میں الحاح سے کام لے، ایک ایک دعاء کو تین بار مانگے تو زیادہ بہتر ہے، اور قبولیت میں جلدی نہ کرے۔

(6) دعاء میں اللہ کا ذکر، اس کے بعد حضور ﷺ پر درود سے شروع کرے پھر سوال کرے، اخیر میں بھی حمد وثناء کا اہتمام کرے، اور آمین کہے۔

(7) دعاء کے اخیر میں اپنے دونوں ہاتھ چہرہ پر پھیر لے۔

(8) باطنی ادب یہ ہے کہ پہلے توبہ کرلے، دوسروں کے حقوق ادا کرلے، اللہ کی طرف پورے قلب کے ساتھ متوجہ ہو اور حلال کھانے کا اہتمام کرے، دعاء کے مقبول ہونے کی اصل بنیادیں یہی ہیں۔

11.8.4 دعاء کا حکم

امام نوویؒ فرماتے ہیں: فقہاء ومحدثین اور جمہور علماء کا راجح مسلک یہی ہے کہ دعاء کرنا مستحب ہے، بسا اوقات دعاء واجب ہوجاتی ہے، مثلاً نماز میں سورۃ فاتحہ کے اندر وارد ہونے والی دعاء، نماز جنازہ میں دعاء، بعض فقہاء کے نزدیک جمعہ کے خطبہ کی دعاء بھی واجب ہے۔

11.8.5 دعاء کے فضائل

دعاء کے فضائل قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّىْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ “ [البقرة:186]

(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں؛ لہذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں، یہ بات تم انھیں سنا دو شاید کہ وہ راہِ راست پالیں)

امام زرکشی سے منقول ہے: اس آیت میں قریب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب بندہ دعاء میں اخلاص پیدا کرتا ہے، اور اللہ کی معرفت میں ڈوب جاتا ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی واسطہ رہ جائے، اور یہی قریب ہونا ہے، دوسری جگہ فرمایا:

”اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ“ [الأعراف : 55]

(اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ایک جگہ ارشاد ہوا:

”وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ“ {غافر : 60]

(تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)

حضور ﷺ نے فرمایا: ”بیشک دعاء عبادت ہی کا نام ہے“، پھر آپ نے مذکورہ آیت ”وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ“ [غافر:60] تلاوت فرمائی (ابوداؤد: 1481) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”دعاء عبادت کا مغز ہے“ (ترمذی: 3698) دعاء کی اہمیت اور اللہ کے فضل کو یہ حدیث اوراجاگر کرتی ہے:

”اللہ تعالیٰ حیاء دار اور کریم ہے، اس کو اس بات سے حیاء آتی ہے کہ ایک شخص اس کی طرف دونوں ہاتھ اٹھائے، اور وہ انہیں خالی اور ناکام واپس کردے“ (ترمذی:3904)

ایک حدیث میں ہے:

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعاء سے زیادہ قابل احترام کوئی چیز نہیں“ (ترمذی:3696)

اس کے علاوہ اور بھی دعاء کے بہت سے فضائل ہیں۔

11.8.6 دعاء کا تعلق عقیدہ سے

دعاء ایمان، توحید، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دل کی زندگی میں اضافہ کرتی ہے، اور انسانی فطرت کو توانائی بخشتی ہے، چونکہ انسان ہروقت کسی نہ کسی چیز کا محتاج ہوتا ہے، اور یہ بھی جانتا ہے کہ قادر مطلق کی مدد کے بغیر وہ اسے حاصل نہیں کرسکتا، پھر اس کا یہ ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کی حاجت سے واقف اور اس کی حاجت روائی پر قادر ہے اور میں خود ایک عاجز بندہ ہوں، بندہ کا یہ اعتراف عقیدہ کی بنیاد ہے، دعاء اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات پر ایمان کی دلیل ہے، حضور اکرم ﷺ نے جن دعاؤں کی تعلیم دی ہے ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنٰی کے ذریعہ اللہ سے مانگنے کا خاص اہتمام کیا ہے؛ تاکہ دعاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کو غذا ملتی رہے، امام زرکشی فرماتے ہیں: دعاء عبادت کا مغز اس لئے ہے کہ دعاء توحید کی دلیل ہے، اللہ سے وہی مانگتا ہے جو اللہ کو ایک مانتا ہے، اور جانتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دینے والا نہیں، وہ اپنے رب کے وجود، اس کے جاننے، سننے اور قدرت رکھنے جیسی دیگر صفات پر یقین رکھتا ہے، لہٰذا دعاء کرنے والے کو چاہیے کہ دعاء کے وقت اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا استحضار رکھے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: دعاء مانگنے والے کی ضرورت جب پوری ہوتی ہے تو اس کے اس علم میں اوراضافہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے واقف ہے، اور وہ ہروقت اپنے بندوں کی پکار اور فریاد سن رہا ہے، وہ ان پر مہربان ہے، اور ہروقت ضرورت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی یہ کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو)[النمل:62]

یہ توحید ربوبیت پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، دعاء قبول کرنے کی قدرت بھی اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے دعاء کرنا اللہ کی اس قدرت کو اس کی طرف پھیرنا ہے اور یہی شرک ہے؛ چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ دعاء صرف اللہ کا حق ہے۔

11.9 خلاصہ

حقوق اللہ میں سب سے پہلے توحید ہے جس کا لغوی معنی اللہ کو ایک ماننا ہے۔توحید کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں:

(1) توحید ربوبیت جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ یہ ایمان رکھے کہ اللہ ہی خالق ورازق ہے، کائنات کا ہر ذرہ اسی نے پیدا کیا اور وہی ہر چیز کی نگہداشت فرمارہا ہے۔

(2) توحید الوہیت جس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی ہو، صرف وہی عبادت کے لائق ہے، تمام انبیاء کرام نے اللہ کو رب ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی عبادت کی بھی دعوت دی، جس طرح ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں، عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

(3) توحید اسماء وصفات میں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے تمام اسماء وصفات کے ساتھ ایمان لانا بھی توحید کا حصہ ہے۔

اس کے بعد شرک سے بچنا ضروری ہے۔شرک کی بھی کئی اقسام بیان کی گئی ہیں، جن میں سب سے پہلے شرک جلی یا شرک اکبر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ کسی کو اللہ کی ذات میں شریک کرنا مثلا خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا شرک اکبر ہے۔ پھر شرک سے متعلق بعض اہم مسائل آتے ہیں مثلا علم غیب، غیر اللہ کی قسم کھانا اور شرک کے بعض دیگر ذرائع مثلا جادو، جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت وغیرہ اور اس کے بعد شرک خفی یا شرک اصغر کے بارے میں حدیث کے حوالہ سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ چھپا ہوا شرک ہے اور شرک کے بارے میں قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ظلم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔

اس طرح عبادت کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تین اقسام (1) قلبی اعمال (2) تعبدی اعمال (3) اور دیگر اعمال کی وضاحت کی گئی ہے، اسلام میں عبادت کا دائرہ بہت وسیع ہے، زندگی کے عام اعمال اور خالص دنیوی کام بھی نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں، عبادت اپنی تمام قسموں کے ساتھ صرف اللہ کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر نقص وعیب سے پاک سمجھا جائے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم میں شعائر اللہ، حرمات اللہ، رسول اللہ، کتاب اللہ اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی تعظیم سب داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی یہ اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس کی تعظیم سے مربوط ہے اور تعظیم معرفت کے تابع ہے، جس کو جتنی زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم اس قدر ہوگی، جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم نہیں کرتا اور اس کے شایانِ شان اس کے اوصاف بیان نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے۔[نوح :13]

دعاء کی دو اقسام ہیں (1) دعاء عبادت اور (2) دعاء سوال، اس طرح دعاء کے آداب ہیں مثلاً: مناسب اوقات و احوال کا انتخاب، دعاء میں اخلاص اور گریہ وزاری، دعاء میں الحاح وغیرہ، حدیث میں دعاء کے فضائل بیان ہوئے ہیں کہ دعاء توحید کی دلیل ہے، اللہ سے وہی مانگتا ہے جو اللہ کو ایک مانتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دینے والا نہیں۔

11.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. حقوق اللہ سے کیا مراد ہے؟
2. اسمائے حسنیٰ کی فضیلت پر روشنی ڈالئے؟
3. عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس موضوع پر دلائل کی روشنی میں لکھئے۔
4. دعاء کے آداب کیا ہیں؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1. توحید کی اقسام پر ایک نوٹ لکھئے؟
2. عبادت کی اقسام پر وضاحتی نوٹ لکھئے؟
3. حرمات اللہ اور کتاب اللہ کی تعظیم پر روشنی ڈالئے؟
4. دعاء کے فضائل کیا ہیں اور اس کا عقیدہ سے کیا تعلق ہے وضاحت کیجئے؟

11.11 فرہنگ

اقسام	:	قسم کی جمع: قسمیں
مسخر	:	تابع کیا گیا
معبود برحق	:	وہ ذات جو حقیقت میں عبادت کے لائق ہے
صفات قدسیہ	:	پاک صفات

متصف	:	کوئی صفت رکھنے والا
تنزیہہ	:	عیب سے پاک کرنا
تمثیل	:	تشبیہ دینا، مشابہ قرار کرنا
تکییف	:	کیفیت بیان کرنا
تصرف	:	استعمال کرنا، صرف کرنا
جوہر	:	وہ چیز جو بذات خود قائم ہو، لب لباب، خلاصہ
کاہن	:	جنوں سے دریافت کر کے غیب کی خبریں بتانے والا
استمداد	:	امداد چاہنا، طلب کرنا
مکلّف	:	ایسا عاقل بالغ شخص جو اس لائق ہو کہ اس پر شریعت کے احکام جاری ہوسکیں
اوامر و نواہی	:	اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم فرمایا ہے وہ اوامر اور جن سے منع فرمایا ہے وہ نواہی کہلاتے ہیں۔
براءت	:	نجات، چھٹکارا
گریہ وزاری	:	آہ وبکا، رونا پیٹنا
الحاح	:	گڑگڑانا
قادر مطلق	:	پوری پوری قدرت رکھنے والا، خدائے تعالیٰ

11.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. شرح العقیدۃ الطحاویۃ — علامہ ابن العز حنفیؒ
2. تقویۃ الایمان (اردو) — مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ
3. کتاب التوحید (عربی) — شیخ محمد بن عبدالوہاب
4. سیرۃ النبی جلد چہارم (اردو) — علامہ سید سلیمان ندویؒ
5. حقیقت شرک (اردو) — مولانا امین احسن اصلاحی
6. العبادۃ فی الإسلام (عربی) — ڈاکٹر یوسف القرضاوی

اکائی 12 : حقوق العباد

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

12.2 تمہید

12.3 حقوق العباد

12.4 انسانی حقوق

12.5 والدین اور اولاد کے حقوق

12.6 ازدواجی حقوق

12.7 قرابت داروں کے حقوق

12.8 پڑوسیوں کے حقوق

12.9 جانوروں کے حقوق

12.10 خلاصہ

12.11 نمونے کے امتحانی سوالات

12.12 فرہنگ

12.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

12.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ ''حقوق العباد'' کا مفہوم کیا ہے؟ اسلام میں ان کی کیا اہمیت ہے، خاص طور سے اس اکائی میں آپ کو انسانی حقوق، والدین اور اولاد کے حقوق، ازدواجی حقوق، قرابت داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق اور جانوروں کے حقوق کی اہم جہتوں سے واقف کرایا جائے گا۔

12.2 تمہید

اسلام میں انسانی زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے: ایک فرائض، دوسرے حقوق، ہر شخص کو اس کی ذمہ داریاں یاد

دلائی گئی ہیں، اوران کوانجام دینے کی تاکید کی گئی ہے، ساتھ ہی دوسروں پراس کے کچھ حقوق بھی رکھے گئے ہیں، اوراسلام نے ایک ہی شخص کو کئی حیثیتوں سے حقوق دیئے ہیں،کبھی اس کے انسان ہونے کی حیثیت سے تو کبھی اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے،کبھی بیٹے اور باپ کی حیثیت سے،کبھی شوہر یا بیوی کی حیثیت، اور بسا اوقات رشتہ دار اور پڑوسی ہونے کے اعتبار سے۔غرض کہ اسلام نے انسانوں کو متنوع حقوق دیئے ہیں، اور جن لوگوں کے ذمہ یہ حقوق رکھے ہیں ان کو ان کی ادائیگی کی پُرزور تاکید کی ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد جب اپنے فرائض کی ادائیگی میں سچا اور امانت دار ہوتا ہے تو دوسری جانب حقوق بھی ادا ہوتے جاتے ہیں، اوراس طرح معاشرہ میں صحیح توازن قائم ہوتا ہے، اسلام میں حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے؛ اس لئے نہ صرف انسانوں کے بلکہ حیوانات، نباتات اور جمادات کے بھی کچھ حقوق رکھے گئے ہیں، اس اکائی میں چند اہم حقوق سے آپ کو واقف کرایا جائے گا۔

12.3 حقوق العباد

حقوق العباد سے مراد وہ حقوق ہیں جو ایک انسان پر اور بالخصوص ایک مسلمان پر اللہ کے بندوں اور اس کی دوسری مخلوقات کے لئے واجب ہیں، دنیا میں انسان ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کا حق بھی ادا کرے، اس طرح اسے اپنے جیسے انسانوں، مسلمانوں اور پھران میں بھی والدین، اولاد، قریبی رشتہ داروں، پڑوسیوں اور خادموں کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے۔شوہر پر بیوی کے اور بیوی کے شوہر پر بھی کچھ حقوق ہیں، حقوق کا یہ دائرہ جانوروں تک پھیلا ہوا ہے، چونکہ انسان ان سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، غور کیا جائے تو اس کے ذمہ جمادات اور نباتات کے بھی کچھ حقوق ہیں کہ ان کو بے موقع صرف نہ کرے، انہیں حقوق کے مجموعہ کا نام حقوق العباد ہے، اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حق کو توبہ کرنے سے معاف فرمادیتا ہے؛ لیکن بندوں کا حق خود ان بندوں کی معافی کے بغیر معاف نہیں فرماتا۔

12.4 انسانی حقوق

اسلام نے انسان کو عزت واحترام سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ آدَمَ ''[بنی اسرائیل:70] (یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی) اوراس کو متعدد حقوق دیئے ہیں، جن میں سے چند حقوق یہ ہیں:

12.4.1 زندگی گذارنے کا حق

اسلام نے ایک انسان کے لئے جن حقوق کی ضمانت لی ہے ان میں سے سب سے پہلا حق زندگی گذارنے کا حق ہے، اس حق سے دوسرے حقوق شروع ہوتے ہیں، دوسرے حقوق انسان کو اسی وقت مل سکتے ہیں جب اسے سب سے پہلے یہ حق دے دیا جائے، اس حق کی حفاظت افراد، معاشرہ اور حکومت ہر ایک کے لئے لازم قرار دی گئی، اسی لئے ناحق کسی انسان کو قتل کرنے سے شریعت نے منع کردیا، فرمایا گیا:

''وَلاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ '' [الأنعام : 152]

(اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ)

اور اسی لئے اگر کوئی ناحق کسی کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لینے کا حکم ہے[البقرۃ:178] چونکہ قاتل سے قصاص لینا کئی دیگر جانوں کو ہلاکت سے بچانا ہے، قرآن مجید نے اپنے حکیمانہ اسلوب میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

"وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" [البقرة :179]

(عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے)

اسی غرض سے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا، اسی انسانی جان کے احترام کے پیش نظر جنین کشی سے منع کیا گیا اور بچہ کی پیدائش کے بعد بھی اسے قتل کرنے سے روکا گیا۔

12.4.2 شخصی آزادی کا حق

اسلام نے شخصی آزادی کو تسلیم کیا ہے، آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عقل وارادہ کی قوت سے نوازا گیا ہے، وہ اپنی پسند وناپسند میں آزاد ہے، اس پر کسی خارجی دباؤ کو درست قرار نہیں دیا گیا، حتی کہ مذہب کے انتخاب میں بھی اس پر جبر واکراہ نہیں، وہ اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا بھرپور حق رکھتا ہے، البتہ ساتھ ساتھ خالق کے ساتھ وفاداری اور اس کے حدود کی پابندی کا حکم دے کر اس کی آزادی کے سامنے ایک ضروری حد قائم کی گئی ہے، یہ قانون اس کی آزادی کے حق کو منظّم کرتا ہے اور انسانی معاشرہ کو سرکشی اور بغاوت سے بچاتا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل انسانی غلامی کے جو طریقے مختلف ملکوں میں رائج تھے ان کا تصور بھی ایک شریف شہری کے لئے ممکن نہیں، اسلام نے اس غلامی کے نظام کو کئی مرحلوں میں ختم کیا، پہلے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی، ان کو ان کے آقاؤں کا بھائی قرار دیا، پھر ان کے آزاد کرنے کو فضیلت کا کام بتایا، اس اسلامی تعلیم نے سینکڑوں غلاموں کو آزادی دلائی، کئی گناہوں کے کفارہ میں غلاموں کی آزادی کو بھی کفارہ کی ادائیگی کا ذریعہ بنا دیا گیا، اس میں بڑی تعداد میں غلام آزاد ہوئے۔

12.4.3 اچھا برتاؤ کرنا

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر انسان سے خواہ وہ بڑا یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، مسلمان ہو یا غیر مسلم یا اس کی کوئی اور حیثیت ہو اس سے اچھی طرح پیش آئے، اچھی بات اچھے انداز میں کہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا "[البقرة :83] (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

حضور ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ:

''جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو وہ بھلائی برائی کو مٹا دے گی، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ'' (ترمذی ، باب ما جاء في معاشرة الناس ،حدیث نمبر:1987)

ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ رکھے، خواہ اس کا تعلق کسی قبیلہ، خاندان، نسل ونسب اور کسی بھی دین ومذہب سے ہو، قرآن مجید میں فرمایا گیا:

''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ'' [المائدة : 8]

(اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، عدل کرو، یہ بات تقوی کے قریب ہے)۔

12.4.4 رحم اور مالی تعاون

اسلام کا پیغام لے کر حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں بھیجا گیا، وہ صرف مسلمانوں کے نبی نہیں ہیں، پوری انسانیت کے نبی ہیں، ان کو سارے جہان کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا گیا، رحمۃ للعالمین ﷺ نے خود اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرمایا اور یہی تعلیم بھی دی، آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا'' (**ترمذی، باب ما جاء في رحمة المسلمين**، حدیث نمبر: 1924)۔

اسلام میں زکوۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، حضور ﷺ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو 30 ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، قرآن مجید میں قیدیوں کو کھانا کھلانے والوں کی تعریف کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قبضہ میں غیر مسلم ہی قید ہو کر آتے تھے، حضور ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت مند کی مدد کرنا انسانی فریضہ ہے، اور یہ مدد صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں؛ بلکہ تمام انسانی برادری اپنی ضرورت کے وقت اس مدد کی مستحق ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مسلمان نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ کسی آدمی سے صرف خدا کے لئے محبت نہ کرے'' (**مسند أحمد : مسند أنس** رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: 13675)

یہ حدیث بھی عام ہے، اس میں ''الناس'' (لوگ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہئے کہ خیر خواہی کے جذبات پوری انسانی برادری کے لئے رکھے اور جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی ان کے لئے بھی پسند کرے۔

12.5 والدین اور اولاد کے حقوق

والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت اسلام میں ضروری قرار دی گئی ہے، توریت و انجیل کی تعلیمات میں بھی والدین کے ساتھ احترام کی تاکید کی گئی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بعد والدین کا درجہ انسانی رشتوں میں سب سے اہم قرار دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔

12.5.1 والدین کا احترام اور ان سے محبت

قرآن وحدیث میں والدین کی تعظیم کی خصوصی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پرودگار! تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا'' [بنی اسرائیل: 24]۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے'' (**مستدرک حاکم : کتاب الجهاد**، حدیث نمبر: 2502)، آپؐ نے فرمایا: ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے'' (**ترمذی ، باب ما جاء من الفضل في رضا الوالد** ، حدیث نمبر: 1899)، ایک مرتبہ آپ ﷺ نے والدین کی عزت وعظمت کو ایک نہایت مؤثر واقعہ کی صورت میں بیان فرما کر اس کا صلہ بھی ذکر فرمایا؛ تاکہ اپنی امت کو تعلیم دیں کہ والدین کا احترام کتنا اہم ہے اور کن مصیبتوں سے نجات کا راستہ ہموار کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''بنی اسرائیل میں یہ واقعہ پیش آیا کہ تین مسافر راستہ میں چل رہے تھے کہ تیز بارش ہونے لگی، تینوں نے ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان اوپر سے اس طرح گری کہ اس نے غار کا منہ بند کردیا، انہوں نے اس بے قراری کے عالم میں پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا: اس وقت ہم میں سے ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہیں پر دارومدار تھا، شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا، تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا، جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کے لئے دور نکل گیا، میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے؛ مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اس طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے، اے اللہ! اگر تجھے معلوم ہے کہ یہ کام میں نے تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان خود بخود غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعاء کی اور غار کا منہ کھل گیا'' (**مسلم ، باب قصة أصحاب الغار الثلاثة والتوسل بصالح الأعمال** ، حدیث نمبر: 2743)۔

یہ حدیث ایک طرف والدین کی خدمت کی فضیلت کو اجاگر کررہی ہے تو دوسری طرف والدین کے احترام اور ان کی عظمت کا لحاظ رکھنے کی بھی تعلیم دے رہی ہے، اس شخص کا رات بھر پیالہ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہنا، صرف اس خیال سے کہ ان کو جگانا ان کے آرام میں خلل کا باعث ہوگا اور سرہانے سے ہٹنا بروقت ان کی خدمت میں رکاوٹ بنے گا، والدین کے احترام کی اعلی مثال پیش کررہی ہے۔

12.5.2 والدین کی اطاعت

اولاد کے اوپر والدین کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی اطاعت کریں اور ان کے حکموں کو مانیں، والدین کی اطاعت کے لئے عام طور سے احادیث میں ''برّ'' کا لفظ اور نافرمانی کے لئے ''عقوق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسلام میں والدین کی نافرمانی حرام قرار دی گئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالی نے بلا شبہ تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کردی ہے'' (بخاری: 3677) اللہ تعالی کی شریعت میں شرک سے بری کوئی چیز نہیں؛ لیکن ماں باپ اگر مشرک بھی ہوں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، صرف شرک کرنے پر مجبور کریں تو ان کی بات ماننے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے

> ''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کر، اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا'' [العنكبوت :8]

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

> ''اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کے ساتھ گذر کر'' [لقمان :15]

ان دونوں آیتوں میں والدین کے ادب، اور ان کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ یمن کا ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور ﷺ نے اس سے پوچھا:

> ''یمن میں تمہارا کوئی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں میرے باپ ہیں، آپ ﷺ نے پوچھا: انہوں نے تمہیں اجازت دے دی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو تم واپس جاؤ اور ماں باپ سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دے دیں تو جہاد میں شرکت کرو، ورنہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو''
> (ابو داؤد ، باب في الرجل يغزو ،حدیث نمبر:2530)۔

12.5.3 والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت

قرآن مجید میں تقریبا 12 آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے، سورہ بقرہ میں توریت کے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

> ''یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا'' [البقرة:83]

نزولِ قرآن کے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے اپنے رسم ورواج اور وہم وخیال کی بنیاد پر بہت سی چیزیں اپنے طور پر حلال یا حرام کرلی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں؟ خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا، ارشاد ہے:

> ''اے پیغمبر! آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا'' [الأنعام:151]

یعنی نیکی نہ کرنا بھی حرام ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے، صحابہ کرام حاضر تھے، فرمایا:

''وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، صحابہ ؓ نے پوچھا: کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا: وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی'' (مسلم ، باب رغم أنف من أدرک أبویه ...، حدیث نمبر: 2551)

ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے؟ فرمایا:

''وقت پر نماز پڑھنا'' عرض کیا: پھر کون؟ فرمایا: ''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا''، دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ''خدا کی راہ میں جہاد کرنا'' (بخاری ، باب فضل الجهاد ، حدیث نمبر: 2782)

والدین کی مالی خدمت اور تعاون کی بھی قرآن مجید میں تاکید کی گئی ہے، فرمایا گیا: ''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے ہے'' [البقرة :215] یہاں سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا گیا۔

والدین اگر ضرورت مند ہوں تو اولاد پر اپنی بیوی اور بچوں کے بعد ان کا نفقہ اٹھانا لازم ہے، ماں باپ کو یہ بھی حق ہے کہ اولاد کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے خرچ کریں، شرط یہ ہے کہ اسراف نہ کریں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ضرورت کے بقدر لینا جائز ہے، امام احمدؒ کے نزدیک اولاد کے مال میں ضرورت کے بغیر بھی لینا جائز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے'' (ابوداؤد ، باب الرجل یأکل من مال ولده ، حدیث نمبر: 3530)۔

12.5.4 ماں کی خصوصی رعایت کی تاکید

شریعت میں ماں باپ دونوں کی خدمت و اطاعت کا حکم دیا گیا؛ لیکن چونکہ ماں فطری طور پر زیادہ کمزور اور حساس ہوتی ہے ، پھر اس کے احسانات اور قربانیاں بھی باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں؛ اس لئے شریعت میں ماں کا حق زیادہ بتایا گیا اور ماں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی ترغیب دی گئی، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں تکلیف اٹھا اٹھا کر اس کو پیٹ میں لئے پھری اور تکلیف ہی سے جنا'' [الأحقاف :15]

حضور ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں''، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں''، اس نے پوچھا: پھر کون؟ ارشاد فرمایا: ''تیری ماں''، اس نے کہا: پھر کون؟ تو آپ نے فرمایا: ''تیرا باپ'' (الأدب المفرد : باب بر الأمر ، حدیث نمبر: ۳)

اسلام نے رضاعی ماں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا سبق سکھایا، حضرت ابوالفضل کہتے ہیں: میں نے جعرانہ کے مقام پر حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ گوشت تقسیم فرما رہے ہیں، اتنے میں ایک عورت آئیں اور آپ کے بالکل قریب پہنچ گئیں، آپ نے ان کے لئے

اپنی چادر بچھادی، وہ اس پر بیٹھ گئی، میں نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون صاحبہ ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ حضورﷺ کی وہ ماں ہیں جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔(ابو داؤد : باب في بر الوالدين ،حدیث نمبر:5744)۔

12.5.5 والدین کے لئے دعاء کا اہتمام

اولاد پر ماں باپ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کریں، قرآن نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم کے بعد یہ دعاء سکھائی ہے:

"وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا" [بنی إسرائيل : 24]

(اور کہو کہ اے میرے پرودگار تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا)

حضورﷺ نے فرمایا:

"جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو اس کے عمل کی مہلت ختم ہوجاتی ہے، صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، تیسرے وہ صالح اولاد جو اس کے لئے دعاء مغفرت کرتی رہے"(ابو داؤد : باب ما جاء في الصدقة عن الميت ، حدیث نمبر:2880)۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہوسکتے ہیں مثلا ان کی وفات کے بعد باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے رہنا وغیرہ۔

12.5.6 اولاد کے حقوق

اسلام نے جس طرح والدین کے حقوق اولاد پر رکھے ہیں، اولاد کے حقوق بھی والدین کے ذمہ رکھے ہیں، اسلام نے ماں باپ پر یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دنیا میں آنے سے پہلے سے ہی ان کی جانوں کا تحفظ کریں، اسی لئے اسلام نے جان بوجھ کر حمل کو ساقط کرنے سے منع کردیا، لوگ افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کیا کرتے تھے، رب کریم نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

"اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مارڈالنا بلاشبہ بڑا گناہ ہے"[بنی اسرائیل:31]۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضور اکرمﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: "شرک"، پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: "والدین کی نافرمانی"، پھر پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مارڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی"(بخاری، باب ما قيل في شهادة الزور ،حدیث نمبر:2653)؛ چنانچہ والدین پر اپنی اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کسی ذریعہ سے بھی ان کو ضائع نہ کریں۔

12.5.7 رضاعت اور حضانت

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی خوراک کا انتظام کرنا باپ کے ذمہ ہے، اور شیر خوارگی کے زمانہ میں دودھ ہی بچہ کی خوراک ہے، اس لئے ماں کی ذمہ داری ہے کہ اس کو دودھ پلائے اور اگر ماں کسی وجہ سے اپنے شوہر کے نکاح سے علاحدہ ہو چکی ہو تو باپ کی ذمہ داری ہے کہ رضاعت (دودھ پلانے) کی ذمہ داری ادا کرے؛ چنانچہ دودھ پلانے والی کی اجرت باپ پر واجب کی گئی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا:

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لئے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان کی دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے'' [البقرة :233]

بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں، حضانت ماں باپ دونوں کا مشترکہ حق ہے، رضاعت بھی اصلا حضانت ہی کا ایک حصہ ہے، فقہ کی اصطلاح میں حضانت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی، یا کم عقل بالغ لڑکے اور لڑکی جن میں تمیز کی صلاحیت نہ ہو ان کی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے' اور یہ اس وقت تک جب تک کہ وہ خود سے اپنے کام انجام دینے کے لائق ہو جائیں۔

ماں کو لڑکوں کا حق پرورش اس وقت تک حاصل ہوگا جب تک خود ان میں کھانے پینے، استنجا کرنے اور کپڑے پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے، احناف کے نزدیک اس کی مدت سات سال متعین کی گئی ہے، اس کے بعد چونکہ لڑکوں کو تہذیب وثقافت اور آداب واخلاق کی ضرورت ہے؛ اس لئے بچے باپ کے حوالے کر دیئے جائیں گے، لڑکیاں ہوں تو بالغ ہونے کے بعد باپ کے حوالے کر دی جائیں گی، یہ مسئلہ اس صورت میں پیش آئے گا جب کہ ماں باپ علاحدہ ہو چکے ہوں، ورنہ مشترک طور پر پرورش کرنا دونوں کا حق ہے۔

12.5.8 شفقت ومحبت اور مساویانہ سلوک

والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت اور نرمی کا معاملہ کریں اور اس کے اظہار کے طور پر اپنے چھوٹے بچوں پر شفقت کا ہاتھ پھیریں، ان کو گود میں لیں، ان کو پیار کریں اور ان کے ساتھ ان کی عمر کے اعتبار سے بہتر سے بہتر سلوک کریں۔ ایک مرتبہ اقرع بن حابس حضور ﷺ کے پاس آئے، حضور ﷺ اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، حضرت اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے: یارسول اللہ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ میرے تو دس بچے ہیں؛ لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا، حضور ﷺ نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا:

''اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں'' (بخاری : باب رحمة الولد ،حدیث نمبر:5998)

اسی طرح اولاد سے ہمیشہ شفقت ومحبت اور ان کو لینے دینے میں ایک جیسا سلوک کرنا چاہئے، اپنی زندگی میں اگر اولاد کو کچھ دینا ہو تو بیٹوں اور بیٹیوں، اسی طرح ان میں چھوٹے بڑے کا فرق کئے بغیر سب کو برابر دینا چاہئے، اگر کسی بچہ کی طرف طبعاً میلان ہو

تو معاف ہے ؛ لیکن سلوک و برتاؤ اور لین دین میں ہمیشہ انصاف اور مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ، ایک مرتبہ حضرت نعمان ﷛ کے والد حضرت بشیر ﷛ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک غلام تھا، وہ میں نے اپنے اس بیٹے کو دے دیا ہے، حضور ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم نے اپنے ہر لڑکے کو ایک ایک غلام دیا ہے''، بشیر ﷛ بولے: نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''غلام کو تم واپس لے لو''، اور فرمایا:

''خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو''(مسلم : باب کراھة تفضیل الولد ،حدیث نمبر:1623)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر مجھے گناہ پر گواہ نہ بناؤ ، میں ظلم کا گواہ نہ بنوں گا'' (مسلم ، حدیث نمبر: 1623)اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ سب لڑکے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں؟''، حضرت بشیر ﷛ نے کہا: یا رسول اللہ! کیوں نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا: ''پھر ایسا کام مت کرو'' (مسلم، حدیث نمبر: 1623)

زندگی میں اولاد کے درمیان اشیاء کا تقسیم کرنا ''ہبہ'' یعنی ہدیہ ہے، اولاد کے درمیان چونکہ انصاف کا حکم ہے، اس لئے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر برابر دیا جائے ، اگر باپ کمی بیشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی ؛ لیکن اگر اس نے وراثت کے اصولوں پر تقسیم کیا ، یعنی لڑکوں کو لڑکیوں کا دوگنا دیا ، یا کمی بیشی کا کوئی دوسرا طریقہ استعمال کیا تو یہ تقسیم صحیح ہو جائے گی ؛ چونکہ وہ اپنے مال کا مالک ہے اور اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا حق رکھتا ہے ہاں اگر کسی بچہ یا بچی کو کسی معقول بنیاد پر زیادہ دیتا ہے، مثلاً وہ معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور ہے، تو گناہ بھی نہیں۔

12.5.9 اولاد کا نفقہ

اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہے، قرآن مجید سے بھی یہی روشنی ملتی ہے، اس لئے بچے کے دودھ پینے کی اجرت باپ پر واجب قرار دی گئی ہے [الطلاق :16] ؛ بلکہ ان عورتوں کی کفالت بھی باپ کے ذمہ رکھی گئی ہے، جو اس کے بچے کی پرورش کرنے میں مشغول ہوں اور ان کو دودھ پلاتی ہوں [البقرة :233] یہ حدیث سے بھی ثابت ہے، حضرت ابوسفیان ﷛ اخراجات کی ادائیگی میں کسی قدر تنگی سے کام لیا کرتے تھے، ان کی بیوی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اس تنگی کی شکایت کی اور دریافت کیا کہ میں شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے خرچ کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اتنی مقدار لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچے کے لئے کفایت کر جائے'' (بخاری :باب إذا لم ینفق الرجل ،حدیث نمبر:3546)

باپ مالدار ہو اور بچے نابالغ ہوں تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اور اگر باپ مالدار ہو اور اولاد بالغ ہوں اور وہ محتاج ہوں تو نکاح تک لڑکیوں کا نفقہ باپ کے ذمہ ہوگا، اسی طرح شادی شدہ لڑکیاں مطلقہ یا بیوہ ہو جائیں، تب بھی باپ ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ لڑکے مفلوج، نابینا یا معذور ہونے کی وجہ سے کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یا ابھی (فرض کی مقدار) حصول تعلیم میں مشغول ہوں تو ان کا نفقہ بھی باپ کے ذمہ ہوگا۔ اگر باپ خود محتاج ہو اور نفقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، اور بچے بالغ اور مالدار ہوں یا

خود کسب معاش کے لائق ہوں تو ان صورتوں میں باپ پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہوگی ؛ لیکن باپ محتاج ہو اور بچے بھی نابالغ یا بالغ محتاج ہوں اور کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو باپ کی ذمہ داری ہوگی کہ کسب معاش کر کے ان کا خرچ اٹھائے ۔

12.5.10 تعلیم وتربیت

والدین پر اولاد کا ایک بڑا حق یہ ہے کہ وہ ان کو اچھی تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں؛ چونکہ اگر جسمانی نشو ونما بہتر ہو اور تربیت کے اعتبار سے انسان ناقص ہو تو وہ قابل تعریف نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا: ''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ'' [تحریم:6] یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود تمام برائیوں، بداخلاقیوں اور بری عادتوں سے بچوں کی حفاظت ہے؛ چونکہ یہی چیزیں انسان کو جہنم سے قریب کرتی ہیں، اس طرح والدین پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دین ودنیا کی نفع بخش تعلیم اور ان کو ہنر مند بنانے کا فرض عائد کیا گیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

''باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت ہے'' (ترمذی حدیث نمبر:1952)۔

12.5.11 بچوں کے لئے دعائیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو اپنے بچوں کے حق میں دعاء خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ'' [الفرقان : 74]

(اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما)

صالح بچوں کے لئے ان کی حفاظت اور ان کی عافیت وسلامتی کے لئے دعاء کرنا بھی ان کا حق ہے، اور والد کی دعاء تو ان دعاؤں میں سے ایک ہے جن کی قبولیت میں کوئی شک نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا:

''تین دعائیں بلاشبہ قبول ہوتی ہیں: والد کی دعاء، مسافر کی دعاء اور مظلوم کی دعاء'' (ابوداؤد : باب الدعاء بظهر الغيب ، حدیث نمبر:1536)۔

12.5.12 بچیوں کی خصوصی رعایت

یوں تو بچے اور بچیوں دونوں سے یکساں محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی ہے؛ لیکن چونکہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے بچیوں کو والدین عار اور شرم کا باعث سمجھتے تھے اور ان کی پیدائش کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور یہ ناپسندیدگی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کو زندہ دفن کردیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپادے (زندہ دفن کردے)'' [النحل :59]

آج بھی سماج میں ایسے لوگ موجود ہیں۔

اسلام نے لڑکیوں کی اہمیت اس طرح بڑھادی کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی، انہیں تعلیم وتہذیب سکھائی اوران کے ساتھ رحم کا سلوک کیا، یہاں تک کہ خدا ان کو بے نیاز کردے تو ایسے شخص کے لئے خدا نے جنت واجب فرمادی''، اس پر ایک صاحب نے دریافت کیا: اگر دو ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''دو لڑکیوں کی پرورش کا بھی یہی صلہ ہے''، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک کے بارے میں پوچھتے تو آپ ﷺ ایک کی پرورش پر بھی یہی بشارت دیتے'' (شرح السنة للبغوي : باب ثواب كافل اليتيم ،حدیث نمبر:3457)

اسی طرح ان کو حقیر نہ سمجھنے اور لڑکوں کی طرح ان سے سلوک کرنے پر یہ خوشخبری سنائی گئی:

''جس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقہ پر اسے زندہ دفن نہیں کیا اور نہ اس کو حقیر جانا اور لڑکے کو اس کے مقابلہ میں ترجیح نہ دی اور زیادہ نہ سمجھا تو ایسے آدمی کو خدا جنت میں داخل کرے گا''

(ابو داؤد: باب فضل من عال يتيمًا ،حدیث نمبر:5146)

معلومات کی جانچ

1. حقوق العباد سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. اسلام میں شخصی آزادی کا کیا تصور ہے؟
3. اسلام میں ماں کے خصوصی مقام کو واضح کیجئے۔

12.6 ازدواجی کے حقوق

حقوق زوجین کی ادائیگی کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ "[البقرة:228]

(اور جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق ہیں)

ان حقوق کی تین جہتیں ہوسکتی ہیں: 1. میاں بیوی کے مشترکہ حقوق 2. شوہر پر بیوی کے حقوق 3. بیوی پر شوہر کے حقوق ذیل میں ہم ان تینوں جہتوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

12.6.1 میاں بیوی کے مشترکہ حقوق

حسن معاشرت

بیوی پر شوہر کے ساتھ حسن سلوک اور اس کا احترام ضروری ہے، اسی طرح شوہر کے لیے بھی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی دلجوئی ضروری ہے، قرآن مجید میں ہے:

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں'' [الروم :21]

ظاہر ہے سکون واطمینان اور محبت والفت کا حصول ایک دوسرے کے احترام اور بہتر برتاؤ کے بغیر نہیں ہوسکتا، شوہر کو چونکہ ''قوامیت'' اور برتری حاصل ہے، اس بات کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس برتری اور انانیت کے زور پر اپنے حسن سلوک سے محروم رکھے؛ اس لیے اس کو زیادہ اس کی تاکید کی گئی، فرمایا گیا:

''اور ان کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو، اگر وہ تم کو نہیں بھاتی ہیں تو ہوسکتا ہے تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی خوبیاں رکھی ہوں'' [النساء :19]

زوجین کے آپسی تعلقات کے لیے سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں ''معروف'' کا لفظ تقریباً پندرہ مقامات پر استعمال ہوا ہے، معروف کے مختلف آیتوں میں مختلف معنی ہیں ؛ لیکن بالعموم اس میں یہ بات شامل ہے کہ بغیر احسان جتائے ہوئے بخشش وکرم کا سلسلہ جاری رکھنا، میاں بیوی ایک دوسرے کے حق میں سراپا محبت اور رحمت بن کر رہیں، قول وفعل میں دونوں ایک دوسرے کے لیے پھول نچھاور کرنے والے ہوں، حتی کہ اگر کسی وجہ سے اس رشتہ کو ختم ہی کرنا پڑے تو شوہر کو یہ تعلیم دی گئی کہ اسلامی طریقہ پر حق طلاق کا استعمال کرتے ہوئے عدت کے بعد ''معروف'' کے ساتھ بیوی کو رخصت کرے:

''فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ '' [طلاق :2]

(تو بہتر طریقے پر ان کو رکھو یا بھلے طریقہ پر ان کو چھوڑ دو)

خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک غصہ ہو جائے تو دوسرا اس کو منانے کی کوشش کرے، حضرت ابو الدرداء ؓ اپنی اہلیہ سے فرمایا کرتے تھے: ''جب تم مجھے غصہ میں دیکھو تو راضی کرلیا کرو، اور جب میں تمہیں غصہ میں دیکھوں تو راضی کرلوں، اس کے بغیر ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے''، حضرت عائشہ عام حالات میں ''ورب محمد ''(محمد کے رب کی قسم) کہتیں، کسی وجہ سے روٹھ جاتیں تو''ورب إبراهيم'' (ابراہیم کے رب کی قسم) کہتیں، حضور ﷺ نے اس فرق کو محسوس کرلیا، اور فرمایا:

''میں جانتا ہوں تم کب مجھ سے خوش ہو، اور کب ناراض ہو'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اعتراف کیا، اور فرمایا:

''جی! بخدا رسول خدا! میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں (بخاری: باب غيرة النساء ووجدهن، حدیث نمبر:5228)

اس واقعہ سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نبوت کی ذمہ داریوں کے باوجود ازدواجی زندگی کو کس قدر خوشگوار رکھتے تھے، اور لاکھ مصیبت وغم ٹوٹ پڑے، باہر کے مسائل کو بہت کم گھر میں چھیڑتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کا معمول مبارک تو یہ تھا کہ وہ گھر کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے:

''تم میں سے ایک عام آدمی کی طرح آپ اپنے گھر میں کام کیا کرتے تھے'' (مسند أحمد، حدیث نمبر: 25341)

آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

’’تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں‘‘(ترمذی، باب فضل ازواج النبی، حدیث نمبر:4269)

ایک دوسرے کی خامیوں کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کا یہ سفر طے کرنا ضروری ہے:

’’ وَلاَ تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ‘‘ [البقرة:237] (اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا نہ بھولو)

خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے خامیوں کو نظر انداز کرنا چاہئے، حضور کرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’کوئی مومن مرد کسی مومن عورت کو ناپسند نہ کرے، اگر اس کی ایک عادت نہ پسند ہو تو دوسری پسند بھی ہوگی‘‘ (مسند احمد، حدیث نمبر:8363)

زینت اختیار کرنا

عورت چونکہ مرکز جمال ہے، اور زینت اس کی چادر ہے، سنورنے کی خواہش اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، اسی لیے سونا چاندی جو اصلاً کرنسی کی بنیادیں ہیں، اور ان کو بازار میں گردش میں رہنا چاہئے، روک کر نہیں رکھنا چاہئے، لیکن عورت کی اسی فطری خواہش کی تسکین کے لیے اسے زیورات پہننے کی اجازت دی گئی، ہاں یہ ضرور حکم دیا گیا کہ اس کی نمائش نہ ہو، جن محرم مردوں کے سامنے اس زینت کو ظاہر کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں سب سے پہلے شوہر کا ذکر ہے:

’’وَلاَ يُبْدِينَ زِيْنَتَهُنَّ إِلاَّ لِبُعُوْلَتِهِنَّ أو...... ‘‘ [النور:31]

’’اور پنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے لیے یا......‘‘

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کو زیب و زینت سے عاری دیکھا تو ان کی اس حالت پر حیرت کا اظہار کیا، اور جب معلوم ہوا کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کو اس سے دلچسپی نہیں تو ان کو نصیحت کی اور فرمایا:’’وَلأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا‘‘(بخاری : باب من اقسم علی اخیه لیفطر فی التطوع ، حدیث نمبر:1968)، (تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے) حضور ﷺ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ کو حق بجانب قرار دیا، اور یہ میاں بیوی دونوں کے لیے نصیحت تھی۔

جس طرح بیوی کا شوہر کے لیے بجنا سنورنا اس کا حق ہے اسی طرح شوہر کا بیوی کے لیے اچھی ہیئت میں رہنا اور مناسب لباس زیب تن کرنا بھی پسندیدہ ہے۔

حضور اکرم ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے تھے تو مسواک فرمایا کرتے تھے (مسند احمد:25553) اس میں عبادت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پہلو ہے کہ گھر والوں کے درمیان آدمی تر و تازہ رہے، امام ابو یوسف سے منقول ہے:

’’جیسے مجھے پسند ہے کہ وہ (میری بیوی) میرے لیے زینت اختیار کرے اسے بھی پسند ہے کہ میں اس کے لیے زینت اختیار کروں‘‘(رد المحتار:۹/۶۰۵)

عبادت اور دینی کاموں میں باہمی تعاون

اسی طرح میاں بیوی کو دینی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے اور اس کی ترغیب دینی چاہئے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس مرد پر رحم فرمائے جو رات میں اٹھ کر نماز پڑھتا ہو اور اپنی بیوی کو بھی اٹھاتا ہو، وہ بھی نماز پڑھتی ہو، اور اگر وہ اٹھنے سے انکار کرتی ہو تو اس کے چہرہ پر پانی کی چھینٹیں مارتا ہو، اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات میں اٹھ کر نماز پڑھتی ہو اور اپنے شوہر کو بھی اٹھاتی ہو، وہ بھی نماز پڑھتا ہو، اور اگر وہ اٹھنے سے انکار کرتا ہو تو اس کے چہرہ پر پانی کی چھینٹیں مارتی ہو'' (النسائی: باب الترغیب فی قیام اللیل، حدیث نمبر: 1610)

میراث پانا

جس طرح بیوی کو اس کے انتقال کے بعد شوہر کے ترکہ میں حصہ ملتا ہے، اور وہ اس طرح کہ شوہر کی اولاد نہ ہو تو نصف (1/2) حصہ اور اولاد ہو تو ایک چوتھائی (1/4) حصہ، اسی طرح شوہر کے لیے بھی بیوی کے ترکہ میں حصہ متعین ہے، اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (1/8) حصہ ملے گا اور لاولد ہو تو چوتھائی (1/4) حصہ ملے گا (النساء: 12)۔

12.6.2 شوہر پر بیوی کے حقوق

مہر

مہر وہ مال ہے جو مرد پر عورت کے لیے عقد نکاح یا جنسی تعلق قائم ہونے کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، مہر کی اہمیت اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ مہر کو قرآن میں ''فریضہ'' کے لفظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے، مہر کا مقصد اس عقد کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور عورت کا اعزاز واکرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ''[النساء:4]

(اور بیویوں کو خوشدلی کے ساتھ ان کا مہر ادا کرو)

مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت کی رضامندی اور خوشدلی کے بغیر مہر کا کچھ حصہ بھی رکھ لے، قرآن میں ہے:

''وَلاَ يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأخُذُوْا مِمَّا آتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا'' [البقرة:229]

(اور جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو ان میں سے کچھ بھی واپس لینا درست نہیں)

ہاں وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں، یعنی میاں بیوی کو جو احکام اللہ کی طرف سے ملے ہیں وہ ان پر قائم نہ رہ سکیں: ''أَلَّا يُقِيمَا حُدُوْدَ اللهِ''[البقرة:229] اور عورت خلع لے لے، یا یہ کہ عورت خوشدلی سے معاف کر دے، تو پھر مرد کے لئے مہر کا مال جائز ہو جاتا ہے:

’’پھر اگر وہ خوش دلی سے اپنے مہر میں سے کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیں تو اس کو ہنسی خوشی کھاؤ‘‘[النساء:4]

اگر چہ نکاح کے عقد میں مہر کا ذکر کرنا ضروری نہیں، لیکن اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر بھی مرد پر کسی نہ کسی صورت میں مہر واجب ہوجاتا ہے، جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہو تو بھی مہر واجب ہوگا، جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا تو وہ زانی ہے۔(مجمع الزوائد: باب فيمن نوى أن لا يؤدي صداق المرأة ،حدیث نمبر:7505)۔

نفقہ رہائش

نفقہ سے مراد یہ ہے کہ شوہر کھانے کپڑے وغیرہ کا انتظام کرے، نیز وہ رہائش کا انتظام کرے، بیوی کے کھانے پینے، رہائش اور کپڑے کے ساتھ ساتھ دوا وعلاج کی ذمہ داری بھی شوہر پر ہے،اگر عورت نکاح کے بعد خود کو مرد کے حوالہ کردیتی ہے تو اس پر اس کا خرچ اٹھانا لازم ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت نکاح کے بعد سے ہی خود کو شوہر کے گھر کا پابند بنالیتی ہے، وہ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی،عورت خود مالدار بھی ہو تو مرد پر اس کی ادائیگی لازم ہے،مرد کی اجازت سے یا اس کے ظلم سے تنگ آکر بیوی میکہ میں رہے تو بھی خرچ شوہر پر ہے(عالمگیری 1 / 545) خورد ونوش، رہائش، اور لباس و پوشاک میں بیوی کے اہل خاندان کے معیار کا لحاظ شوہر کی استطاعت کے ساتھ ضروری ہے، اگر بیوی کے گھر کا معیار اونچا ہو تو کم از کم درمیانی درجہ کے نفقہ کا انتظام شوہر پر لازم ہے(ہدایہ/ 2 / 417) اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے،اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کے لیے اس کو پورا کرنا واجب ہے (ہدایہ 2 / 421) عدت طلاق میں بھی شوہر پر نفقہ واجب ہے۔

علاج کو اصلا فقہاء نے نفقہ میں شامل نہیں کیا ہے، بلکہ عورت اگر خود مالدار ہو تو اسی پر ہے، اور اگر وہ غریب ہو تو اس کے گھر والوں پر،لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاج گذشتہ زمانہ میں بنیادی ضرورت میں شامل نہیں تھا، اس لیے کہ صحت اور توانائی کے لیے بالعموم لوگ اہتمام کرتے تھے، پرہیز سے کام لیتے تھے، غذاؤں میں مضر اثرات کی ملاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے بیماریاں اس طرح وبا کی شکل میں عام بھی نہیں ہوئی تھیں، چنانچہ فقہاء نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اجتہاد کیا، آج دوا علاج نے غذا کی جگہ لے لی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی اہمیت اس بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے،بعض مریض کھانے سے بڑھ کر دوا کے سہارے زندہ ہوتے ہیں، جب درد ومصیبت نے گھیر رکھا ہو، اور موت دروازہ پر دستک دے رہی ہو تو کھانا کیوں کر کھایا جائے، اس لیے اس دور کے زیادہ تر فقہاء علاج کو نفقہ میں شامل کرتے ہیں، اخلاقا بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ صحت کی حالت میں شوہر بیوی سے لطف اندوز ہو اور بیماری کی حالت میں اسے میکہ پہونچا کر اپنی عاجزی کا ثبوت دے(الفقه الإسلامي وأدلته:10 / 110)۔

عدل

ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو کھانے پینے، لباس و پوشاک اور رات گذارنے کے اعتبار سے پوری طرح برابری برتنا ضروری ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’جس کی دو بیویاں ہوں اور ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا اس کا ایک پہلو جھکا ہوا ہوگا‘‘(أبو داود، باب القسم بين الزوجين، حدیث نمبر:2135)

ہاں کسی ایک کی طرف دل کا میلان اس کی کسی خوبی کی وجہ سے زیادہ ہو تو اس پر پکڑ نہیں؛ لیکن معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہونا چاہئے، حضور ﷺ سفر پر بھی تشریف لے جاتے تو قرعہ اندازی فرماتے جس بیوی کے نام قرعہ نکلتا اسی کو ساتھ لے جاتے (مسنداحمد، حدیث نمبر: 26314)،جس شخص کے اندر انصاف کی صلاحیت نہ ہو اسے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہیں (النساء:3)۔

12.6.3 بیوی پر شوہر کے حقوق

بیوی پر شوہر کے حقوق کی پاسداری اور ان کی رعایت کی اور زیادہ تاکید کی گئی ہے:

”وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَة “ [البقرة:228] (البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے)

امام جصاص رازی لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالی نے میاں بیوی دونوں کے حقوق بیان کئے ہیں؛ لیکن مرد کو ایک خصوصی حق دیا ہے جو عورت کو حاصل نہیں۔(احکام القرآن،جصاص :2/ 68)۔ابن عربی کہتے ہیں: اس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ مرد عورت سے مرتبہ میں بڑھا ہوا اور نکاح کے حقوق میں عورت سے مقدم ہے(أحکام القرآن،ابن عربی : 1/ 361)۔

بیوی پر شوہر کے چند حقوق درج ذیل ہیں:

شوہر کی اطاعت

مرد کو اللہ تعالی نے گھر کا ذمہ دار بنایا ہے، اور یہ صرف اس وجہ سے کہ فطری طور پر اس کو زیادہ قوی اور نگہداشت کی صلاحیت رکھنے والا بنایا گیا ہے،اور اس لیے کہ وہ مالی ذمہ داری اٹھاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ “[النساء:34]

’’مرد عورتوں پر نگراں ہیں،اس لیے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے،اور اس لیے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں‘‘

حضرت علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ قوّام کے معنی یہ ہیں کہ مرد عورتوں کے امیر ہیں، چنانچہ بیوی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام باتوں میں شوہر کی اطاعت کرے جن کا اللہ تعالی نے حکم فرمایا ہے،اور اس کی اطاعت یہ ہے کہ وہ اس کے لیے خیر خواہ اور اس کے مال کی محافظ بن کر رہے (ابن کثیر)،شوہر کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا گیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''میں اگر کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے''(ترمذی : باب حق الزوج علی المرأة،حدیث نمبر:285)

بیوی شوہر کو خوش رکھ کر اس دنیا سے جائے تو حضور ﷺ نے اس کے جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔(ترمذی: باب حق الزوج علی المرأة،حدیث نمبر:286)یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ

''انسان کا سب سے بہترین خزانہ نیک بیوی ہے کہ شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کردے،اور جب اسے حکم دے تو بات مانے،اور جب موجود نہ ہو تو اس کی حفاظت کرے''(أبوداؤد:باب فی حقوق المال،حدیث نمبر:1666)

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

''عورت کے لیے اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھنا،یا اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں کسی کو آنے دینا جائز نہیں،یعنی شوہر کے گھر بار،مال و دولت،اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت اس کا حق ہے''(بخاری : باب لا تأذن المرأة في بيت زوجها،حدیث نمبر:5195)

12.7 قرابت داروں کے حقوق

12.7.1 قرابت داروں سے مراد؟

عربی میں قرابت داروں یا رشتہ داروں کے لئے متعدد الفاظ استعمال ہوے ہیں مثلاً:اقارب ، ذوی القربی ، ذوی الأرحام ، أولو الأرحام وغیرہ۔

اقارب میں درجہ بدرجہ ماں، باپ، بھائی بہن، بیٹے بیٹیاں اور ان سے جڑی ہوئی ساری رشتہ داریاں مثلاً دادا، دادی، نانا، نانی اور ان سے اوپر کے رشتہ دار، اسی طرح پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور ان سے چلنے والی نسل، اسی طرح چچا، پھوپھیاں، ماموں اور خالائیں اور ان سب کے بچے بچیاں سب شامل ہیں،خواہ ان میں کوئی قریب کا ہو کوئی دور کا،کوئی محرم ہو کوئی غیر محرم ہر ایک درجہ بدرجہ رشتہ داروں میں داخل ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ والدین اور اولاد کو حقوق کے اعتبار سے اولیت حاصل ہے اور شریعت نے ان کو خصوصی درجہ عطا فرمایا ہے، اسی طرح زوجین کے تعلقات کی نوعیت بھی الگ ہے، اس لئے ان کو علاحدہ بیان کیا گیا، یہاں ان کے علاوہ مجموعی طور پر دیگر رشتہ داروں کے حقوق بیان کئے گئے ہیں۔

12.7.2 صلہ رحمی اور اس کی فضیلت

قرابت کے حقوق ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں ''وَصُلُ الرَّحِمِ'' یا''صلةُ الرّحم ''کہ تعبیر استعمال ہوئی،اردو میں اسی کے لئے''صلہ رحمی'' کا مرکب لفظ مشہور ہے،''رحم'' کی تشریح خود حضور ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی کہ''رحم'' رحمٰن سے مشتق ہے،اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب فرمایا:

’’جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا‘‘[بخاری : باب من وصل وصله الله ، حدیث نمبر:5988]

اور اس سے اشارہ رحم مادر کی طرف ہے کہ وہیں سے انسان اس دنیا میں آتا ہے اور سارے انسان ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ اور ان میں جو آپس میں رشتہ دار ہیں ان کو اور قریبی واسطوں نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اس رشتہ کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔

صلہ رحمی کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

’’وَأُوْلُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوْا إِلٰى أَوْلِيَائِكُمْ مَّعْرُوفًا كَانَ ذٰلِكَ فِيْ الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا‘‘[الأحزاب :6]

(مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین ومہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں؛ البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو، یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تقوی کی تلقین کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا پاس ولحاظ رکھنے کی تلقین فرمائی:

’’وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ‘‘ [النساء:1]

(اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتہ داروں کا خیال رکھو)

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کی معصیت سے بچتے رہو اور رشتوں کو کاٹنے سے بچو، جب حضور ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اچانک اس خلاف عادت پیش آنے والے واقعہ سے آپ پر جو گھبراہٹ کی کیفیت تھی، اس پر تسلی دیتے ہوئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا؛ چونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں [بخاری: باب ما ودعک ربک ، حدیث نمبر: 4953] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہ انسانی ضرورت ہے اور اس کی اہمیت بغیر شرعی رہنمائی کے بھی انسان محسوس کر سکتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

’’جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے‘‘[بخاری: باب إكرام الضيف ،حدیث نمبر:6138]

اس حدیث میں حضور ﷺ نے صلہ رحمی کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے، ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے صلہ رحمی کو رزق میں برکت اور درازی عمر کا ذریعہ قرار دیا، فرمایا:

’’جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے‘‘[بخاری: باب من أحب البسط في الرزق، حدیث نمبر:2067]

احادیث میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ صلہ رحمی صرف یہ نہیں کہ صلہ رحمی کرنے والے رشتہ داروں کے ساتھ بدلہ کے طور پر حسن سلوک کیا جائے اور جو رشتہ داری کا حق ادا نہیں کرتے ان کا حق ادا نہ کیا جائے؛ بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''بدلہ چکانے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں، صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ داری توڑی جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے''[بخاری : باب لیس الواصل بالمکافئ ،حدیث نمبر:5991]

اس کے برخلاف شریعت میں قطع رحمی، یعنی رشتوں کو کاٹنے کی سخت مذمت کی گئی ہے، ابھی اوپر آپ نے پڑھا کہ اللہ تعالیٰ رحم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے، جو تجھے کاٹے گا میں اسے کاٹوں گا اور جو اللہ سے کٹ جائے اسے پھر اور کس خیر کی امید ہو سکتی ہے، ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''بغاوت اور قطع رحمی سے بڑھ کر کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ آخرت میں اس کی متعین سزاؤں کے علاوہ اس کو دنیا میں بھی فوراً سزا دے دی جائے''

ایک حدیث میں ایسے شخص کی سزا یہ سنائی گئی ہے کہ

''بنی آدم کے اعمال ہر جمعرات یعنی جمعہ کی رات کو پیش ہوتے ہیں، چنانچہ قطع رحمی کرنے والے کا عمل قبول نہیں کیا جاتا''[مسند احمد، حدیث نمبر:10272]

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ

''قطع رحمی کرنے والے جنت میں داخل نہ ہوگا''[بخاری: باب إثم القاطع ،حدیث نمبر:5984]

صلہ رحمی یعنی قرابت داری کا حق ادا کرنے کی درج ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں:

12.7.3 مالی تعاون

قرآن مجید میں سب سے زیادہ تاکید رشتے داروں پر خرچ کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہے فرمایا گیا:

''آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، فرما دیجئے کہ جو مال بھی خرچ کریں وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور غریبوں کے لئے''[البقرۃ:215]

ایک جگہ فرمایا گیا: ''تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر''[الروم:38] گویا یہ احسان نہیں؛ بلکہ اس کا حق ہے، ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے عدل واحسان کے حکم کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا کہ

''رشتہ داروں پر خرچ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے''[النحل:90]

ایک جگہ یہ ہدایت دی گئی کہ امیر رشتہ دار غریب رشتہ دار پر اپنی بخشش کا سلسلہ ختم نہ کرے اگر چہ اس سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور تم میں سے مال و دولت میں وسعت والے لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دیں گے بلکہ معاف کر دیں اور درگذر کر دیں''[النور:122]

اس آیت میں مالی امداد کی ترغیب کے ساتھ ساتھ رشتہ داوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کرنے کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

مالی امداد میں ان کو تحفہ تحائف پیش کرنا، ضرورت پر ان کو قرض دینا، حتی کہ ان کو صدقات اور زکوۃ دینا سب کچھ شامل ہے، زکوۃ دینے میں بھی غریب مستحق زکوۃ رشتہ داروں کو دوسرے پر مقدم رکھنا چاہیے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''مسکین پر صدقہ کرنا ایک اجر کا سبب ہے اور رشتہ داروں کو صدقہ دینا دوہرے اجر کا سبب ہوتا ہے، ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرے صلہ رحمی کا'' [مسند أحمد، حدیث نمبر:16226]

فقہاء نے ان رشتہ داروں میں ترتیب یہ بیان کی ہے کہ بھائی' بہن' پھر ان کی اولاد پھر چچا اور پھوپھی' پھر ماموں اور خالہ زکوہ کے زیادہ حقدار ہیں' اس کے بعد رشتہ داروں کا حق ہے۔

12.7.4 حق وراثت

مشرکین عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی بڑی اولاد کو اس کا مال مل جاتا، چھوٹی اولاد محروم کردی جاتی، اسی طرح عورتوں کا وراثت میں کوئی حصہ مقرر نہ تھا، اسلام نے اس طریقہ کو انصاف کے خلاف قرار دیا، اور قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا:

''اس مال میں سے مردوں کا حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ کر فوت ہو جائیں، اور اسی طرح عورتوں کا حصہ ہے جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر ہے'' [النساء:7]

دوسرے حقوق کی طرح وراثت کے معاملہ میں بھی درجہ بندی کی گئی ہے اور یہ اصول رکھا گیا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ نہیں مل پائے گا، اور اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ سب سے پہلے ان رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ دیا جاتا ہے جن کے متعینہ حصے قرآن مجید، حدیث رسول یا اجماع امت سے ثابت ہیں اور ان کو ''اصحاب فروض'' کہتے ہیں، ان میں چار مرد: (1) باپ (2) دادا اور پر تک (3) شوہر (4) اخیافی بھائی ہیں، اور آٹھ عورتیں: (1) اخیافی بہن (2) بیوی (3) بیٹی (4) پوتی (5) حقیقی بہن (6) علاتی بہن (7) ماں (7) دادی، نانی شامل ہیں، ان کے بعد ان رشتہ داروں کی باری آتی ہے جن کو قرآن وحدیث میں ترکہ کا مستحق تو قرار دیا گیا ہے لیکن ان کے حصے متعین نہیں کئے گئے ہیں اور جن کو ''عصبات'' کہتے ہیں، بلکہ اصحاب فروض کے معین حصے دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس کے وہ مستحق ہوتے ہیں، اور اصحاب فروض کی غیر موجودگی میں پورے ترکہ کے وارث قرار پاتے ہیں، ان کی بھی تین قسمیں ہیں (1) عصبہ بنفسہ (2) عصبہ بغیرہ (3) عصبہ مع غیرہ۔

(1) عصبہ بنفسہ سے مراد وہ مرد ہے جس کی میت سے قرابت میں عورت واسطہ نہ ہو، پھر اس عصبہ بنفسہ کے چار درجات ہیں:۔

(الف) میت کی اولاد ذکور یعنی بیٹا، پوتا، پر پوتا، نیچے تک

(ب) میت کے باپ، دادا، پردادا، اوپر تک

(ج) میت کے باپ کی اولاد ذکور یعنی بھائی، بھائی کا بیٹا، پوتا، نیچے تک

(د) میت کے دادا (اوپر تک) کی اولاد ذکور جیسے چچا اور اس کی اولاد (نیچے تک) یا اسی طرح میت کے باپ کا چچا اور اس چچا کی اولاد ذکور، یا میت کے دادا کا چچا اور اس چچا کی اولاد ذکور۔

(2) عصبہ بغیرہ سے مراد نصف اور دو تہائی پانے والی وہ چار اصحاب فروض عورتیں ہیں جو اپنے اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ ہو کر بھائی کا نصف پاتی ہیں، یعنی بیٹی، پوتی، حقیقی بہن، علاتی بہن۔

(3) عصبہ مع غیرہ سے مراد میت کی حقیقی یا علاتی بہنیں ہیں جو میت کی بیٹی، پوتی کے ساتھ عصبہ ہوجاتی ہیں، مذکورہ بالا تینوں قسموں کے عصبات میں سے قریب تر عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ اور دوہرے رشتہ والے عصبہ کی موجودگی میں اکہرے رشتہ کا عصبہ محروم ہوجائے گا۔

اس کے بعد ذوی الارحام کی باری آتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو اصحاب فروض میں ہیں نہ عصبہ میں، عصبات کی طرح ذوی الارحام کے بھی ترتیب وار چار درجات ہیں:

(1) میت کے وہ فروع جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں جیسے نواسہ و نواسی، بیٹے و پوتے کے نواسے و نواسی

(2) میت کے وہ اصول (باپ دادا اوپر تک) جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں مثلاً نانا، پرنانا، میت کی ماں کا نانا، دادا اور دادی، نانی۔

(3) میت کے بھائی بہن کی وہ اولاد جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں مثلا بھانجہ، بھانجی، بھتیجی اور پھر ان کی اولاد، اسی طرح اخیافی بھائی بہن کی اولاد

(4) میت کے دادا، دادی، نانا، نانی کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبہ نہ ہوں مثلاً پھوپھی، خالہ، ماموں، اخیافی چچا اور ان کی اولاد۔

عصبات کی طرح ذوی الارحام میں بھی اوپر کے درجہ کے ذوی الارحام کی موجودگی میں نیچے درجہ کے ذوی الارحام محروم ہوں گے۔

آپ اس تھوڑی سی تفصیل سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں کتنی وضاحت کے ساتھ وراثت کا قانون ذکر کیا گیا ہے، اس سے ہمیں رشتہ داروں کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی میت کے مال میں ان کا حصہ متعین ہے، اسی طرح رشتہ داروں کے درمیان مراتب کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے۔

12.7.5 دیگر حقوق

صلہ رحمی کا مطلب ہی یہی ہے کہ رشتہ داروں کو اپنے حسن سلوک، اچھے اخلاق، مالی تعاون وغیرہ میں خصوصی طور پر شامل رکھا جائے، بلکہ ان کو دوسروں پر مقدم رکھا جائے، علماء نے بعض اہم حقوق کی وضاحت بھی کی ہے: ابن ابی حمزہ کہتے ہیں: صلہ رحمی ضرورت کے وقت مال سے بھی ہوسکتی ہے، مصیبت کے وقت میں ہر قسم کی مدد سے بھی ہوسکتی ہے، اور عام حالات میں رشتہ داروں سے خندہ پیشانی سے ملنا اور ان کے لئے دعائے خیر کرنا بھی صلہ رحمی میں داخل ہے، امام قرطبی فرماتے ہیں: آپسی محبت، رواداری، خیر خواہی عدل وانصاف، رشتہ داروں سے متعلق واجب اور مستحب فرائض کی ادائیگی، ان پر خرچ کرنا، ان کی خبر گیری رکھنا، اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنا، یہ ساری چیزیں صلہ رحمی کے لئے ضروری ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض اور حقوق اس میں آتے ہیں، مثلاً گاہے گاہے ان سے ملاقات کا اہتمام، ایک ہی جگہ رہتے ہوں تو سلام میں پہل، محبت کا اظہار، ان کی ضیافت، ان کی دعوت قبول کرنا، ان کے آپسی تنازعات کو حل کرنے کی کوشش، اور ان سب سے بڑھ کر ان کو بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا؛ اسی لئے حضور ﷺ کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا گیا [الشعراء:214] اور اس پر عمل کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے ہر ایک کا نام لے لے کر کہہ دیا کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالو، اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔

خلاصہ یہ کہ رشتہ داروں تک ہر خیر کے پہنچانے اور برائیوں سے ان کو دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش سے صلہ رحمی کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

12.8 پڑوسیوں کے حقوق

12.8.1 پڑوسی کون ہے؟

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

''اور اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت داروں ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، پاس اٹھنے بیٹھنے والے مسافر اور غلام باندیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو'' [النساء:36]

اس آیت میں قرآن مجید نے تین قسمیں ذکر کی ہیں: 1. ''جار ذی القربی'' 2. ''جار الجنب'' 3. ''صاحب بالجنب''

''جار ذی القربی'' سے یا تو وہ پڑوسی مراد ہے جو مکان سے متصل ہو، اور اس کے مقابلہ ''جار الجنب'' سے وہ پڑوسی مراد ہے جو کچھ فاصلے پر رہتا ہو، یا ''جار ذی القربی'' سے ایسا پڑوسی مراد ہے جو رشتہ دار بھی ہو اور ''جار الجنب'' سے وہ پڑوسی جو پڑوس میں تو ہو رشتہ دار نہ ہو، ''صاحب الجنب'' یعنی وہ لوگ جو وقتی طور پر ساتھ رہتے ہوں، جیسے ایک سفر کے مسافر، ایک ہی تعلیمی ادارہ کے طلباء، ایک ہی کارخانہ کے ملازم، ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے، ایک ہی کاروبار میں شراکت رکھنے والے لوگ وغیرہ۔

اسلام نے پڑوسیوں کے سلسلہ میں مسلم غیر مسلم، رشتہ داروں اور غیر رشتہ دار میں کوئی فرق نہیں رکھا، ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، ہاں اگر پڑوسیوں کی ایک دوسرے اعتبار سے درجہ بندی کی جائے تو اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ ایک پڑوسی صرف پڑوسی ہوتا ہے دوسرا پڑوسی پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہوتا ہے، تیسرا پڑوسی پڑوسی اور مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ جو حیثیت اس تیسرے کی ہوگی دوسرے کی نہیں اور جو دوسرے کی ہوگی وہ پہلے کی نہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ:

''ان سے پڑوسی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''چالیس گھر آگے، چالیس گھر پیچھے، چالیس گھر دائیں طرف اور چالیس گھر بائیں طرف'' [الأدب المفرد: باب الأدنى فالأدنى من الجيران ،حدیث نمبر:159]

12.8.2 پڑوسیوں کا مقام اور ان کے ساتھ حسن سلوک

حضور ﷺ نے پڑوسیوں سے محبت اور ان کے اکرام کو ایمان کی علامت قرار دیا، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے'' [بخاری: باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ،حدیث نمبر:6018]

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے اس کو اللہ سے قربت کا ذریعہ قرار دیا، فرمایا:

’’اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہو اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہو‘‘[ترمذی:باب ما جاء في حق الجوار،حدیث نمبر:1944]

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے پڑوسیوں کو رشتہ داروں کے قریب قریب حسن سلوک اور حقوق کا مستحق قرار دیتے ہوئے فرمایا:

’’مجھے جبرئیل علیہ السلام پڑوسی کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ اسے وراثت میں شریک کردیں گے‘‘[بخاری: باب الوصاة بالجار، حدیث نمبر:6015]

اس حدیث میں حضور ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کی طرف سے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں اس قدر تاکید فرماتے رہے کہ اب مجھے گمان ہو چلا تھا کہ کہیں ان کو رشتہ داروں کی طرح ترکہ کا وارث قرار دے دیا جائے گا، اگر چہ ایسا نہ ہوا، لیکن اس سے پڑوسیوں کی غیر معمولی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

پڑوسیوں کو اپنی زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہ پہونچانا، ان کی خبر گیری کرنا، ان کی امداد کرنا، آڑے وقت ان کا ساتھ دینا، ان کو تحائف پیش کرنا یہ ساری چیزیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں داخل ہیں، سب سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ ایک شخص اپنے پڑوسی کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھے، حضور ﷺ نے فرمایا:

’’خدا کی قسم! وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا‘‘، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کون یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں‘‘[مسند أحمد، حدیث نمبر:7878]

دوسرے یہ کہ اپنے پڑوسی کی ضروریات کا خیال رکھے، حضور نے فرمایا:

’’وہ شخص مؤمن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے‘‘[الأدب المفرد: باب لا يشبع دون جاره ،حدیث نمبر:112]

حضور ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

’’اے ابوذر! جب شوربا پکایا کرو تو پانی بڑھادو، اور اس سے اپنے پڑوسیوں کی کو بھی بھیجو‘‘[مسلم: باب الوصية بالجار، حدیث نمبر:205]

عام طور پر کھانے پینے کی چیزیں عورتیں ہی بھیجتی ہیں، اس لئے عورتوں سے فرمایا:

’’اے مسلمان عورتو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے کسی چیز کو حقیر نہ سمجھے، اگر چہ بکری کی کُھر ہی کیوں نہ ہو‘‘[بخاری: كتاب الهبة وفضلها ، حدیث نمبر:2566]

آپ ﷺ نے تحفہ بھیجنے والی اور قبول کرنے والی دونوں عورتوں کے لئے نصیحت فرمائی کہ دونوں معمولی تحفہ کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ بھیجنے والے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے قبول کرلیں۔

اگر تمام پڑوسیوں کے ساتھ ممکن نہ ہو تو کم از کم جن کا دروازہ سب سے قریب ہو اس کے ساتھ احسان کرنا چاہیے' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ دریافت کیا:

''یارسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا: ''جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو''[بخاري : باب أي الجوار أقرب ،حدیث نمبر:2259]

اس طرح اگر دو گھروں کی درمیانی دیوار ایک ہو اور پڑوسی اس کا ایسا استعمال کرے کہ دوسرے پڑوسی کا معمولی نقصان ہو رہا ہو تو اسے برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ،ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی شخص اپنے پڑوسی کو دیوار میں لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے''[مسلم : باب غرز الخشب في جدار الجار ، حدیث نمبر:1609]

پڑوسی اگر غیر مسلم بھی ہو تو وہ ایک مسلمان کے حسن سلوک کا مستحق ہے:

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک بکری ذبح کی ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی پڑوسی کو بھی بھیجا؛ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے جبرئیل علیہ السلام ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے''[ابوداؤد:باب في حق الجوار ،حدیث نمبر: 5152]

پڑوسیوں کی نگہداشت اور ان کا خیال رکھنے کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ان کے یہاں کوئی حادثہ پیش آیا ہو، جب حضور ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو آپ نے فرمایا:

''جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا پکاؤ؛ چونکہ ان کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ آج وہ کچھ کام نہیں کر سکے''[ترمذی: باب ما جاء في الطعام يضع لأهل البيت ،حدیث نمبر:998]

اسی لئے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ میت کے گھر والوں کے لئے کم از کم ایک دن ایک رات ان کے لئے کھانا پکائیں ،اور اس کو مستحب کہا گیا ہے۔

پڑوسیوں کی عزت وناموس کی حفاظت

ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی سے دن رات کی قربت کی وجہ سے خیر کی زیادہ امید رکھتا ہے،اور اپنے مال اور عزت کے سلسلے میں وہ اس پر اعتماد بھی کرتا ہے،اس لئے اگر اس کی جانب سے کوئی تکلیف دہ بات پیش آئے تو حضور ﷺ نے اسے دس برائیوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے،آپ ﷺ نے فرمایا:

’’زنا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کہا ہے؛ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام، اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے‘‘[الأدب المفرد: باب حق الجوار ،حدیث نمبر:103]

12.8.3 حق شفعہ

اگر کوئی شخص اپنا مکان یا اپنی زمین بیچتا ہے تو اسلامی ادب یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے اس ساتھی سے پوچھ لے جو اس مکان یا زمین میں اس کا شریک ہے، اگر کوئی شخص نہ ہو تو اس شخص سے معلوم کرے جو اس گھر یا مکان کے فوائد اور حقوق مثلاً راستہ، نالی وغیرہ میں اس کا شریک ہو، اور اگر ایسا بھی کوئی شخص نہ ہو تو اپنے پڑوسی سے معلوم کر لے، حضور ﷺ نے فرمایا:

’’جس کے پاس کوئی زمین یا باغ ہو اسے اس وقت تک نہ بیچے جب تک اس کو اپنے شریک کے سامنے پیش نہ کرے‘‘[مسند أحمد، حدیث نمبر:14292]

اگر وہ کسی اور کو فروخت کرتا ہے تو ان تینوں حضرات میں سے ترتیب وار ایک کے بعد ایک کو حق ملتا ہے کہ جیسے ہی گھر یا زمین کی فروختگی کا اسے علم ہو وہ گھر بیچنے والے کے خلاف آواز اٹھائے اور قانونی چارہ جوئی کرے کہ میں اس فروخت شدہ جائیداد کو خریدنا چاہتا ہوں، یہ حق شفعہ ہے، پڑوسی بھی ان میں سے ایک ہے، اس سے بھی پڑوسی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

12.8.4 پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک اچھائی کا معیار

انسان کے اچھا ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس کو اچھا کہے وہ شخص جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، پڑوسی بھی قریب رہنے والوں میں ایک ہے:

’’ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا؟ فرمایا: ’’جب اپنے پڑوسی کو تم اپنے بارے میں اچھا کہتے سنو تو تم سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے ہوئے سنو تو تم سمجھو کہ برا کر رہے ہو‘‘[ابن ماجه : باب الثناء الحسن ،حدیث نمبر:4228]

دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتی تھی اور دن کو روزہ رکھتی، صدقہ و خیرات بھی کرتی؛ مگر زبان کی تیز تھی، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھی، لوگوں نے اس کا حال آپ ﷺ سے پوچھا: آپ ﷺ نے فرمایا:

’’اس میں کوئی نیکی نہیں، اس کو جہنم ملے گی، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسری عورت کا حال سنایا جو صرف نماز پڑھ لیتی اور معمولی صدقہ دے دیتی، مگر کسی کو ستاتی نہ تھی، آپ نے فرمایا: ’’عورت جنتی ہوگی‘‘ [الأدب المفرد : باب لا يؤذي جاره، حدیث نمبر:119]

معلومات کی جانچ

1. میاں بیوی کے باہمی حسن معاشرت پر روشنی ڈالئے۔

2. صلہ رحمی کی فضیلت بیان کیجئے۔

3. اسلام میں پڑوسیوں کا کیا مقام ہے؟ وضاحت سے لکھئے۔

12.9 جانوروں کے حقوق

12.9.1 جانور اسلام کی نظر میں

جانور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک حیرت انگیز نشانی ہے، قرآن وحدیث میں جانور اور اس کے حقوق کے بارے میں بے شمار تعلیمات دی گئی ہیں، قرآن کریم کی بہت سی سورتوں کے نام مختلف جانوروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں، مثلا: سورہ بقرہ (گائے، بیل)، سورہ انعام (پالتو جانور)، سورہ نحل (شہد کی مکھی)، سورہ نمل (چیونٹی)، سورہ عنکبوت (جالا کی مکڑی)، سورہ فیل (ہاتھی)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں جانوروں کے مقصد تخلیق کو بیان فرمایا ہے:

”وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ، وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ، وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ، وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ [النحل:8-5]

(اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی، وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے، اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں، وہ اور بہت سی چیزیں تمہارے فائدے کے لیے پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے)

احادیث میں بھی بعض جانوروں کی غیر معمولی افادیت اور ان کی قابل تعریف عادتوں کی بنیاد پر ان کا خاص ذکر آیا ہے، مثلا: گھوڑوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”گھوڑوں کی پیشانی سے قیامت تک کے لئے خیر کو وابستہ کر دیا گیا ہے“ [بخاری: باب الخيل معقود بنواصيها الخير ،حدیث نمبر:2849]

بعض روایتوں میں اونٹ اور بکری کا اضافہ ہے اور وہ اس طرح کہ اونٹ اپنے مالک کے لئے باعثِ عزت ہے اور بکری برکت ہے۔ (الجامع الصغير : باب الإبل عز لأهلها ،حدیث نمبر:4526]

ایک روایت میں مرغ کی تعریف کی گئی، آپ ﷺ نے فرمایا:

''مرغ کو برامت کہو؛ چونکہ وہ نماز کے لئے بیدار کرتا ہے''[ابو داؤد: باب ما جاء في الديك والبهائم، حدیث نمبر:5101]

اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے بارے میں اپنی قدرت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے:

''أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ''

(کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو، وہی ہر چیز کا نگہبان ہے''[الملک :19]

اوران جانوروں کی حیثیت اس طرح بھی بڑھادی کہ یہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں[الحج:18]، انسانوں کی طرح ان کی بھی امت ہے[الانعام : 38]ان کا رزق بھی اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔[العنکبوت:60] لیکن ان کو سلیقہ سکھایا کہ اللہ پر توکل کرتے ہیں اوراس کے بعد اسباب اختیار کرتے ہیں،حضور ﷺ نے فرمایا:

''اگر تم اللہ پر توکل کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے،صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام میں سیر ہوکر(اپنے گھونسلوں میں)واپس آتے ہیں''[ابن ماجہ:باب التوکل والیقین، حدیث نمبر:4164]

چونکہ انسان کے سامنے جانور بے بس ہیں اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان پرظلم کرے،اورظلم کرنے والے کرتے بھی ہیں؛اس لئے حضور ﷺ نے ان کے کچھ حقوق بیان فرمائے ہیں،ان میں چند درج ذیل ہیں:

12.9.2 جانوروں کا نفقہ

جو شخص پالتو جانور رکھتا ہو اس کی خوراک کا انتظام کرنا،اس پر واجب ہے،حضرت سہل بن حنظلہ ؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گذرے جس کی کمر اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی،آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان بے زبان مویشیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو،اچھی حالت میں ان پر سواری کرواوراچھی حالت میں ان کو کھاؤ''[أبو داؤد : باب ما يؤمر به من القيام على الدواب،حدیث نمبر:2548]

ایک روایت میں ہے کہ:

''ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں گئے،اس میں ایک اونٹ تھا جو آپ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اورا س کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے،آپ ﷺ اس کے پاس گئے اوراس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرااورفرمایا:'' یہ کس کا اونٹ ہے؟''ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا :یہ میرا ہے یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ فرمایا:''اس جانور کے بارے میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے،خدا سے نہیں ڈرتے،اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اوراس سے مسلسل کام لیتے ہو''[ابوداؤد،حدیث نمبر:2549]

رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کے بارے میں فرمایا:

''اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور وہ بندھی بندھی بھوک سے مرگئی، وہ عورت نہ تو اس کو غذا دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ خود زمینی کیڑوں سے اپنی غذا حاصل کرتی''

[بخاري : باب ما يقول بعد التكبير ،حدیث نمبر:745]

اس کے برخلاف حضور ﷺ نے ایک شخص کے ایک کتے کو پانی پلانے کے عمل کو اس کے لئے ذریعۂ نجات بتایا ہے۔

صحابہ ؓ نے دریافت کیا:

''کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر ذی حیات اور تر جگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے میں) ثواب ہے''[بخاری: باب الآبار علی الطريق ، حدیث نمبر:2466]

12.9.3 جانوروں کے آرام کا خیال

جانوروں کا ایک حق یہ ہے کہ ان سے کام لینے یا ان کی سواری کرنے کے بعد ان کو آرام کا وقت دیا جائے؛ چنانچہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ''[مسلم : باب مراعاة مصلحة الدواب ، حدیث نمبر:178]

تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارہ کی جو تکلیف راستہ میں ہوئی ہے، وہ اس سے جلد نجات پائے۔

12.9.4 جانوروں کو اذیت دینے کی ممانعت

جاہلیت میں ایک طریقہ یہ تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، حضور ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا، اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے۔[ترمذی: باب ماجاء في كراهية أكل المصبورة ، حدیث نمبر:1475] اس سے بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''زندہ جانور سے جو حصہ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے، اسے نہ کھاؤ''[ترمذی : باب ما جاء في قطع من الحي فهو ميت، حدیث نمبر:1480]

جانوروں کو آپس میں لڑانے سے بھی آپ نے منع فرمایا:

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مویشیوں کو آپس میں لڑانے سے منع فرمایا ہے''[ترمذی: باب ما جاء في كراهية التحريش، حدیث نمبر:1708]

اسی طرح جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔[ابو داؤد: باب النهي عن الوسم في الوجه، حدیث نمبر:2564]

12.9.5 ذبح کے وقت آسانی برتنے کی ہدایت

اسلام میں بلاضرورت کسی جانور کو قتل کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے (مستدرک حاکم) لیکن جن جانوروں کے شکار یا ذبح کی اجازت دی گئی ان کے شکار یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالی نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لئے جب کسی چیز کو جان سے ختم کرنا ہو تو اسے اچھے طریقے سے ختم کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو اور تم اپنی چھری کو اچھی طرح تیز کر لیا کرو اور ذبیحہ کو آرام دیا کرو''[مسلم : باب الأمر بإحسان الذبح، حدیث نمبر:1955]

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جانوروں کو دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر ذبح کرنے سے منع کیا گیا؛[نسائی: باب النهي عن الذبح بالظفر، حدیث نمبر:4403] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوگی۔

کسی جانور کو جلانے سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، ایک مرتبہ چیونٹیوں کی ایک جگہ پر آپ ﷺ کی نظر پڑی جس کو بعض لوگوں نے جلا دیا تھا، فرمایا:

> ''اس کو کس نے جلایا ہے؟ آپ ﷺ کے ساتھیوں نے کہا: ہم نے، فرمایا:'' آگ کے ذریعہ عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب یعنی اللہ تعالی کو ہی ہے''[ابو داؤد: باب في كراهية حرق العدو بالنار، حدیث نمبر:2673]

12.10 خلاصہ

اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ حقوق بندوں کی معافی کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اسلام نے ایک شخص کو اس کی مختلف حیثیتوں سے متعدد حقوق دیئے ہیں، انسان کے علاوہ جانوروں کے حقوق بھی متعین کئے ہیں، اسلام انسانی بنیاد پر ہر شخص کو زندگی گذارنے اور شخصی آزادی کو استعمال کرنے کا حق فراہم کرتا ہے؛ لیکن وہ اس کی آزادی کو اللہ کے حکموں کے تابع بناتا ہے اور اسی طرح وہ اس کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف ایک اللہ کی غلامی میں داخل کرتا ہے، اسلام انسانی بنیاد پر ہر ایک سے اچھا برتاؤ کرنے اور ہر ایک پر رحم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام یہ درس دیتا ہے کہ ہر ایک کے لئے وہی پسند کیا جائے جو خود انسان اپنے لئے پسند کرتا ہے اور ضرورت کے وقت ہر ایک کی مدد کی جائے، اس میں مسلمانوں کی تخصیص نہیں؛ بلکہ اسلام کی یہ ہدایات سب کے حق میں ہیں۔

اسلام نے والدین کے احترام، ان سے محبت، ان کی اطاعت، ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کا تاکیدی حکم دیا ہے، قرآن مجید میں تقریباً 12/آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے اور ان کے حکم پر اُف تک کہنے سے منع کیا

گیا ہے، بوڑھے والدین کی خدمت کو حضور ﷺ نے جہاد سے افضل قرار دیا ہے، حسن سلوک کے ساتھ ساتھ والدین کے نفقہ کی ذمہ داری بھی اولاد پر رکھی گئی ہے، شریعت میں ماں باپ دونوں کی خدمت و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؛ لیکن چوں کہ ماں فطری طور پر زیادہ کم زور اور حساس ہوتی ہے اور اس کی قربانیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں؛ اس لئے شریعت میں ماں کا حق زیادہ بتایا گیا ہے، ماں باپ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے حق میں دعائیں کی جائیں، اسی طرح والدین پر اولاد کے کچھ حقوق عائد کئے گئے ہیں، بطور خاص رضاعت اور حضانت کا حق، بچوں پر شفقت و محبت اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کا حق، ان کے نفقہ اور ان کی تعلیم و تربیت کا حق، ان سارے حقوق کی ادائیگی والدین پر واجب ہے، اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ والدین اور خصوصاً باپ اپنے بچوں کے لئے دعائیں کرتا رہے، بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت وغیرہ پر حضور اکرم ﷺ نے خصوصی اجر و ثواب کی خوشخبری سنائی ہے۔

زوجین کے حقوق کی تین جہتیں ہیں: (1) مشترکہ حقوق: جن میں حسن معاشرت، زینت اختیار کرنا، عبادت اور دینی کاموں میں تعاون باہمی، حق مباشرت اور میراث پانا داخل ہیں۔ (2) شوہر پر بیوی کے حقوق: جن میں مہر، نفقہ ورہائش اور عدل وغیرہ شامل ہیں۔ (3) بیوی پر شوہر کے حقوق: جن میں شوہر کی اطاعت اور گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت داخل ہے۔

اسلام نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا بار بار حکم دیا گیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، قرآن مجید نے رشتہ داروں کے مالی تعاون کی بڑی تاکید کی ہے، رشتہ داروں کو وراثت میں بھی حق دیا گیا ہے؛ البتہ اصول یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا، خندہ پیشانی کے ساتھ رشتہ داروں سے ملنا اور ان کے لئے دعاء خیر کرنا بھی صلہ رحمی میں داخل ہے۔

اسلام نے پڑوسیوں کے کچھ حقوق رکھے ہیں' حضرت جبرئیل علیہ السلام پیغمبر اسلام ﷺ کو پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی تاکید فرماتے تھے؛ حتی کہ ان کو گمان ہو چلا تھا کہ کہیں پڑوسیوں کو وراثت میں بھی حصہ نہ دے دیا جائے، پڑوسیوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کو حق شفعہ بھی دیا گیا ہے، اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کو اچھائی کا معیار قرار دیا گیا۔

اسلام میں نہ صرف انسانوں کے بلکہ جانوروں کے حقوق بھی بیان کئے گئے ہیں، جن میں اہم ترین حقوق یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس مصرف کے لئے بنایا ہے، ان کو اسی میں استعمال کیا جائے، ان کے کھانے پینے اور ان کے آرام کا خیال رکھا جائے، ان کو اذیت دینے اور خاص طور سے آگ کے ذریعہ سے سزا دینے پر سخت وعید آئی ہے اور ان کے ذبح میں بھی آسانی برتنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

12.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کے بارے میں دلائل کے ساتھ لکھئے۔

2. اولاد پر شفقت اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک پر ایک نوٹ لکھئے۔

3. پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت وفضیلت بیان کیجئے۔

4. جانوروں کے حقوق بیان کیجئے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1. والدین کے احترام اور ان سے محبت پر ایک نوٹ لکھئے۔

2. شوہر پر بیوی کے کیا حقوق ہیں؟ وضاحت سے لکھئے۔

3. صلہ رحمی کی فضیلت پر روشنی ڈالئے۔

4. رشتہ داروں کے حق وراثت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیجئے۔

12.12 فرہنگ

ازدواجی	:	نکاح سے متعلق۔
قرابت دار	:	رشتہ دار۔
متنوع	:	قسم قسم کا۔
توازن	:	دو چیزوں کا باہم ہم وزن ہونا۔
ضمانت لینا	:	ذمہ داری لینا۔
قصاص	:	خون کا عوض خون۔
جنین کُشی	:	پیٹ کے بچہ کو مار ڈالنا۔
جبرواکراہ	:	زوروزبردستی۔
کفارہ	:	شریعت میں گناہ یا خطا کا مقررہ عوض۔
کسب معاش	:	مال کمانا۔
شیرخوارگی	:	دودھ پینے کی عمر۔
ہبہ	:	ہدیہ، عطا، بخشش۔
ذی حیات	:	جاندار۔

12.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرۃ النبی ﷺ جلد ششم (اردو)	علامہ سید سلیمان ندویؒ
2. حقوق العباد (اردو)	عالم فقری
3. آداب زندگی (اردو)	مولانا یوسف اصلاحی
4. مجموعہ قوانین اسلامی (اردو)	مرتبہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
5. قاموس الفقہ (اردو)	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 13 : آدابِ زندگی

اکائی کے اجزاء

13.1 مقصد

13.2 تمہید

13.3 اخلاق

13.3.1 اخلاق کا مفہوم

13.3.2 اخلاق کی اہمیت

13.3.3 اسلامی اخلاق کی خصوصیات

13.4 باہمی تعاون

13.4.1 باہمی تعاون کا مفہوم

13.4.2 باہمی تعاون کا بنیادی اصول اور اس کی وسعت

13.4.3 انسانی بنیاد پر تعاون

13.4.4 ایمانی بنیاد پر تعاون

13.4.5 خانگی بنیاد پر تعاون

13.5 سچائی اور امانت کا وسیع تصور

13.5.1 اسلام میں سچائی کا تصور

13.5.2 زبان کی سچائی

13.5.3 دل کی سچائی

13.5.4 عمل کی سچائی

13.5.5 اسلام میں امانت کا وسیع تصور

13.5.6 امانت کی مختلف شکلیں

13.6 نصح وخیرخواہی

13.7 خدمت خلق

13.7.1 خدمت خلق کی اہمیت

13.7.2 فرد کی خدمت

13.7.3 عوامی خدمات

13.8 خلاصہ

13.9 نمونے کے امتحانی سوالات

13.10 فرہنگ

13.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

13.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ اخلاق کا مفہوم، اس کی اقسام، اخلاق کی اہمیت اور اسلام میں اخلاق کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں، اسی طرح اس اکائی میں آپ کو باہمی تعاون کے مفہوم، اس کے فوائد، اور اس کی بنیاد سے واقف کرایا جائے گا، آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ اسلام میں سچائی کی تین قسمیں ہیں: زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، اور امانت کا تصور بھی اسلام میں خاصا وسیع ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہیں، آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسلام میں نصح وخیرخواہی اور خدمت خلق کی کیا اہمیت اور اس کے کتنے فوائد اور فضائل ہیں۔

13.2 تمہید

اسلام نے انسانوں کو زندگی گذارنے کا ایک جامع اور مکمل دستور عطا کیا ہے، ہر شخص کو اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کرنے کی تعلیم دی ہے اور معاشرہ کے دیگر افراد کے ساتھ بھی، اور اس کو ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی ظلم سے روک دیا ہے اور کامیاب زندگی گذارنے کے لئے اس کو کچھ آداب بتائے ہیں، ان میں اہم ترین آداب حسن اخلاق، باہمی تعاون، سچائی، امانت، نصح وخیر وخواہی اور خدمت خلق ہیں، اخلاق سے خوشی ومسرت اور امن وامان کی فضا ہموار ہوتی ہے، باہمی تعاون سے زندگی کے مسائل آسانی سے حل ہوتے ہیں، سچائی اور امانت سے انسانی زندگی دھوکہ اور فریب سے محفوظ رہتی ہے، نصح وخیرخواہی کے جذبات سے خالق اور مخلوق دونوں کے حق میں وفاداری ظاہر ہوتی ہے اور ایک خیرخواہ انسان ہوسکتا ہے کسی کو کوئی مادی فائدہ نہ پہنچا سکے؛ لیکن اپنے جذبۂ خیرخواہی سے ہمیشہ دوسروں کے بارے میں نیک تمنائیں رکھتا ہے اور اپنے ضرر سے ہر ایک کو محفوظ رکھتا ہے، خدمت

خلق ایک شخص کے بندہ ہونے کی پہچان بھی ہے اور مخلوق خدا سے محبت کی دلیل بھی، یہ خیر خواہی کا اعلیٰ درجہ ہے، جس میں خیر خواہی کسی مفید عمل کی شکل میں سامنے آتی ہے، اگر ہر شخص میں فرد اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو کمزوری یا عدم استطاعت کی وجہ سے کسی کا کام نہ رکے اور ایک معتدل معاشرہ وجود میں آئیں۔

13.3 اخلاق

13.3.1 اخلاق کا مفہوم

اخلاق عربی زبان کا لفظ ہے، یہ خُلُق کی جمع ہیں، جس کے معنی عادت اور فطرت کے ہوتے ہیں، اہل علم کے مطابق اخلاق انسان کی باطنی صورت کو کہتے ہیں، چونکہ انسان کی دو صورتیں ہیں، ایک ظاہری صورت اور اس سے مراد وہ شکل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے، ظاہری شکل وصورت اچھی بھی ہوسکتی ہے بُری بھی، اسی طرح ایک باطنی صورت ہے، اور اس سے مراد نفس کی وہ حالت ہے جس سے بلاتکلف اچھے اور بُرے افعال صادر ہوتے ہیں، امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے: خَلق ظاہری صورت کو کہتے ہیں جس کو قوت بصارت سے پرکھا جاتا ہے، اور خُلق باطنی صورت کو کہتے ہیں جس کو جاننے کے لئے قوت بصیرت کی ضرورت ہے۔

انسان کے اندر خیر وشر دونوں طرح کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، اس سے ظاہر ہونے والے اخلاق بھی دونوں طرح کے ہوتے ہیں، اگر یہ اخلاق اچھے ہوں تو ان کو ''اخلاق حسنہ'' یا ''فضائل'' کہتے ہیں اور اگر بُرے ہوں تو ''اخلاق سیئہ'' یا ''رذائل'' کہتے ہیں، پھر یہ فضائل یا رذائل کسی کے اندر فطری طور پر ہوتے ہیں جیسا کہ حضور ﷺ نے حضرت اشج بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

> ''تمہارے اندر دو عادتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں: بردباری اور صبر وانتظار''، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ دونوں اخلاق میں نے اپنے اندر پیدا کئے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان کو میری فطرت میں رکھ دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''بلکہ یہ دونوں اخلاق اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر فطری طور پر رکھے ہیں''، وہ بول اٹھے: ساری تعریفیں اس اللہ کے لئے جس نے میرے اندر فطری طور پر دو ایسے اخلاق رکھ دیئے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں'' (أبو داؤد ، باب في قبلة الرجل، حدیث نمبر:5225)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق فطری بھی ہوتے ہیں، اور انہیں محنت اور توجہ سے انسان اپنے اندر پیدا بھی کرتا ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس نے صرف فضائل کو اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ رذائل سے اجتناب کی بھی تاکید کی ہے۔

13.3.2 اخلاق کی اہمیت

اسلام میں حسن اخلاق کو ایمان کے مکمل ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے، گویا یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں''(ترمذی، **باب ما جاء في حق المرأة على زوجها**،حدیث نمبر:1162)

قرآن مجید میں کامیاب ایمان والوں کی جو صفات ذکر کی گئیں ہیں، ان میں بھی اخلاق کی بعض قسموں کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق ایمان کی خصوصیات میں سے ہے، مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک حیا ہے''(**بخاری : باب أمور الإيمان**، حدیث نمبر:9)

ایک حدیث میں فرمایا:

''جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا! جس کو خدا اور اس کے رسول سے محبت ہو، جو دوسرے سے صرف خدا کے لئے محبت کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں ڈالے جانے سے''(**بخاري : باب حلاوة الإيمان**،حدیث نمبر:16)

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا:

''(بھوکوں کو) کھانا کھلانا، اور جانے انجانے ہر ایک کو سلام کرنا'' (**بخاري : باب إطعام من الإسلام**، حدیث نمبر:12)

ایک حدیث میں فرمایا:

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہے، اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں''(**ترمذي : باب ما جاء في أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده**، حدیث نمبر:2627)

یہ اور اس طرح کی بے شمار حدیثیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اخلاق کا ایمان سے راست تعلق ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

''بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے''(**بخاري : باب علامة المنافق**،حدیث نمبر:33)

اسلام میں نماز اور روزہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اچھے اخلاق کو بھی کبھی نماز پڑھنے والوں اور روزہ رکھنے والوں کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''انسان حسن اخلاق سے اس شخص کا درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر عبادت کرے''(**أبو داؤد : باب في حسن الخلق**،حدیث نمبر:4798)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اخلاق بھی عبادت ہے، اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''(**بخاری: باب صفة النبي ﷺ**، حدیث نمبر:3559)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

''(قیامت کی) ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی''(**أبو داؤد، باب في حسن الخلق**، حدیث نمبر:4799)

ایک حدیث میں ہے:

''اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''(**معجم کبیر للطبرانی، باب ما جاء في التداوی**، حدیث نمبر:471)

اس سے معلوم ہوا کہ حسن اخلاق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے، اور درحقیقت رسول کی محبت کا ذریعہ بھی یہی ہے، فرمایا:

''تم میں میرے سب سے محبوب اور آخرت میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں سب سے اچھے اخلاق والے ہیں اور مجھے ناپسند اور آخرت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بکواس کرنے والے، بدگو اور منکر بداخلاق (ہیں)''

اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تصور پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ اخلاق حسنہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات کا سایہ ہیں، اور اس کی کامل صفات کے ادنیٰ مظاہر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''حسن اخلاق اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے''(**المعجم الأوسط للطبرانی**، حدیث نمبر:8344)

13.3.3 اسلامی اخلاق کی خصوصیات

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے بعض پہلو وہ ہیں جن کی طرف کسی آسمانی شریعت میں یا کسی قانون میں رہنمائی نہیں کی گئی، اسلام نے جس طرح عقائد اور عبادات کی چھوٹی بڑی تفصیل بیان کی ہے، اخلاق کے سلسلہ میں بھی اس کی تعلیمات جامع اور مکمل ہیں، اور ان کی بہت سی خصوصیات ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

(1) اسلامی اخلاق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، انسانی زندگی کا سب سے بلند مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، اور جب ان اخلاقی تعلیمات کی تاکید اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہے تو گویا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد اور ان کا منشا یہی ہے، انسان اگر ان کو عمل میں لے آئے تو اللہ کی خوشنودی کا حاصل ہونا یقینی ہو جاتا ہے، اور اس طرح یہ اخلاقی قدریں ہر شخص کے لئے قابل عمل ہوتی ہیں، اس کا تعلق کسی زمانہ اور کسی علاقہ سے بھی ہو، چونکہ یہ رہنمائی اس ذات کی طرف سے ہے جس نے خود انسان کو پیدا کیا، اور پیدا کرنے والے سے بڑھ کر مخلوق کی ضرورتوں، تقاضوں، اور نفسیات سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔

(2) اسلامی اخلاق کی حیثیت صرف نظریہ کی نہیں، سراپا عمل کی ہے، انسانی زندگی کو اس سے آراستہ کرنا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

(3) اسلامی اخلاق کی تعلیمات میں انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔

(4) اسلامی اخلاق کا تعلق صرف ظاہر سے نہیں؛ بلکہ اس میں نیت اور مقصد کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

(5) اسلامی اخلاق کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، عقیدہ سے اس کا تعلق اس طرح ہے کہ تمام اعمال عقیدہ کی ہی میزان پر تولے جاتے ہیں؛ اس لئے ایک مسلمان کا عقیدہ بھی اسے اچھے اخلاق کو اختیار کرنے اور برے اخلاق سے خود کو بچانے کی ترغیب دیتا ہے، اخلاق کا تعلق شریعت سے بھی ہے، اور شریعت احکام کے مجموعہ کو کہتے ہیں، معاملات، معاشرتی زندگی اور پرسنل لا کے احکام بھی اخلاق سے مربوط ہیں، اور اسلام ان شعبوں میں قانون سے زیادہ اخلاقی تعلیمات سے کام لیتا ہے۔

(6) اسلامی اخلاق میں زندگی کے ہر شعبہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو شامل کرلیا گیا ہے، صرف اصولی ہدایات دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، سچ کی تعریف کے ساتھ ساتھ جھوٹ کی مذمت بھی کی گئی ہے، ایک کے فوائد تو دوسرے کے نقصانات بھی گنائے گئے ہیں، سخاوت کی ترغیب دی گئی تو بخل سے نفرت بھی دلائی گئی ہے، وعدوں کے پاس ولحاظ کا حکم دیا گیا تو وعدہ خلافی پر نکیر بھی کی گئی ہے، صرف یہ نہیں کہا گیا کہ نیکی کرو، اور نہ یہ کہ سب کے ساتھ نیکی کرو، بلکہ وضاحت کے ساتھ اس طرح رہنمائی کی گئی کہ والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں، مسافروں، مانگنے والوں، غریبوں، یتیموں، غلاموں اور قیدیوں سب کے ساتھ نیکی کرو، صرف قرآن مجید کا ذکر کیا جائے تو ان کی پندرہ سو سے زیادہ آیتیں اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہیں، یعنی ایک چوتھائی قرآن اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، احادیث اس کے علاوہ ہیں، احادیث کے مختلف ابواب اور عنوانات دیکھے جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی اخلاقی حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا جو داعی اسلام ﷺ کی تلقین میں نہ آیا ہو، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے صرف قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کی فہرست میں سوا سو سے زائد اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا ہے اور صرف بخاری، ترمذی ابوداؤد سے ایک سو چالیس سے بھی زائد اخلاقی تعلیمات کو شمار کروایا ہے۔

(7) ایسے اخلاق بھی بیان کئے گئے ہیں جن سے خود انسان کا اپنا ذاتی فائدہ ہے، جیسے مصیبتوں میں صبر، کاموں میں غور وفکر کی عادت، کاموں کو اچھی طرح انجام دینا، کسی کام کو جلدی نہ کرنا وغیرہ اور ان اخلاق کی فہرست تو بہت طویل ہے جن کا فائدہ دوسروں کو پہونچتا ہے، اور حقوق العباد ادا ہوتے ہیں۔

(8) اسلامی اخلاق عالمی نوعیت کے ہیں، یہ مسلمان اور غیر مسلم، عرب وعجم سب کے لئے ہیں، سودی معاملات مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ حرام، چوری، زنا اور ان جیسی برائیوں کا بھی یہی حال ہے، عدل مسلمان وغیر مسلم سب کے ساتھ واجب، ظلم مسلمان وغیر مسلم سب پر منع، اس طرح اسلامی اخلاق قبائلی، قومی اور مذہبی عصبیت سے پاک ہیں۔

(9) اسلامی اخلاق کی ایک بڑی خصوصیت اس کا توازن اور اعتدال ہے، وہ افراط وتفریط سے پاک ہے، اس میں جسم کی بھی رعایت ہے، روح کا بھی خیال، اس میں دنیا اور آخرت دونوں کے تقاضوں کا لحاظ ہے، اچھے اخلاق حقوق اور فرائض کے درمیان تقسیم ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جیسے فطرت انسانی کا لحاظ، افراد کے درمیان پائے جانے والے مزاج ومذاق اور صلاحیتوں کی رعایت کے اعتبار سے اخلاقی حکم، اسی طرح اخلاقیات کا مصلحتوں کے مطابق ہونا اور عام طور سے اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ان کے فوائد کو بیان کرنے کا اہتمام وغیرہ۔

13.4 باہمی تعاون

13.4.1 باہمی تعاون کا مفہوم

تعاون عربی کے لفظ ''عون'' سے بنا ہے، جس کے معنی مددگار کے ہیں، اس سے اعانت مدد کرنے کے معنی میں ہے، اور اسی سے تعاون ہے جس کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے، شریعت میں بھی تعاون کے معنی یہی ہیں؛ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تعاون حق کے معاملہ میں ہو اور اللہ کی رضا کے لئے ہو، باطل کے معاملہ میں تعاون ظلم ہے، اس طرح اسلام میں تعاون کی اصطلاحی تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ کار خیر، اللہ کی اطاعت اور گناہوں سے اجتناب میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

13.4.2 باہمی تعاون کا بنیادی اصول اور اس کی وسعت

اسلام نے مختلف بنیادوں پر باہمی تعاون کی ترغیب دی ہے اور اس سلسلہ میں ایک اصول متعین کر دیا ہے، قرآن مجید کی آیت ہے:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَان''[المائدة:2]

(جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو)۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ باہمی تعاون اللہ کا حکم ہے اور اس کی دو بنیادیں ہیں، ایک ''برّ'' اور دوسری ''تقویٰ''، برّ کے معنی نیکی، بھلائی اور ہر ایسا کام جس سے اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچتا ہو، ایک حدیث میں ہے:

''برّ خوش خلقی کا نام ہے''(مسلم : باب تفسير البر والإثم ،حدیث نمبر:2553)

اور تقویٰ کے معنی ہیں ایسا کام جس سے اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہو، اگر چہ راست طور پر اس کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو، اس حکم سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آرہی تھی کہ ایسے کاموں میں تعاون اسلام کے منشأ کے خلاف ہے، جن سے اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچتا ہو اور وہ اللہ کو ناپسند ہو؛ لیکن تاکید اور مزید وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ گناہ اور ظلم کے معاملہ میں کسی کا تعاون کرنا درست نہیں، گناہ کے لئے ''الإثم'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کی تعریف حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ

''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم یہ ناپسند کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے واقف ہوں''(مسلم، حدیث نمبر:2553)

اور ''عُـدْوَان'' کے معنی دوسروں کی حق تلفی اور ظلم کے ہیں، جس طرح پہلے دونوں کاموں کا کرنا قابل تعریف ہے، ان میں دوسروں کا تعاون بھی شریعت کا حکم ہے، اس کے برخلاف دوسرے دونوں کاموں کا کرنا بھی ممنوع ہے، اور ان میں دوسروں کا تعاون بھی ناپسندیدہ اور قابل گرفت ہے، پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب آپ ﷺ کو تسلی دی تھی اور یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا اور اس کے بعد اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ کے چند اوصاف ذکر کئے تھے، تو ان میں ایک وصف یہ بھی ذکر کیا تھا کہ آپ ﷺ حق کے معاملہ میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں (بخاری: باب أول ما بدئ به رسول الله ﷺ، حدیث نمبر: 6982) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعاون کی اصل بنیاد نیکی، بھلائی اور حق وصداقت ہے۔

اس آیت نے باہمی تعاون کا ایک وسیع تصور پیش کیا ہے، اگر خیر کا کوئی کام ہو تو خواہ وہ کام سماجی ہو یا معاشی، مذہبی ہو یا سیاسی، مسلمانوں کے تعاون کا مستحق ہے، تعاون کی ضرورت مسلمانوں کو ہو یا عام انسانوں کو، اپنوں کو ہو یا بیگانوں کو، تعاون کی ضرورت کسی انفرادی کام میں ہو یا اجتماعی کام میں۔

تعاون کے سلسلے میں یہ اصول بھی ذہن نشیں رہنا چاہئے کہ شریعت میں جو حکم اصل کام کا ہے وہی اس میں تعاون کا ہے، اگر وہ کام واجب ہے تو اس میں تعاون بھی واجب ہوگا اور اگر وہ کام مستحب ہے تو تعاون بھی مستحب ہوگا، حضور ﷺ نے فرمایا:

''خیر کی رہنمائی کرنے والا اس کارِ خیر کو انجام دینے والے کی طرح ہے'' (ابو داؤد: **باب في الدال على الخير**، حدیث نمبر: 5129)

13.4.3 انسانی بنیاد پر تعاون

تعاون کی سب سے بڑی بنیاد انسانیت ہے، ظلم کسی پر بھی ہو وہ ہمارے تعاون کا مستحق ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اگر مظلوم ہو تو اس کی مدد کریں گے، ظالم کی مدد کیسے کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ظلم سے اس کا ہاتھ روک دو، یہی اس کی مدد ہے'' (**بخاري: باب أعن أخاك ظالمًا أو مظلوما**، حدیث نمبر: 2443)

نبوت سے پہلے حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی؛ البتہ مختلف قبیلوں کے مخصوص طریقوں اور متعینہ دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے، اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا، چونکہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے قبیلہ کے افراد بھی نہ تھے؛ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ طاقت کے زور پر اپنا حق حاصل کر سکے، اس اجنبی شخص نے صحن کعبہ میں مکہ کے لوگوں کے سامنے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا ذکر کیا اور ان کے ضمیر سے انصاف مانگا، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے، اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا'' (**البداية والنهاية**: 2/291) یہ واقعہ مظلوم کی مدد کے لئے بھی دلیل فراہم کرتا ہے اور حضور ﷺ خواہش کہ اگر اب بھی مجھے کسی ایسے معاہدہ کے لئے بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا، اس بات کی دلیل ہے کہ انصاف پسند حکمرانوں کے ساتھ سیاسی تعاون بھی درست ہے، اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ''منکر'' کو روکنے کا حکم دیا گیا، منکر میں تمام برائیاں شامل ہیں، اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے اور ظلم کسی پر بھی ہو اسے روکنا اسلام کا حکم ہے، یہاں تک کہ انسانوں کے علاوہ اللہ کی دوسری مخلوقات پر بھی ظلم ہو تو وہ ممنوع ہے، اس کا روکنا اور روکنے میں تعاون کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح انسانی بنیاد پر معاشی اور مالی تعاون بھی درست ہے، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت (شرکتی کے ساتھ تجارتی معاملہ) کی ہے، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہوگئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ میں قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے، اور یہ رقم آپ نے سرداران قریش ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو بھیجی جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین کی قیادت کر رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی وجہ معلوم کی تو اس نے کہا کہ وہ جزیہ ادا کرتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا کہ ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر ہم تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے گھر میں بکری ذبح ہوئی، انہوں نے پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت فرمائی، واپسی پر دریافت فرمایا کہ کیا یہودی پڑوسی کو بھی اس میں سے بھیجا گیا ہے، جب جواب نہیں، ملا تو خاص طور پر ان کو بکرے کا گوشت بھیجا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا۔

چنانچہ فقہاء کا اس پر بھی قریب قریب اتفاق ہے کہ نفلی صدقات غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے۔

باہمی تعاون میں تعاون حاصل کرنا بھی شامل ہے، علم جیسی مقدس شے میں اسلام نے کسی تعصب سے کام نہیں لیا اور علم وحکمت کو مومن کی متاع گمشدہ قرار دیا (ترمذی: باب ما جاء في فضل النفقة على العبادة، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، حضور ﷺ نے ہجرت کے سفر میں ایک مشرک عبداللہ بن اریقط کو اپنا رہبر بنایا اور اس سے تعاون حاصل کیا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق وانصاف کے کاموں میں انسانیت کی بنیاد پر تعاون حاصل کرنا درست ہے، حضور ﷺ نے عام حکم فرمایا:

> ''جس کے پاس زائد سواری ہو تو وہ اس کو دیدے جس کے پاس کوئی سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد توشہ سفر ہو وہ اس کو دیدے جس کے پاس توشہ نہ ہو'' (ابو داؤد، باب في حقوق المال، حدیث نمبر: 1663)

یہ حکم بھی عام ہے، اسی طرح والدین، قرابت داروں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور ضرورت مندوں وغیرہ کی مدد کا حکم عام ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

13.4.4 ایمانی بنیاد پر تعاون

قرآن کریم میں ایمان والوں کو بھائی بھائی قرار دیا گیا ہے [الحجرات: 10] اور حضور ﷺ نے ایمان والوں کے اتحاد وتعاون کی مثال ایک جسم سے دی ہے کہ اگر اس کے کسی عضو میں بھی کوئی درد ہو تو پورا جسم بے خوابی اور بخار سے تڑپ اٹھے (بخاري: باب رحمة الناس والبهائم، حدیث نمبر: 6011) ایک اور حدیث میں آپ نے یہاں تک فرمایا:

''مومن مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے،اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے''(بخاری : باب تشبیک الأصابع في المسجد وغیرہ ،حدیث نمبر:481)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے،اس پر ظلم نہ کرے اور اس کو بے سہارا نہ چھوڑے، جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری فرمائی گا،کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عوض قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور فرمادے گا،اور جو کسی مسلمان کے عیب پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی فرمائیں گے''(بخاري : باب لا یظلم المسلم المسلم ،حدیث نمبر:2442)

ان احادیث میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں سے تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔

صحابہ ؓ حصول علم میں بھی ایک دوسرے کا تعاون کیا کرتے تھے،حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ''میں نے اپنے ایک انصاری پڑوسی سے یہ طئے کرلیا تھا کہ ہم دونوں باری باری مجلس رسول میں حاضر ہوا کریں گے، چنانچہ ایک دن وہ جاتا، ایک دن میں جاتا، جب میں جاتا تو آکر اس دن کی باتیں اس کو بتاتا،اور جب وہ جاتا تو وہ مجھے اس دن کی باتوں سے آگاہ کرتا''(بخاری:باب التناوب في العلم ،حدیث نمبر:87) حضور ﷺ نے افضل ترین کاموں کا ذکر فرمایا تو اس میں ایک کام یہ بھی ذکر فرمایا کہ''تم کسی ہنرمند کی مدد کردو، یا بے ہنر کا کام کردو''(مسلم : باب بیان کون للإیمان ،حدیث نمبر:84)

وقف اور زکوۃ کا اجتماعی نظام مسلمانوں کے باہمی تعاون کی ہی علامت ہے،مسلمانوں کے باہمی اجتماعی تعاون کا ایک نمونہ اسلام کا شورائی نظام بھی ہے۔

13.4.5 خانگی بنیاد پر تعاون

اسلام نے عام انسانوں اور عام مسلمانوں کے مقابلہ میں رشتہ داروں اور بالخصوص اپنے اہل خانہ کو خصوصی حقوق دینے کی تاکید کی ہے،اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو تعاون میں بھی مقدم رکھا جائے ، یہ تعاون جسمانی بھی ہوسکتا ہے اور مالی بھی،حضور ﷺ نے اشعری لوگوں کی تعریف فرمائی کہ

''جب کسی غزوہ میں ان کا زاد سفر ختم ہوجاتا ہے، یا مدینہ میں ان کا کھانا کم پڑجاتا ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، اس کو ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں اور ایک برتن سے برابر سرابر اسے آپس میں تقسیم کرتے ہیں''،آپ ﷺ نے فرمایا:''وہ مجھ سے ہیں میں ان سے ہوں''(بخاری:باب الشرکة في الطعام، حدیث نمبر:2486)

قرآن مجید میں جگہ جگہ والدین اور رشتہ داروں کے خصوصی حقوق بیان کئے گئے ہیں،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کو تعاون میں فوقیت دینا چاہئے ،حضور ﷺ اپنے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے،غلام بھی گھر میں رہتے ہیں،حضور ﷺ نے ان کے بارے میں بھی ہدایت فرمائی کہ:

''ان کو زیادہ کام نہ دیا جائے، اور اگر تم ان کو زیادہ کاموں کا مکلّف بناؤ تو ان کا تعاون کرو'' (**مسلم: باب إطعام المملوک مما یأکل**، حدیث نمبر: ؟؟؟)

اسلام میں نفقہ اور وراثت وغیرہ کا نظام کا بھی اسی خانگی تعاون کا حصہ ہے۔

معلومات کی جانچ

1. اخلاق کا مفہوم واضح کیجئے۔

2. باہمی تعاون کی مختلف بنیادیں بیان کیجئے۔

13.5 سچائی اور امانت کا وسیع تصور

13.5.1 اسلام میں سچائی کا تصور

عرف عام میں سچائی کے معنی سچ بولنے کے ہیں؛ لیکن اسلام نے اس کا بہت وسیع تصور دیا ہے اور اس طرح اس میں صرف قول کی سچائی نہیں، عمل کی سچائی بھی داخل ہوگئی ہے، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں اس کی چند قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں، بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری کے مقامات و مراتب میں سچائی؛ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے ان قسموں کو تین میں سمیٹ دیا ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، ان تینوں قسموں کے مطالعہ سے اس موضوع کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

13.5.2 زبان کی سچائی

زبان کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو بولا جائے سچ بولا جائے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور قول وقرار کو نبھانا بھی اس میں داخل ہے، اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کو بتاتا ہے، سورۂ احزاب کی ایک آیت میں ہے:

''لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ''[الأحزاب :24]

(تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے)

اس آیت میں صادق (سچے) کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچائی ایمان کی اور جھوٹ نفاق کی علامت ہے، اس حقیقت کو حضور ﷺ نے مختلف پیرایہ میں بیان فرمایا، ایک روایت میں ہے کہ

''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''ہوسکتا ہے''، پھر پوچھا: کیا بخیل ہوسکتا ہے؟ جواب دیا: ''ہوسکتا ہے''، پھر دریافت کیا: کیا جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''نہیں'' (**موطا مالک: باب ما جاء فی الصدق والکذب**، حدیث نمبر: 3630)

کئی صحابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے؛لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر نہیں''(**بیھقی: باب من کان منکشف الکذب**،حدیث نمبر:20827)

مطلب یہ ہے کہ مومن میں خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے تقاضے کے بالکل خلاف ہے، چنانچہ ایک جگہ یہ فرمایا:

''کسی بندہ کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ جھوٹ کو ہر طرح نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق میں بھی''(**مسند احمد**،حدیث نمبر:8630)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

'' جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جھگڑا کرے تو حق کے خلاف بات کہے''(**بخاری: باب علامة المنافق**،حدیث نمبر:34)

ان روایتوں سے یہ پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ سچ سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے،حضور ﷺ نے فرمایا:

''سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے،اور سچ بولتے بولتے وہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھ دیا جاتا ہے،اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ اللہ کے یہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے''(**مسلم : باب قبح الکذب وحسن الصدق**،حدیث نمبر:2607)

13.5.3 دل کی سچائی

سچ کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے وہ اخلاص کے ہم معنی ہوجاتی ہے، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہوسکتا ہے کہ وہ دل کی تہہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی؛لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالٰی نے فرمایا:''اور اللہ گواہ ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں''[**المنافقون**:1] یعنی اپنی گواہی میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو کہتے ہیں: ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دل میں کوئی اور غرض ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے:

’’قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص : ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے، اور علم والا اپنے علم، شہید اپنی جاں بازی اور دولتمند اپنی دولت کے کارنامے بیان کرے گا؛ لیکن ان کارناموں کو سن کر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ’’تم جھوٹ کہتے ہو، اور فرشتے بھی یہی کہیں گے‘‘ (**مسلم : باب من قاتل للریاء والسمعة**، حدیث نمبر :1905)

یہ کارنامے اگر چہ غلط طور پر بیان نہیں کئے گئے تھے ؛ لیکن چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے کارناموں کا حقیقی مقصد خدا کی خوشنودی نہ تھی ؛ بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھا جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں ۔

13.5.4 عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، اسے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلا ایک شخص نماز میں خشوع خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس کا مقصد صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے؛ لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بڑھ کر باریک ہے، اور وہ یہ کہ ایک شخص نمائش کے لئے ایسا نہیں کرتا؛ لیکن ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع خضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع خضوع نہیں ہے؛ اس لئے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں سچا نہیں، اس لئے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اس لئے جن مسلمانوں نے ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر (کسی طرح کا) شک نہیں کیا اور اللہ کے راستہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہیں‘‘ [**الحجرات :15**]

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہے، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کردی، پھر اس عمل کی سچائی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کمزوری یا پس و پیش نہ ہو، اس مرتبہ سے بڑھ کر عمل کی سچائی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول وقرار کے کرنے کا سچا و پکا عزم کیا جائے اس کو اس وقت پر پورا کر کے دکھایا جائے، حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انہوں نے یہ کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوہ اُحد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریبا اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، وعدہ کو پورا کرنے کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا:

’’مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے‘‘ [**الأحزاب:19**]

اور عمل کی سچائی کی سب سے اعلی مثال یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ، اس کا ہر عمل حق اور سچ میں بالکل ڈھل جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، فرمایا گیا:

''اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں''[الحدید :19]

اس سے مراد ایمان کامل اور اس کے مطابق عمل صالح کا اہتمام ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے اور جو مسلمان ان سارے معنوں میں سچا ہوتا ہے وہی کامل مومن ہوتا ہے۔

13.5.5 اسلام میں امانت کا وسیع تصور

عرف عام میں کسی کے پاس کوئی چیز حفاظت کے لئے رکھی جائے اور وہ اپنے سامان کی طرح اس کی حفاظت کرے اور اسی طرح اس کو واپس کر دے تو اس کو امانت کہتے ہیں، اسلامی تصور کے مطابق یہ امانت کی ایک قسم ہے، اس کے علاوہ امانت کے دائرہ میں اور بھی چیزیں آتی ہیں مثلاً کسی کا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ اسے وقت پر ادا کرے یہ بھی امانت ہے، کسی کے راز کو چھپانا بھی امانت ہے، مجلس کی بات کو مجلس تک محدود رکھنا بھی امانت ہے، کسی کو مشورہ دینا اور اس کے نجی مقصد کو لوگوں میں عام نہ کرنا بھی امانت ہے، کوئی کسی کام پر ملازم ہے تو نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اس کو انجام دینا بھی امانت ہے، اور امانت کے تعلق سے قرآن کا حکم یہ ہے:

''بے شک تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کردو''[النساء:58]

اسی لئے مفسرین کے نزدیک اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام تکلیف شرعی ہے، [الأحزاب:??] اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے، اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور وہ تمام امانتیں بھی داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

ابولبقاء کفوی نے لکھا ہے کہ ''ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کی ہے وہ امانت ہے، جیسے نماز، زکوۃ، قرض کی ادائیگی، اور ان میں سب سے زیادہ تاکیدی حکم ودیعت کا ہے یعنی وہ چیز جو بطور امانت کسی کے پاس رکھی جائے، اور رازوں کو چھپانا بھی امانت ہے''، کفوی کا ہی قول ہے: ''ہر وہ چیز جس کے سلسلے میں کسی پر اطمینان کیا جائے وہ خواہ مال ہو یا کوئی قابل احترام چیز یا راز امانت میں داخل ہے''۔

13.5.6 امانت کی مختلف شکلیں

کسی نے کسی کو کوئی چیز رکھنے کو دی یا سفر میں گواہ اور قرض کو لکھنے والا کوئی نہ ملا تو اس سے گروی رکھ کر اس سے قرض لیا یہ بھی امانت ہے، قرآن کا حکم ہے:

''تو جو امین بنایا گیا اسے چاہئے کہ امانت ادا کرلے اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے''[البقرة:283]

یعنی لے کر مکر نہ جائے ، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے ، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے ، جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے، اُن میں وہ بھی داخل ہیں جو امانتوں کو ادا کرتے ہیں ، اور وہ مسلمان جن کو اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، دونوں میں امانت داروں کو شامل فرمایا ہے، فرمایا:

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کا خیال کرتے ہیں''[المؤمنون:18،المعارج :32]

کسی ملازمت اور نوکری کو اس کی شرطوں کی رعایت کے ساتھ انجام دینا بھی امانت ہے، جس کام کے لئے کسی کو رکھا جائے اسے چاہئے کہ پوری دیانت داری سے اس کو ادا کرے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کام کرنے کا پابند بنایا گیا ہے وہ ایک دو گھنٹہ چھپے چوری بیکار بیٹھا رہے، یا اس کام کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور خود کو غلط طور پر اس کا اہل ثابت کر کے وہ کام حاصل کر لے تو چونکہ وہ حقیقت میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا امانت کے خلاف ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری نہیں مانگی، ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔[القصص:26] اس آیت میں سب سے بہتر ملازم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس سے مشورہ کیا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے(ترمذی: باب أن المستشار مؤتمن)

ایک حدیث میں ہے:

''جس نے اپنے بھائی کو یہ جانتے ہوئے کسی بات کا مشورہ دیا کہ اس کا فائدہ دوسری بات میں ہے تو اس نے خیانت کی''(ابوداؤد: باب في نقل الحديث ،حدیث نمبر:4869)

اسلام میں مجلسوں کو بھی امانت کی حفاظت عطا کی گئی ہے، چونکہ مجلس کی بات دوسری جگہ پہنچ کر بسا اوقات فتنہ کا سبب بنتی ہے، ہاں اگر اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے تو پھر اس بات کو عام کرنے کی اجازت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''مجلسیں امانت کے ساتھ ہوں، مگر تین موقعوں پر، کہیں کسی نے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبروریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو''(ابوداوٗد)

تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے(ابوداؤد، كتاب الأدب: باب ما يكره من ذكر الرجل ما يكون من إصابة أهله، حدیث نمبر:2174) راز کے یہی معنی ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر بتائے؛ بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، حضور ﷺ نے فرمایا:

’’جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر دیکھے (کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے) تو وہ بات بھی امانت ہوتی ہے‘‘(ابوداؤد: باب في نقل الحديث، حدیث نمبر:4868)

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالی کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے، حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا:

’’عورتوں کے سلسلہ میں خدا سے ڈرو‘‘ اور فرمایا: ’’کیوں کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے‘‘(ابو داؤد : باب في صفة حجة النبي ﷺ، حدیث نمبر:1905)۔

سچائی اور امانت سے متعلق ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سچائی اور امانت کا کتنا وسیع تصور دیا ہے، اور جھوٹ اور خیانت کی کیسی حوصلہ شکنی کی ہے؛ بلکہ حضور ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

’’جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں‘‘(مصنف ابن أبي شيبة : باب ما قالوا في صفة الإيمان ، حدیث نمبر:30320)

13.6 نصح وخیر خواہی

عربی میں خیر خواہی کے لئے ’’النصحية‘‘ اور ’’النصح‘‘ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، نصیحت ’’غش‘‘ (دھوکہ) کی ضد ہے، اس میں خلوص اور سچائی کا مفہوم پوشیدہ ہے، اسی سے ’’توبة نصوح‘‘ بنا ہے یعنی ایسی توبہ جو بالکل خالص اور سچی ہو، جس میں کوئی کمی اور کمزوری نہ ہو، نصیحت میں ہر وہ قول وفعل داخل ہے جس سے کسی کا فائدہ مقصود ہو، جرجانی کے نزدیک ہر قسم کی بھلائی کی دعوت اور فساد سے روکنا نصیحت ہے۔

نصح وخیر خواہی افراد اور قوم دونوں کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، نصیحت امت کی عمارت کی بنیاد ہے، قرآن وحدیث میں نصح وخیر خواہی کا تاکیدی حکم آیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں سب سے جامع حدیث حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

’’دین خیر خواہی کا نام ہے‘‘، یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! خیر خواہی کس کے لئے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے لئے، اس کی کتاب کے لئے، اسکے رسول کے لئے، مسلمانوں کے اماموں کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے‘‘(مسلم: باب بيان أن الدين النصيحة ، حدیث نمبر:55)

یہ حدیث وضاحت کر رہی ہے کہ دین کی بنیاد اور اس کا لب لباب نصح وخیر خواہی ہے، یہ باقی تو امت میں دین باقی اور اگر یہ مفقود ہو تو زندگی کے تمام شعبوں میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ انبیاء کرام کا معاملہ اپنی قوموں کے ساتھ نصح وخیر خواہی پر مبنی ہوتا تھا، حضرت نوح علیہ السام نے اپنی قوم سے فرمایا:

"تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے" [الأعراف :62]

نصح وخیر خواہی کی قسمیں

بنیادی طور پر نصح وخیر خواہی کی پانچ قسمیں ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کی گئی حدیث میں آپ نے دیکھا۔

اللہ کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے ، اس کی تصدیق کی جائے ، اس کی تمام صفات کمال وجلال کا اعتراف کیا جائے ، ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے اس کی بندگی کا حق ادا کیا جائے ، انسان اپنی زندگی میں ہر وقت اس کی طرف رجوع ہو، توبہ واستغفار کا اہتمام کرتا ہو، چونکہ اس سے نافرمانی ہوتی رہتی ہے اور نافرمانی کی تلافی توبہ واستغفار سے ہی ہوتی ہے، توبہ کے بارے میں قرآنی حکم یہ ہے:

اللہ کی کتاب "قرآن مجید" کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے ، اس میں غور وفکر اور تدبر سے کام لیا جائے ، اس کے الفاظ ومعانی کو سیکھا جائے ، اس کے احکامات وتعلیمات پر خود بھی عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دی جائے اور انہیں کے مطابق اپنے آپسی معاملہ میں فیصلہ کیا جائے۔

اللہ کے رسول کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے ، ان سے محبت کی جائے ، اور محبت میں ان کو اپنی جان ، اپنے مال اور اپنے بال بچوں پر مقدم رکھا جائے ، حضور ﷺ نے فرمایا:

"تم میں کوئی اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں" (بخاری : باب حب الرسول ﷺ من الإیمان ، حدیث نمبر:15)

ان کی اطاعت کی جائے ، دین کے اصول وفروع میں ان کی اتباع کی جائے ، ان کی سنتوں کا احترام کیا جائے ، اللہ کے علاوہ ہر ایک کے قول پر ان کے قول کو ترجیح دی جائے ، دل وجان سے ان کی توقیر وتعظیم کی جائے ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے نبی (ﷺ)! ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کردینے والا بنا کر بھیجا ہے؛ تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس کا ساتھ دو، اس کی تعظیم وتوقیر کرو" [الفتح:8]

آپ ﷺ کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کو عام کیا جائے ، آپ ﷺ کے دوستوں سے محبت اور آپ ﷺ کے دشمنوں سے دشمنی اور نفرت رکھی جائے ، آپ ﷺ کی عزت وکرامت کا دفاع کیا جائے ، آل بیت اور صحابۂ کرام ﷢ سے محبت رکھی جائے ، آپ ﷺ پر درود وسلام کا اہتمام کیا جائے۔

اس آیت میں ان تینوں قسم کی خیر خواہی کا ذکر آ گیا ہے:

''ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''[التوبة:91]

ائمہ مسلمین سے مراد مسلم ریاست کے امراء اور علماء دونوں ہیں، ان کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی بات مانی جائے اور ان کی اطاعت کی جائے، حضور ﷺ نے کئی احادیث میں سمع وطاعت کی تعلیم دی ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے، ہاں اس کے لئے یہ شرط ضرور رکھی ہے کہ ''إنما الطاعة في المعروف''(بخاری: حدیث نمبر:7145)اطاعت ایسی چیزوں میں ہوگی جو اللہ کے حکموں کے مطابق ہو، اگر حاکم کے کسی حکم سے اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو پھر اس کی بات نہیں مانی جائے گی، یہ اللہ کے ساتھ نصح وخیر خواہی ہوگی۔

اسلام میں عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی بھی خصوصی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر حدیث میں آیا ہے، ایک دوسری حدیث میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوۃ دینے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی''(بخاری:)

اس سے نصح وخیر خوہی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ نماز وزکوۃ کے ساتھ ساتھ اس پر بھی بیعت ہوتی تھی، ایک حدیث میں مسلمانوں کے دوسرے مسلمانوں پر چھ حقوق بتائے گئے ہیں، انہیں میں ایک حق یہ بھی ہے کہ

''اگر وہ تمہاری خیر خواہی کا محتاج ہو تو تم اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرو''(مسلم: باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، حدیث نمبر:2162)

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، جو کچھ اپنے لئے پسند کیا جائے ان کے لئے پسند کیا جائے، ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے، کارِ خیر میں ان کا تعاون کیا جائے، ان کو اذیت دینے سے بچا جائے، ان کے لئے دعائیں کی جائیں اور ان کو حق وصبر کی تلقین کی جائے۔

خیر خواہی کی دیگر قسمیں

قرآن مجید میں انبیاء کرام کی اپنی قوم کے ساتھ جس نصح وخیر خواہی کا اوپر ذکر آیا، ظاہر ہے اس میں تمام انسانوں کی بھلائی شامل ہوتی تھی، ایک حدیث کے اندر نصیحت کے لفظ سے مذکورہ پانچ قسموں کا ذکر آیا ہے؛ لیکن اسلام نے حقوق کی ادائیگی اور حسن اخلاق کی تعلیم دے کر اس خیر خواہی کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے، جب انسان کا تعلق دنیا کی ہر چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی خیر خواہی بھی ہر شے کے ساتھ ہونی چاہئے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع صرف نہ کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشو ونما کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ دی جائے، اور ان کے آرام کا خیال رکھا جائے اور عام انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے، اور خود انسان کے لئے اپنے ساتھ بھی خیر خواہی ضروری ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور پر کام لیا جائے، اپنی صحت اور صحت عامہ کی حفاظت میں بحیثیت شہری حکومت کے ساتھ خیر خواہی کرے اور اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس سے خیر عام ہو اور شر کا خاتمہ ہو۔

معلومات کی جانچ

1. اسلام میں سچائی کا تصور کیا ہے؟

2. اسلام میں امانت کا تصور کیا ہے؟

3. خیر خواہی کا اسلام میں کیا مفہوم ہے؟

13.7 خدمت خلق

13.7.1 خدمت خلق کی اہمیت

خدمت سے انسان کو راحت پہنچتی ہے، اس کے کام آسان ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، خدمت کی بعض قسمیں تو وہ ہیں جن کے ذریعہ ہم اپنے ذمہ واجب حقوق ادا کرتے ہیں اور بعض وہ خدمات ہیں جو ہم رضا کارانہ طور پر انجام دیتے ہیں، خدمت خلق کا دائرہ بہت وسیع ہے، افراد کی خدمت بھی خدمت خلق ہے، اور عوامی اور رفاہی خدمات بھی خدمت خلق میں شامل ہیں، جو سینکڑوں لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور ان کا فیض تا دیر قائم رہتا ہے۔

خدمت خلق بھی اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا حصہ ہے، اور معاشرہ میں زندگی گذارنے کا ایک فطری تقاضہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے کمزور کو طاقتور کی، غریب کو امیر کی اور جاہل کو عالم کی خدمت کا محتاج بنایا ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ طاقتور، امیر یا عالم کمزوروں، غریبوں اور بے پڑھے لکھے لوگوں کی خدمات سے بے نیاز ہیں، زندگی میں ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے دوسروں سے مربوط کر دی ہے اور کامیاب انسان وہ ہے جو دوسروں کی ضرورت کے وقت ان کی خدمت کے لئے ایسا ہی بے قرار ہو جائے جس طرح اس وقت ہوتا ہے جب کسی پریشانی میں دوسروں کی خدمت کا محتاج ہوتا ہے۔

خدمت خلق سے حقوق العباد کی ادائیگی اور ان کی راحت رسانی کا کام تو ہوتا ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سامان بھی ہوتا ہے، اور اس طرح خدمت عبادت بن جاتی ہے، ایک حدیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ خدمت خلق خود اللہ تعالیٰ کی خدمت ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

> ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا؛ لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی، انسان گھبرا کر عرض کرے گا، اے میرے رب! تو سارے جہاں کا پروردگار، تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے؛ لیکن اس کے باوجود تو اس کی عیادت کے لئے نہیں گیا، اگر تو اسکے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا: اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے

کھانا طلب کیا تھا؛لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا، اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا، اسی طرح عرض کرے گا: اے دو جہاں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا؟ اور میں تجھے کیسے پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا؛لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کردیا تھا، اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی، آج اس کا ثواب یہاں پاتا''(**مسلم :باب فضل عيادة المريض**،حدیث نمبر:2569)

اور کچھ سعادت مند وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خدمت کے لئے منتخب فرماتا ہے، جب تک ان کی خدمت جاری رہتی ہے، اللہ کا فیضان جاری رہتا ہے، اور جب وہ خدمت خلق چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نعمتوں سے محروم کر کے دوسروں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے اور ان کے لئے اسباب مہیا فرماتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''بیشک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کو بندوں کے فائدے کے لئے خاص طور سے اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دی ہیں، جب تک وہ ان کو خرچ کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان میں ان نعمتوں کو باقی رکھتا ہے، جب وہ بخشش روک دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے نعمتوں کو چھین لیتا ہے اور دوسروں کو عطا کردیتا ہے(**المعجم الأوسط للطبراني**،حدیث نمبر:5162)

سورۂ دہر کی آیات 8 سے 22 تک ان لوگوں کے لئے اللہ کی رضا، جنت کی نعمتوں اور اس کی آسائشوں کا تذکرہ ہے جو مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

خدمت خلق کے بہت سے راستے ہیں، کسی کو ذاتی طور پر مادی منفعت پہنچانا ہی خدمت نہیں ہے، اپنے علم و تجربہ سے کسی کو فائدہ پہنچانا، کسی کو اچھا مشورہ دینا، کسی کی دینی رہنمائی کرنا، کسی راہ گیر کو راستہ بتانا اور کسی نابینا کی دستگیری کرنا اور س کے سڑک عبور کرنے میں مدد دینا، عوامی خدمات کے کام مثلاً مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنا، راستہ کی مرمت، پانی کے ذرائع کا انتظام، بجلی کی فراہمی یہ سب خدمت خلق میں شامل ہیں۔

اس طرح ہم یہاں اس کی دو قسمیں کرتے ہیں، فردی خدمت، عوامی اور اجتماعی خدمت، حضور ﷺ نے فرمایا:

''بھلا ہو اس شخص کا جس کو اللہ تعالیٰ نے خیر کا دروازہ کھولنے اور شر کا دروازہ بند کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور برا ہو اس شخص کا جس کو اللہ نے شر کا دروازہ کھولنے اور خیر کا دروازہ بند کرنے کا ذریعہ بنایا ہے'' (**ابن ماجه : باب من كان مفتاح للخير**،حدیث نمبر:238)

13.7.2 فردی خدمت

انفرادی پیمانہ پر دیکھا جائے تو والدین، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق کی بحسن خوبی ادائیگی اور ان کے حق سے بڑھ کر ان کا خیال بھی خدمت خلق میں داخل ہے اور مانگنے والوں کو دینا بھی خدمت خلق ہے؛لیکن کمزوروں کی دیکھ بھال اور ان کے لئے تگ و دو، ڈھونڈ کر ان کی مدد اور پھر مسلسل ان کے لئے کوشش اور محنت خدمت خلق کا اعلی درجہ ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''بیواؤں اور مسکینوں کے لئے سعی کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا رات میں قیام کرنے والے، دن میں روزہ رکھنے والے کے مانند ہے''(بخاری: باب فضل النفقة على الأهل، حدیث نمبر:5353)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: سعی کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو ان کی معاش کے لئے دوڑ دھوپ کرے اور ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے محنت ومشقت کرے۔

انسانوں میں ایک کمزور وجود یتیم کا بھی ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک وقتی طور پر کرنا بھی خدمت خلق ہے؛ لیکن اس کے وسیع تقاضے اسی وقت پورے ہوں گے جب کہ ایک مدت تک اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا (رشتہ دار ہو) یا کسی دوسرے کا اور میں وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے''، امام مالک نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کرکے بتایا''(مسلم : باب الإحسان إلى الأرملة، حدیث نمبر:2983)

اس حدیث میں کفالت کا لفظ بڑا اہم ہے، اس میں اس کی پرورش بھی داخل ہے اور تعلیم وتربیت بھی، اور معاشی انتظام بھی، امام نوویؒ نے لکھا ہے: یہ فضیلت اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جو یتیم کی دیکھ بھال خود یتیم کے مال سے ہی کرے۔

عادت کے مطابق خدمت کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا؛ لیکن اچانک بغیر کسی تیاری کے کوئی تقاضا آجائے تو اس وقت انسان کی سخاوت اور ایثار کا امتحان ہوتا ہے، ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! مجھے بھوک لگی ہے، حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کو خبر بھجوائی؛ لیکن ان کے یہاں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی، تو حضور ﷺ نے اعلان فرمایا: ''ہے کوئی جو آج رات اس کی ضیافت کرے، اللہ اس پر رحم فرمائے، ایک انصاری صحابی کھڑے ہوئے، انہوں نے کہا: میں ہوں یارسول اللہ! وہ اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی سے کہا: اللہ کے رسول کے مہمان آئے ہیں، ان سے بچا کر کچھ نہ رکھو، انہوں نے کہا: بخدا صرف بچوں کا کھانا بچا ہے، فرمایا: جب بچے رات کا کھانا مانگیں تو ان کو سلادینا، اور آکر چراغ بجھا دینا، آج رات ہم بھوکے رہیں گے، ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا، دوسرے دن صبح یہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو فلاں میاں بیوی کے کارنامہ پر تعجب ہوا یا ہنسی آئی، اور اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی:

" وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ " [الحشر : 9]

(اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گرچہ وہ خود تنگی میں ہوں)

ایک روایت میں ہے کہ یہ صحابی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

" لَن تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" [آل عمران : 92]

(تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو)

تو عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اپنا پسندیدہ مال خرچ کرو، میرا پسندیدہ مال میرا باغ ''بیرحاءٗ'' ہے، یہ اللہ کے لئے صدقہ ہے، آپ جہاں چاہیں اسے صرف کردیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نفع بخش مال ہے، اسے اپنے رشتہ داروں پر صرف کریں'' انہوں نے کہا: یارسول اللہ! یہ آپ انہیں دے دیں، آپ ﷺ نے حضرت ابوطلحہ کے رشتہ داروں و چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردیا'' (**بخاری: باب الزكاة على الأقارب**، حدیث نمبر: 1461)

13.7.3 عوامی خدمات

خدمت کی ضرورت جس طرح ایک فرد کو ہوسکتی ہے، اس جیسے بہت سے انسانوں کو ہوسکتی ہے، اس لئے اسلام نے معاشرتی خدمات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مومن کے مرنے کے بعد بھی اس کے جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں، وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی (کیوں کہ اس کو نیکی کی راہ پر لگانے میں اس کی کوششوں کا بھی دخل تھا)، قرآن شریف جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا، جو مسجد اس نے بنوائی یا مسافروں کے لئے کوئی مکان جو اس نے تعمیر کرایا، یا نہر جو اس نے کھودوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا، اس کا ثواب اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا'' (**ابن ماجه : باب ثواب معلم الناس الخير**، حدیث نمبر: 242)

اس حدیث میں رفاہ عام کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے، اور انہیں صدقات جاریہ قرار دیا گیا ہے، ان میں مسافروں کے لئے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں پیسہ صرف کرنا بہترین صدقہ ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''صدقات میں بہتر صدقہ یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خیمہ کا سایہ فراہم کیا جائے'' (**ترمذی: باب ما جاء في فضل الخدمة في سبيل الله**، حدیث نمبر: 1627)

پانی زندگی بنیادی ضرورت ہے، آج کے ترقی یافتہ دور میں ضرورت کے مطابق صاف پانی کی فراہمی بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہوسکتا ہے جس میں بندگان خدا کے لئے نہر کی تعمیر کو صدقۂ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کونسا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پانی''؛ چنانچہ انہوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوایا'' (**ابوداؤد: باب فی فضل سقی الماء**، حدیث نمبر: 1681)

بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور اس میں مدد دینا بھی ایک رفاہی خدمت ہے، اس سے مجموعی طور پر پوری قوم اور ملک کو فائدہ پہنچتا ہے، حکومت خود بھی غیر آباد زمینوں کو آباد کر کے اس کی آمدنی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا سکتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ اسے آباد کرنا چاہیں انہیں اس کی اجازت دی جائے اور آسانیاں فراہم کی جائیں، اسلام نے اسے کار ثواب بتایا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا اس کو اس کا اجر ملے گا، اس سے ضرورت مند مخلوق (انسان، جانور، پرندے وغیرہ) جو کچھ کھائے وہ سب اس کی طرف سے صدقہ ہے''(**جامع معمر بن راشد : باب ما أصيب من أرض الرجل** ،حدیث نمبر:19689)(اس کا اجر ملے گا)۔

غذا اور صحت و تندرستی کے نقطۂ نظر سے شجر کاری کی اہمیت بھی واضح ہے، ان سے صاف ستھری اور تازہ ہوا ملتی ہے، وہ ٹھنڈا اور فرحت بخش سایہ فراہم کرتے ہیں، بہت سے درختوں کے پھلوں اور پتوں میں انسانوں اور جانوروں کی غذا اور علاج ہے، زمین کی آبادکاری میں درخت لگانا اور باغات کا تیار کرنا بھی آتا ہے، اسلام نے اس کی خصوصی فضیلت بیان کی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''اگر کوئی شخص درخت لگائے اور اس کے پھل سے آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے حق میں ایک صدقہ ہے''(**مسند احمد**،حدیث نمبر:27506)

مسجد اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں؛ لیکن دور اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں، حضور ﷺ نے فرمایا:

''جس نے کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا گھر جنت میں بنائے گا''(**ابن ماجه : باب من بنى لله مسجدا** ،حدیث نمبر:736)

اسلام میں وقف کو بھی غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اس سے اللہ کی عبادت کے لئے مسجد اور عیدگاہیں، تربیت و تعلیم کے لئے مدرسے اور جامعات، تدفین کے لئے قبرستان بنائے جا سکتے ہیں اور اس سے دیگر رفاہی کام بھی کر سکتے ہیں۔

مسجد نبوی کی زمین آپ ﷺ نے دونو جوانوں سہل اور سہیل سے لے کر مسجد کے لئے وقف کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اشارے پر چار ہزار دینار میں ایک کنواں ''بئر رومہ'' اس کے یہودی مالک سے خرید کر وقف کیا۔

شریعت میں رفاہی کاموں کے لئے وقف خدمت خلق کا بہت نفع بخش اور دیرپا ذریعہ ہے، اس کی اصل محفوظ رہتی ہے، اور اس کی منفعت ان لوگوں کے کام آتی رہتی ہے، اس طرح اسلام نے بڑے پیمانے پر خدمت خلق کی تاکید کی ہے اور اس کے اصول بتائے ہیں، جن کے لئے وہ وقف کیا گیا ہو۔

13.8 خلاصہ

اخلاق ایک باطنی صورت ہے، اور اس سے مراد نفس کی وہ حالت ہے، جس سے بلا تکلف اچھے اور بُرے اعمال صادر ہوتے

ہیں، اگر اخلاق اچھے ہوں تو ان کو ''اخلاق حسنہ'' یا ''فضائل'' کہتے ہیں اور بُرے ہوں تو ''اخلاق سیئہ'' یا ''رذائل'' کہتے ہیں، اس دنیا کو حسن اخلاق کی ضرورت ہے؛ چوں کہ دنیا کی ہر خوشی اور امن وامان اسی اخلاق کی بدولت ہے، اسلام نے اخلاق کے شعبہ میں جامع اور مکمل رہنمائی کی ہے، اسلام میں حسن اخلاق کو ایمان کے مکمل ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اسلامی اخلاق کی حیثیت نظریہ اور فلسفہ کی نہیں، سراپا عمل کی ہے، اور اخلاقی کی تعلیمات میں انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔

اسلام میں باہمی تعاون کی بنیاد ''برّ وتقویٰ'' ہے، ایسے کاموں میں تعاون سے منع کیا گیا ہے جن کا تعلق گناہ اور ظلم سے ہے، باہمی تعاون ایک معاشرتی ضرورت ہے، تعاون کچھ انسانی بنیادوں پر ہوگا، کبھی ایمانی بنیادوں پر اور کبھی خانگی اور خاندانی بنیادوں پر۔

اسلام نے سچائی اور امانت کا وسیع تصور دیا ہے، سچائی کا تعلق صرف زبان سے نہیں، دل اور عمل سے بھی ہے، دل کی سچائی کو ''اخلاص'' کہتے ہیں اور عمل کی سچائی کو ''عمل صالح''، اسی طرح امانت کا تصور ہے، کسی کے پاس کوئی چیز رکھی جائے، وہ اس کی اپنے سامان کی طرح حفاظت کرے اور ہو بہو اس کو مالک کے حوالہ کردے، یہ بھی امانت ہے؛ لیکن صرف یہی امانت نہیں، ملازمت کو اس کی شرطوں کے ساتھ انجام دینا بھی امانت ہے، کسی کو صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، راز کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہے، میاں بیوی کے تعلقات بھی امانت میں داخل ہیں۔

اسلام میں نصح وخیر خواہی سے مراد ہر وہ قول وفعل ہے جس سے کسی کا فائدہ مقصود ہو، اسلام نے اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب، اس کے رسول، ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے ساتھ خصوصی خیر خواہی کی تعلیم دی ہے اور بالعموم پوری انسانیت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کی تاکید کی ہے، اس کے علاوہ قرآن وحدیث میں اللہ کی بنائی ہوئی ہر چیز کے ساتھ مختلف انداز میں نصح وخیر خواہی کی ترغیب دی گئی ہے، اور کہیں اس کو تاکیدی حکم کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اسلام نے خدمت خلق کا بھی جامع تصور پیش کیا ہے، انفرادی پیمانہ پر دیکھا جائے تو والدین، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق کی اچھی طرح ادائیگی بھی خدمت خلق میں داخل ہے؛ لیکن کمزوروں کی دیکھ بھال اور ان کے لئے تگ ودو، ڈھونڈ کر ان کی مدد خدمت خلق کا اعلیٰ درجہ ہے، اسلام نے معاشرتی خدمات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے؛ اس لئے اسلام میں وقف کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے، مسجدوں، مدرسوں اور قبرستانوں کی تعمیر بھی اس اعتبار سے خدمت خلق ہے کہ ان سے اجتماعی فائدہ مربوط ہے، سرائے خانہ کی تعمیر، خیموں کے سائے فراہم کرنا، صاف پانی کی فراہمی کے لئے آبی وسائل کا انتظام، بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا اور خلق خدا کے فائدہ کے لئے شجر کاری یہ ساری چیزیں خدمت کی مختلف شکلیں ہیں۔

13.9 نمونہ کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. اسلام میں اخلاق کی کیا اہمیت ہے؟ بیان کیجئے۔

2. باہمی تعاون کے بنیادی اصول اور اس کی وسعت پر روشنی ڈالئے۔

3. عمل کی سچائی سے کیا مراد ہے؟

4. فرد کی خدمت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اسلامی اخلاق کا مفہوم بیان کیجئے۔

2. انسانی بنیاد پر تعاون کا کیا مطلب ہے؟

3. اسلام میں امانت کی مختلف شکلیں کیا کیا ہیں؟

4. اسلام میں عوامی خدمات کی کیا کیا صورتیں ہیں؟

13.10 فرہنگ الفاظ

صادر ہونا	:	نکلنا، ظاہر ہونا۔
آلودگی	:	ناپاکی، گندگی، گنہگاری۔
وحدہ لاشریک لہ	:	وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔
سرچشمہ	:	سوتا، پانی کے نکلنے کی جگہ، مجازاً کسی بھی چیز کے نکلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔
منشأ	:	ارادہ، مقصد
نظریہ	:	تھیوری، اصول۔
میزان	:	ترازو
اخلاقیات	:	تعلیم و تربیت کا وہ حصہ جس کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔
افراط و تفریط	:	کمی بیشی، غیر معتدل حالت۔
ناگزیر	:	ضروری۔
لبیک کہنا	:	فوراً قبول کرنا۔
متاع گمشدہ	:	کھوئی ہوئی چیز ۔
بہ نفس نفیس	:	اپنی ذات سے۔

خندق	:	کھائی، گڑھا۔
حَواری	:	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔
جاں بازی	:	دلیری، بہادری۔
مفقود	:	کھویا ہوا، غائب۔
رفاہ عام	:	عام لوگوں کی بھلائی۔

13.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرۃ النبی جلد ششم (اردو) علامہ سید سلیمان ندوی
2. دین رحمت (اردو) مولانا شاہ معین الدین ندوی
3. اسلام میں خدمت خلق کا تصور مولانا سید جلال الدین عمری
4. امانت کا قرآنی تصور مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

بلاک:4 سیرت نبوی ﷺ

فہرست

اکائی نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
14.	سیرت کی تدوین	279-303
15.	سیرت نبوی (مکی دور)	304-333
16.	سیرت نبوی (مدنی دور)	334-365
17.	سیرت نبوی بحیثیت اسوہ حسنہ	366-383

اکائی 14 : سیرت کی تدوین

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

14.2 تمہید

14.3 سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

14.4 عربی زبان میں سیرت نگاری

14.5 اردو زبان میں سیرت نگاری

14.6 سیرت نگاری عصر حاضر میں

14.7 خلاصہ

14.8 نمونے کے امتحانی سوالات

14.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

14.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ پیغمبر انسانیت آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی کے ہر ہر پہلو کو محفوظ رکھنے کے لیے متقدمین ومتاخرین، علما واصحاب قلم نے کس قدر محنت کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ سیرت نگاری مختلف زمانوں میں کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی اکیسویں صدی میں داخل ہوئی ہے۔ اس اکائی کو پڑھ کر آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ سیرت نبوی پر مختلف زبانوں میں اتنی زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کتابوں کی حتمی اور مکمل فہرست سازی کا دعوی کرنا آسان نہیں ہوگا اس لئے کہ ماضی میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کے متعلق ہمارے پاس معلومات محفوظ نہیں ہیں اس پر مستزاد یہ کہ کتب سیرت نبوی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

14.2 تمہید

اس اکائی میں سیرت نگاری کے مختلف ارتقائی مراحل کا جائزہ پیش کیا جائے گا اور ہر عہد کی اہم ترین کتب سے متعارف کراتے ہوئے اہم کتابوں کی ایک فہرست بھی پیش کی جائے گی۔ اس بات کی وضاحت کی جائے گی کہ سیرت نبوی کو محفوظ کرنے کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ وہ کن کن مراحل سے گزری ہے؟ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو محفوظ کرنے

کے لیے متقدمین ومتاخرین علماء وفضلاء نے کس قدر جانفشانی سے کام لیا ہے اور کس قدر محنت ومشقت برداشت کی ہے؟ اسی کے ساتھ عربی اور اردو زبان میں لکھی جانے والی اہم ترین کتب کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

14.3 سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

نبی کریم ﷺ سے عقیدت ومحبت، اسلام کو زندہ وجاوید بنانے کا جذبہ متعدد علوم وفنون کا سرچشمہ بنا جن میں فن سیرت نگاری بھی شامل ہے۔ آپ ﷺ سے محبت وعقیدت کا فطری تقاضا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی حیات مقدسہ، آپ ﷺ کے اخلاق، اور اقوال وافعال کو تفصیل کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لیے اسوہ ونمونہ بن سکے اور قرآن کریم کے فرمان ﴿لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة﴾ ''رسول اللہ کی سیرت میں تمہارے لیے بہتر نمونہ ہے'' کی ہر زمانہ میں عملی تفسیر بن جائے۔

سیرت کے لغوی واصطلاحی معنی

''سیرۃ'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع ''سیر'' ہے۔ اس لفظ کا مادہ ''س ی ر'' ہے اور سار، یسیر، سیرا و مسیرا سے ماخوذ ومشتق ہے۔ اہل لغت نے اس کے کئی معانی ومفاہیم بیان کیے ہیں جیسے چال چلن، چلنا پھرنا، روش، ہیئت وحالت، شکل وصورت، طریقہ ومذہب، سنت، کردار، کہانی و پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان وغیرہ۔

لفظ ''سیرت'' کے مذکورہ معانی ومفاہیم عمومی ہیں۔ بعد میں اس کے معانی ومفاہیم مخصوص ہوتے چلے گئے چنانچہ اولیں مرحلہ میں اس لفظ سے آنحضرت ﷺ کے مغازی مراد لیے گئے۔ بعد میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اس سے مراد آپ ﷺ کا وہ رویہ لیا گیا جو آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جنگ اور صلح میں روا رکھا تھا اور آخری مرحلہ میں اس لفظ سے مراد آپ ﷺ کی پوری زندگی اور تمام حالات کو بیان کرنا لیا گیا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق اصطلاحی طور سے '' آنحضرت ﷺ کے واقعات زندگی (سوانح) پر ہوتا رہا اور اب بھی اس کا خصوصی مفہوم یہی ہے''۔

لفظ ''سیرت'' آپ ﷺ کے حالات زندگی کو بیان کرنے کے لیے مخصوص ہوگیا ہے۔ دیگر اشخاص واکابرین کے حالات زندگی پر لکھی جانے والی کتب کو عام طور سے سوانح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لفظ ''سیرت'' کسی اور کے حالات زندگی کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً ہر زمانہ میں مذکورہ لفظ آپ ﷺ کے علاوہ دیگر افراد کے حالات زندگی کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے جیسے ''سیرت معاویہ''، ''سیرت عنترہ''، ''سیر الملوک''، ''سیرت سیف بن ذی یزن''، ''سیرت صلاح الدین ایوبی'' اور ''سیرت عائشہؓ'' وغیرہ۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے لفظ ''سیرت'' بسا اوقات دیگر اکابرین کے حالات زندگی کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جو اس لفظ کی توسیعی صورت ہے۔ لیکن عام طور سے اس سے مراد ''سیرت نبوی'' ہی لی جاتی ہے جو اس لفظ کی مخصوص صورت ہے۔

آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کے لیے لفظ ''سیرت'' کا استعمال سب سے پہلے ابن ہشام (م 213ھ) نے کیا تھا کہ انھوں نے جب ابن اسحاق (م 151ھ) کی کتاب کو حذف واضافہ کے ساتھ مرتب کیا تو اسے ''هذا كتاب سيرة رسول الله ﷺ''

(یہ کتاب سیرت رسول اللہ ﷺ ہے) کہہ کر متعارف کرایا۔ابتدائی زمانہ میں عربی زبان میں لکھی جانے والی غالباً یہ واحد کتاب ہے جسے'' کتاب سیرۃ رسول اللہ ﷺ '' سے موسوم کیا گیا ہے۔جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا' اولین عہد کی کتابوں کو عام طور سے مغازی کے نام سے بیان کیا جاتا ہے جب کہ بعد میں لکھی جانے والی کتب کو ان کے مصنفین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف ناموں سے موسوم کیا جن میں کبھی لفظ'' سیرت'' کا استعمال کیا جاتا تھا اور کبھی نہیں کیا جاتا تھا۔بیسویں صدی میں لکھی جانے والی متعدد کتب میں لفظ'' سیرت'' اس کے نام کا بنیادی عنصر قرار دیا گیا چنانچہ بہت سی کتابیں صرف'' السیرۃ النبویۃ '' کے نام سے ہی شائع ہوئی ہیں۔

فن سیرت نگاری کا آغاز اور اس کے اسباب

آنحضرت ﷺ چونکہ آخری پیغمبر تھے اور آپ ﷺ کو رہتی دنیا تک لیے تمام انسانوں کے لیے اسوہ ونمونہ بنا کر پیش کیا گیا تھا لہذا آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کے ایک ایک پل اور لمحہ کو محفوظ کرنے کا سامان بھی فراہم کیا گیا چنانچہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ آپ ﷺ ہر زمانہ میں پوری انسانیت کے لیے نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا آپ ﷺ کی تمام تر زندگی کو محفوظ کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔آپ ﷺ کے معمولات زندگی اور طرز معاشرت کی مکمل پیروی کو عین ایمان قرار دیا گیا جو فن سیرت نگاری کے وجود پذیر ہونے کا سب سے بنیادی اور اہم سبب ہے۔اس مقدس فن کی تدوین کے پیچھے ان کا یہی جذبہ کارفرما تھا کہ آپ ﷺ کے حالات زندگی سے بعد میں آنے والوں کو متعارف کرایا جائے تا کہ وہ آپ ﷺ کے اسوہ پر عمل کر کے دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوسکیں۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ'' آنحضرت ﷺ کے شمائل واخلاق وعادات سے متعلق احادیث ہی کو سیرت کہتے ہیں''۔واقعہ یہ کہ دونوں الگ الگ فن ہیں اور دونوں کے مقام ومرتبہ میں بھی فرق ہے کہ فن حدیث کے مقابلہ میں فن سیرت کا درجہ کسی قدر کم ہے حتی کہ بسا اوقات اصحاب حدیث اور اصحاب سیر کو دو الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کا مخالف گروہ قرار دیا جاتا ہے۔

فن حدیث میں بکھری ہوئی روایات سیرت کے باوجود فن سیرت کو الگ سے مدون کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اول الذکر فن میں روایات سیرت بغیر کسی ترتیب کے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں جس سے آپ ﷺ کی ذات گرامی کی مکمل شکل ابھر کر سامنے نہیں آتی تھی لہذا ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ آپ ﷺ کی ذات گرامی کی مکمل شکل کو اجاگر کرنے کے لیے فن سیرت کی بنیاد پڑی اور اصحاب سیر نے کتب حدیث میں بکھری ہوئی روایات کی مدد سے آپ ﷺ کے مکمل احوال وکوائف مرتب کیے تا کہ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بعد میں آنے والی نسلوں کو متعارف کرایا جا سکے۔

مستشرقین کا یہ اعتراض بالکل بیجا ہے کہ عربوں کے پرانے طریقۂ مفاخرت کی پیروی کرتے ہوئے دراصل سیرت کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کے غزوات کو فخریہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔حالانکہ سیرت نبوی کے پروان چڑھانے میں سب سے بنیادی کردار آپ ﷺ کے'' اسوۂ حسنہ'' نے ادا کیا ہے چنانچہ قرآن کریم نے آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کو سب کے لیے قابل تقلید اور مثالی نمونہ قرار دیا جس کے نتیجہ میں امت اسلامیہ نے آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ہر گوشے کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جن میں غزوات بھی شامل ہیں لہذا مغربی مصنفین کا آپ ﷺ کو صرف سپہ سالار کی شکل میں پیش کرنا درست نہیں ہے۔

فن سیرت نبوی سے مسلمانوں کے شغف کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔فن سیرت نگاری کے جائزہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اس کے ابتدائی نقوش عہد صحابہ میں مرتب ہوئے اس فن کے خدوخال کو واضح کرنے اور اس کے گیسوسنوارنے میں وہ صحابہؓ کرامؓ بھی شامل تھے جن کی مبارک آنکھوں نے آنحضرت ﷺ کے رخ روشن کا دیدار کیا تھا اور وہ آپ ﷺ کے معمولات زندگی کے چشم دید گواہ تھے۔لہذا ان کا فرمایا ہوا مستند قرار پایا کہ ان کی فراہم کردہ بنیادوں پر ہی بعد کے سیرت نگاران اپنی نگارشات کی تعمیر کرتے رہے ہیں۔

پہلی صدی ہجری ہی میں آپ ﷺ کے احوال زندگی سینوں میں محفوظ کئے جانے لگے، پھر وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے عہد اموی میں اس مرحلہ میں داخل ہوگئے کہ انھیں کتابوں کے قالب میں ڈھالا جانے لگا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مغازی کی طرف خاص توجہ کی۔ان کے حکم سے عاصم بن عمر بن قتادہ (م 121ھ) نے مسجد دمشق میں مغازی ومناقب کا درس دینا شروع کیا۔اس زمانہ میں ابن شہاب زہریؒ (م 124ھ) نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی۔ان کے زیراثر اس فن کا ذوق لوگوں میں عام ہوا چنانچہ اس زمانہ کے بہت سے لوگ ''أصحاب المغازی'' کے لقب سے ملقب کیے جانے لگے۔

عہد اموی سے اس کا جو مبارک سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے۔پندرہ صدیوں پر محیط اور مختلف زبانوں پر مشتمل یہ ذخیرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کی فہرست سازی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کیونکہ ماضی میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کے متعلق ہمارے پاس معلومات محفوظ نہیں ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ کتب سیرت نبوی کے ذخیرہ میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔یہ اضافہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ایک تسلسل کے ساتھ جاری وساری ہے۔

سیرت نبوی کے ذخیرہ میں ہر زمانے کے اصحاب قلم نے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔انھوں نے سیرت وحیات نبوی کے ہر ہر پہلو کو اتنے اہتمام سے محفوظ اور قلم بند کیا ہے کہ اس کی جزوی تفصیل بھی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ان کے مقابلہ میں دوسری اقوام وملل کے افراد اپنے مذہبی قائدین کی زندگی کا عشرعشیر بھی محفوظ نہ رکھ سکے بقول علامہ شبلی (1857-1914) ''مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات وواقعات کے ایک ایک حرف کو اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہوسکے اور نہ آئندہ کیے جاسکتے ہیں''۔

14.4 عربی زبان میں سیرت نگاری

سیرت نبوی کے موضوع پر لکھی جانے والی عربی کتب کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے ایک معتد بہ حصہ منظر عام پر آچکا ہے جب کہ بہت سی کتب ابھی تک منظر عام پر آنے کے انتظار میں دنیا کی مختلف لائبریریوں کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔نہ جانے کتنی ایسی کتابیں ہیں جن کا ذکر ہمیں سیرت نبوی کے مختلف مصادر میں ملتا ہے لیکن وہ اس وقت ہماری موجودہ معلومات کے مطابق ناپید ومفقود ہیں۔ان مفقود مصادر کی فہرست بھی خاصی طویل ہے مذکورہ عہد میں لکھی جانے والی اکثر کتب سیرت زمانہ کی دست وبرد کا شکار ہوگئیں اور صرف ان کے نام ہی تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

کتب حدیث کی طرح کتب سیرت ومغازی کی باقاعدہ ابتداء بھی اگر چہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م 101ھ) کے زمانے میں ہوئی تھی لیکن اس کے ابتدائی نقوش اس عہد سے پہلے بھی ملتے ہیں۔اولین کتب سیرت کے باقاعدہ مؤلفین مثلاً محمد بن اسحاق اور ان کے معاصرین سے پہلے بھی تابعین اور تبع تابعین میں بعض ایسے علماء کے نام ملتے ہیں جنھوں نے مغازی وسیر کے مجموعے تالیف کیے تھے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ مجموعے ہم تک نہیں پہنچ سکے لیکن ان کے حوالے بعد کی تالیف کی جانے والی کتب سیرت ومغازی میں جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

ابتدائی عہد کے سیرت نگاروں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا طبقہ: عروہ بن زبیر(م 94ھ)،ابان بن عثمان (م 105ھ)،وہب بن منبہ (م 110ھ)اور شرحبیل بن سعد (م 123ھ) وغیرہ۔

دوسرا طبقہ: ابن شہاب زہری (م 124ھ)،عاصم بن عمر بن قتادہ (م 130ھ)اور عبداللہ بن ابوبکر بن حزم (م 135ھ)وغیرہ۔

تیسرا طبقہ: موسیٰ بن عقبہ(م 141ھ)معمر بن راشد(م 150ھ)محمد بن اسحاق (م 151ھ)اور واقدی (م 207ھ)وغیرہ۔

مذکورہ بالا مؤلفین میں سے صرف سیرت ابن اسحاق اور مغازی واقدی ہم تک یوں پہنچی ہیں کہ اول الذکر کی تہذیب ابن ہشام نے کی تھی جسے اصل کتاب سیرت مان لیا گیا ہے۔سیرت ابن اسحاق بروایت یونس بن بکیر کو ابھی حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر سہیل زکار نے اپنے قیمتی مقدمات کے ساتھ شائع کیا ہے۔

عہد صحابہ میں ہی تدوین احادیث کا کام شروع ہو چکا تھا،بعض صحابۂ کرام نے اپنے اپنے صحیفے مرتب کر لیے تھے لیکن چونکہ اس وقت علوم کی تقسیم نہیں ہوئی تھی لہذا انھوں نے اپنے اپنے صحیفوں میں ہر قسم کی احادیث کو اکٹھا کر لیا تاہم وہ اپنی مجالس میں ان کی تعلیم الگ الگ موضوع کی حیثیت سے دیتے تھے جیسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ضمن میں ملتا ہے کہ انھوں نے اس وقت کے مروجہ علوم میں سے ہر علم کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا تھا۔ان علوم میں فن مغازی بھی شامل تھا۔ان مخصوص مجالس کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس نظر نہیں آتی کہ بعض افراد نے انھیں قلم بند بھی کر لیا ہو۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سیرت نبوی کے اولین مصنفین میں سے سب کے سب اعلیٰ درجہ کے محدث تھے اور انھوں نے احادیث نبوی کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی۔سیرت نبوی کے موضوع پر موجود کتب کی اگر موضوعاتی تقسیم کی جائے تو اسے دو بنیادی زمروں- نثری کتب سیرت اور منظوم کتب سیرت- میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ سیرت نبوی کا اکثر سرمایہ نثر میں ہی ہے۔

سیرت نبوی پر موجود نثری سرمایہ کی موضوعاتی تقسیم یوں جاسکتی ہے:

1. مستقل کتب سیرت اور ان کی شرحیں جیسے سیرت ابن اسحاق،سیرت ابن ہشام،کتاب المغازی از واقدی،الروض الأنف،شرح سیرت ابن ہشام از سہیلی اور نور النبراس في شرح سیرة ابن سید الناس'' از سبط ابن عجمی وغیرہ۔
2. متعلقات کتب سیرت یا سیرت نبوی کے خاص پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی کتب سیرت جیسے دلائل نبوت،علامات نبوت،معجزات نبوی،نسب رسول،آباء واجداد نبوی،اسماء رسول اللہ،عصر رسول اور ہجرت نبوی ﷺ وغیرہ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں۔

3. تاریخ وطبقات کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب جیسے طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ یعقوبی اور انساب الاشراف وغیرہ میں سیرت نبوی کا مواد۔

ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے اپنی کتاب "**معجم ما ألف عن رسول الله** ﷺ" میں سیرت نبوی کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو کئی ایک زمروں میں تقسیم کیا ہے اور ہر زمرہ میں کئی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔اس کتاب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو سیرت نبوی ﷺ سے کس قدر شغف و والہانہ محبت تھی۔

حسب ذیل سطور میں متقدمین ومتاخرین کی فن سیرت کی اہم ترین کتب کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

1. **کتاب المغازی عروہ بن زبیر:** عروہ بن زبیر موجودہ معلومات کے مطابق سیرت نبوی کی اولین کتاب ہونے کا شرف مغازی عروہ بن زبیر کو حاصل ہے۔عروہ بن زبیر (23-94ھ) کا شماران تین کبار تابعین میں ہوتا ہے جنھوں نے سیرت نبوی کو مرتب ومدون کر کے بعد میں آنے والے مؤلفین سیرت کی راہیں ہموار کردی تھیں۔ابن اسحاق، واقدی اور طبری نے ان سے خاص طور سے ہجرت حبشہ ومدینہ اور غزوہ بدر کے ضمن میں کثرت سے روایات لی ہیں۔

عروہ بن زبیر کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ان کا خاندانی پس منظر بہت ہی اعلی وارفع ہے کہ وہ حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ جیسے والدین کی اولاد تھے۔ان کی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ تھیں۔اس خاندانی حسب ونسب کی وجہ سے انھیں سیرت نبوی سے متعلق تمام معلومات تقریباً براہ راست حاصل ہوگئی تھیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرویات سیرت نبوی کو صرف سینہ بہ سینہ منتقل نہیں کیا بلکہ اسے "سفینہ" میں بھی منتقل کردیا۔اب تک کی معلومات کے مطابق ان کی کتاب المغازي سیرت نبوی کی اولین کتاب ہے۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمۃ کے بقول اس کتاب کی تدوین 63ھ سے قبل ہوچکی تھی جس کی خبر ارباب اقتدار کو بھی تھی چنانچہ حضرت عبدالملک بن مروانؒ نے ان سے 65ھ کے اپنے سفر حج میں غزوہ بدر اور فتح مکہ کے بارے میں تفصیلات معلوم کی تھیں۔

حضرت عروہ کی کتاب المغازی کو ان کی زندگی ہی میں شہرت نصیب ہوگئی تھی۔اس کی روایت کئی لوگوں نے کی تھی لیکن سب سے زیادہ شہرت ان کے پروردہ حضرت ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل اسدی مدنی (م 137ھ) کی روایت کو حاصل ہوئی۔اسی وجہ سے بعض لوگ ان سے مروی روایات کو ان کی مستقل کتاب سیرت قرار دیتے ہیں۔ابوالاسود یتیم عروہ کے علاوہ ان کی مرویات بیان کرنے والوں میں ابن شہاب زہری اور سعد بن ابراہیم جیسے مؤلفین سیرت شامل ہیں۔ابوحسان حسن بن عثمان زیادی بغدادی (م 243ھ) نے بھی ان کی کتاب المغازی کو مرتب ومدون کیا تھا لہذا بعض لوگ ان کے مرتب کردہ نسخہ کو ان کی مستقل بالذات کتاب شمار کرتے ہیں۔

حضرت عروہ کی کتاب المغازی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہے تاہم اس کی متعدد روایات مصادر وآخذ میں بکھری ہوئی ہیں۔ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی نے ان مرویات کو اکٹھا کر کے "مغازی رسول الله ﷺ **لعروة بن الزبير برواية أبي الأسود**

يتيم عروة عنه'' کے نام سے شائع کیا اور اس پر ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ **مکتب التربية العربي لدول الخليج** سے شائع ہوئی تھی۔ اس کو مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی نے اردو کے قالب میں ڈھالا اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔

2. **كتاب المغاز ابان بن عثمانی:** حضرت ابان بن عثمان (20-100ھ) کا شمار اولین مؤلفین سیرت میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے صاحبزادے تھے جس کی وجہ سے انھیں رسول اکرم ﷺ کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرنے کی سہولت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مغازی کی اولین کتاب انھوں نے ہی مرتب کی تھی جس کے راوی مغیرہ بن عبدالرحمٰن تھے۔ ان کی کتاب سیرت کے حوالے بعد میں لکھی جانے والی کتب سیرت میں بہت کم ملتے ہیں۔

3. **كتاب المغازی وہب بن منبہ:** وہب بن منبہ (34-110ھ) کا شمار ان تابعین میں ہوتا ہے جنھوں نے کاروان سیرت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ان کی کتاب سیرت کے حوالے بھی بعد میں لکھی جانے والی کتب سیرت میں ذرا کم کم ہی ملتے ہیں۔ بقول جوزف ہوروونس ''وہب کی ساری کتابیں سیرت کا دیباچہ ہیں اور آنحضرت ﷺ سے قبل رسالت کی تاریخ بتاتی ہیں''۔

4. **كتاب المغازی عاصم بن عمر بن قتادہ:** عاصم بن عمر بن قتادہ (م 120ھ) مشہور تابعی ہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم کے مطابق انھوں نے دمشق کی جامع مسجد میں سیرت رسول ﷺ کا درس دینا شروع کیا جس نے لوگوں کو اندر سیرت کا مذاق عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے یہ سلسلہ مدینہ لوٹنے کے بعد بھی جاری رکھا۔ ان کے درس میں بیان کردہ واقعات کو متعدد لوگوں نے بطور یادداشت اپنی اپنی بیاضوں میں نقل کرلیا جو بعد میں آنے والے مؤلفین کے لیے خام مواد ثابت ہوا۔ بقول ڈاکٹر محمود الحسن ''عاصم بن عمر اس اعتبار سے خاصے اہم ہیں کہ وہ قدیم اصحاب سیر اور جدید مؤلفین کے مابین بیچ کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

ایک روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں محمد بن اسحاق ان کے درس میں برابر شریک ہوا کرتے تھے اور ان سے مروی متعدد روایات کو اپنی کتاب سیرت میں درج کیا تھا۔ ابن اسحاق کے علاوہ امام واقدی اور امام طبری نے بھی ان سے مروی اچھی خاصی روایات کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا۔

5. **كتاب المغازی امام زہری:** محمد بن شہاب زہری (52-124ھ) کا شمار ان سیرت نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف فن سیرت کو ایک اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچا دیا بلکہ لوگوں میں سیرت ومغازی کا عام ذوق بھی پیدا کردیا۔ ان کا کارنامہ صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ کی سیرت لکھی بلکہ انھوں نے سیرت نگاروں کی ایک جماعت کی تربیت کی اور انھیں اس میدان کے سرخیل اصحاب میں شامل کردیا۔ مثال کے طور پر موسی بن عقبہ (تقریباً 55-141ھ) اور محمد بن اسحاق (85-151ھ) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ ان کے دیگر شاگردوں میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمّار، اور عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں کہ کتب تراجم وطبقات میں ان کا بنیادی وصف ''صاحب المغازی'' کی حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دوسری صدی ہجری تک لکھی جانے والی کتب سیرت میں امام

زہری سے بہت زیادہ اخذ واستفادہ کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت تک لکھی جانے والی کتب سیرت کی متعدد روایات کا سلسلہ اسنادامام زہری پر ہی ختم ہوتا ہے۔

امام زہری کو کتاب المغازی مرتب کرنے کا خیال غالبا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر تدوین حدیث کا کارنامہ انجام دیتے ہوئے آیا تھا۔اسی بنیاد پران کی کتاب المغازی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلی صدی کے آخر میں لکھی گئی تھی۔اس کی تالیف کا دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے اموی امیر خالد بن عبداللہ قسری نے ان سے کتاب الأنساب اور کتاب السیرۃ لکھنے کی فرمائش کی تھی اور غالبا وہ ان کی فرمائش کو پورا نہیں کرنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے امیر سے کہا کہ سیرت لکھنے کے دوران حضرت علیؓ کا بھی ذکر آئے گا تو انھوں نے کہا کہ اگران کا ذکر کرنا تو الفاظ خیر میں نہیں کرنا اس بنا پر انھوں نے ان کی فرمائش پوری کرنے سے معذرت کر لی اور بعد میں اپنی منشا کے مطابق کتاب لکھی۔

امام زہری کی کتاب مفقود ہے ان کی مرویات موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق اور معمر بن راشد کی اسناد سے کتب حدیث وسیرت میں بکھری پڑی ہیں۔اسی طرح ان کی بیشتر مرویات بسند عبدالرزاق بن ہمام عن معمر بن راشد مصنف عبدالرزاق کی کتاب المغازی کے تحت بیان کی گئی ہیں۔امام زہری کی کتاب المغازی کا سب سے اہم اور بنیادی مأخذ حضرت عروہ بن زبیر کی مرویات سیرت ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے سعید بن مسیّب، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ اور بہت سے دوسرے راویوں کی سند سے مغازی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔

امام زہری کی کتاب سیرت پوری سیرت نبوی کو محیط تھی۔اس کے علاوہ اس میں عہد خلفائے راشدین اور عہد اموی کے حالات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب اپنی اصل شکل میں ہم تک نہیں پہنچی لیکن مصادر میں بکھری ہوئی مرویات پر مشتمل ''المغازی النبویۃ'' دارالفکر دمشق سے 1981ء میں شائع ہو چکی ہے۔

6. **کتاب المغازی عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم:** عبداللہ کا پورا نام عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم (م 135ھ) ہے۔ان کے والد قاضی ابوبکر کا شماران تابعین میں ہوتا ہے جنھیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے احادیث نبوی کو جمع کرنے کا حکم دیا تھا لہذا انھوں نے بہت ذوق وشوق کے ساتھ احادیث کو اکٹھا کیا۔والد کا ذوق بیٹے میں بھی منتقل ہوا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ تابعین کے بعد تین ایسے علماء سامنے آئے جنھیں مغازی سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی احادیث سے۔ان علماء میں عاصم بن عمر، ابن شہاب زہری کے ساتھ عبداللہ بن ابوبکر کا نام نامی بھی شامل ہے۔موخرالذکر کا درجہ بیان کرتے ہوئے جوزف ہورووٹس نے لکھا ہے کہ ''ان کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ انھوں نے بس اخبار جمع کیے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اسے تاریخی ترتیب کے ساتھ مدون کرنے کی کوشش کی''۔

عبداللہ بن ابوبکر کا شمار امام ابن اسحاق کے اہم شیوخ میں ہوتا ہے جن سے استفادہ کرتے ہوئے بہت سی روایات انھوں نے اپنی کتاب سیرت میں درج کی ہیں۔ان کے علاوہ واقدی، ابن سعد اور طبری نے بھی ان سے متعدد روایات اپنی اپنی کتب میں نقل کی ہیں۔

7. كتاب المغازی موسی بن عقبہ: موسی بن عقبہ (تقریبا55-141ھ) کا شمار ان ابتدائی سیرت نگاران میں ہوتا ہے جنھوں نے فن سیرت کا ایک علمی ڈھانچہ تیار کیا تھا اور اس کا ایک علمی پیمانہ مقرر کیا تھا مغازی واقدی کے محقق مراسدن جونس کے بقول موسی بن عقبہ اور ابن اسحاق نے سیرت نگاری کی وہ بنیاد فراہم کردی جس پر متاخرین اپنی اپنی کتبِ سیرت کی تعمیر کرتے رہے۔

ان کا شمار مدینہ منورہ کے اکابرین علم وفضل میں ہوتا ہے انھوں نے اپنی ساری عمر حدیث وفقہ وسیرت نبوی اور دیگر علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں گزاری۔ان کے اوقات کا اکثر حصہ مسجد نبوی کے حلقۂ درس وتدریس خصوصا سیرت بنوی کی تدریس میں گزرتا تھا۔انھوں نے اس فن کو عروہ بن زبیر اور ابن شہاب زہری جیسے اساطین فن سے حاصل کیا۔ان کے علاوہ انھوں نے اپنے نانا ابوحبیبہ سے بھی اس فن میں استفادہ کیا۔ان کا تعلق آل زبیر سے تھا جس کی وجہ سے انھیں بھی سیرت نبوی کے بہت سے واقعات کا علم تھا۔ان کی مغازی کے راوی ان کے بھتیجے اسمعیل بن ابراہیم بن عقبہ (م169ھ) وغیرہ ہیں۔دیگر راویان اور ان کے تلامذہ میں سلیمان بن بلال تیمی اور محمد بن فلیح اور عثمان بن عمر وجزری شامل ہیں۔

موسی بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک خاص پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔امام مزی کے بقول مدینہ کے مشہو سیرت نگار شرحبیل بن سعد (م123ھ) نے سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی تھی جس پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ انھوں نے ذاتی اغراض کی بنا پر اس میں غلط مباحث شامل کردیئے ہیں خصوصا اصحاب بدر واحد کی فہرست میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔جب اس کی بازگشت موسی بن عقبہ تک پہنچی تو انھوں نے کہا کہ لوگ اتنے جری ہوگئے ہیں کہ سیرت نگاروں پر اعتراض کرنے لگے ہیں لہذا کبرسنی کے باوجود انھوں نے ایک کتاب المغازی لکھی جس میں مہاجرین حبشہ، اصحاب بدر واحد کی صحیح فہرست فراہم کی۔اس کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ امام مالک علیہ الرحمہ اس کو سیرت ابن اسحاق پر ترجیح دیتے تھے اور اسے صحیح ترین کتاب سیرت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مغازی کا فن سیکھنا ہو تو موسی بن عقبہ سے سیکھو۔ان کے علاوہ دیگر کبار ائمہ نے اس کی صحت واہمیت وافادیت کا اعتراف کیا ہے۔موجودہ زمانہ کے ممتاز سیرت نگار اکرم ضیاء عمری کے بقول مغازی موسی بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق اس فن کی صحیح ترین کتب ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے موسی بن عقبہ کی کتاب ابن اسحاق کی کتاب کے مقابلے میں فوقیت رکھتی ہے اور صحیح ترین ہے۔

یہ کتاب اپنے زمانہ تصنیف سے اہل علم کی توجہات کا مرکز بن گئی تھی۔پانچویں صدی ہجری تک یقینی طور پر وہ علماء کرام کے زیر مطالعہ رہی تھی جس کا اندازہ ان کتب سے کیا جاسکتا ہے جن میں اس کے نصوص موجود ہیں۔موجودہ معلومات کے مطابق اس کا پہلا مکمل نسخہ تیار کرنے کا سہرا ابونعیم اصفہانی کے سر جاتا ہے۔اسی نسخہ سے تقریبا دو صدی کے بعد یاقوت حموی نے ایک مزید نسخہ تیار کیا۔ان کے بعد ان کے نسخہ سے قاضی ابن ابی شہبہ (م789ھ) نے ایک اختصار تیار کیا۔علامہ ابن حجر وابن سید الناس نے مغازی موسی بن عقبہ کی مرویات کی معتدبہ تعداد الاصابة، فتح الباری اور عیون الأثر میں محفوظ کردی ہیں۔ان سے پہلے ابن عبدالبر اپنی کتاب سیرت الدرر میں اس کی تلخیص پیش کرچکے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے پاس اس کا کوئی نسخہ محفوظ تھا جس سے وہ مسلسل استفادہ کرتے رہے تھے۔یہ چند نام بطور مثال پیش کیے گئے ہیں ورنہ وہ کم ازکم دسویں صدی تک علماء کرام کے زیر مطالعہ رہی تھی حتی کہ زمانہ کے دست وبرد کا شکار ہوگئی کیونکہ ممتاز مؤرخ اور سیرت نگار امام حسین بن محمد دیار بکری (م966ھ) نے اپنی کتاب ''تاریخ الخمیس في أنفس النفیس'' میں اس کی مرویات براہ راست نقل کی ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جرمن مستشرق سخاؤ نے سب سے پہلے مغازی موسی بن عقبہ سے دنیا کو متعارف کرایا لیکن پچاس سال بعد مستشرق شاخت نے سخاؤ کی تحقیقات کو اصل کتاب کا حصہ ماننے سے انکار کردیا۔ان کے اعتراضات کا جواب ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے اپنی کتاب''دراسات في الحديث النبوي ''میں تفصیل سے دیا ہے۔۔سخاؤ کا شائع کردہ نسخہ دراصل ابن قاضی شہبہ کا منتخب کردہ نسخہ تھا جسے بعد میں ڈاکٹر حسن سلمان نے اپنی تقدیم وتعلیق کے ساتھ شائع کیا تھا اور سخاؤ وشاخت کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

اس کے بعد یوسف ہوروتس نے ابتدائی مؤلفین سیرت پر ایک اہم اور قیمتی مقالہ لکھا جس میں پہلی بار موسی بن عقبہ کی زندگی پر کسی حد تک تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔

مستشرقین کی ان کوششوں کے بعد غالبا ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے سب سے پہلے موسی بن عقبہ کی شخصیت اور ان کے کارنامے پر عربی زبان میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا۔اس مقالہ نے عرب دنیا میں مغازی موسی بن عقبہ کی اہمیت کو پہلی بار آشکارا کیا اور اس کے مشتملات کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔اب تک کی معلومات کے مطابق مغازی موسی بن عقبہ کی مرویات کو جمع کر کے محمد باقشیش اور حسین مرادی نصب نے اپنے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کردیا ہے۔ان کے علاوہ ولید قیسہ اور راقم السطور نے بھی مغازی موسی بن عقبہ کی مرویات کو جمع کیا لیکن وہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔

8. **کتاب المغازی معمر بن راشد:** معمر بن راشد (96-150 ھ) کا شمار امام زہری وہشام بن عروہ کے اہم تلامذہ میں ہوتا ہے۔انھوں نے بھی ایک کتاب سیرت پر لکھی تھی جو زمانہ کے دست وبرد کا شکار ہوگئی۔ان کی کتاب سیرت کے کچھ حصے واقدی، ابن سعد، بلاذری اور طبری کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں جن کا تعلق ماقبل بعثت، فترۂ وحی، اسعد بن زرارہ کا واقعہ، بنونضیر کا معاملہ اور صلح حدیبیہ سے ہے۔ان محفوظ مرویات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کتاب سیرت ایک مکمل ترین کتاب سیرت تھی جس سے بعد میں آنے والے مؤلفین سیرت نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔غالبا اسی لیے ابن معین نے مالک اور یونس کے ساتھ معمر کو بھی زہری کے ثقہ ترین راویوں میں شمار کیا ہے۔

9. **کتاب المغازی محمد بن اسحاق:** محمد بن اسحاق (85-151 ھ) کا شمار ان مؤلفین سیرت میں ہوتا ہے جن کے سب سے زیادہ گہرے اثرات سیرت نگاری پر پڑے ہیں۔انھوں نے مشہور قول کے مطابق بغداد میں خلیفہ وقت امیر المؤمنین منصور کے حکم سے ان کے بیٹے مہدی کے لیے کتاب سیرت لکھی تھی۔یہ کافی مفصل تھی لیکن خلیفہ کی منشا کے مطابق بعد میں اس کی تلخیص کردی گئی اور یہ وہی ملخص نسخہ ہے جس کی تہذیب وتنقیح ابن ہشام نے کی۔آج کی علمی دنیا میں سیرت ابن ہشام ہی سیرت ابن اسحاق کا بدل قرار دی جاتی ہے۔

ابن اسحاق متقدمین سیرت نگاران میں سے اولین سیرت نگار ہیں جنھوں نے مدینہ کے بجائے بغداد میں اپنی کتاب مرتب کی تھی۔ان سے پہلے لکھی جانے والی تمام کتب سیرت مدینہ منورہ میں لکھی گئیں تھیں۔ان کی کتاب کا سنہ تألیف 136 ھ کے آس پاس قرار دیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا: **كتاب المبتدأ، كتاب المبعث** اور **كتاب المغازی**۔بقول محمود غازی''ابن اسحاق کی یہ کتاب بھی طویل عرصے تک مقبول ومتداول رہی، ساتویں آٹھویں ہجری تک اس کے نسخے عام تھے۔ابن اثیر سمیت ساتویں آٹھویں ہجری تک آنے والے محدثین اور اہل سیر کے ہاں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں''۔

ابن اسحاق کے شیوخ سیرت میں ابان بن عثمان، ابن شہاب زہری، عاصم بن عمر بن قتادہ، سعد بن ابراہیم اور ہشام بن عروہ وغیرہ شامل ہیں۔ امام زہری فن سیرت میں اپنے شاگرد کے فضل وکمال کے بہت زیادہ معترف تھے اور انھیں سیرت کا سب سے بڑا عالم مانتے تھے اور ان سے فن سیرت کو حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

ابن اسحاق کی **کتاب المغازی** کی روایت ان کے کئی شاگردوں نے کی لیکن زیاد بن عبداللہ بکائی (م 183ھ) جیسی شہرت کسی اور کو حاصل نہ ہوسکی۔ سیرت ابن ہشام کا دارومدار بکائی کی روایت پر ہی ہے اور وہی تنہا شاگرد ہیں جن کی مکمل روایت مغازی ابن اسحاق ابن ہشام کے واسطہ سے آج بھی معروف ومشہور ہے۔

ابن اسحاق کے دوسرے شاگردوں میں یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ کی روایات کتابی شکل میں ہم تک ڈاکٹر حمیداللہ علیہ الرحمہ کی تلاش وجستجو اور محنت شاقہ کے نتیجہ میں پہنچی ہیں۔

ابن اسحاق کو بعض لوگ ثقہ اور بعض لوگ غیر ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ثقہ وعدم ثقہ ہونے کی بحث سے قطع نظر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ فن سیرت کے فروغ میں ابن اسحاق کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ ان کی **کتاب المغازی** کو اس قدر شہرت نصیب ہوئی کہ اس کی روایت کرنے والوں کی تعداد بقول مطاع طرابیشی ساٹھ سے زیادہ ہے۔ اس کتاب کی شہرت کا اندازہ اس کی شرح لکھنے والوں، اس کی تلخیص کرنے والوں، اس کے مترجمین اور اسے نظم کے قالب میں ڈھالنے والوں کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔

ابن اسحاق کی خدمات سیرت کو ابن عدی نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: ''ان کے فضل وکمال کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے امراء وملوک کو لایعنی کتابوں کی مشغولیت سے ہٹا کر رسول اللہ ﷺ کے مغازی، آپ ﷺ کی بعثت اور ابتدائے خلق کے واقعات پڑھنے میں لگا دیا۔ یہ فضل وکمال سب سے پہلے ان کو حاصل ہوا، ان کے بعد ایک جماعت نے مغازی پر کتابیں لکھیں مگر ان میں سے کوئی ابن اسحاق کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا''۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مختلف زبان میں تراجم ہوئے اس کا فارسی ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کے مختصرات تیار کیے گئے جیسے ''**اختصار أخبار محمد بن اسحاق**'' از احمد بن محمد بن مفرج اشبیلی (م 637ھ) اور ''**الذخیرة في مختصر السیرة**'' از ابراہیم بن محمد معروف بہ ابن مرحّل (م 611ھ)۔ بعض کتب میں اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جیسے ''**دراسة في سیرة النبي ومؤلفها ابن اسحاق**'' از عبدالعزیز دوری۔

10. سیرۃ النبی ابن ہشام: ابن ہشام کا پورا نام عبدالملک بن ہشام (م 218ھ) ہے۔ ان کا شمار کبار سیرت نگاران ومؤرخین میں ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اولین صدیوں میں لکھی جانے کتب سیرت میں سے وہ واحد کتاب ہے جو مکمل شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ ابن ہشام کے ثقہ ہونے پر سب کو اتفاق ہے۔ ابن ہشام کی کتاب سیرت دراصل ابن اسحاق کی کتاب سیرت کی تلخیص وتنقیح ہے کہ ابن ہشام نے اپنے استاد زیاد بکائی سے مروی ابن اسحاق کی کتاب سیرت کی روایت، حذف واضافہ، تنقیح وتلخیص کے بعد کی ہے جس کے نتیجہ میں کتاب ابن اسحاق میں اتنی زیادہ تبدیلی پیدا ہوگئی کہ اس

نے ایک نئی کتاب کا قالب اختیار کرلیالہذا اسے ابن اسحاق کی کتاب سیرت کا پرتو قرار دیا جاتا ہے کہ اگر ابن ہشام کی کتاب بھی ناپید ہوگئی ہوتی تو ابن اسحاق کی کتاب سیرت بھی مکمل طور نا پید ہوگئی ہوتی اور اس کی روایات بھی دیگر کتب سیرت کی طرح صرف مصادر میں پائی جاتیں۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''ابن ہشام نے اس قدر فن کارانہ مہارت اور سلیقے سے ابن اسحاق کی کتاب تہذیب و اصلاح کی ہے کہ اب اس کتاب کی موجودگی میں ابن اسحاق کی کتاب المغازی کے ناپید ہونے کا افسوس نہیں رہتا......مناسب ترمیم وتنقیح، تشریح وتوضیح اور حذف و اضافے کے ساتھ ابن اسحاق کی کتاب کو ایک نئے پیراہن میں پیش کیا۔ سیرت ابن ہشام کا سب سے بڑا وصف اس کی حسن ترتیب اور جامعیت ہے''۔

سیرت ابن ہشام اپنے مواد ومباحث کی وجہ سے ہمیشہ علماء کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی لہذا اس کی شرحیں لکھی گئیں جیسے ''**الروض الأنف في شرح سيرة ابن هشام** '' از عبدالرحمٰن بن عبداللہ سہیلی (م 581ھ)، ''**تفسير غريب أبيات السيرة لابن هشام** '' یا ''**الاملاء على سيرةابن هشام** '' از ابوذر مصعب بن محمد خشنی (م 604ھ) اور ''**كشف اللثام في سيرة ابن هشام** '' از بدرالدین محمود بن احمد عینی (م855ھ) وغیرہ۔ اسے نظم کے قالب میں بھی ڈھالا گیا جیسے ''**نظم سيرة ابن هشام**'' یا ''**الوصول الى السول في نظم سيرة الرسول لابن هشام**'' از فتح بن موسیٰ قصری (588-663ھ)۔

اس کے مختصرات تیار کیے گئے جیسے ''**بلوغ المرام من سيرة ابن هشام والروض الأنف والاعلام** '' از ابوبکر ابن حجۃ حموی (777-837ھ)، ''**الالمام بالروض وسيرة ابن هشام الملقب بجلاء الأفكار بسيرة المختار** '' از محمد بن ابراہیم بلبیسی مقدسی (م 937ھ)، وغیرہ۔

سیرت ابن ہشام کا اردو، فارسی، انگریزی، لاطینی، جرمن اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

11. کتاب المغازی ابومعشر نجیح سندھی: ابومعشر سندھی (م 170ھ) کا اصل نام عبدالرحمٰن بن ولید تھا۔ جب انھیں مدینہ کے بازار میں بیچا گیا تو ان کے مالکوں نے ان کا نام نجیح رکھا۔ ابومعشر کو بھی اپنے معاصرین کی طرح فن سیرت سے کافی دلچسپی تھی۔ ان کی کتاب سیرت کے اقتباسات واقدی، ابن سعد اور طبری کی کتب میں پائے جاتے ہیں لیکن اصل کتاب ناپید ہو چکی ہے۔ ان اقتباسات کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابومعشر نے ایک مکمل کتاب سیرت تصنیف کی تھی۔

12. کتاب المغازی امام واقدی: امام واقدی (130-207ھ) کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عمر اپنے دادا اور والد کی نسبت سے واقدی کہلاتے ہیں۔ انھوں نے مدینہ کے مشہور محدثین مالک بن انس، معمر بن راشد، ابومعشر نجیح سندھی اور ابن جریج وغیرہ سے استفادہ کیا۔ انھیں حدیث کے علاوہ فقہ، سیرت ومغازی اور تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔ ابن ندیم کی الفهرست کے مطابق انھوں نے سیرت نبوی اور متعلقات سیرت نبوی کے موضوع پر چار کتابیں: التاريخ والمغازي والمبعث، أزواج النبي، وفاة النبي اور السيرة نامی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے اولین الذکر کتاب ''كتاب المغازى'' کے نام سے معروف ومشہور ہے اور ان کی شہرت کا سبب بنی ہے۔

واقدی نے اس کتاب میں اپنے مدنی اساتذہ اور اس زمانہ میں موجود مواد سیرت سے کافی استفادہ کیا۔ساتھ ہی ساتھ ابن اسحاق کا نام لیے بغیر ان کی کتاب سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب ابن اسحاق کی کتاب کے مقابلہ میں زیادہ مفصل، مکمل اور جامع ہے۔اس کتاب کا موضوع اگرچہ غزوات نبوی ہیں لیکن اس میں دیگر امور سیرت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر اسے آپ ﷺ کی مدنی زندگی کا آئینہ کہا جا سکتا ہے جس میں کافی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ آپ ﷺ کی مدنی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

امام واقدی کے ثقہ ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔اکثر محدثین کے نزدیک وہ ثقہ نہیں ہیں بلکہ بعض نے انھیں جھوٹا تک قرار دیا ہے تاہم فن سیرت میں ان کے مقام ومرتبہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیرت ومغازی میں وہ استناد کا درجہ رکھتے ہیں لیکن حدیث میں انھیں وہ مقام ومرتبہ حاصل نہیں ہے۔

13. **ابن سعد کی الطبقات الکبری (اولیں دو جلدیں):** ابن سعد کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن سعد بغدادی (168-230ھ) ہے۔ان کا شمار ثقہ محدثین وسیرت نگاران میں ہوتا ہے۔انھوں نے اس فن کو امام واقدی سے حاصل کیا تھا کہ وہ ان کے کاتب اور شاگرد تھے۔محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے استاد اگرچہ قابل اعتماد نہیں ہیں لیکن وہ خود مستند ومعتبر ہیں۔ان کی پیدائش اگرچہ بصرہ میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔مشہور مؤرخ بلاذری کا شمار ان کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔باسٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

انھوں نے الگ سے کوئی کتاب سیرت نہیں لکھی بلکہ اپنی مشہور زمانہ کتاب ''الطبقات الکبری'' کی ابتدائی دو جلدوں کو سرور کائنات ﷺ کے حالات زندگی بیان کرنے کے لیے مختص کر دیا۔بعض مصادر میں ان جلدوں کو ''کتاب أخبار النبي'' سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔مذکورہ کتاب ۸ جلدوں پر مشتمل ہے۔باقیماندہ جلدیں صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے حالات کو بیان کرتی ہیں۔

پروفیسر جوزف ہورووتس کے بقول ابن اسحاق کے بعد ابن سعد کو ہی وہ اولین مؤلف سمجھا جاتا ہے جس کی لکھی ہوئی سیرت مکمل حالت میں ہم تک پہنچی ہے جس میں بعض مواقع پر ابن اسحاق سے زیادہ تفصیلات پائی جاتی ہیں......ابن سعد کے یہاں مواد کی باضابطہ تنظیم کا رکارجحان بھی ملتا ہے۔وہ غالبًا پہلے مؤلف ہیں جنھوں نے ''علامات النبوة'' کو یکجا کیا ہے اس سے زمانۂ مابعد میں ''دلائل النبوة'' جیسی کتابوں کی تالیف کی گئی۔اسی طرح اس نے اپنی کتاب کی فصل ''صفة أخلاق رسول الله'' لکھ کر شمائل کے موضوع پر تصانیف کا راستہ ہموار کیا۔

ابن سعد نے اپنی کتاب میں سب زیادہ انحصار واقدی کی بیان کردہ روایات پر کیا ہے۔ان کے علاوہ انھوں نے موسی بن عقبہ، ابن اسحاق، ابومعشر نجیح اور دیگر لوگوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کو زیادہ وقیع اور معتبر بنا دیا۔

14. **کتاب الشمائل محمد بن عیسی ترمذی:** امام ترمذی (م 279ھ) کا شمار ثقہ ترین محدثین میں ہوتا ہے۔ان کی سنن کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔انھوں نے آپ ﷺ کے حالات وعادات اور اخلاق کریمہ کا ذکر اپنی مشہور کتاب ''الشمائل النبوية والخصائل المصطفوية المعروف بكتاب الشمائل'' میں کیا ہے۔غالبا عادات وخصائل نبوی ﷺ پر یہ اولین

کتاب ہے جو آج بھی موجود ہے۔اس کتاب کی متعدد شروح وتراجم ہو چکے ہیں جن میں شیخ ابراہیم بیجودی کی شرح ''**المواهب اللدنية على الشمائل المحمدية**'' خاصی مشہور ہے۔

مذکورہ بالا کتب سیرت کے علاوہ متعدد کتب سیرت کا ذکر مصادر ومراجع میں ملتا ہے۔ان میں سے زیادہ تر کتابیں زمانہ کی دست برد کا شکار ہو چکی ہیں اوران کی مرویات کا بہت ہم کم حصہ مصادر ومراجع میں محفوظ ہو سکا ہے لیکن ان کے مؤلفین کا شمار اپنے اپنے عہد وعلاقہ کے اکابر سیرت نگاران میں ہوتا تھا۔ان مؤلفین سیرت میں محدث شعبی (م 109ھ)، یعقوب بن عتبہ بن اخنس (م 138ھ)، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز اوسی (م 162ھ)، محمد بن صالح بن دینار (م 168ھ)، عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمٰن مخزومی (م 170ھ)، علی بن مجاہد رازی کندی (م بعد 180ھ)، زیاد بن عبداللہ بکائی (م 183ھ)، سلمہ بن ابرش انصاری (م 191ھ)، ولید بن مسلم قرشی (م 195ھ)، یعقوب بن ابراہیم رازی (م 208ھ)، عبدالرزاق بن ہمام (م 211ھ)، ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم (م 285 ھ) اور محمد بن عائذ دمشقی جیسے مؤلفین سیرت شامل ہیں۔ان کے علاوہ متعدد علماء وفضلاء کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فن مغازی کے ماہر تھے اورانھوں نے فن مذکور میں کوئی کتاب لکھی تھی جن کے نام کشف الظنون جیسی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن ان کے بارے میں دیگر کسی قسم کی اور معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا کتب متقدمین علماء کی ہیں۔متاخرین علماء نے بھی فن سیرت پر قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔متاخرین علماء کی کتب سیرت میں سے متعدد کتب ایسی ہیں جو متقدمین علماء کی کتب سیرت کی شرح وتوضیح کے طور پر لکھی گئی تھیں۔ان کتابوں میں اصل کتابوں کے مقابلے میں معلومات زیادہ پائی جاتی ہیں لہذا انھیں مستقل تصانیف کا درجہ دیا جا سکتا ہے ان میں سے چند اہم کتب کا تعارف درج ذیل سطور میں کرایا جارہا ہے:

1. **شرف المصطفی**: حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری (م 406ھ) نے آٹھ جلدوں پر مشتمل مذکورہ کتاب لکھی تھی۔ **الاصابة** میں اس کے بکثرت حوالے پائے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب میں ہر قسم کی رطب ویابس روایات جمع کر دی ہیں اور ثقہ وغیر ثقہ روایات میں کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں کی ہے۔

2. **جوامع السيرة**: علامہ ابن حزم (م 456ھ) کا شمار اندلس کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ان کا پورا نام ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم ہے۔نبی کریم ﷺ کی سیرت پر یہ نہایت مختصر مگر جامع کتاب ہے۔حضور اکرم ﷺ کے علاوہ اس میں صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور اموی وعباسی خلفاء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

3. **الدرر في اختصار المغازى والسير**: حافظ ابن عبدالبر (م 463ھ) کا شمار اندلس کے مشہور علماء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد کتب بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں مذکورہ کتاب بھی شامل ہے اس کے متعدد حوالے متعدد کتب سیرت میں پائے جاتے ہیں۔

4. **الشفاء بتعريف حقوق المصطفى**: قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی (م 544ھ) کا شمار اندلس کے نامور علما میں ہوتا ہے۔انھوں نے متعدد کتب بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ان میں سے مذکورہ کتاب کا تعلق فن سیرت نبوی سے ہے جو ''ان کی سب سے اہم کتاب ہے۔یہ کتاب اپنے مضامین کی نوعیت، ندرت، اثر انگیزی کے اعتبار سے خاص طور بڑی اہم

ہیں‘‘۔ مذکورہ کتاب سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتب سے اس لیے منفرد قرار دی جاسکتی ہے کہ اس میں آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ کو ذکر نہ کر کے صرف سیرت نبوی کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جو عام طور پر سیرت کی کتب میں مذکور نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے مباحث اور علامہ ابن قیم کی کتاب ’’**زاد المعاد في هدي خير العباد**‘‘ کے مباحث میں کسی قدر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں قرآن میں مذکور آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف کی تفصیل درج ہے۔ دوسرے حصہ میں آپ ﷺ کے ان حقوق کا ذکر کیا گیا ہے جو مخلوق پر عائد ہوتے ہیں۔ تیسرے حصہ میں آپ ﷺ سے متعلق ناروا و نا مناسب یا روا اور مناسب امور کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے حصہ میں آپ ﷺ پر سب وشتم کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

5. **الروض الأنف**: یہ کتاب سیرت ابن اسحاق/ ابن ہشام کی شرح ہے۔ اس کتاب کا شمار اہم ترین کتب سیرت میں ہوتا ہے۔ امام سہیلی (م 581ھ) کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے۔ اس شرح کو لکھنے کے لیے مصنف تقریبا 120 کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ بعد میں آنے والے سیرت نگاران امام سہیلی کے خوشہ چیں قرار دیے جاسکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اپنی کتب سیرت میں الروض الأنف سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ مثلا امام ذہبی (م 748ھ) نے اس کا اختصار تیار کیا۔ امام علاء الدین مغلطائی (م 762ھ) نے مذکورہ کتاب کو بنیاد بنا کر **الزهر الباسم** لکھی۔

6. **الوفا بأحوال المصطفى**: اس کتاب کے مؤلف مشہور محدث حافظ عبدالرحمٰن ابن جوزی (م 597ھ) ہیں جس میں مکمل طور پر سیرت نبوی کو بیان کرنے کے ساتھ آپ ﷺ کے حلیۂ مبارک کی تفصیل بیان کی گئی۔ مزید برآں آپ ﷺ معنوی صفات جیسے اخلاق حسنہ وغیرہ کے ساتھ دیگر امور نبوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب حیات نبوی کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ شمائل وخصائص نبوی اور دلائل نبوت کو بھی بیان کرتی ہے۔

7. **المختصر في سيرة سيد البشر**: حافظ عبدالمومن دمیاطی (م 705ھ) کی یہ کتاب سیرت دمیاطی کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب کے حوالے متاخرین کی کتب سیرت میں ملتے ہیں۔ سیرت نبوی پر یہ مختصر سی کتاب ہے۔ اس کے ایک نسخہ کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود ہے جو تقریبا سو صفحات پر مشتمل ہے۔

8. **عيون الأثر في فنون المغازي والسير**: اس کتاب کے مؤلف ابن سید الناس اندلسی (م 734ھ) ہیں جن کا شمار اندلس کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا شمار فن سیرت کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے جسے معیاری مصادر کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے ہر جگہ حوالے دینے کا اہتمام کیا ہے۔

9. **زاد المعاد في هدى خير العباد**: علامہ ابن قیم (م 751ھ) کا پورا نام شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن بکر بن ایوب دمشقی ہے۔ ان کی مذکورہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور سیرت بالخصوص اخلاق نبوی ﷺ کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے مذکورہ کتاب میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت وصورت، خصائل وشمائل، عادات واخلاق اور رفتار وگفتار کے متعلق ایک ایک بات محفوظ کر دی ہے۔ افعال نبوت پر محققانہ بحث پیش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور محمود خالد ’’یہ کتاب اپنی معنویت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے واقعی زاد المعاد یعنی توشۂ آخرت ہے‘‘۔

مذکورہ کتاب سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتب سے اس بنا پر منفرد و الگ قرار دی جاسکتی ہے کہ اس میں آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ کو ذکر نہ کر کے سیرت نبوی کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جو عام طور پر سیرت کی کتب میں مذکور نہیں ہوتے ہیں۔اس کے مباحث اور قاضی عیاض کی کتاب ''کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفی '' کے مباحث میں کسی قدر یکسانیت پائی جاتی ہے۔اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

10. **الزهر الباسم في سيرة أبي القاسم** : حافظ علاء الدین مغلطائی (م 762ھ) کی یہ کتاب سیرت مغلطائی کے نام سے مشہور و معروف ہے۔مؤلف نے اس کتاب کو سہیلی کی الروض الأنف کو بنیاد بنا کر مرتب کیا تھا۔علامہ بدر الدین عینی (م 855ھ) نے اس کے ایک حصہ کی شرح **کشف اللثام** کے نام سے کی۔حافظ مغلطائی نے مذکورہ کتاب کے علاوہ کم از کم سیرت کے موضوع پر دو کتاب اور لکھی تھی جن کے نام ''**الاشارة الی سيرة المصطفی و آثار من بعده من الخلفاء**'' اور ''**تلخيص سيرة المصطفی**'' بالترتیب بیان کیے جاتے ہیں۔

11. **السيرة النبوية** : حافظ ابن کثیر (710-774ھ) کا پورا نام اسماعیل بن عمر ہے۔ان کی یہ کتاب دراصل ان کی مبسوط تاریخ **البداية والنهاية** کا ایک حصہ ہے جسے بعد میں مذکورہ سے الگ کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔اس کتاب میں حضور اکرم ﷺ کے حالات نہایت تحقیق کے ساتھ، مربوط انداز میں سنہ وار لکھے گئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے سیرت نبوی کے موضوع پر ''**الفصول في اختصار سيرة الرسول**'' نامی ایک کتاب اور لکھی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ''**شمائل الرسول ودلائل نبوته وفضائله وخصائصه**'' اور ''**مولد رسول الله** ﷺ'' نامی کتب بھی بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

12. **المواهب اللدنية**: سیرت نبوی کے موضوع پر احمد بن محمد بن ابو بکر قسطلانی (م 923ھ) کی اس کتاب کو خاصی مقبولیت حاصل ہے۔اس کتاب کا پورا نام ''**المواهب اللدنية بالمنح المحمدية في السيرة النبوية**'' ہے۔یہ کافی ضخیم کتاب ہے لیکن اس میں ہر قسم کی روایات مؤلف نے جمع کر دی ہیں۔بقول علامہ شبلی اس میں ہزاروں کی تعداد موضوع، ضعیف اور غلط احادیث موجود ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام زرقانی (م 1122ھ) نے اس کی ایک مبسوط شرح ''**شرح المواهب اللدنية**'' لکھنے کے علاوہ اس کے اسرار و رموز کو اپنی ایک دوسری کتاب ''**اشراق مصابيح السير النبوية بمرج أسرار المواهب اللدنية**'' میں اجاگر کیا ہے۔ان کے علاوہ دیگر افراد نے بھی اس کے حواشی مرتب کیے ہیں۔

13. **أنسان العيون في سيرة الأمين المأمون**: تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ''سیرت حلبیہ'' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔یہ کتاب دراصل ''**عيون الأثر**'' از ابن سید الناس اور ''**السيرة الشامية**'' از محمد بن یوسف شامی کی تلخیص ہے۔اس کتاب کے مصنف علی بن برہان الدین حلبی (م 1044ھ) ہیں۔سیرت نبوی کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں مذکورہ کتاب بہت مشہور و متداول ہے۔اس کتاب کی تلخیصیں لکھی گئیں جیسے ''**خلاصة الأثر في سيرة سيد البشر**'' از احمد بن ابوبکر

بن احمد عریفی بطحیشی مفتی عکا (م 1147ھ) کے علاوہ تاج الدین موفق قابسی (متوفی بعد 1155ھ) نے ''اتحاف البرية بمنتقى السيرة الحلبية'' کے نام سے اس کا اختصار تیار کیا۔

14. **شرح المواهب اللدنية:** یہ شرح محمد بن عبدالباقی زرقانی (م 1122ھ) کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل یہ شرح ''المواهب اللدنية'' از قسطلانی کی مبسوط شرح ہے۔ یہ شرح سہیلی کی ''الروض الأنف'' کے بعد سب سے زیادہ جامع، مستند اور محققانہ تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور محمود خالد ''عربی میں اس سے زیادہ محققانہ کتاب سیرت پر آج تک شائع نہیں ہوئی۔ مصنف نے ہر ایک بات کے متعلق جتنی حدیثیں مروی ہیں وہ سب ایک جگہ لکھ دی ہیں''۔

منظوم کتب سیرت

آنحضرتﷺ کے تئیں مسلمانوں کی گہری عقیدت و دلچسپی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ متعدد علماء وفضلاء پوری سیرت نبوی کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اہم ترین منظوم کتب سیرت کا تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

1. محمد بن ابراہیم معروف بہ فتح الدین شہید (م 793ھ) نے دس ہزار ابیات پر مشتمل سیرت لکھی۔

2. حافظ ابن حجر کے استاد زین الدین عراقی (725-806ھ) نے ''الألفية'' نامی کتاب سیرت پر لکھی تھی جسے انھوں نے حافظ مغلطائی کی مختصر کتاب سیرت کو سامنے رکھ کر منظوم کیا تھا۔ ہزار اشعار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ''الألفية'' کہلاتی ہے۔ بعض مصادر میں اس کا نام ''الدرر السنية في السيرة الزكية'' بیان کیا گیا ہے۔

3. شہاب الدین احمد بن عماد الدین اقفہسی (م 808ھ) نے بھی سیرت نبوی کو منظوم کیا تھا اور خود ہی اس کی ایک شرح لکھی تھی۔ مصادر میں اس کا نام ''شرح نظم السيرة النبوية'' یا ''شرح الدرر في هجرة سيد البشر'' یا ''الدرة الضوئية في الهجرة النبوية'' مذکور ہے۔

4. شمس الدین باعونی (م 871ھ) نے بھی ایک منظوم کتاب سیرت ''منحة اللبيب في سيرة الحبيب'' لکھی ہے۔ یہ منظوم سیرت بھی دراصل حافظ مغلطائی کی کتاب سیرت کا شعری قالب ہے جو ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔

سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جانے والی کتب

علماء وفضلاء نے جس طرح آنحضرتﷺ کی مکمل حیات طیبہ کو محفوظ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اس کی مثال ہمیں تاریخ کی کسی شخصیت کے حوالے سے نہیں ملتی ہے۔ انھوں نے مستقل اور مکمل کتب سیرت کے علاوہ حیات پاک کے مختلف پہلوؤں پر بھی گرانقدر تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ مسلمانوں کی ذات نبوی سے عقیدت ومحبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں حیات طیبہ کے متعدد مخصوص گوشوں پر بھی مستقل کتابیں لکھ کر کتب سیرت نبوی کے ذخیرہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

علماء وفضلاء نے سیرت نبوی کے جن مخصوص گوشوں کو اپنی اپنی کتب میں اجاگر کیا ہے ان میں ولادت باسعادت (مثلاً ابوالقاسم سبتی کی ''الدر المنظم في المولد الأعظم'')، اسلاف واسماء رسول، دلائل نبوت (مثلاً ابوبکر بیہقی کی ''دلائل

النبوة'')، علامات نبوت، شمائل نبوی (مثلا امام ترمذی (م279ھ) کی''کتاب الشمائل '')، اخلاق نبوی (مثلا امام ابن قیم (م751ھ) کی''زاد المعاد في هدي خير العباد'')، طب نبوی، خصائص نبی، خطابت نبوی (مثلا ابواحمد عسال اور ابوالشیخ ابن حبان کی کتب)، نسب رسول (مثلا امام طبرانی اور ابن مندہ کی کتب)، مکاتبات نبوی (مثلا عمارہ بن زید کی کتاب)، وفات نبوی، ازواج مطہرات (مثلا دمیاطی کی کتاب) آپ ﷺ کے موالی، کتّاب نبوی (مثلا عبداللہ بن علی بن احمد بن حدیدہ کی''المصباح المضي في كتّاب النبي'') وغیرہ شامل ہیں۔

معلومات کی جانچ

1. لفظ''سیرت'' کے لغوی واصطلاحی معنی کیا ہیں؟

2. ابتدائی سیرت نگاروں کو کتنے طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے؟ ان طبقات کے نمائندہ سیرت نگاروں کے نام لکھیں؟

14.5 اردو زبان میں سیرت نگاری

اردو زبان وادب کا دامن سیرت رسول ﷺ پر لکھی جانے والی کتابوں سے مالا مال ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو نثر کے قافلہ میں سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتب خاصی تاخیر سے شامل ہوتی ہیں۔ اردو میں اگرچہ منظوم کتب سیرت کا آغاز گیارہویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا لیکن نثر میں ان کی ابتداء تیرہویں صدی ہجری سے ہوئی اور دیگر موضوعات کی طرح سیرت نبوی کے موضوع پر لکھی جانے والی اولین کتاب کا شرف دکن کو حاصل ہے چنانچہ محمد باقر آگاہ (م1220ھ) نے سیرت کے موضوع پر''ریاض السیر'' لکھی اور قاضی بدرالدولہ (م1280ھ) نے''فوائد بدریہ'' لکھی۔ شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج کے زیرنگرانی بہت سی مذہبی کتب شائع ہوئیں جن میں سیرت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتاب''اخلاق النبی ﷺ'' از غلام اشرف بھی شامل ہے۔

قدیم اردو میں موجود ذخیرۂ سیرت نبوی کا اکثر حصہ مثنوی کی شکل میں ہے کیونکہ اردو اصناف سخن میں وہی ایک ہیئت ایسی ہے جس میں تسلسل کے ساتھ حیات نبوی کے مراحل کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اصناف مثلا قصیدہ، رباعی اور غزل کی ہیئت بھی سیرت نبوی کے واقعات بیان کرنے لیے استعمال کی گئی ہے لیکن چونکہ ان کا دامن مثنوی کے مقابلہ میں تنگ ہے لہذا ان کا استعمال بہت زیادہ نہیں کیا گیا ہے۔

قدیم اردو زبان کا یہ سرمایۂ سیرت نبوی میلاد ناموں (مثلا عبدالمالک بھروچی کا مولود نامہ/تولد نامہ)، معراج ناموں (مثلا سید بلاقی کا معراج نامہ)، وفات ناموں (مثلا امامی کا وفات نامہ سرور کائنات)، شمائل ناموں (عثمان کا شمائل محمدی یا شمائل نامہ) اور نورناموں (مثلا مراد نابینا کا نورنامہ) کی شکل میں موجود ہے جس سے حیات طیبہ کے مخصوص گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سرمایہ زیادہ تر منظوم ہے تاہم بعض کتابیں نثر میں بھی ہیں اور بعض میں نظم ونثر دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

سیرت نبوی کے مذکورہ بالا مخصوص پہلوؤں کے علاوہ سیرت نبوی کی کئی ایک منظوم کتب بھی مرتب کی گئی ہیں جیسے ولی ویلوری کی روضۃ الانوار، نوازش علی شیدا کی اعجاز احمدی (چار جلدیں) اور گلشن ایمان، محمد باقر آگاہ کی ہشت بہشت، مخدوم حسینی کی معجزات رسالت، نامی کی مدینۃ الانوار، غلام محمود حسرت کی ریاض السیر وغیرہ۔

اردو سیرت نگاری کا باقاعدہ آغاز 1858ء سے ہوتا ہے۔ 1900ء کے اختتام تک سیرت نبوی کا فن اپنے مختلف ارتقائی مراحل سے گزرا۔ اس عہد میں کثرت سے مولود نامے لکھے گئے، مناظرانہ کتب سیرت منظر عام پر آئیں اور مغربی و مشرقی مصنفین کی کتب سیرت کا ترجمہ کیا گیا۔

اردو سیرت نگاری کا عہد زریں 1900ء کے بعد شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ اب تک دراز ہے حتی کہ اردو زبان کے دامن میں سیرت کی اتنی کتابیں اکٹھا ہو گئی ہیں کہ ان کی مکمل فہرست سازی اگر ممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔ مذکورہ عہد میں اردو سیرت نگاری کی اہم اور بنیادی کتب منظر عام پر آئیں۔ اس عہد میں کتب سیرت کی ایک خوبصورت اور رنگ برنگی کہکشاں نظر آتی ہے جس میں ہر مکاتب فکر کے علماء کی کاوشیں شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سیرت نبوی کے موضوع پر قلم اٹھانے والے بعض مصنفین غیر مسلم ہیں۔ ان حضرات کی کتب سیرت میں حضرت محمد صاحب بانی اسلام از شردھے پرکاش دیو، رسول عربی یا محمد کی سرکار از سردار گوردت سنگھ دارا، عرب کا چاند از سوامی لکشمن پرشاد، پیغمبر اسلام از رگھوناتھ سہائے (خالد اختر کی تحقیق کی مطابق یہ کتاب ان کے بجائے احمد ندیم قاسمی نے لکھی تھی) وغیرہ شامل ہیں۔

اس عہد میں لکھی جانے والی اہم ترین کتب سیرت میں مستقل کتب سیرت کے علاوہ سیرت نبوی کے مختلف و گوناگوں پہلوؤں پر اہم کتب تالیف کی گئیں۔ سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے والے افراد میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی علمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ میں سیرت نبوی پر تحقیقی انداز میں نئے موضوعات اور پہلوؤں پر لکھنے والوں میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مقام و مرتبہ سب سے زیادہ بلند نظر آتا ہے انھوں نے سیرت نبوی کے مختلف گوشوں کو اپنی کتب و مقالات کے ذریعہ اجاگر کرنے کی نمایاں کوششیں کیں۔

اردو کی کتب سیرت عام طور سے عربی تاریخوں اور عربی کتب سیرت کو سامنے رکھ کر ہی لکھی گئی ہیں تاہم متعدد مصنفین نے خود بھی فکر و تحقیق سے کام لیتے ہوئے اپنی اپنی کتب مرتب کی ہیں جن میں علامہ آزاد بلگرامی، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور چند دوسرے اہل علم بھی شامل ہیں۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔ سیرت نبوی کی کتابوں میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی ''سیرۃ النبی'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین''، سید سلیمان ندوی کی ''خطبات مدارس''، سرسید احمد خان کی ''خطبات احمدیہ''، مولانا عبدالرؤوف دانا پوری کی ''اصح السیر''، علامہ راشد الخیری کی ''آمنہ کا لعل''، ملا واحدی کی ''سرور کائنات''، مولانا محمد علی لاہوری کی ''سیرت خیر البشر''، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ''سیرت المصطفی''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''مردوں کی مسیحائی''، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم''، عبدالحلیم شرؔر کی ''خاتم المرسلین''، نعیم صدیقی کی محسن ''انسانیت''، مولانا مودودی کی ''سیرت سرور عالم'' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ''نبی رحمت''، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی ''الرحیق المختوم''، بریگیڈیر گلزار احمد کی ''غزوات نبوی''، مولانا وحید الدین خان کی ''پیغمبر

انقلاب''، ڈاکٹر خالد علوی کی ''انسان کامل''، پیر کرم علی شاہ کی ''ضیاء النبی''، خالد مسعود کی ''حیات رسول امی''، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی ''پیغمبر اعظم و آخر'' اور سید ایوب شاہجہانپوری کی ''آفتاب نبوت'' وغیرہ سیرت نبوی کے موضوع پر مشہور وقابل ذکر کتابیں ہیں۔ مذکورہ بالا کتب میں خطبات احمدیہ، سیرۃ النبی، اصح السیر، رحمۃ للعالمین، خطبات مدراس، محسن انسانیت اور حیات نبی امی اپنی تکنیک اور مقصدیت کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتی ہیں۔

سرسید احمد خان نے 1870ء میں ''خطبات احمدیہ'' کو مکمل کیا۔ یہ کتاب سر ولیم میور کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی۔ سرسید نے اس کتاب کی تالیف کے وقت اسلام اور عیسائی مذہب کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کافی تحقیق وکاوش کے بعد اسے مکمل کیا۔ سرسید کا انداز بیان مصالحانہ اور اسلام اور عیسائیت کو قریب تر لانے والا۔ اردو کتب سیرت میں علامہ شبلی کی کتاب سب سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد شبلی نے خود مکمل کی جب کہ باقی جلدیں علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم کا شاہکار ہیں۔ علامہ شبلی نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت وتحقیق سے کام لیا۔ اولین دو جلدیں آنحضورﷺ کی حیات طیبہ کا احاطہ کرتی ہیں۔ باقی ماندہ جلدوں میں سیرت رسول کے دیگر پہلوؤں پر علمی ومنطقی انداز میں بحث کی گئی ہے۔ سرسید احمد خان اور شبلی نعمانی نے مغربی مصنفین کے سیرت اس کے بعض پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب کو اپنی توجہ مارکر بنایا اور اپنے اسلوب میں اس کی رعایت کی ہے لیکن ان کا مذکورہ طرز عمل بعض لوگوں کو پسند نہیں آیا لہذا کئی لوگوں نے ان کے انداز بیان پر شدید نکتہ چینی کی۔ خاص طور سے مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے ان کے طرز استدلال کی سخت مخالفت کی اور ''اصح السیر'' لکھی۔ یہ ضخامت کے لحاظ سے علامہ شبلی کی کتاب کا نصف ہے لیکن خاص سیرت کے موضوع پر اس میں مواد زیادہ ہے۔ ''خطبات مدراس'' سید سلیمان ندوی کے آٹھ لکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اکتوبر ونومبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں دیے تھے۔ اس میں آنحضورﷺ کی زندگی، سیرت، تعلیم واخلاق کے جملہ پہلوؤں پر علمی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مختصر کتاب میں مولانا ندوی نے اپنی علمی وادبی صلاحیت اور تاریخی معلومات کا پورا نمونہ پیش کردیا ہے اور جو کچھ سیرۃ النبی کی جلدوں میں موجود ہے اسے کتاب کے بارہ لکچروں میں سمودیا ہے۔ نعیم صدیقی نے محسن انسانیت میں سیرت کے موضوع پر نئے ڈھنگ سے قلم اٹھایا ہے اور جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالحلیم شرر نے ''جویائے حق'' لکھ کر کر ناول کے طرز پر سیرت نگاری کا پہلا تجربہ کیا جو سب سے کامیاب سمجھا گیا۔ اس قسم کا دوسرا تجربہ صادق سردھنوی نے ''آفتاب علم'' لکھ کر کیا تھا۔ ماہر القادری کی ''دریتیم'' بھی مذکورہ زمرہ میں شامل کی جاسکتی ہے۔ جناب خالد مسعود کی کتاب ''حیات رسول امی'' اپنے نت نئے گوشوں کی وجہ سے انفرادیت رکھتی ہے۔

اردو کے ذخیرہ کتب سیرت نبوی میں معتدد ایسی کتابیں مثالی ہیں جو کسی اور زبان خاص طور سے عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ کچھ ترجمے انگریزی زبان سے بھی کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام ودیگر مستقل کتب سیرت کے ترجموں کے علاوہ امام ترمذی کی شمائل کا اردو ترجمہ کرامت علی جونپوری نے ''انوار محمدی'' اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے ''خصائل نبوی'' کے نام سے کیا جب کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اسے بچوں کی زبان میں منتقل کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''مدارج النبوۃ'' کا ترجمہ خواجہ عبدالحمید نے کیا جو نول کشور سے شائع ہوا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے رسالہ ''سرور المحزون'' کا ترجمہ شوکت علی شاہجہانپوری نے ''در مکنون'' کے نام سے کیا۔ مذکورہ رسالہ کے کئی ایک ترجمے

ہو چکے ہیں اور اس کی کئی شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ مذکورہ کتب کے علاوہ متعدد کتب سیرت ایسی ہیں جو ان کے علاوہ دیگر زبانوں سے اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔

معلومات کی جانچ

1. سیرت کی اولین کتابوں پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟

2. چند اہم عربی کتب سیرت کا تعارف کرائیں۔

14.6 سیرت نگاری عصر حاضر میں

سیرت نبوی سے شغف ہر زمانہ میں جاری رہا ہے اور اس کے ذخیرۂ کتب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اضافہ مختلف زبانوں میں ہنوز جاری ہے۔عصر حاضر میں لکھی جانے والی کتب کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: مغربی مصنفین کی کتب سیرت، مسلم مصنفین کی کتب سیرت

مغربی مصنفین کی کتب سیرت

سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں علمی نشأۃ ثانیہ کا ظہور ہوا۔ مستشرقین کی کوششوں سے نادر الوجود عربی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں استشراق کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے قطع نظر اس تحریک کے نتیجہ میں مشرقی تصنیفات کی اشاعت وطباعت کا اہتمام کیا گیا۔ متقدمین کی محفوظ عربی کتب سیرت اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں شائع ہوئیں اور ان میں سے متعدد کتب کا یورپی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ مغرب کے اہل علم وفضل نے ان سے استفادہ کرتے ہوئے سیرت رسول ﷺ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

یورپ کے سیرت نگاروں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. عربی زبان اور اصل مآخذ سے بیگانہ سیرت نگاروں۔ انھوں نے دیگر مصنفین یورپ کی تصنیفات اور ترجمہ شدہ کتب کی مدد سے اپنی کتابیں مرتب کیں۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ مشتبہ اور ناقص مواد کو اپنے طبعی رجحان کے مطابق کتاب کی شکل دے دیں۔ ان میں سے بعض مصنفین انصاف پسند بھی تھے جیسے گبن (Gibbon) اور کارلائل (Carlyle) تاہم اکثریت متعصب تھی اس نے اسلام اور آنحضور ﷺ کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

2. عربی زبان وادب سے گہری واقفیت رکھنے والے مصنفین اور تاریخ وفلسفۂ اسلام کے ماہرین لیکن وہ فن سیرت سے ناآشنا تھے۔ ان لوگوں کو سیرت یا دین اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی البتہ ضمنی مواقع پر رسول اللہ سے متعلق تعصب کے ساتھ لکھا۔ ایسے مصنفین کی فہرست بہت طویل ہے۔

3. اس زمرہ میں وہ مستشرقین آتے ہیں جنھوں نے اسلامی ادبیات کا خاصا مطالعہ کیا ہے مثلا پامر(Palmer)، مارگولیتھ (Margoliouth)،سرولیم میور(Sir William Muir)،نولدیکی(Noeldeke)،گولڈزیہر(Goldziher)، کائتانی(Caetani)،شاخت(Schacht)،منٹگمری واٹ(Montgommery Watt)اوراشپرنگر(Sprenger) وغیرہ لیکن ان کی سیرت نبوی پرلکھی کتابیں تعصّبات سے لبریز ہیں۔کچھ کے یہاں زیادہ تعصب پایا جاتا ہےتو کچھ کے یہاں اس کی مقدار کم ہے۔ان مصنفین نے سیرت رسول اللہ ﷺ پر جونکتہ چینیاں کی ہیں ان میں سے اکثر نامعقول ہی نہیں مکروہ بھی ہیں مثلاً مکی زندگی پیغمبرانہ زندگی تھی لیکن وہ مدینہ میں بادشاہی میں تبدیل ہوگئی، کثرت ازدواج اورعورتوں سے رغبت، جبریہ اشاعت اسلام،لونڈی غلام بنانے کی اجازت اوراس پرعمل،مادہ پرستانہ پالیسی اور بہانہ جوئی وغیرہ۔

علامہ شبلی علیہ الرحمہ نے مستشرقین کے اعتراضات کاتفصیلی جائزہ سیرۃ النبی کے مقدمہ میں لیا ہےاوران کےشکوک وشبہات کا مثبت جواب دیا ہے۔ان کے علاوہ سرسید احمد خان نے الخطبات الاحمدیۃ میں،سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی باقی ماندہ جلدوں اور رحمت عالم وخطبات مدراس میں، قاضی سلیمان منصور پوری نے رحمۃ للعالمین میں،میجر جنرل اکبر خاں نے حدیث دفاع میں ودیگر مؤلفین سیرت نے اپنی اپنی کتابوں میں مسیحی اورمغربی سیرت نگاروں کے غیر منصفانہ اندازتحریر پراپنے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ان کے نقطۂ نظر کوغلط اورمہمل بتایا ہےاورسیرت نبوی کی صحیح تصویرکشی کی ہے۔

مسلم مصنفین کی کتب سیرت

عصر حاضر میں عربی زبان میں سیرت نبوی کے موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں اوراس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ان کتابوں کے سیرت نبوی کے ذخیرہ میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ان کتابوں نے اپنے معروضی انداز بیان سے جہاں دلوں میں آپ ﷺ سے محبت کومزید پختہ کیا وہیں مشکوک ذہنوں کے شکوک وشبہات کوختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ساتھ ہی ساتھ مستشرقین کی موشگافیوں کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح صورت حال کی وضاحت کی گئی ہے۔

عصرحاضرمیں لکھی جانے والی کتب میں یوسف بن اسماعیل نبہانی کی حجة الله على العالمين في معجزات سيد المرسلين ،عبدالحلیم محمودکی الرسول،محمدقطب کی قبسات من رسول ،عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی کی مع الرسول ،انورجندی کی شمائل الرسول ،محمدغزالی اورسعیدرمضان کی فقه السيرة ،عبدالرحمٰن عزام کی الرسالة الخالدة ،محمدجادمولی کی محمد المثل الكامل ،مصطفٰی سباعی کی السيرة النبوية دروس ،حسن البناشہیدکی نظرات في السيرة ،محمدعزت دروزہ کی سيرة الرسول صور مقتبسة من القرآن الكريم ،احمدعزالدین عبداللہ خلف اللہ کی السيرة المحمدية الخالدة ،محمدحسین ہیکل کی حياة محمد ،عباس محمودعقادکی عبقرية محمد ،طٰہ حسین کی علی هامش السيرة ،توفیق الحکیم کی محمد ﷺ ،علامہ خضری کی نور اليقين في سيرة سيدنا المرسلين ،مصطفٰی غلایینی کی لباب الخيار في سيرة المختار ،عبدالرحمٰن شرقاوی کی محمد رسول الحرية ،محمودشیث خطاب کی الرسول القائد ،محمد بن عبدالوہاب کی مختصر سيرة الرسول ،علی محمدصلابی کی السيرة النبوية :عرض ووقائع وتحليل أحداث ،مہدی رزق اللہ کی السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية کےعلاوہ محمدعطیہ ابراشی کا سلسلہ کتب سیرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معلومات کی جانچ

1. عصر حاضر میں سیرت نگاری کو کتنے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

2. مغربی سیرت نگاروں کا آنحضورﷺ کے متعلق عمومی رویہ کیسا ہے؟

14.7 خلاصہ

فن سیرت نگاری کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فن سیرت نگاری کے ابتدائی خد وخال احادیث کی روایات کے ضمن میں ظاہر ہوئے تھے جس میں موضوعاتی تقسیم نہیں پائی جاتی تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی مسجد نبوی میں لگنے والے علمی حلقوں میں احادیث کو موضوعات کے اعتبار سے بیان کیا جانے لگا جن میں سیرت نبوی کا موضوع بھی شامل تھا۔

مفقود مصادر سیرت کو دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلے زمرہ میں وہ کتب ہیں جن کی مرویات مصادر میں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں جب کہ دوسرے زمرہ میں وہ کتب سیرت شامل ہیں جن کا ذکر ان کے مصنفین کی دیگر کتب کی فہرست کے ساتھ ملتا ہے اور عام طور سے ان کی مرویات نہیں ملتی ہیں۔

اب تک کی معلومات کے مطابق اولین مولف سیرت حضرت عروہ بن زبیر ہیں۔ان کے بعد مؤلفین سیرت کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے لیکن دیگر علوم وفنون کی طرح اس فن کی ابتدائی اور بنیادی کتب زمانہ کے دست وبرد کا شکار ہوگئیں تاہم ان مؤلفین سیرت کی خدمات سیرت کا اندازہ ان کی ان مرویات سیرت سے ہوتا ہے جو مختلف مصادر میں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔

مفقود مصادر سیرت کا جائزہ لینے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ حضرت امام زہری اس لحاظ سے سب سے زیادہ منفرد نظر آتے ہیں کہ زیادہ تر مرویات سیرت انھیں کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہیں اور سیر ومغازی کی تدوین پر سب سے زیادہ اثرات امام ابن اسحاق کے ہی مرتب ہوئے ہیں کا انھوں نے سیرت نبوی کے مطالعہ کا ایک عہد ساز رجحان پیدا کیا۔ایک جائزہ کے مطابق ان کی کتاب المغازی راویان کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے۔

متقدمین ومتاخرین سیرت نگاروں کی کتب سیرت میں سے متعدد کتب چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔وہ کتب سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

عصر حاضر میں لکھی جانے والی کتب کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔مغربی مصنفین کی کتب سیرت اور مسلم مصنفین کی کتب سیرت۔مغربی مصنفین کی کتب سیرت سے مراد وہ کتب ہیں جو مستشرقین نے مرتب کی ہیں۔ان میں وہ قدیم عربی کتب سیرت بھی شامل ہیں جو انھوں تحقیق کے بعد شائع کیں یا ان کا ترجمہ کسی یورپین زبان میں کیا۔مغربی سیرت نگاروں میں گبن، کارلائل، مارگولیتھ، سرولیم میور، نولدیکی، گولڈزیہر وغیرہ جیسے مؤلفین سیرت شامل ہیں۔مستشرقین نے سیرت نبوی پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ تعصّبات سے لبریز ہیں۔کچھ کے یہاں زیادہ تعصب پایا جاتا ہے تو کچھ کے یہاں اس کی مقدار کم ہے۔ان مصنفین نے سیرت رسول اللہﷺ پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ بے بنیاد اور غلط فہمیاں پر مبنی ہیں۔علامہ شبلی، سر سید احمد خان، سید سلیمان ندوی، قاضی سلیمان منصور پوری، میجر

جنرل اکبر خاں دیگر مؤلفین سیرت نے اپنی کتابوں میں مغربی سیرت نگاروں کے غیر منصفانہ انداز تحریر پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ان کے نقطہائے نظر کی خامیاں واضح کی ہیں اور علمی وفکری انداز میں واقعات سیرت کو بیان کیا ہے۔

مسلم مصنفین کی کتب سیرت سے مراد وہ کتب سیرت ہیں جو مسلم مصنفین کے قلم سے نکلی ہیں۔مسلمانوں نے سیرت نبوی کے ذخیرہ میں گرانقدر اضافہ کیا اور اپنے معروضی انداز بیان سے جہاں دلوں میں آپ ﷺ سے محبت کو مزید پختہ کیا ہے وہیں مشکوک ذہنوں کے شکوک وشبہات کو ختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ساتھ ہی ساتھ مستشرقین کی نکتہ چینیوں کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی۔مسلم سیرت نگاران کی کتب سیرت کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اردو زبان وادب کا دامن سیرت رسول ﷺ پر لکھی جانے کتابوں سے مالا مال ہے اردو میں منظوم ومنثور کتب سیرت کا آغاز گیارھویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی ہجری میں بالترتیب ہوا بعض دیگر موضوعات کی طرح فن سیرت نبوی پر لکھی جانے والی اولین کتاب کا شرف دکن کو حاصل ہے۔

قدیم اردو زبان کا سرمایۂ سیرت نبوی میلادناموں، معراج ناموں، وفات ناموں، شمائل ناموں اور نورناموں کی شکل میں موجود ہے جن سے حیات طیبہ کے مخصوص گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔یہ سرمایہ زیادہ تر منظوم ہے تاہم بعض نثر میں بھی ہیں اور بعض نظم ونثر دونوں میں ایک ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ابتداء سے لے کر آج تک اردو میں سیرت نبوی کے موضوع پر اس قدر مواد اکٹھا ہو چکا ہے کہ اس کی فہرست سازی اگر ممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔اس میں سیرت نبوی کے بنیادی پہلوؤں کے علاوہ دوسرے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔اس ذخیرہ میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں جو کسی اور زبان خاص طور سے فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔

14.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. فن سیرت نبوی کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسباب بتائیں۔
2. عروہ بن زبیر کی ''کتاب المغازی'' کا تعارف کرائیں۔
3. فن سیرت نگاری کے ارتقاء میں عاصم بن عمر بن قتادہ کی خدمات کو اجاگر کریں۔
4. عصر حاضر میں سیرت نگاری کے ارتقاء پر روشنی ڈالیں۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. امام زہری کی کتاب سیرت کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کریں۔
2. فن سیرت نبوی کے ارتقاء میں ابن اسحاق کا کیا کردار ہے؟ بیان کریں۔

3. موسیٰ بن عقبہ کی ''کتاب المغازی'' کا تعارف کرائیں۔

4. اردو سیرت نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

5. مغربی مصنفین کی سیرت نگاری کے خدوخال کی وضاحت کیجیے۔

6. عربی اور اردو میں لکھی جانے والی تیس کتابوں اور ان کے مؤلفین کے نام لکھیے۔

14.9 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. سیرت النبی (مقدمہ) : علامہ شبلی نعمانی، اعظم گڑھ
2. سیرت نبوی کی اولیں کتابیں اور ان کے مؤلفین : جوزف ہورووٹس/ مترجم نثار احمد فاروقی، نئی دہلی
3. جدید کتابیات سیرت : محمد عارف گھانچی، کراچی
4. مصادر سیرت نبوی : پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (زیر طبع)
5. اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ سیرت، لاہور
6. نقوش رسول نمبر، لاہور
7. اردو نثر میں سیرت رسول : انور محمود خالد، لاہور

اکائی 15 : سیرت نبوی (مکی دور)

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

15.2 تمہید

15.3 سیرت نبوی (مکی دور)

15.4 نبوت اور مکی زندگی

15.5 ہجرت حبشہ

15.6 حضرت عمر بن خطابؓ کا قبول اسلام

15.7 قریش کا بائیکاٹ

15.8 غموں کا سال

15.9 سفر طائف

15.10 واقعہ اسراء و معراج

15.11 بیعت عقبہ اولی

15.12 ہجرت مدینہ

15.13 مکی زندگی میں حضور ﷺ کا طرز عمل

15.14 خلاصہ

15.15 نمونے کے امتحانی سوالات

15.16 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

15.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اسلام کی آمد اور نبی کریم کی بعثت کس ماحول اور حالات میں ہوئی؟ آپ ﷺ کا خاندانی مقام و مرتبہ کیا تھا؟ آپ ﷺ کی پرورش و پرداخت کیسے ہوئی۔ عرب معاشرہ میں آپ ﷺ کی اپنی ذات و شخصیت کو کس نظر

سے دیکھا جاتا تھا۔ بعثت نبوی کے وقت آپ ﷺ کے حالات کیا تھے اور بعثت کے بعد آپ ﷺ کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا نیز آپ نے ﷺ ان کا کس طرح مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ آپ حلف الفضول جیسے معاہدہ، ہجرت حبشہ و مدینہ کے اسباب اور ان کی ضروری تفصیلات سے واقف ہو جائیں گے۔

15.2 تمہید

چھٹی صدی عیسوی کو تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور قرار دیا جاتا ہے۔ انسانیت اپنی تباہی و بربادی کے آخری نقطہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس صدی میں پھیلی ہوئی عالمگیر تاریکی اور اس ماحول میں بعثت نبوی کا ذکر ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے:
’’چھٹی صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جاسکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلی قدروں کی حامل ہو، نہ کوئی ایسی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو، اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات وخصوصیات کا حامل ہو، اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی کوئی روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے صحیح علم اور صحیح عمل نایاب ہو چکا تھا اور خدا کا راستہ بتانے والے خال خال ہی پائے جاتے تھے۔ اس عالمگیر تاریک اور فساد کا نقشہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ لوگوں کی کرتوت سے خشکی اور تری میں فساد پھیل چکا تھا۔ ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب غار میں گرنے والی تھی عین وقت پر اللہ تعالی نے محمد رسول اللہ ﷺ کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں‘‘۔

15.3 سیرت نبوی (مکی دور)

15.3.1 عرب کی وجہ تسمیہ اور جزیرۃ العرب کے حدود

عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ بعض اہل لغت کے مطابق اس کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں چونکہ عرب زبان جو معاملے میں خود کو دوسروں کے مقابلے میں برتر تصور کرتے تھے اس لئے انھوں نے خود کو عرب اور دوسروں کو عجم سے موسوم کیا۔ دوسری رائے کے مطابق لفظ عرب دراصل ’’عـــربة‘‘ تھا جس کے معنی سامی زبانوں میں دشت وصحرا اور ریگستان کے ہیں چونکہ ملک کا زیادہ تر حصہ صحرا پر مشتمل ہے لہذا اس کا نام عرب پڑ گیا۔ اس رائے کو زیادہ معتبر قرار دیا جاتا ہے۔

جزیرۃ العرب اپنے طول و عرض میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے جو ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے تین طرف میں پانی ہے چنانچہ مشرق میں خلیج عرب یا خلیج فارس، جنوب میں بحر ہند اور مغرب میں بحر احمر یا بحر قلزم واقع ہے جب کہ شمال میں وہ مفروضہ سرحدی خط ہے جو خلیج عقبہ سے خلیج عرب میں شط العرب کے دہانے سے گذرتا ہے۔ اس پورے جزیرہ نما پر صحرائیت کا غلبہ ہے اور طبعی عوامل، ارضیاتی حوادث اور جغرافیائی جائے وقوع کے سبب اس پر خشکی غالب ہے۔

جزیرۃ العرب کے شہر مکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ سکونت پذیر ہوئے اور اللہ کی بندگی کے لیے وہاں سب سے پہلا گھر ''کعبہ' بنایا اور اس کو ہمیشہ آباد رکھنے کی دعا کی۔اس دعا کی مقبولیت کے نتیجہ میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی اور یہ خط ساری دنیا میں برپا ہونے والے انقلاب کا سرچشمہ بن گیا۔

15.3.2 جزیرۃ العرب میں بعثت کے اسباب

جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ کی بعثت کے اسباب میں سے عربوں کی فطری زندگی بھی ایک سبب تھی کہ ان کے دلوں کی تختی بالکل صاف تھی۔اپنی اصل فطرت پر قائم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور آہنی ارادہ کے مالک تھے کہ اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کے خلاف تلوار اٹھا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اگر سمجھ میں آ گئی تو اس کو نہ صرف دل سے قبول کرتے تھے بلکہ اس کے لیے اپنی جان دینے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

جزیرۃ العرب میں بعثت کا دوسرا سبب مکہ میں خانۂ کعبہ کی موجودگی تھی جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا اور جسے آگے چل کر ہمیشہ کے لیے توحید کی دعوت کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کا نتیجہ تھی جو انھوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کرتے وقت کی تھی ﴿**ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایٰتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم انک أنت العزیز الحکیم**﴾ ''اے ہمارے رب انھیں میں سے ان کے اندر ایک ایسے پیغمبر کو مقرر کر جو ان لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائیں اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔بلاشبہ آپ ہی قدرت والے اور حکمت والے ہیں۔

جزیرۃ العرب میں بعثت کا تیسرا سبب خود جزیرۃ العرب کا مخصوص جغرافیائی محل وقوع ہے جس نے اسے سب سے موزوں مرکزِ دعوت کی شکل دے دی تھی کہ وہاں سے اس نئی دعوت و پیغام کو ساری دنیا میں پہنچایا جاسکتا تھا اور ساری قوموں کو خطاب کیا جاسکتا۔کہ ایک طرف وہ براعظم ایشیا کا ایک حصہ تھا تو دوسری جانب براعظم افریقہ و یورپ سے قریب تھا اور مختلف براعظموں کو جوڑتا بھی تھا۔ساتھ ہی ساتھ وہ تجارتی کاروانوں کی گذرگاہ بھی تھا جس کے نتیجہ میں مختلف ممالک و اقوام کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ان کے اور ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتے رہتے تھے۔مزید برآں دو زبردست برسرپیکار طاقتوں' عیسائیت و مجوسیت' کے درمیان واقع ہونے کے باوجود اس سے ان کی ماتحتی قبول نہیں کی اور کبھی بھی اپنی آزادی کا سودا نہیں کیا اور خصوصیات کی ہمیشہ حفاظت کی۔

15.3.3 رسول اکرم ﷺ کے آباء واجداد

رسول اللہ ﷺ کا اصل خانوادہ خاندان بنوعبد مناف ہے جس کی چار اہم اور بڑی شاخیں ہیں: بنوعبد شمس، بنو ہاشم، بنومطلب اور بنونوفل۔

آپ ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم کا شمار مکہ کے سربرآوردہ اور معززین میں ہوتا تھا۔ان کا نام عمرو تھا، ان کے عہد میں مکہ میں سخت قحط پڑا ۔وہ زبردست سخاوت وفیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زمانہ تک لوگوں کو ہشیم اور ثرید جیسے کھانا فراہم کرتے

رہے جس کی وجہ سے ان کا نام ہاشم پڑ گیا۔ وہ حاجیوں کی خدمت اور مہمان نوازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اس سخاوت اور فیاضی سے ہاشم کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا شمار مکہ کے اشراف میں ہوتا تھا۔ وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جود وسخا اور فیاضی میں سارے عرب میں مشہور تھے۔ بیت اللہ کے زائرین کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار اور سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ بے کسوں اور مظلوموں کی فریادرسی اور اعانت میں کبھی سستی نہیں کرتے تھے۔ انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی خوراک مہیا کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ عمدہ اخلاق ومحاسن کے پیکر تھے۔ اخلاق رذیلہ اور پست خیالات سے خود بھی بچتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی ان سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں بت پرستی اور شرک کو بالکل چھوڑ دیا تھا اور ملت ابراہیمی اختیار کر کے پکے موحد بن گئے تھے۔ شراب نوشی زنا کاری، ظلم وسرکشی اور برہنہ ہوکر طواف کعبہ سے منع کیا کرتے تھے۔ وہ مستجاب الدعوات بھی تھے۔ ان اوصاف وکمالات کی بنا پر لوگ انھیں الفیاض اور شیبۃ الحمد کے معزز القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔

عبدالمطلب کے زمانہ کا سب سے مشہور واقعہ اصحاب الفیل ہے کہ یمن کے عیسائی حکمراں ابرہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ناپاک ارادہ کیا لیکن اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہا۔ اللہ تعالی نے اپنی تائید سے قریش کی کمزور مدافعت کو اتنا موثر بنادیا کہ اصحاب فیل کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے جس کی طرف قرآن کریم کی سورہ ایلاف میں اشارہ کیا گیا ہے۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ اتنی اہمیت کا حامل قرار پایا کہ انھوں نے اس سے اپنے کلینڈر کا آغاز کیا اور وہ سال عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہلایا۔

آپ ﷺ کے والد محترم عبدالمطلب کے سب چہیتے، لاڈلے اور چھوٹے بیٹے تھے۔ حضرت عبدالمطلب نے زمزم کے کنویں کے تعلق سے یہ منت مانی تھی کہ اگر وہ ان کے قبضہ میں آ گیا اور ان کے دس بیٹے ہوں گے تو وہ اپنے ایک بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کردیں گے۔ انھیں جب اپنے مقصد میں کامیابی مل گئی تو انھوں اپنی نذر و منت کو پورا چاہا۔ اتفاق سے قرعہ ان کے اس بیٹے کے نام نکلا جو انھیں سب سے چہیتا تھا اور اللہ نے جس کے مقدر میں یہ شرف لکھ دیا تھا وہ اس پیغمبر اعظم ﷺ کے والد ہوں گے جن کی بعثت کی دعا حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کی تھی اور جس کی بشارت حضرت مسیح علیہ السلام نے سنائی تھی۔

عبدالمطلب جب اپنے بیٹے کو لے کر قربان گاہ کی طرف چلے تو قریش نے اس سے روکا کہ اس ایک غلط ریت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ نذر کی تکمیل کیونکر ہو؟ اس لیے عبدالمطلب کو یثرب کی مشہور کاہنہ کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا۔ اس نے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ خانہ کعبہ کے دس اونٹ اور عبداللہ کے مابین قرعہ ڈالا جائے، اگر قرعہ عبداللہ کے نام نکلتا ہے تو بیس اونٹ پر قرعہ ڈالا جائے، دس دس اونٹ کا اضافہ اس وقت تک کیا جائے جب تک اونٹوں پر قرعہ نہیں نکلتا ہے۔ جب یہ عمل کیا گیا تو عبداللہ کا فدیہ سو اونٹ ٹھہرا۔ عبدالمطلب نے احتیاطا تین بار قرعے کی تکرار کر کے اطمینان کرلیا کہ واقعی وہ اللہ کو منظور ہے۔

جناب عبداللہ حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جمیلہ کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اٹھارہ سال یا دوسری روایات کے مطابق کم وبیش پچیس سال کی عمر میں عبدالمطلب نے جناب عبداللہ کا نکاح بنوزہرہ کے ایک ممتاز خاندان کی ایک شریف زادی اور نیک و پاک باز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب سے کردیا۔

آنحضرتﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ طہارت نفس، شرافت نسب، عزت و وجاہت، عفت و پاکبازی میں بے مثال تھیں اور اپنی قوم میں سیدۃ النساء کے لقب سے مشہور تھیں۔ ددھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے آنحضرتﷺ عرب کے بہترین قبیلے اور بہترین قوم میں سے تھے۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے لیے شام چلے گئے۔ واپسی میں بیمار ہوکر مدینہ منورہ میں اپنے رشتہ داروں کے پاس ٹھہر گئے۔ جب قافلہ والوں نے ان کی بیماری کا احوال عبدالمطلب سے بیان کیا تو انھوں نے اپنے بیٹے حارث کو ان کی خبر گیری کے لیے روانہ کیا لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب یہ خبر مکہ پہنچی تو عبدالمطلب اور ان کے خانوادہ پر بجلی بن کر گری۔ حضرت آمنہ کی دنیا ہی اجڑ گئی لیکن وہ صبر و رضا اور ہمت و استقامت کا پیکر اور راضی برضائے الٰہی ہوکر صبر و شکر کی مثال بن گئیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاتم النبیین، سید المرسلین اور رحمۃ للعالمین کی ماں ہونے کا شرف بخشنے کا فیصلہ فرما دیا تھا۔ آپﷺ کی ولادت جناب عبداللہ کی وفات کے سات ماہ بعد ہوئی جس نے اس غمزدہ خاندان کی جھولی کو خوشیوں سے بھر دیا۔

15.3.4 نسب

ابوالقاسم محمد (رسول اللہﷺ) بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قُصَی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

مذکورہ بالا نسب آپﷺ سے مروی ہے اور اس کے اوپر کے متعلق آپﷺ نے ارشاد فرمایا ''کذب النسابون'' (نسب بنانے والے جھوٹے ہیں)۔

آنحضرتﷺ کے نسب کے سلسلہ میں عدنان تک تو سب متفق ہیں لیکن اس سے اوپر حضرت اسماعیل علیہ السلام تک ماہرین انساب میں اختلاف ہے کہ کتنی پشتیں ہیں۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ بعض نساب نسبت کے وقت اوپر کے صرف نامور اور مشہور آباء و اجداد کا ذکر کر دیتے ہیں اور کم مشہور افراد کو درمیان سے حذف کر دیتے ہیں چنانچہ جن لوگوں نے آنحضرتﷺ کے اجداد کا استقصا کیا ہے ان کے نزدیک تعداد زیادہ ہے اور جن حضرات نے صرف نامور اور چیدہ آباء و اجداد شمار کیے ہیں، ان کے نزدیک تعداد کم ہے۔

نسب نبویﷺ کے ضمن یہ بات قابل ذکر ہے کہ آنحضرتﷺ کے سلسلۂ نسب کی ایک ایک کڑی، جس سے آپﷺ کا سلسلۂ پیدائش مربوط ہے، نجابت و شرافت اور عزت و نیک نامی کا پیکر تھی۔ آپﷺ کے سب آباء و اجداد اور والدہ ماجدہ، نانیاں اور دادیاں نہایت پاکباز، نیک اور باوقار خواتین تھیں۔ آپﷺ کے تمام بزرگ شرعی نکاح سے پیدا ہوئے تھے۔ آپﷺ کے سارے خاندان میں کبھی کوئی شخص زنا اور بدکاری کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ آپﷺ کا سارا سلسلۂ نسب محترم، نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں معزز اور مؤقر تھے۔ شرافت نسبی بھی آپﷺ کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کو انتہائی شریف و اعلیٰ خاندان میں پیدا فرماتا ہے۔ حضرت محمدﷺ کا خاندان قریش کے خاندانوں میں سب سے ممتاز تھا۔ فرمان نبوی کے مطابق ''اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے حضرت

اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور بنو اسماعیل میں سے بنو کنانہ کو اور بنو کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا''۔

15.3.5 ولادت

سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش دوشنبہ (پیر) کے روز پہلے عام الفیل کے ماہ ربیع الاول کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی۔ ربیع الاول کی تاریخ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور و متداول روایت وقول کے مطابق ولادت نبوی کی تاریخ 12/ربیع الاول قرار پاتی ہے لیکن مشہور ماہر فلکیات وہیئت داں محمود پاشا کی تحقیق کے مطابق وہ بابرکت تاریخ 9/ربیع الاول تھی کہ 12/ربیع الاول کی تاریخ پیر کے روز کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی ہے۔ عہد حاضر کے متعدد سیرت نگاروں نے محمود پاشا کی بیان کردہ تاریخ کو صحیح مانتے ہوئے 9/ربیع الاول کی تاریخ کو درست مانا ہے جو آپ ﷺ کی ولادت کی عیسوی تاریخ 22/اپریل 571ء سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔

15.3.6 رضاعت

عرب کے شرفاء کے دستور کے مطابق آپ ﷺ کو اپنی ماں کا دودھ یا تو نصیب ہی نہ ہوا یا ہوا تو محض چند روز کے لیے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ کو ابولہب کی باندی ثوبیہ نے دوددھ پلایا جس سے خوش ہو کر ابولہب نے اپنی مذکورہ باندی کو آزاد کردیا تھا۔ ان کے بعد آپ ﷺ کو دودھ پلانے کی سعادت بنوسعد کی حضرت حلیمہ سعدیہؓ کو ملی کہ وہ اپنے قبیلہ کی ہم پیشہ خواتین کے ساتھ وہاں کی رسم کے مطابق شیرخوار بچوں کی تلاش میں آئی تھیں۔ آپ ﷺ جس عورت کے سامنے بھی پیش کیے جاتے وہ اس لیے انکار کردیتی کہ یتیم بچے کے خاندان سے زیادہ مالی و مادی منفعت کی امید نہیں ہے۔ ابتداء میں حضرت حلیمہ نے بھی آپ ﷺ پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن آخر کار آپ ﷺ کے لیے حلیمہ نے اپنی گود وا کردی اور آپ ﷺ کو لے کر اپنی وادی میں چلی گئیں۔ یتیم عبداللہ ﷺ کی فطرت میں اللہ نے عدل رکھ دیا تھا کہ وہ اپنی رضاعی ماں کی صرف ایک ہی چھاتی کو منھ لگاتے تھے اور دوسری کو ہمیشہ اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔

دو یا ڈھائی سال کی عمر میں دودھ چھڑانے کے بعد حضرت حلیمہؓ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ کے پاس لے گئیں۔ ان دنوں مکہ کی آب و ہوا خراب تھی لہذا والدۂ ماجدہ نے آپ ﷺ کو دوبارہ حضرت حلیمہ کے ساتھ واپس بھیج دیا جہاں آپ ﷺ چھ سال کی عمر تک رہے اور آپ ﷺ کی ذات گرامی کے فوائد سے حضرت حلیمہ سعدیہ کے خاندان کے ساتھ ساتھ بنوسعد بھی مستفیض ہوتے رہے۔ مشہور روایت کے مطابق اسی دوران واقعۂ شق صدر بھی پیش آیا کہ دو فرشتوں نے آپ ﷺ کے سینۂ مبارک کو چاک کر کے قلب مبارک سے گوشت کے ٹکڑے یا لوتھڑے کی مانند ایک خراب اور سیاہ چیز نکال کر باہر پھینک دی اور قلب کو اچھی طرح دھو کر اور صاف کر کے اس کی جگہ رکھ دیا اور وہ اس طرح ہو گیا جیسے پہلے تھا۔

15.3.7 والدہ اور دادا کی وفات

چھ سال کی عمر میں والدہ محترمہ نے آپ ﷺ کو واپس بلایا اور آپ ﷺ اور خادمہ ام ایمنؓ کے ساتھ مرحوم شوہر کی قبر دیکھنے کے لیے مدینہ گئیں۔ وہاں محلّہ بنونجار میں ایک مہینہ قیام رہا۔ واپسی میں ابواء نامی مقام پر ان کا انتقال ہوگیا۔ وہیں ان کی تدفین دی گئی۔ حضرت ام یمنؓ آپ ﷺ کو واپس لائیں اور عبدالمطلب کی امانت ان کے حوالہ کردی۔ دادا نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اب ماں کے فرائض کی ادائیگی کا بار بھی اٹھالیا۔ آٹھ سال کی عمر میں شفیق ومحبت کرنے والے دادا نے بھی اپنی آنکھیں موندلیں اور آپ ﷺ کی کفالت و پرورش کا بار مشہور روایات کے مطابق جناب ابوطالب کو اٹھانا پڑا جو اپنے تمام بھائیوں میں سب سے کم آمدنی والے لیکن زیادہ خرچ والے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے محبوب چچا کی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے منع کرنے کے باوجود رؤسائے قریش کی بکریاں اجرت پر چرانا شروع کردیں تاکہ چچا کے اخراجات میں کسی حد تک تعاون کرسکیں۔

آپ ﷺ اپنے شفیق ومحبت کرنے والے چچا و چچی کے سایۂ عاطفت میں پلتے رہے یہاں تک سن شعور تک پہنچ گئے۔ چونکہ اللہ تعالی کو آپ ﷺ کو رسالت ونبوت سے نوازنا تھا اس لیے آپ ﷺ کی تربیت اور نشوونما ایک خاص انداز میں ہوئی۔ اللہ تعالی نے ہر قدم پر اپنے حبیب ﷺ کی رہنمائی اور حفاظت فرمائی اور جاہلیت کی تمام بری اور مشرکانہ عادات سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ آپ ﷺ اپنی قوم کی کسی مشرکانہ تقریب میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت پاکبازی اور راست بازی میں گذری۔ بچپن سے ہی آپ ﷺ شرم وحیا کے پیکر تھے۔ ایک طرف آپ ﷺ امانت داری، راست گفتاری اور دیگر اوصاف حمیدہ واخلاق فاضلہ سے آراستہ تھے تو دوسری طرف بدگوئی، فحش بیانی، غیر مہذب اور خراب عادتوں سے بھی بہت دور تھے۔ آپ ﷺ نے نہ تو کبھی میلے ٹھیلے میں شرکت کی اور نہ لہو ولعب میں شامل ہوئے۔ اگر ایک دومرتبہ ارادہ بھی کیا تو اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو اس سے باز رکھا اور کسی صورت میں بھی تماشاہ گاہ تک پہنچ نہ پائے۔

15.3.8 اولین سفر تجارت

جناب ابوطالب نے جب فلسطین کے تجارتی سفر کا ارادہ کیا تو وہ آپ ﷺ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ بیت المقدس کے شمال دمشق کے قریب میں بُصریٰ نامی مقام پر بحیرا راہب نے خلاف معمول ان کی ضیافت کا سامان کیا کہ انھیں اس قافلہ کے ساتھ خدا کا خاص معاملہ اور غیر معمولی واقعات نظر آرہے تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو آپ ﷺ کی مزید پذیرائی کی اور اس بات کا اطمینان کرلیا کہ نبوت کی نشانیاں آپ ﷺ میں موجود ہیں۔ انھوں نے ابوطالب کو آپ ﷺ کی شان ومرتبہ کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ آپ ﷺ کو لے کر وطن واپس جائیں اور یہود سے خاص طور سے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائیں۔ ان کے مشورہ کے مطابق ابوطالب غالبا اپنا سفر ادھورا چھوڑ کر مکہ واپس چلے آئے۔

مذکورہ بالا واقعہ سیرت کو ابن ہشام اور سیرت کی دیگر کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کی صحت میں محدثین وناقدین کو روایۃً اور درایۃً دونوں لحاظ سے شک ہے۔ اس واقعہ کو مستشرقین نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عقیدۂ توحید کی یہ صاف وبے لاگ تعلیمات آپ ﷺ نے دراصل ایک عیسائی عالم سے حاصل کی تھیں۔

15.3.9 عہد شباب

مکہ مکرمہ میں ابو طالب کی ایک دکان تھی ۔ وہ کپڑے اور عطر کا کاروبار کرتے تھے ۔ننھا اور ذہین بھتیجا بھی اسی ماحول میں پروان چڑھا۔فطری دیانت داری کی وجہ سے رفتہ رفتہ شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوتی چلی گئی ۔ آپ ﷺ کی راست بازی اور راست گفتاری کی وجہ سے ''الامین ''اور'' الصادق '' کا خطاب آپ ﷺ کے لیے زبان زد خاص وعام ہوگیا ۔کتب احادیث وسیر کے مطابق آپ ﷺ نے قبل از نبوت عہد نبوت میں تجارتی کاروبار کیا تھا اور اس میں بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی تھی ۔

آپ ﷺ نے اپنے چچا و دیگر افراد کے ساتھ شام و فلسطین و یمن و بحرین وغیرہ کے جو اسفار تجارت کیے تھے اس سے آپ ﷺ کو تجارتی اصول وضوابط سیکھنے میں بڑی مدد ملی ۔لہذا جب آپ ﷺ نے آزادانہ تجارت شروع کی تو ان اصول وضوابط سے یقینی طور پر فائدہ اٹھایا ہوگا ۔اس دوران میں آپ ﷺ نے جن لوگوں کے ساتھ لین دین کیا انھوں نے آپ ﷺ کو انتہائی امین ، پابند عہد اور دیانت دار پایا۔

15.3.10 جنگ فجار

آپ ﷺ چودہ ،سترہ یا بیس سال کے تھے کہ جنگ فجار (حرب الفجار) چھڑی ۔ 585ء میں یہ جنگ قیس عیلان اور قریش کے قبیلوں میں حج کے محترم مہینے میں پیش آئی ۔قریش چونکہ اس جنگ میں برحق تھے اس لیے آپ ﷺ نے اپنے خاندان کی مدافعت میں عملی حصہ لیا چنانچہ آپ اپنے ایک چچا کو تیر پکڑانے کا کام کررہے تھے ۔

اس جنگ کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ شاہ حیرہ نعمان بن منذر کے ایک تجارتی قافلہ کی سربراہی کے مسئلہ کو لے کر اس جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلۂ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہا ۔ جنگ فجار چار جنگوں کا نام ہے جو بالترتیب 585ء، 586ء، 587ء، 588ء میں صرف ذوالحجہ کے مقدس مہینہ میں ہوئیں ۔ چونکہ قریش اس زمانہ میں جنگ کرنا حرام سمجھتے تھے لہذا انھوں نے ان جنگوں کے بعد '' قد فجرنا '' (ہم نے گناہ کا ارتکاب کیا) کا اعتراف کیا ۔اس اعتراف کی بنا پر مذکورہ بالا سلسلۂ جنگ ''حروب الفجار '' کے نام سے مشہور ہے ۔

15.3.11 حضرت خدیجہؓ کے مال کے ساتھ سفر تجارت

جب آنحضرت ﷺ کی عمر پچیس سال کے قریب ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آپ ﷺ کی زندگی میں انقلاب پیدا کردیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ ﷺ کی دیانت داری ،حسن معاملہ اور ایفائے عہد کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا ۔ وہ شہرت حضرت خدیجہؓ کے کانوں تک بھی پہنچی ۔ وہ ایک مالدار تجارت پیشہ خاتون تھیں اور مکہ معظّمہ میں اپنی نیک نامی کے باعث '' طاہرہ '' کے نام سے مشہور تھیں ۔انھوں نے آپ ﷺ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میرا سامان تجارت لے کر شام جائیں ، جو معاوضہ دوسروں کو ملتا ہے اس سے آپ ﷺ کو دوگنا ملے گا ۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ پیشکش اپنے چچا ابو طالب سے مشورہ کرنے کے بعد قبول کرلی ۔

حضرت خدیجہؓ نے بہت سا سامان تجارت آپ ﷺ کے سپرد کیا اور ایک غلام جس کا نام میسرہ تھا کو بھی رفاقت و خدمت کے لیے ساتھ کر دیا۔ اس مرتبہ بھی آپ ﷺ نے بُصریٰ کا سفر کیا۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا اور معمول سے زیادہ منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ نے وعدے کے مطابق آپ ﷺ کو معاوضہ دیا اور انعام واکرام کے ساتھ ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ آپ ﷺ کی دیانت داری سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔

15.3.12 حضرت خدیجہؓ سے نکاح

مذکورہ بالا سفرِ تجارت کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ واپسی کے تین مہینے بعد آپ ﷺ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوگئی۔ عام روایات کے مطابق اس وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی۔ اس نکاح میں آپ ﷺ کی جانب سے شریک ہونے والوں میں جناب ابوطالب اور حضرت حمزہؓ اور حضرت خدیجہ کی جانب سے جناب ورقہ بن نوفل وغیرہ شریک تھے۔ خطبۂ نکاح جناب ابوطالب نے پڑھا۔

شادی کے بعد جس طرح ہر شخص کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اب تک آپ ﷺ لوگوں کی بکریاں واونٹ اجرت پر چراتے تھے یا مکہ کے تاجروں کا مال لے کر ادھر ادھر کا سفر کرتے تھے اور اسے فروخت کرتے تھے لیکن شادی کے بعد آپ ﷺ نے ان سب کاموں کو چھوڑ دیا اور حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی نگرانی کرنے لگے اور مستقل طور پر مکہ میں قیام پذیر ہوگئے۔

15.3.13 حلف الفضول

قبل اسلام مکہ میں اس نام سے دو معاہدے ہوئے تھے جس میں وہاں کے چند نیک نیت اور شریف افراد نے آپس میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ اپنے شہر میں کسی پر ظلم نہیں ہونے دیں گے، چاہے وہ وہاں کا باشندہ ہو یا اجنبی۔

پہلا معاہدہ شہر کے اولین بازآبادکاروں میں طے ہوا تھا۔ قبیلۂ جرہم سے تعلق رکھنے والے تین سرداروں -فضل بن وداعہ، فضل بن قضاعہ یا فضل بن فضالہ اور فضیل بن حارث یا فضیل بن شراعہ- نے حلف لے کر اقرار کیا تھا کہ اگر کسی کمزور و بے بس پر ظلم ہو تو ہم اپنے کنبوں سمیت مظلوم کی حمایت اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ ظلم کرنے والا اس کا حق نہ دے دے اور ضعیف کو قوی سے اور اجنبی کو مقامی آدمی سے اس کا حق نہ دلا دیں۔ حلف الفضول کا اولین معاہدہ کم و بیش چار ہزار سال قبل ہوا تھا۔

حلف الفضول کا دوسرا معاہدہ سنہ ہجری سے کوئی تینتیس سال قبل ہوا تھا جس کہ تحت حلف الفضول کے مشہور معاہدہ کی تجدید ہوئی۔ اس تجدید کا یہ سبب بیان کیا جاتا ہے کہ یمن کے قبیلہ زبید کا ایک شخص عمرہ کرنے مکہ آیا اور حسب معمول اپنے ساتھ کچھ سامان فروخت کرنے کے لیے بھی لایا۔ اکثر روایات کے مطابق عاص بن وائل سہمی نے اس شخص کو قیمت دینے میں لیت ولعل سے کام لیا۔ براہ راست مطالبوں سے کام نہ چلا تو وہ دیگر سربراہان مکہ کے پاس گیا لیکن تب بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس وقت وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور وہاں سے اپنی مظلومی کی داستان چند طنزیہ اشعار میں بہ آواز بلند سنائی جسے سن کر بعض

سربراہان قریش کو غیرت بھی آئی اور برا بھی لگا لہذا زبیر بن عبدالمطلب نے ایک نئے حلف الفضول کی تجویز پیش کی اور اس کی بھرپور تائید عبداللہ بن جُدعان نے کی۔ نتیجتاً ایک نئے حلف الفضول کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے بعد سب نے مل کر عاص بن وائل سے زبیدی تاجر کا حق دلوایا اور بعد میں بھی بڑے لوگوں سے معاملہ کرنے میں یہ معاہدہ کام آتا رہا۔

اس معاہدہ میں شامل ہونے والوں میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو زہرہ اور بنو تیم شامل تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس معاہدہ میں بنو حارث بن فہر یا بنو اسد بن عبدالعزیٰ بھی شامل تھے۔

معاہدہ کی تفصیلات میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس معاہدہ کی تفصیلات یہ بیان کی جاتی ہیں کہ اگر مکہ میں کسی پر ظلم ہوگا تو ہم اس کی مدد کو دوڑیں گے اور ظالم کو مکہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اس معاہدہ کی قرارداد پیش کرنے میں آپ ﷺ بھی پیش پیش تھے۔ یہی وجہ کہ آپ ﷺ بعثت کے بعد فرماتے تھے ''میں نے یہ حلف اٹھایا تھا۔ اگر آج بھی کوئی اس کی دہائی دے تو میں اس کی مدد ضرور کروں گا اور قیمتی سرخ اونٹوں کی ایک قطار کے عوض بھی اس فریضہ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوں گا''۔

یہ معاہدہ حلف الفضول اس لیے کہلاتا ہے کہ شروع میں اس معاہدہ کا جن افراد کو خیال آیا تھا ان تمام لوگوں کے ناموں میں لفظ ''فضل'' مشترک تھا۔

15.3.14 خانۂ کعبہ کی تعمیر نو

سماجی روایت کے مطابق خانۂ کعبہ کے بیرونی پردوں کو بخور کی دھونی دی جاتی تھی۔ اس عمل کے دوران ایک مرتبہ ہوا کی شدت سے چنگاریوں نے پردوں میں آگ لگا دی، عمارت کافی پرانی اور کمزور ہوگئی تھی، رہی سہی کسر تیز اور موسلا دھار بارش نے پوری کردی اور عمارت مکمل طور پر بیٹھ گئی۔ اہل مکہ نے اس کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا اور تعمیر جدید میں صرف حلال کمانے اور کھانے والوں سے چندہ لیا، سود خوروں اور قحبہ خانوں کے مالکوں کا چندہ قبول نہیں کیا گیا۔ انھیں دنوں مکہ کے قریب شعیبہ (جدہ) میں مصر سے آنے والی ایک کشتی ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ زندہ بچے، کچھ سامان بھی بچایا جا سکا جس میں ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے بھی تھے۔ اہل مکہ نے ان کا سارا سامان حتی کہ کشتی کے تختے بھی خرید لیے تاکہ انھیں کعبہ کی چھت میں استعمال کیا جا سکے۔

اہل مکہ نے پہلے خانۂ کعبہ کا ملبہ صاف کیا اور پرانی بنیادوں پر نئی دیواریں کھڑی کرنی شروع کردی۔ قبائل شہر نے کام بانٹ لیا تھا لہذا ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے بھی اپنے قبیلہ کے ساتھ اس تعمیر نو میں حصہ لیا۔ سارے کام خوش اسلوبی سے انجام پائے یہاں تک کہ چار دیواری کوئی گز بھر بلند ہوگئی۔ اس وقت حجر اسود کو اس کے مقررہ مقام پر نصب کرنے کا معاملہ سامنے آ گیا۔ ہر قبیلہ اس شرف کو حاصل کرنا چاہتا تھا لہذا اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے قبائل میں رقابت کا آغاز ہوگیا اور بات خون خرابے تک پہنچ گئی ایک بزرگ ابوامیہ حذیفہ بن مغیرہ نے یہ مشورہ دیا کہ اس وقت جو شخص سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر آئے اسے حکم بنا دیا جائے۔ سب نے اس رائے کو قبول کرلیا۔ اتفاق سے آپ ﷺ مسجد میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص تھے۔ آپ ﷺ کو دیکھ سب بیک زبان پکار اٹھے ''یہ تو امین ہیں۔ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے''۔ سارا ماجرا سن کر آپ ﷺ نے ایک چادر منگوائی اور اس میں حجر اسود کو رکھا اور قبائل کے نمائندوں نے چادر کے کونے کو پکڑ کر حجر اسود کو اٹھا کر دیوار کے قریب

کیا۔اس کے بعد آپ ﷺ نے سب کی اجازت اور ان سب کے متفقہ وکیل ہونے کی حیثیت سے پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کیا۔اس طرح آپ ﷺ نے اپنی حکمت و دانشمندی سے ایک بڑے قضیہ کا فیصلہ کر دیا اور اہل مکہ کو ایک یقینی کشت و خون سے بچا لیا۔

15.3.15 کار رسالت کے لیے تربیت

نبوت و رسالت کا منصب اپنے ساتھ بہت بڑی ذمہ داریاں لاتا ہے لہذا جس شخص کو اللہ تعالی اس منصب سے نوازنا چاہتا ہے اس کی پیدائش کے وقت سے ہی خاص تربیت فرماتا ہے۔ یہ تربیت اللہ تعالی کی خصوصی نگرانی میں ہوتی ہے۔اس لیے وہ ہونے والے نبی کی خاص امداد فرماتا ہے اور اس کو مشکلات سے نکالنے کے لیے غیر معمولی انتظامات بروئے کار لاتا ہے۔ یہ سنت الٰہی ہمیں حیات نبوی کے ہر ہر قدم پر بہت واضح طور پر نظر آتی ہے چنانچہ آپ ﷺ پیدا ہوئے تو والد کی وفات ہو چکی تھی لہذا آپ ﷺ ان کے سایۂ عاطفت سے محروم تھے۔آپ ﷺ کو یتیمی کی بنا پر کن دشواریوں سے گذرنا پڑا ہوگا اس کا ذکر تو کتب سیرت میں نہیں ملتا ہے لیکن دیگر یتیموں کے حالات کو دیکھتے ہوئے آپ کی پریشانیوں و مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس کی صرف ایک مثال کتب سیرت میں ملتی ہے کہ جب آپ ﷺ کو دائیوں کے سامنے پیش کیا گیا تو اکثر نے آپ ﷺ کو گود لینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ آپ ﷺ یتیم تھے۔

آپ ﷺ والد کے سایۂ عاطفت سے محروم تو تھے ہی والدہ کی محبت و شفقت سے بھی بھر پور طور سے مستفیض نہ ہو سکے کیونکہ ان کا انتقال بھی بہت جلد ہو گیا والدین کی وفات کے بعد شفیق دادا نے آپ ﷺ پر اپنی محبت و شفقت نچھاور کر دی لیکن یہ دورانیہ بھی بہت ہی مختصر ثابت ہوا اور دادا نے بھی اپنی آنکھیں موند لیں۔اس وقت آپ ﷺ کی عمر محض آٹھ سال تھی۔آپؐ خاندان بنو ہاشم کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے قبیلہ کی عمومی تولیت میں ضرور تھے لیکن زندگی کی جدوجہد میں بہر حال آپ خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔والد محترم نے بھی کچھ خاص ترکہ نہیں چھوڑا تھا جس کی مدد سے کوئی کاروبار تجارت کیا جا سکتا لہذا آپ ﷺ نے دیگر انبیا کی طرح مکہ والوں کی بکریاں چرائیں اور کفالت کرنے والے کی ضروریات کی تکمیل میں ہاتھ بٹایا۔

نبی کریم ﷺ کی عمر جب معاشی جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے کی ہوئی تو دوسرے قریشی نوجوانوں کی طرح آپ ﷺ بھی تجارتی سفروں میں جانے لگے۔ان اسفار سے آپ ﷺ کو گوناگوں فوائد حاصل ہوئے۔تجارتی اسفار کے نتیجے میں ہونے والی تربیت اس وقت کام آئی جب آپ ﷺ اللہ کے دین کی دعوت پھیلانے پر مامور ہوئے اور اس سلسلہ میں افراد اور وفود کے ساتھ آپ ﷺ کے مذاکرات ہونے لگے۔

آپ ﷺ کے عنفوان شباب میں حلف الفضول جیسے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور اس کے ذریعہ اس بات کی تربیت کی گئی کہ خیر کے کاموں میں شریک ہونے اور حق کی پاسداری کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔

نبیوں کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جس ماحول میں تبلیغ کے لیے مبعوث کیے جانے والے ہوتے ہیں اللہ تعالی ان کو اس ماحول سے پوری طرح آگاہ کرنے کا سامان کر دیتا ہے۔حضور اکرم ﷺ کی بعثت چونکہ بنو اسماعیل میں ہونے والی تھی اور آپ ﷺ کو ملت ابراہیم کو از سر نو زندہ کرنا تھا لہذا آپ ﷺ کو بنو اسماعیل کی مرکزی بستی مکہ میں ان کے معزز اور حکمراں

خانوادے قریش میں پیدا کیا گیا۔ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے بتوں پر انحصار اور ان کی عقیدتوں کے مراکز اور ملت ابراہیمی میں کی گئی خیانتوں سے پوری طرح واقف کرایا گیا۔ مکہ میں پورے عرب سے اکٹھے ہونے والے تمام قبائل کے بارے میں آپ ﷺ کو بہت زیادہ معلومات حاصل تھیں جن سے آپ ﷺ نے نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد بھرپور فائدہ اٹھایا۔

15.3.16 روحانی ریاضت سے شغف ومحبت

عمر مبارک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ آپ ﷺ تنہائی کی جستجو میں رہنے لگے۔ اسی جستجو میں آپ ﷺ غار حراء پہنچے جو آپ ﷺ کو کعبہ کے سامنے ہونے اور اس میں کامل تنہائی اور یکسوئی میسر ہونے کی وجہ سے پسند آیا لہذا آپ ﷺ نے وہاں ابراہیمی طریقہ پر عبادت شروع کردی۔ اس زمانہ میں آپ ﷺ کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ کئی کئی دنوں تک غار حراء میں قیام فرماتے تھے۔ اپنے ساتھ توشہ بھی لے جاتے تھے جس میں آپ ﷺ ادھر سے گزرنے والے مسافروں اور مسکینوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ جب کھانا وغیرہ ختم ہو جاتا تو دوبارہ اپنے اہل وعیال کی طرف واپس آجاتے اور ان کے ساتھ ایک دو روز رہ کر کچھ دنوں کا توشہ لے کر دوبارہ غار حراء چلے جاتے۔ غار حراء میں آپ ﷺ کی آمد ورفت کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔

غار حراء میں آپ ﷺ کی اس عبادت وریاضت کو ''تحنث'' کا نام دیا گیا ہے۔ تحنث کے معنی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کے ہیں۔ علامہ عینی کے مطابق اس کے معنی غور وفکر اور عبرت پذیری کے ہیں جب کہ ابن الجوزی نے اس کے معنی متعدد راتوں کی مسلسل عبادت بیان کیا ہے۔ اس لفظ کے خواہ کوئی بھی معنی لیے جائیں تحنث نے حضور اکرم ﷺ کے قلب مبارک کو وحی کے حصول کے لیے سازگار بنانے میں ابتدائی کام کیا اور وہ قلب صافی تیار کیا جو فرشتہ سے روشنی کے حصول کے لیے موزوں تھا۔

اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو ذہنی اعتبار سے بار نبوت اٹھانے کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔ اسی دوران آپ ﷺ کو رویائے صادقہ کے ذریعہ بشارتیں دی جاتیں، مستقبل کے واقعات سے آگاہ کیا جاتا اور بہت سے مخفی حقائق کے تعلق سے آپ ﷺ کی رہنمائی کی جاتی۔ یہ سلسلہ تقریبا چھ ماہ تک چلتا رہا۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ رات کو جو بھی خواب دیکھتے، بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی میں اس کی صاف شفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی تھی۔ آپ ﷺ کو غیبی آوازیں کثرت سے سنائی دینے لگیں حتی کی ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا ''مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میری عقل متاثر نہ ہو جائے کیونکہ کہ میں اکثر کوئی آواز سنتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا''۔ ان امور کے علاوہ متعدد امور اور نشانیاں ایسی ظاہر ہوئیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

15.4 نبوت اور مکی زندگی

15.4.1 اولین وحی کا نزول

دوشنبہ 17 رمضان 13 قبل ہجری کو حضور ﷺ کے روحانی قوی نے اس مقررہ حد کمال کو حاصل کر لیا جس کے بعد

آپ ﷺ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنی تخلیق کے مقصد کو انجام دینے کے قابل ہو گئے ۔ چنانچہ آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی ۔ جب آپ ﷺ کی عمر قمری اعتبار سے چالیس سال کی ہوئی تو جبریل آنحضرت ﷺ کے پاس غار حراء میں آئے ۔ انھوں نے آپ ﷺ سے کہا: اقـرأ (پڑھو) ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ یہ جواب سن کر انھوں نے آپ ﷺ کو زور سے بھینچا، اور پھر دوبارہ کہا: پڑھو ۔ آپ ﷺ نے دوبارہ جواب دیا: مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ انھوں نے دوبارہ آپ ﷺ کو بڑے زور سے بھینچا، پھر چھوڑ کر کہا: پڑھو ۔ آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دہرایا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا تو حضرت جبرائیل نے آپ ﷺ کو تیسری مرتبہ اس زور سے بھینچا کہ آپ ﷺ تھک کر چور ہو گئے ، پھر آپ کو چھوڑ کر کہا: پڑھو ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا پڑھوں؟ ۔ انھوں نے کہا: ﴿اقـرأ بـاسـم ربـک الـذي خـلـق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الأكرم الذي علّم بالقلم علّم الانسان ما لم يعلم﴾ یعنی ’’پڑھیے اپنے رب کے نام سے ، جو خالق ہے ، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا ہے ، پڑھیے کہ آپ کا رب نہایت بزرگ کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ، اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا‘‘ ۔ جب اس عمل کی تکمیل ہوگئی تو حضرت جبریل واپس چلے گئے اور مذکورہ آیات آپ ﷺ کے ذہن میں نقش ہو گئیں ۔

آپ ﷺ سخت گھبراہٹ کی عالم میں اس طرح گھر تشریف لائے کہ آپ ﷺ کا سارا جسم کانپ رہا تھا ۔ گھر پہنچ کر آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: مجھے کمبل اڑھاؤ ، جب طبیعت سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور اپنی جان کی طرف سے لاحق ہونے والے خوف کا بھی ذکر کیا ۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور آپ ﷺ کے اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ جیسے نیک و صالح فرد کو اللہ کیونکر ہلاک کر سکتا ہے ۔ یقیناً اس معاملہ میں کوئی خیر مخفی ہے جو آپ ﷺ کے لیے خوشخبری کا باعث ہوگا ۔

آپ ﷺ کو دلاسہ دینے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ﷺ اس سلسلہ میں میرے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے بھی مل لیں کہ وہ ایک بڑے عالم اور نیک آدمی ہیں ۔ وہ آسمانی کتابوں کا بھی علم رکھتے ہیں ۔ آپ ﷺ کو رفیق حیات کا مشورہ پسند آیا اور ورقہ بن نوفل کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ تمام روداد سن کر انھوں نے فرمایا: ’’آپ ﷺ اس امت کے نبی ہیں ۔ آپ ﷺ کے پاس بھی وہی فرشتۂ وحی آیا ہے جس کو اللہ حضرت موسی علیہ السلام کے پاس بھیجا جاتا تھا‘‘ ۔ مزید فرمایا: ’’کاش میں توانا ہوتا ، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو اس شہر سے نکال دے گی ۔ حضور اکرم ﷺ نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا میری قوم میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی ۔ انھوں نے فرمایا: ہاں ، جو شخص بھی یہ پیغام لے کر آیا اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی‘‘ ۔

ورقہ بن نوفل نے اس وقت آپ ﷺ سے یہ وعدہ کیا کہ اگر میں زندہ رہا تو میں ان سخت حالات میں آپ کی حتی الامکان بھرپور مدد کروں گا لیکن اس واقعہ کے بعد جلد ہی انتقال ہو گیا تھا ۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا ۔ پھر جاری ہوا اور قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا ۔ فترۂ وحی کے دوران بعض اوقات آپ ﷺ وحی کے اعادے کی خواہش کے باعث بے چین و بے قرار ہو جاتے تو آسمان کے افق پر دوبارہ اسی ناموس اعظم کی جھلک نظر آجاتی جو آپ ﷺ کو یقین دلاتا کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور وہ جبرئیل ہیں ۔

فترۂ وحی کے زمانہ میں آپ ﷺ عموماً مکہ سے نکل کر غاروں میں قیام فرماتے اور وہاں نمازیں پڑھتے اور دیگر امورِ عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ عام طور پر اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت علیؓ رہا کرتے تھے اور وہ آپ ﷺ کی طرح عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

معلومات کی جانچ:

1. حلف الفضول کے معاہدے پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ اس کا سبب کیا تھا؟
2. خانۂ کعبہ کی تعمیر نو کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟

15.4.2 اسلام کی دعوت وتبلیغ اور اولین مسلمان

آپ ﷺ کو جب نبوت سے نوازا گیا تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جن پر آپ ﷺ کو پورا اعتبار تھا کہ وہ آپ ﷺ کی بات کا یقین کریں گے اور ان کی بات بلا کسی تردد کے مان لیں گے کیونکہ انھیں آپ ﷺ کے صادق ہونے کا پورا یقین تھا۔ ان سب سے آپ ﷺ کے ذاتی روابط و دیرینہ تعلقات تھے۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ کو مایوس بھی نہیں کیا اور آپ ﷺ کی پہلی بار دعوت دینے پر آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو دل وجان سے قبول کرلیا۔ روایات کے مطابق عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی آپ ﷺ پر جان چھڑکنے والی بیوی حضرت خدیجہؓ تھیں، دوستوں میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب صدیق پڑ گیا کہ آپ ﷺ کی دعوت کو انھوں نے بلا چوں چرا قبول کرلیا تھا۔ غلاموں میں آپ ﷺ کے جان نثار خادم حضرت زید بن حارثہ اور بچوں میں آپ ﷺ کی تربیت آغوش میں پرورش پانے والے آپ ﷺ کے دس سالہ چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ دعوت نبوی کے اولین مرحلہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت عمرو بن عبسہ سُلمی اور خالد بن سعید بن العاص بھی شامل ہیں۔

خفیہ دعوت وتبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ اس عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی کوششوں سے حضرت بلال بن رباح، حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے اسلام قبول کرلیا۔

ان کے علاوہ دیگر معززین قریش میں سے کئی لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان معززین کے علاوہ دیگر طبقات کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، انھیں ''السابقون الأولون'' (اولین اسلام قبول کرنے والے) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں: حضرت جعفر بن ابی طالب مع زوجہ اسماء بنت عمیس، عیاش بن ابی ربیعہ مع زوجہ اسماء بن سلامہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد، حضرت ارقم بن ارقم، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت قدامہ بن مظعون، حضرت عبداللہ بن مظعون، حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت ابواحمد بن جحش، حضرت زینب بنت جحش، حضرت سلیط بن عمرو، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر، حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت سعید بن زید، حضرت خنیس بن حذیفہ، حضرت خباب بن الارت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سمیہ اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا حتی کہ اسلام کی بازگشت مکہ کی فضا میں سنائے دینے لگی اور جگہ جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت بلال، حضرت خباب بن الارت، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم اجمعین جرأت رندانہ اور دلیری سے کام لیتے ہوئے اسلام کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت کفار مکہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اس نئے مذہب کو کسی نہ کسی طرح دبانا ضروری ہے۔ چنانچہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے مرد و خواتین پر ظلم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

ابتداء میں تبلیغ بہت خفیہ انداز میں ہوتی رہی لیکن جب آیت کریمہ ﴿انذر عشیرتك الأقربین﴾ ''اپنے آپسی رشتہ داروں کو ڈراؤ'' اور اس جیسی دیگر آیات نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے اپنے گھرانے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے تقریبا چالیس افراد کو کھانے پر مدعو کیا اور ان کے سامنے دین اسلام کی دعوت پیش کی۔ ابولہب کو آپ ﷺ سے ذاتی کدورت تھی لہذا اس نے جلسہ کو درہم و برہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس موقعہ پر صرف حضرت علی بن ابی طالب نے آپ ﷺ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اپنے ایمان لانے کا اعلان کیا۔

15.4.3 کوہ صفا سے اسلام کی دعوت

جب خفیہ تبلیغ سے کسی قدر اسلام پھیل گیا تو حکم ربانی ہوا کہ ﴿فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين﴾ یعنی آپ ﷺ کو جو حکم دیا جاتا ہے وہ برملا بیان کر دیجئے اور مشرکوں سے کنارہ کش رہیے۔ حکم الہی کی تعمیل کے لیے آپ ﷺ کوہ صفا پر چڑھ گئے اور وہاں سے ''یا صباحاہ'' کا نعرہ بلند کر کے تمام مکہ والوں کو پہاڑ کے نیچے جمع کر لیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اگر میں بتلاؤں کہ اس پہاڑی کی دوسری جانب ایک لشکر جرار تم پر یلغار کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے؟ سب نے تصدیق کی کہ وہ آپ ﷺ کو سچا اور امین مانتے تھے۔ آپ ﷺ نے مکہ کے ایک ایک قبیلہ کا نام لے کر فرمایا کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف شدید عذاب سے ڈرسنانے کے لیے مامور کیا ہے۔ لہذا اگر تم لوگ دونوں جہاں کی کامیابی چاہتے ہو تو دل و زبان سے لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لو۔ اس موقع پر بھی واحد آواز جو آپ ﷺ کے خلاف اٹھی تھی وہ ابولہب کی تھی جس نے بدزبانی کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا غارت ہو (نعوذ باللہ) کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا اس پر تمام مجمع منتشر ہو گیا۔

اعلان عام کے آپ ﷺ کے طریقۂ تبلیغ میں بھی تبدیلی آ گئی، جہاں چند لوگ آپ ﷺ کو اکھٹے نظر آتے آپ ﷺ انھیں دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے، ان کو مخاطب کر کے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے۔ اس زمانہ میں آپ ﷺ اپنی تبلیغ میں توحید باری، نبوت اور حساب آخرت پر زیادہ زور دیتے تھے، ساتھ ہی ساتھ اچھے اخلاق اختیار کرنے اور نیک بننے کی تلقین فرماتے تھے۔

15.4.4 مشرکین کی ایذا رسانیاں

آپ ﷺ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ ہر نیا مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت اپنی جگہ ایک مبلغ بن کر اپنے حلقہ میں جوش و خروش کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کر دیتا جس کے نتیجہ میں اسلام کی شہرت پھیلنے

لگی۔اس صورت حال کو دیکھ کر مشرکین مکہ سخت برہم ہوئے اور اسلام قبول کرنے والوں کو دوبارہ اپنے پرانے دین کو قبول کرنے کے لیے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے لگے۔جس کا جس پر بس چلتا تھا وہ اسے شدید اذیت دیتا تھا لیکن اسلام کا نشہ مسلمانوں پر ایسا چڑھا تھا کہ وہ ہر ظلم وستم کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے لیکن دین اسلام سے روگردانی انھیں کسی بھی قیمت پر قبول نہیں تھی۔جیسے جیسے آیات قرآنی میں کفر وشرک کی مذمت میں اضافہ ہوتا گیا اور اسلام کا دائرۂ اثر بڑھتا گیا ویسے ویسے کفار مکہ کی ایذا رسانی میں شدت آتی گئی۔کفار مکہ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ کاروائیوں کی انتہا کردی تھی چنانچہ بہتیرے مسلمانوں کے لیے ایمان محفوظ رکھتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔

مسلمانوں کو قبول اسلام کی جو شدید مصیبتیں اور مشکلیں اٹھانی پڑیں اس کی روداد طویل ہے۔بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ لا الہ الا اللہ کہنا معمولی قسم کے دلیر کا کام نہیں تھا۔یہ کلمہ زبان سے وہی شخص ادا کرسکتا تھا جس کو ماں، باپ، بھائی، بیٹے، بیوی بلکہ پورے قبیلہ سے کٹ جانے کی جرأت ہو، مال ومتاع سے محروم ہونے کی ہمت ہو، طرح طرح کی اذیتوں، ذلتوں کو سہنے اور برداشت کی طاقت ہو اس کے بعد ہی کوئی بھی شخص کلمہ لا الہ الا اللّٰہ کو علانیہ زبان پر لا سکتا تھا۔

کفار مکہ کی ان اذیتوں کا شکار ہونے والے صرف غلام اور مجبور لوگ ہی نہیں تھے بلکہ ان میں آزاد اور معزز خاندان کے افراد کے علاوہ موالی اور حلیف وغیرہ بھی شامل تھے حتی کہ آپ ﷺ بھی ان کی اذیتوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔مثال کے طور پر ابوجہل کے اکسانے پر عقبہ بن ابی معیط نے سجدہ کی حالت میں آپ ﷺ کی گردن پر اونٹ کی بھاری اوجھڑی لاکر ڈال دی جس کے بوجھ کی وجہ سے آپ ﷺ سجدے سے سر تک نہ اٹھا سکے۔آپ ﷺ کو اس مصیبت سے حضرت فاطمہؓ نے نجات دلائی اور ابوجہل کو برا بھلا کہا۔اس نے طیش میں آکر صاحبزادی رسول کو اتنے زور کا تھپڑ مارا کہ وہ رونے لگیں کہ اس وقت وہ ایک معصوم سی بچی تھیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ بیت اللہ شریف میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ کی گردن میں اپنی چادر ڈال کر اس شدت سے بل دیا کہ آپ ﷺ کا دم گھٹنے لگا۔اس مصیبت سے آپ ﷺ کو وہاں موجود کچھ نیک لوگوں نے چھٹکارا دلایا۔

کفار مکہ کی ایذا رسانیوں کا شکار ہونے والوں میں حضرت عثمان بن مظعون، حضرت زبیر بن عوام، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت خالد بن سعید بن العاص، حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر اور ان کا خاندان، حضرت صہیب رومی، حضرت خباب بن الارت، حضرت لبینہ، حضرت ام عبیس، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کے نام قابل ذکر ہے۔مذکورہ بالا حضرات نے اللہ کی راہ میں ہر قسم کی شدید سے شدید اذیتیں قبول کرلیں حتی کہ ان میں سے بعض جیسے حضرت عمار بن یاسر اور ان کی والدۂ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما نے جام شہادت بھی نوش فرمالیا لیکن اسلام سے منھ نہ موڑا۔

15.4.5 دارارقم میں پناہ

کفار کی ایذا رسانیاں پوری شدومد سے جاری تھیں حتی کہ یہ ناممکن ہوگیا کہ آپ ﷺ امن وسکون سے مکہ میں کوئی تبلیغی کام کرسکیں۔اس لیے آپ ﷺ مضافات میں تشریف لے جانے لگے خصوصا حج کے موقع باہر آنے والے افراد کی خدمت میں اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے لیکن ابولہب کو آپ ﷺ سے اتنی عداوت ہوگئی تھی کہ ہر جگہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جس شخص کو اسلام کی

دعوت دی جاتی اسے ورغلا کر دین اسلام قبول کرنے سے باز رکھتا۔ بعثت کے بعد تقریباً پانچ سال اسی طرح گزر گئے، چالیس پچاس آدمی مسلمان بھی ہو گئے تھے لیکن کفار قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی اتنی شدید ہو گئی تھی کہ آپ ﷺ صفا نامی پہاڑی کے سامنے حضرت ارقمؓ بن ارقمؓ کے گھر میں پناہ لے کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے لگے۔ مسلمانوں کو بھی اس اولین اور نئے مرکز اسلامی کی اطلاع تھی لہذا جب کوئی شخص مسلمان ہونے کا ارداہ ظاہر کرتا تو اسے دار ارقم بھیج دیا جاتا جہاں وہ اوران سے پہلے ہونے والے مسلمان اطمینان وسکون کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے۔ دار ارقم کافی کشادہ تھا کہ اس میں تیس آدمی آپ ﷺ کے ساتھ نماز باجماعت پڑھ سکتے تھے۔

دار ارقم کے انتخاب کی غالبا بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس میں نماز پڑھتے وقت خانہ کعبہ (ابراہیمی قبلہ) اور بیت المقدس (اہل کتاب کا قبلہ) دونوں کو بیک وقت قبلہ بنانا ممکن تھا۔

اسلام قبول کرنے والے قریش کے ہاتھوں ظلم ہی نہیں سہہ رہے تھے بلکہ قریش کے دوسرے گھٹیا ہتھکنڈوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے مثلا جو لوگ تجارت پیشہ تھے ان سے لین دین نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ جو لوگ محنت مزدوری کرتے تھے ان کی اجرتوں کی ادائیگی میں ٹال مٹول کیا جاتا تھا یا انھیں اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ اس نئے دین کو چھوڑ دیں تب ان کی اجرت ادا کی جائے گی۔ اولین مسلمانوں نے اپنا ہر قسم کا نقصان تو برداشت کر لیا لیکن اسلام سے منہ نہ موڑا۔

15.4.6 قریش کی معاندانہ تدبیریں

قریش کو جب ظلم وستم سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اور وہ اس طوفان بلاخیز کے سامنے باندھ باندھنے میں ناکام ہو گئے تو انھوں آپ ﷺ کو کار نبوت سے باز رکھنے کی بالواسطہ تدبیریں کیں اور آپ ﷺ کو مال ودولت، حسین وخوبصورت لڑکیوں حتی کہ مکہ کی بادشاہت تک کی پیش کش اس شرط کے ساتھ کر دی کہ آپ ﷺ کار نبوت سے باز آ جائیں اور ان کے بتوں کو برا بھلا نہ کہیں۔

15.4.7 قریش کی سفارت ابوطالب کی خدمت میں

جب وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو گئے تو وفد کی شکل میں جناب ابوطالب کے پاس گئے اور اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا کہ ان کا بھتیجا ان کے دین ومذہب کو برا بھلا کہتا ہے، ان کے معبودوں کو جھوٹا قرار دیتا ہے اور ان کے آباء واجداد کو گمراہ قرار دیتا ہے جس سے قریش میں ہر طرف بے چینی اور انتشار پھیل رہا ہے لہذا آپ اپنے بھتیجے کو ایسا کرنے سے روکیں یا درمیان سے ہٹ جائیں تاکہ ہم خود آپ ﷺ سے نمٹ لیں۔ جناب ابوطالب نے نرمی سے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور خوش اسلوبی سے معاملہ کو ٹال دیا۔

اس سفارت کے باوجود بھی جب آپ ﷺ اپنے کار نبوت میں مصروف رہے اور دعوت اسلام کا سلسلہ اسی زور وشور کے ساتھ جاری رہا تو وفد کی صورت میں اشراف قریش دوبارہ ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کرنے کے بجائے دھمکی دی کہ اگر اب بھی انھوں نے آپ ﷺ کو نہیں روکا تو انھیں بھی آپ ﷺ کا ہم خیال سمجھ لیا جائے گا اور یہ چیز ہمارے درمیان لڑائی کا سبب بن جائے گی۔ یہ الٹی میٹم سن کر ابوطالب کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ انھوں نے آپ ﷺ کو بلا کر اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ ان کے انداز تکلم سے آپ ﷺ نے اندازہ لگا لیا کہ شاید اب چچا بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

خدا کی قسم اگر وہ لوگ میرے ہاتھوں میں سورج اور چاند بھی لا کر رکھ دیں تو میں اپنے منصب نبوت سے دست بردار نہیں ہو سکتا اور نہ اس دعوت کے کام کو چھوڑ سکتا ہوں یہاں تک کہ اللہ مجھے غلبہ دے دے یا میری جان اس راہ میں قربان ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آپ ﷺ کے عزم و استقلال سے ابو طالب بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے لہذا انھوں نے فرمایا کہ تم اپنی جدو جہد میں مصروف رہو، جس چیز کی جی چاہے تبلیغ کرو میں تمھیں ان کے حوالہ کبھی نہ کروں گا۔

قریش نے ابو طالب کو ایک پیش کش یہ بھی کی تھی کہ محمد ﷺ کو ہمارے حوالہ کر دو تاکہ آپ ﷺ کو قتل کر ملک کو فساد سے بچایا جا سکے، اور بدلے میں جس شخص کو چاہو لے لو اور اسے اپنا متبنی بنا لو۔ ابو طالب نے پر لطف جواب دیا کہ یہ تو انصاف نہیں ہے کہ تم میرے بیٹے کو قتل کر دو اور میں تمہارے بیٹے کو ساری زندگی کھلاتا پلاتا رہوں۔

قریش کی مذکورہ تجویز کی تائید عبد مناف کی ایک شاخ بنو نوفل کے سردار مطعم بن عدی نے بھی کی۔ اس ہتک آمیز پیش کش کو ٹھکرانے کے بعد بنو عبد مناف بھی تقسیم ہو گئے اور صرف بنو ہاشم (ابولہب کو چھوڑ کر) اور بنو مطلب آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے۔

جب قریش آپ ﷺ اور ابو طالب سے مایوس ہو گئے تو ان کا سارا غصہ قبیلہ کے ان افراد پر اترنا شروع ہوا جن کا کوئی حمایتی نہیں تھا۔ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان اشخاص پر ٹوٹ پڑا جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو قید، زدوکوب، بھوک پیاس، اور مکہ کی سخت گرمی اور جھلسا دینے والی تپش کی اذیتوں سے دوچار کیا اور انھیں سخت سے سخت مظالم کا شکار بنایا۔ ان کے مظالم کا شکار ہونے والوں میں حضرت بلال حبشی، حضرت عمار بن یاسر اور ان کا خانوادہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عثمان بن عفان، حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ جیسے افراد بھی شامل تھے۔

جب قریش کی تمام تدبیریں فیل ہو گئیں تو انھوں نے اپنی مجلس مشاورت میں کافی بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ آپ ﷺ کے متعلق یہ خبر پھیلا دی جائے کہ آپ ﷺ جادوگر (نعوذ باللہ) ہیں، جادو کے زور سے ماں باپ، باپ بیٹے، بھائی بھائی، میاں بیوی اور خاندان والوں میں جدائی پیدا کر دیتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے بعد وہ حج کے موسم میں جب قافلوں کی آمد شروع ہوئی تو مختلف گزرگاہوں پر بیٹھ گئے اور جو بھی گزرتا اسے آپ ﷺ کے پاس جانے سے روکتے اور وہ تمام باتیں دہراتے جو انھوں نے آپس میں طے کر رکھی تھیں۔

15.4.8 حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام

ابو جہل نے ایک مرتبہ آپ ﷺ کے ساتھ بدتمیزی کی آپ کے ساتھ برا سلوک کیا۔ آپ ﷺ نے خاموشی سے برداشت کر لیا اور ابو جہل کو کچھ بھی نہیں کہا۔ عبداللہ بن جدعان کی باندی نے وہ سارا ماجرا حضرت حمزہ کو اس وقت سنایا جب وہ شکار سے واپس آ رہے تھے۔ اس واقعہ کو سن کر انھیں بہت غصہ آیا اور فوراً ہی خانۂ کعبہ پہنچے جہاں ابو جہل اپنے آدمیوں کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے پہنچتے ہی اپنی کمان سے ابو جہل کے سر پر وار کیا اور اسے شدید زخمی کر دیا اور کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے بھتیجے کو برا بھلا کہو اور گالی دو۔ میں بھی اس کے دین پر ہوں، جو وہ کہتا ہے وہی میں بھی کہتا ہوں۔ اگر تمہارے اندر ہمت ہے تو مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ ابو جہل پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بنو مخزوم کے کچھ افراد نے بیچ بچاؤ کرایا۔

15.4.9 عتبہ بن ربیعہ بارگاہ نبوی میں

قریش کی تمام تر تدبیریں جب الٹی پڑنے لگیں اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو عتبہ بن ربیعہ نے قریش کے اکابر سے براہ راست آپ ﷺ سے گفتگو کرنے کی اجازت مانگی کہ شاید کچھ بات بن جائے۔ قریش کی مرضی سے وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کو اس کام سے باز رہنے کے لیے بڑی سے بڑی پیش کش کی۔ ان کی گفتگو سن کر آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ حٰم السجدہ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ آپ کی ساری باتوں کا جواب ان آیات میں موجود ہے۔

عتبہ بن ربیعہ بارگاہ نبوی سے اٹھ کر اپنے ساتھیوں کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (ﷺ) سے جو کلام میں نے سنا ہے اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔ نہ یہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت۔ اے قریش میری مانو تو اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ کلام کسی بڑے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اگر عرب محمد (ﷺ) کو کسی مصیبت میں ڈالیں گے تو تمہارا مقصد اس میں حصہ لیے بغیر بھی پورا ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص غلبہ پا گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت اور اس کی عزت تمہاری عزت ہو گی۔

عتبہ کی رائے سن کر اشراف قریش نے کہا کہ تم پر بھی اس شخص کا جادو چل گیا ہے۔ عتبہ نے کہا: میں نے اپنی رائے دے دی، اب تم لوگ جو چاہو کرو۔

15.5 ہجرت حبشہ

مکہ کی سرزمین جب مسلمانوں کے لیے تنگ ہونے لگی اور کفار مکہ کا ظلم اپنی حدوں سے آگے بڑھ گیا تو آپ ﷺ نے ایک طرف مسلمانوں کو تسلی دی اور حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کی۔ اور دوسری طرف بارگاہ خداوندی میں دعا کی اے رب اسلام کو عمرو بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے اسلام سے قوت بخش کیونکہ یہی دونوں مسلمانوں کو تنگ کرنے اور انھیں شدید اذیتوں سے دوچار کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔

حالات جب تشویش ناک حد تک نازک ہو گئے اور بہتیرے مسلمانوں کے لیے ایمان سلامت رکھتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے خاص طور سے ان لوگوں کو جو مصائب کا بہت زیادہ شکار تھے، حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا کہ وہاں کا عیسائی بادشاہ اپنی رحم دلی اور انصاف پسندی کے لیے مشہور تھا اور اس کے ملک میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ وہاں ہجرت کرنے کا ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ ملک عرب کے مغرب میں بحر قلزم کے پار ہونے کی وجہ سے نہایت قریب تھا۔

اجازت نبوی ملنے کے بعد قریش کے تقریباً تمام اہم خانوادوں کے افراد، حضرت عثمان بن مظعونؓ کی قیادت میں حبشہ روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ سنہ پانچ نبوی کا ہے، اس اولین ہجرت میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں۔ جب وہ لوگ خیر وعافیت کے ساتھ حبشہ پہنچ گئے اور ان کے قیام پر وہاں کی حکومت کو بھی کوئی اعتراض نہ ہونے کی خبر مکہ پہنچی تو حبشہ ہجرت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

15.5.1 قریش کا تعاقب

جب قریش نے یہ دیکھا کہ حبشہ کی سرزمین مسلمانوں کی عمدہ جائے پناہ ثابت ہو رہی ہے تو انھوں نے صورت حال سے واقف کرانے کے لیے حبشہ کے بادشاہ کی خدمت میں سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ مسلمانوں کا سکون غارت کیا جا سکے۔ انھوں نے اپنے سفیروں عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ- کے ساتھ بادشاہ اور مذہبی رہنماؤں کے لیے تحفے تحائف بھیجے۔ انھوں نے پہلے مذہبی رہنماؤں کو صورت حال سے واقف کرا کے ان کی تائید حاصل کی پھر بادشاہ کے دربار میں پہنچ کر اپنی سفارت کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بادشاہ کے سرداران نے بھی ان کی باتوں کی تائید کی اور مسلمانوں کو واپس بھیج دیئے جانے کی تجویز پیش کی۔

اس صورت حال کو دیکھ کر بادشاہ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ فریق ثانی کی بات سنے بغیر مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال دیا جائے لہذا حقیقت سے باخبر ہونے کی خاطر اس نے مسلمانوں کے نمائندوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حکم شاہی کے مطابق مسلمانوں کا وفد دربار میں یہ طے کر کے حاضر ہوا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہمیں اسلام کے بارے میں تمام سچی باتوں کو بتانا ہے۔ جب وہ دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے قریش کی بات ان کے سامنے رکھی اور جواب طلب کیا۔ مہاجرین کی جانب سے حضرت جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوئے اور نہایت فصیح و بلیغ زبان میں بادشاہ کو صحیح صورت حال سے باخبر کیا اور اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ ان کے معروضات کو سن کر نجاشی نے قریش کے وفد کی درخواست رد کر دی۔

اس ناکامی سے تلملا کر سفیران قریش نے نجاشی کے دینی جذبات کو بھڑکانے کا فیصلہ کیا اور دوسرے دن دربار میں حاضر ہو کر اس کو مسلمانوں کے ان عقائد و خیالات سے آگاہ کیا جو وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق رکھتے تھے۔ ان کی یہ کوشش بھی ناکام ہوئی چنانچہ اس نے دوبارہ مسلمانوں کو بلا کر ان کا نقطۂ نظر معلوم کیا۔ حضرت جعفرؓ نے ایک بار پھر ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے سورہ مریم کی وہ آیات پڑھیں جن میں حضرت عیسی علیہ السلام کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔ ان آیات کو سن کر نجاشی نے کہا کہ اللہ کی قسم تم نے جو کچھ کہا ہے وہ اور حضرت عیسی علیہ السلام جو کچھ لائے ہیں ایک ہی منبع سے نکلنے والی روشنی ہے۔ اس نے زمین پر ہاتھ مار کر ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ جو کچھ تم نے بیان کیا ہے حضرت عیسی علیہ السلام اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔

نجاشی نے اپنے دربار سے مسلمانوں کو بہت عزت و اکرام سے رخصت کیا، ان کو امان دی اور قریش کے سفیر ذلیل وخوار ہو کر مکہ واپس آ گئے اور مسلمان حبشہ میں نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

ہجرت حبشہ کا سب سے اچھا ثمرہ یہ نکلا کہ جب قریشی سفارت ناکام ہو کر واپس چلی گئی تو حبشہ کے نیک طینت عیسائیوں پر مشتمل بیس افراد کے ایک گروہ نے مکہ آ کر صورت حال کا اپنی آنکھوں سے جائزہ لیا۔ وفد نے آپ ﷺ سے بھی ملاقات کی اور بکثرت سوال کر کے اطمینان کر لیا کہ وہی نبی مبعوث ہیں جن کی بشارت حضرت عیسی علیہ السلام نے دی تھی۔ رہی سہی کسر آپ ﷺ کی تلاوت نے پوری کر دی وہ تمام کا تمام وفد اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔

اس نئی صورت حال کا قریش نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے نجاشی کو خط لکھ کر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جس کو اس نے فوراً قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس واقعہ نے قریش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اگر اسی طرح لوگ یہاں آ آ کر محمد

ﷺ سے متاثر ہوتے رہیں گے اور مسلمان ہوتے جائیں گے تو ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔لہٰذا انھوں نے بیرون مکہ سے آنے والوں پر بھی نظر رکھنا شروع کر دی اگر ان میں سے کوئی آپ ﷺ سے ملنے کی کوشش کرتا تو اس کو سزا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔انھیں آپ ﷺ سے نہ ملنے دینے کی ہر راہ اختیار کرتے تھے تاہم اسلام کا معاملہ ایسا تھا ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اس کی مثال عمرو بن عبسہ سلمی اور ابوذر غفاری کے اسلام قبول کرنے سے دی جا سکتی ہے۔

15.6 حضرت عمر بن خطابؓ کا قبول اسلام

ابھی اہل مکہ حبشہ میں اپنی سفارت کی ناکامی کے غم سے ابھر نہیں پائے تھے۔اللہ تعالی نے حضور اکرم ﷺ کی اس دعا کو قبولیت بخش دی جس میں آپ ﷺ نے حضرت عمر یا ابوجہل میں سے کسی ایک کے ایمان قبول کرنے کی دعا کی تھی۔اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی دعا کے نتیجے میں اسلام کی سعادت سے حضرت عمرؓ کو نوازا۔ان کے اسلام قبول کرنے سے اہل مکہ پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا کہ اب وہ مسلمانوں پر وہ ظلم و ستم نہیں کر سکتے جواب تک کرتے آئے ہیں کیونکہ حضرت عمر بن خطابؓ سب کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے اور یہ بات بھی حقیقت کہ جس دن انھوں نے اسلام قبول کیا اسی دن سے اسلام اور مسلمانوں کا اقبال بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

حضرت عمر بن خطابؓ کے قبول اسلام کی دو تین روایات بیان کی جاتی ہیں۔مشہور روایت کے مطابق حضرت عمر بن خطابؓ کے اسلام قبول کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک دن اس نیت سے نکلے کہ آج آپ ﷺ کو قتل کر کے اسلام جیسے فتنہ وفساد کا سد باب کر دیا جائے۔راستہ میں انھیں نعیم بن عبداللہ ملے اور ان کے خطرناک تیور دیکھ کر کہا کہ پہلے اپنی بہن و بہنوئی کی خبر لو کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔یہ سنتے ہی انھوں نے بہن کے گھر کا رخ کیا۔وہاں پہنچے تو انھیں تلاوت کریم میں مشغول پایا جسے دیکھ کر وہ سخت برہم ہوئے۔بہن نے اوراق قرآنی کو چھپا لیا۔انھوں نے اپنے بہنوئی کو پیٹنا شروع کر دیا۔بہن نے ان کی مدافعت کی تو انھیں بھی مارا جس سے وہ زخمی ہو گئیں۔بہن نے جوش میں آ کر کہا جو چاہو کر لو ہم اسلام قبول کر چکے ہیں۔بہن کو زخمی دیکھ کر فطری محبت بیدار ہو گئی۔کچھ غصہ نرم پڑا تو کہا وہ چیز مجھے دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔بہن نے ان سے پہلے غسل کرنے کے لیے کہا پھر ان کے سامنے وہ اوراق رکھ دیئے جن میں سورہ طہ کی آیات مذکور تھیں۔انھیں پڑھتے ہی ان کے دل و دماغ کی کیفیت بدل گئی اور اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا۔وہ وہاں سے نکل کر سیدھے دار ارقم پہنچے۔انھیں دیکھ وہاں کے مکینوں کو کچھ ہچکچاہٹ ہوئی لیکن دروازہ کھول دیا گیا۔آپ ﷺ نے ان سے پوچھا اے عمر کس ارادہ سے آئے ہو انھوں نے کہا کہ کلمۂ شہادت پڑھنے کے لئے۔یہ اتنا غیر متوقع جواب تھا کہ ایک لمحہ کے لیے سب پر سکتہ طاری ہو گیا لیکن صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی سب نے مل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

حضرت عمرؓ مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم پہنچے اور وہاں باجماعت نماز ادا کی اور اہل مکہ میں سے کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو اس عمل سے روک دے۔

15.7 قریش کا بائیکاٹ

حبشہ میں مسلمانوں کا سکون سے رہنا اور حضرت عمر کے قبول اسلام نے قریش کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ان کی تمام تدبیریں ناکام ہوتی چلی جارہی تھیں۔قریش اپنی ناکامی کا سبب بنو ہاشم و بنو مطلب کو سمجھ رہے کہ ان کی حمایت کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کا کچھ نہیں بگاڑ پارہے ہیں لہذا ان میں سے کچھ جوشیلے افراد نے پورے قبیلہ کو ہی سزا دینے کی تجویز پیش کی کہ ان کا سماجی بائیکاٹ کردیا جائے تاکہ وہ قریش کے مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔ یہ معاہدہ سنہ سات نبوی کا ہے۔

قریش نے مذکورہ تجویز پر عمل کرتے ہوئے دونوں خانوادوں سے ہر قسم کے سماجی روابط ختم کردیئے حتیٰ کہ ان سے بات چیت بھی بند کردی گئی۔روایات کے مطابق اس معاہدہ کو قانونی اور سماجی حیثیت دینے کے لیے اسے خانۂ کعبہ میں آویزاں کردیا گیا تھا۔اس مقاطعہ کا شکار ابولہب کو چھوڑ کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام افراد ہوئے خواہ وہ مسلم ہوں یا مشرک۔ پورا خاندان گویا محصور ہوکر رہ گیا تھا۔قریش کا یہ بائیکاٹ تقریبا تین سال تک جاری رہا۔بنو ہاشم پر وہ ایام بہت ہی سخت گذرے اور انھوں نے بہت مشکل سے سانسوں کی ڈور کو برقرار رکھا۔تاہم جس طرح ہر رات کی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، صبح ہوتی ہے اسی طرح اس غیر انسانی بائیکاٹ کو ختم کرنے کے اسباب بھی پیدا ہوگئے اور چند نیک طینت افراد نے اس ظالمانہ معاہدہ کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ختم کرادیا اور بنو ہاشم و بنو مطلب کے افراد کی سماجی و معاشی زندگی بحال ہوگئی۔

اس معاہدہ کو ختم کرانے والوں میں ہشام بن عمرو بن ربیعہ عامری، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، زمعہ بن اسود اور ابوالبختری بن ہاشم وغیرہ پیش پیش تھے۔

15.8 غموں کا سال

بعثت نبوی کا دسواں سال رسول اللہ ﷺ کے لیے پے در پے مشکلات کا سال ثابت ہوا۔اسی لیے آپ ﷺ اسے عـــام الحزن (غم کا سال) کہتے تھے۔اسی سال آپ ﷺ کے شفیق و مونس و مددگار چچا ابوطالب کا انتقال ہوا جن کی وجہ سے قریش چاہنے کے باوجود آپ ﷺ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے تھے۔ جناب ابوطالب نے بنو ہاشم کی سربراہی کے پورے دورانیہ میں حضور اکرم ﷺ کی سرپرستی بڑی شفقت کے ساتھ کی اور وہ پورا تحفظ دیا جو قبیلہ کے ایک فرد کی حیثیت سے حضور اکرم ﷺ کا حق تھا۔روایات کے مطابق آپ ﷺ کی خواہش اور کوشش کے باوجود ان کا انتقال ان کے آباء واجداد کے دین پر ہوا تھا۔

ابھی اپنے چچا کے انتقال کے صدمہ سے ابھر بھی نہیں پائے تھے کہ آپ ﷺ کی غمگسار، مونس، قدردان اور مزاج شناس بیوی حضرت خدیجہؓ بھی سفر آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ان کی جدائی نے آپ ﷺ کے لیے غیر معمولی مسائل پیدا کردیئے تھے۔آپ ﷺ کو ان سے اتنا زیادہ تعلق خاطر تھا کہ ان کی زندگی میں آپ ﷺ نے دوسری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں، انھیں کے بطن سے آپ ﷺ کی تمام اولادیں- چار بیٹیاں اور ایک بیٹا- ہوئے۔آپ ﷺ تاعمر ان کو یاد کرکے ان کی خوبیوں اور قربانیوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

15.9 سفر طائف

ابو طالب کے انتقال کے بعد خاندان کی سربراہی ابولہب کے حصہ میں آئی جو اسلام کا کٹر دشمن تھا۔ روایات کے مطابق اس نے شروع میں آپ ﷺ کی حمایت کی لیکن جلد ہی اس نے آپ ﷺ سے اپنی برأت کا اظہار کر کے گویا آپ ﷺ کو بے یارومددگار چھوڑ دیا اور آپ ﷺ اپنے قبیلہ کی حمایت سے عملاً محروم ہوگئے۔ سربراہ قبیلہ کا رویہ دیکھ کر سب کی ہمت بلند ہوگئی چنانچہ وہ آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جب آپ ﷺ لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیتے تو آپ ﷺ کو روک دیا جاتا یا شور وغل مچا دیا جاتا۔ آپ ﷺ پر خاک ڈالی جاتی، حرم میں دوران نماز اذیت دی جاتی، گھر میں غلاظت ڈال دی جاتی گویا کوئی ایسا عمل وحربہ باقی نہ رہ گیا تھا جسے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔

قریش کی ایذارسانیاں جب حد سے بڑھ گئیں اور آپ ﷺ کو ابولہب نے عملاً اپنی سرپرستی سے بے دخل کر دیا تو آپ ﷺ نے نئی جوار وحمایت حاصل کرنے کے لیے اپنے متبنی زید بن حارثہ کے ساتھ طائف کا سفر کیا کہ وہاں کے سربراہان بھی مکہ کے سرداروں کے بالمقابل سمجھے جاتے تھے۔ طائف میں اس وقت عمرو بن عمیر کے تینوں بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب سب سے بااثر سردار تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر کے ان کی حمایت چاہی لیکن انھوں نے نہ صرف انکار کر دیا، بلکہ آپ ﷺ کا مذاق بھی اڑایا۔ انھوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے بیٹوں اور غلاموں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا کہ آپ ﷺ کو پریشان کریں لہذا انھوں نے آپ ﷺ اور حضرت زید کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی شدید زخموں سے دوچار کر دیا۔

واپسی کے سفر میں آپ ﷺ سرداران مکہ عتبہ وشیبہ کے انگوروں کے باغ میں آرام کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گئے جہاں ان کے غلام عداس نے مالکان کے حکم پر آپ ﷺ کی انگوروں سے تواضع کی۔ غلام مذکور آپ ﷺ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ ﷺ کے ہاتھوں اور سروں کو بوسہ دیا۔

سفر طائف سے واپسی پر آپ ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں اپنی بے بسی اور عاجزی کا ذکر کرتے ہوئے صرف اسی کی رضا میں راضی ہونے اور اللہ کی نصرت کی دعا مانگی۔ دل سے نکلی ہوئی دعا نے فوراً ہی شرف قبولیت کا جامہ پہن لیا اور روایات کے مطابق فرشتہ نے حاضر خدمت ہو کر فرمایا کہ اگر آپ ﷺ فرمائیں تو میں اس بستی کو دو پہاڑوں کے بیچ پیس کر رکھ دوں لیکن رحمۃ للعالمین اس کو کیونکر گوارا کر سکتے تھے لہذا منع کر دیا کہ ممکن ہے ان ہی نافرمانوں کی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں۔

مکہ کے واپسی کے سفر میں آپ ﷺ نے نخلہ نامی مقام پر قیام فرمایا اور چونکہ ان کے قبیلہ نے ان کی حمایت سے عملاً ہاتھ اٹھا لیا تھا اس لئے انھوں نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ آپ ﷺ کو اپنی امان میں لے لیں۔ مطعم بن عدی اسی وقت اپنے بیٹوں کے ساتھ گئے اور تلواروں کے سائے میں لا کر طواف کعبہ کرایا اور اپنی حمایت کا برملا اعلان کیا کہ محمد ﷺ کو اب کوئی گزند نہ پہنچائے کہ وہ میری جوار میں ہیں۔

15.10 واقعہ اسراء ومعراج

حیات نبوی کے اہم واقعہ اسراء ومعراج کے ضمن میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا؟ کتنی بار پیش آیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ تاہم مستند روایات کے مطابق یہ واقعہ 27 / رجب دس نبوی کو بوقت شب بعد از نماز عشاء اور فجر کی نماز سے پہلے پیش آیا۔

اسراء سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر ہے جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں کیا گیا ہے جب کہ معراج کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے وہ آسمانی سفر تھا جس میں ملائکہ کو دیکھنے کے ساتھ جنت و دوزخ کی سیر اور مناجات باری کا واقعہ پیش آیا۔

یہ سفر اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کی ضیافت اور عزت افزائی کے بطور ہوا تھا۔ اس کے ذریعہ آپ ﷺ کی دل داری و دلنوازی کی گئی، طائف کے زخموں کو مندمل کیا گیا اور اس توہین و ناقدری اور بے گانگی و بے وفائی کی تلافی کی گئی جس کے سخت امتحان میں آپ ﷺ سفر طائف کے دوران گذرے تھے۔

واقعہ معراج کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شب آپ ﷺ حطیم یا حجر کعبہ میں آرام کر رہے تھے۔ بیداری اور نیند کی درمیانی حالت تھی کہ آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معیت میں متعدد فرشتوں کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا انھوں نے آپ ﷺ کے سینۂ اطہر کو چاک کیا اور اسے آب زمزم سے دھو کر علم و حکمت سے بھر دیا۔ پھر آپ ﷺ کے سامنے سواری کے لیے براق نامی سواری پیش کی گئی اس پر سوار ہو کر آپ ﷺ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معیت میں ساتوں آسمان پر تشریف لے گئے جہاں مختلف انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ جب سدرۃ المنتہیٰ پہنچے تو باری تعالی نے آپ ﷺ کو شرف گفتگو بخشا۔ اسی موقعہ پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ واپسی پر آپ ﷺ کو جنت و دوزخ اور ملأ اعلی کے دوسرے مناظر دکھلائے گئے۔

معراج سے واپسی پر آپ ﷺ نے تبلیغ و دعوت کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ اب آپ ﷺ مکہ مکرمہ کے آس پاس دیگر قبائل کے پاس تشریف لے جاتے اور انھیں اسلام کے پیغام سے آگاہ کرتے۔ حج کے موسم میں آنے والوں کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ آپ ﷺ کی ان دعوتی سرگرمیوں کا کسی نے نرمی و اخلاق سے جواب دیا تو کسی نے اجڈ پن اور سختی سے اس کا انکار کیا لیکن کوئی بھی اس سعادت دارین کا خواہش مند نہ ہوا۔

15.11 بیعت عقبہ اولی

انھیں تبلیغی سرگرمیوں کے دوران آپ ﷺ کی ملاقات عقبہ میں قبیلۂ خزرج کے چھ آدمیوں سے ہوئی جو مدینہ سے مکہ رسوم حج کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ابدی سعادت ان کے ہم رکاب تھی کہ آپ ﷺ کی دعوت پر وہ سب حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے اور آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اسلام کی تبلیغ کی مزید کوششیں کریں گے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو وعدے کے مطابق سال بھر تبلیغی سرگرمیوں میں اس تندہی سے مصروف رہے کہ اوس و خزرج کے گھروں میں رسول اکرم کے چرچے ہونے لگے۔ وہ لوگ سنہ گیارہ نبوی میں رسوم حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے اور اپنے ساتھ مزید سات نئے افراد کو لے آئے ان تمام لوگوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔ اسی کو بیعت عقبہ اولی کہتے ہیں۔

بعض سیرت نگار اس کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ان کے نزدیک بیعت عقبہ اولی وہ بیعت ہے جس میں ان پانچ افراد نے اسلام قبول کیا تھا جنھوں نے مدینہ میں اسلام کو پھیلانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ان لوگوں نے واپسی پر آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ ایک معلم کو بھیج دیا جائے تاکہ وہ انھیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کر سکے۔آپ ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیج دیا۔انھوں نے اس خوبی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو پھیلایا کہ مدینہ میں بہت سرعت سے اسلام کی اشاعت ہونے لگی حتی بسا اوقات پورا کا پورا خاندان ایک ساتھ اسلام قبول کر لیتا تھا۔

15.11.1 بیعت عقبہ ثانیہ

سنہ بارہ نبوی کے موسم حج میں آنے والے پانچ سو حاجیوں میں سے تہتر (73) مسلمان مرد اور دو خواتین تھیں۔یہ قافلۂ اسلام آپ ﷺ سے پہاڑ کی گھاٹی (عقبہ) میں رات میں ملا۔وہاں انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئیں تو ہم آپ ﷺ کی ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسے اپنے خاندان کی کرتے ہیں۔انھوں نے آپ ﷺ کو یقین دلایا کہ اگر آپ ﷺ کی حمایت میں ساری دنیا سے جنگ بھی کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہوں گے اور ہر صورت میں آپ ﷺ کی اطاعت کے پابند ہوں گے۔آپ ﷺ نے ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ان کی حمایت کا اقرار کیا۔

تعداد کی کثرت کے باعث آپ ﷺ نے ان کے بارہ نقیب مقرر فرمائے اور اسعد بن زرارہؓ کو نقیبوں کا سردار مقرر کیا۔

بعض سیرت نگار اسے بیعت عقبہ ثالثہ قرار دیتے ہیں کہ پہلی بیعت عقبہ سنہ دس نبوی میں، دوسری سنہ گیارہ نبوی میں اور تیسری سنہ بارہ نبوی میں ہوئی تھی۔اکثر سیرت نگاروں کے نزدیک صرف دو بیعت عقبہ ہوئی تھی ان کی رو سے پہلی بیعت عقبہ سنہ گیارہ نبوی میں اور دوسری سنہ بارہ نبوی میں ہوئی ۔وہ سنہ دس نبوی میں پیش آنے والے واقعہ کو بیعت میں شمار نہیں کرتے۔

15.12 ہجرت مدینہ

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد آنحضرت ﷺ کی ہدایت پر مکہ مکرمہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہجرت کر کے مدینہ جانے لگے۔ان میں سے متعدد کو جسمانی اور مالی تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔تھوڑے ہی دنوں میں مکہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور وہاں آنحضرت ﷺ اور ابوبکرؓ کے خاندان کے علاوہ کمزور مسلمان اور نوجوان رہ گئے جنھیں ان کے خاندان والوں نے اذیت پہنچانے کے لیے قید کر رکھا تھا۔

مسلمانان مکہ کے ترک وطن پر کفار قریش گھبرائے کہ کہیں مسلمان قوت حاصل کر کے مکہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔اس مسئلہ کو لے کر دارالندوۃ میں ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ ہر قبیلہ سے ایک بہادر نوجوان چنا جائے اور وہ سب یکبارگی آپ ﷺ پر حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں۔اس طرح آپ ﷺ کے قتل کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا قبیلہ پر نہیں آئے گی اور بنو ہاشم و بنو مطلب ان تمام قبائل سے جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہیں گے۔آنحضور ﷺ اپنی ایک معمر خاتون رشتہ دار کی وجہ سے دشمنوں کے منصوبہ سے آگاہ ہو گئے اور فوراً حضرت ابوبکرؓ کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں بھی اس خبر سے آگاہ کیا۔مشاورت کے

بعد یہ طے پایا کہ آج رات آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئیں گے اور دونوں شہر کے جنوب میں واقع غار ثور میں جا کر پناہ لیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی وقت یہ بندوبست کرلیا کہ روزانہ مکہ سے ان حضرات کو کھانا دستیاب ہوتا رہے اور وہ مکہ کے حالات سے باخبر ہوسکیں اور چوتھے روز غار پر دو اونٹ اور ایک ماہر رہبر موجود رہے تاکہ دونوں مدینہ روانہ ہوسکیں۔ آنحضرت ﷺ نے مختلف لوگوں کی امانتیں حضرت علیؓ کے حوالہ کیں اور انھیں ان کے مالکان تک پہنچانے کے بعد مدینہ آنے کی ہدایت کی۔

مشرکین مکہ پروگرام کے مطابق رات کو کاشانہ نبوی پر آئے اور جھانک جھانک کر اطمینان کرتے رہے کہ کوئی سو رہا ہے۔ جب رات زیادہ ہوگئی تو آپ ﷺ اللہ کی مدد و نصرت سے دشمنوں کے حصار سے اس طرح نکل گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور دونوں حضرات نے وہاں سے نکل کر غار ثور میں پناہ لی۔

صبح کے وقت جان کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے بستر سے حضرت علیؓ کو بیدار ہوتا ہوا پایا وہ اپنے منصوبہ کی ناکامی پر چیں بہ جبیں تو ضرور ہوئے لیکن ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ آپ ﷺ کی تلاش چاروں طرف ہونے لگی۔ آپ ﷺ کو تلاش کرکے لانے والے کو سو اونٹوں کے انعام کی خوشخبری سنائی گئی۔ ایک مرتبہ دشمن بالکل غار ثور کے دہانہ پر پہنچ گئے لیکن مشئیت الٰہی کے سبب وہاں سے واپس آگئے۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے کیئے گئے نظم کے مطابق' ان دونوں حضرات کو کھانا پانی ملتا رہا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق چوتھے دن آپ ﷺ غار ثور سے نکل کر عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں ساحل کے کنارے کنارے نامانوس راستوں سے مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

15.12.1 سراقہ بن مالک کا تعاقب

اس قدر احتیاط کے باوجود بنو مدلج کے سردار سراقہ بن مالک نے قافلۂ نبوی کو دیکھ لیا اور انعام کی لالچ میں آپ ﷺ کے تعاقب میں نکل پڑا۔ جب ایک دم نزدیک آگیا تو حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے کہ کہیں سراقہ انھیں گرفتار نہ کرلے لیکن غیبی امداد کی وجہ سے سراقہ پے در پے مشکلات کا شکار ہونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ اس نے ان حضرات کا تعاقب کرکے غلطی کی ہے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ آنحضور ﷺ سے معافی اور امان کا خواستگار ہوا۔ آپ ﷺ نے اسے امان دی اور بطور نشانی ہڈی یا جھلی پر ایک تحریر لکھ کر اس کے حوالہ کی۔

ادھر انصار مدینہ کو آپ ﷺ کی ہجرت کی خبر مل چکی تھی لہذا وہ ہر روز قبا کے پاس آپ ﷺ کا انتظار کرنے لگے۔ جب آپ ﷺ خیر و عافیت کے ساتھ قبا پہنچے تو مردوں نے ہتھیار سجا کر اور بچوں بچیوں نے دف بجا کر آپ ﷺ کا استقبال کیا۔ قبا کے مختصر قیام میں آپ ﷺ نے وہاں ایک مسجد کی تعمیر کی اور اس کا قبلہ متعین کیا۔ قبا میں تیرہ چودہ دن قیام کرکے آپ ﷺ مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف اسے حاصل ہو لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے لہذا وہ اپنے متعینہ مقام پر ہی جا کر رکے گی۔ آپ ﷺ کی اونٹنی وہاں ٹھہری جہاں آج مسجد نبوی ہے۔ اس وقت وہاں ایک کھلا میدان تھا لیکن وہاں سے قریب ترین مکان حضرت ابوایوب انصاریؓ کا تھا وہ اپنی قسمت پر نازاں، شاداں وفرحاں ہوتے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کا سامان اپنے دومنزلہ مکان کی دوسری منزل پر منتقل کردیا۔

قیام کی جانب سے اطمینان کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ زمین قیمتاً خرید لی جہاں اونٹنی بیٹھی تھی۔ وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ آپ ﷺ نے وہاں مسجد نبوی کے علاوہ اپنے خاندان کے دیگرافراد کے لیے کمرے تعمیر فرمائے۔ تعمیر سے فراغت کے بعد آپ ﷺ وہیں منتقل ہو گئے اور مدینہ سے چھ آدمی روانہ کیے تاکہ وہ خاندان نبوی وصدیقی کو لے آئیں۔

حضرت انس بن مالک کی والدہ اپنے دس سالہ بیٹے کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے بیٹے کو آپ ﷺ کی خدمت کے لیے منتخب کرنے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور حضرت انس بن مالکؓ آپ کے ذاتی خادم بن گئے۔

ہجرت نبوی اور مدینہ میں قیام نبوی کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی مکی زندگی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے اور مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

15.13 مکی زندگی میں حضور ﷺ کا طرز عمل

مکی زندگی میں آپ ﷺ کا طرز عمل ہم سب کے لیے ایک اہم اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ غیر موافق حالات میں کیونکر زندگی گزاری جاسکتی ہے اور مشترکہ معاشرہ میں اپنی شناخت و پہچان کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

آپ ﷺ کی مکی زندگی یتیمی کی حالت میں شروع ہوئی۔ ان پر ان کی ماں، دادا اور چچا نے اپنی محبت وشفقت کو نچھاور کر دیا لیکن آپؐ ماں اور پھر دادا کی محبت وسرپرستی کے کم مدت تک ہی مستفید ہو سکے۔ اس کے بعد چچا کی سرپرستی میں رہے اور آپ نے ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے اجرت پر بکریاں چرائیں۔ ان کی دکان پر کام کیا جہاں سے آپ کی ایمانداری اور سچائی کا شہرہ عام ہونا شروع ہوا جو عنفوان شباب میں اس مرحلہ میں پہنچ گیا کہ آپ ﷺ کے عدل وانصاف پر اہل مکہ کو پورا پورا بھروسہ تھا، اس کی مثال خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے موقعہ پر حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کے واقعے سے دی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ کے امین وصادق ہونے کا اعتراف اہل مکہ کو ہمیشہ رہا تھا، اس کی عملی مثال کوہ صفا سے دعوت حق کے اعلان سے دی جاسکتی ہے کہ ان تمام لوگوں نے متفقہ طور پر اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ جو کچھ کہیں گے سچ ہی کہیں گے۔

بعثت کے بعد آپ ﷺ کا طرز عمل ایک فکر مند داعی کا تھا جو اس فراق میں پریشان رہتا تھا کہ اس کی دعوت کس طرح لوگ قبول کر لیں تاکہ ان کی دنیا وآخرت سنور جائے۔ آپ ﷺ امت کے غم میں مسلسل مبتلا رہتے تھے حتی کہ اللہ نے آیات قرآنی کے ذریعہ آپ ﷺ کو تسلی دی کہ آپ ﷺ امت کے سلسلہ میں پریشان نہ ہوں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔

دعوت اسلام کے تعلق سے آپ ﷺ کا طرز عمل یہ تھا کہ بہت ہی محبت و پیار سے دھیمے انداز میں تبلیغ کرتے تھے صالح اور نیک فطرت لوگ آپ ﷺ کی دعوت قبول کر لیتے تھے۔ جو لوگ آپ ﷺ کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے آپ ﷺ ان کو انھیں کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ سرداران قریش کے بعض افراد نے آپ ﷺ پر نہ جانے کیسے کیسے ستم کیے لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی ان کو پلٹ کر جواب نہیں دیا بلکہ ان کے حق میں خیر کی دعا ہی کرتے رہے۔ سفر طائف کے جاں گسل واقعات کے بعد بھی آپ ﷺ کی زبان مبارک پر ان کے لیے بددعا کا کوئی لفظ نہیں آیا بلکہ ان کے حق میں آپ نے دعائے خیر ہی کی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ کا مکی طرز عمل ہمارے لیے مکمل اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم کسی بھی زمانہ ومعاشرہ میں کامیاب وسرخرو ہو سکتے ہیں۔

معلومات کی جانچ:

1. سفر طائف کا واقعہ مختصراً نقل کیجئے۔

2. بیعت عقبہ ثانیہ کب ہوئی تھی اور اس میں کتنے افراد شامل تھے؟

15.14 خلاصہ

بعثت نبوی کے وقت دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گذر رہی تھی۔شرک و بت پرستی کا بول بالا تھا۔دین ابراہیمی اور دیگر آسمانی مذاہب اپنی شناخت کھو چکے تھے۔انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب غار میں گرنے والی تھی عین وقت پر اللہ تعالی نے محمد رسول اللہ ﷺ کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

جزیرۃ العرب میں بعثت کے اسباب میں سے عربوں کی فطری زندگی، مکہ میں خانۂ کعبہ کی موجودگی اور خود جزیرۃ العرب کا مخصوص جغرافیائی محل وقوع ہے جس نے اسے سب سے موزوں مرکزِ دعوت کی شکل دے دی تھی کہ وہاں سے اس نئی دعوت و پیغام کو ساری دنیا میں پہنچایا جا سکتا تھا اور ساری قوموں کو خطاب کیا جا سکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے نسب کے سلسلہ میں عدنان تک تو سب متفق ہیں لیکن اس سے اوپر حضرت اسماعیل علیہ السلام تک ماہرین انساب میں اختلاف ہے کہ کتنی پشتیں ہیں۔آپ ﷺ کا سلسلۂ نسب محترم، نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔وہ سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں بڑے معزز اور مؤقر تھے۔شرافت نسبی آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

آپ ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم اور دادا عبدالمطلب کا شمار مکہ کے سربرآوردہ اور معززین میں ہوتا تھا۔آپ ﷺ کے والد محترم عبدالمطلب کے سب سے چہیتے، لاڈلے اور چھوٹے بیٹے تھے جو حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے۔ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جمیلہ کا دور دور تک شہرہ تھا۔اٹھارہ سے پچیس سال کی عمر میں عبدالمطلب نے جناب عبداللہ کا نکاح بنوزہرہ کے ایک ممتاز خاندان کی ایک شریف زادی اور نیک و پاک باز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب سے کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ طہارت نفس، شرافت نسب، عزت و وجاہت، عفت و پاکبازی میں بے مثال تھیں اور اپنی قوم میں سیدۃ النساء کے لقب سے مشہور تھیں۔ددھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ عرب کے بہترین قبیلے اور بہترین قوم میں سے تھے۔

آپ ﷺ کی جب ولادت ہوئی تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔عربوں کے دستور کے مطابق آپ ﷺ کے رضاعت کے ایام اور اس کے بعد کے چند سال قبیلہ بنوسعد میں گذرے جہاں پہلی مرتبہ شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔آپ ﷺ کی دایہ کا نام حضرت حلیمہ سعدیہ تھا۔

چھ سال کی عمر میں آپ ﷺ کی والدہ نے اپنے پاس بلا لیا لیکن جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ دادا نے بار کفالت اٹھایا لیکن آٹھ سال کی عمر میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

ماں باپ اور دادا کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کی کفالت کی ذمہ داری حضرت ابو طالب نے اٹھائی۔ ان کے سائے میں بچپن گذار کر نوجوان ہوئے۔ نوجوانان قریش کی طرح آپ ﷺ نے تجارتی اسفار کیے اور امانت وصداقت کی وجہ سے امین وصادق کے لقب سے پکارے گئے۔

حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کی مدافعت میں اپنی تمام تر توانائی صرف کر دی لیکن کفار قریش کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے حتی کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ابھی ان کے صدمہ سے آپ ﷺ ابھر بھی نہیں پائے تھے کہ آپ ﷺ کی جانثار، غمگسار اور مونس بیوی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔

ان کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کی مشکلات بڑھ گئیں۔ کفار قریش نے آپ ﷺ پر شدید ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ سب سے تکلیف دہ واقعہ سفر طائف تھا۔

سفر طائف کے بعد اسراء ومعراج کا واقعہ پیش آیا۔ اسراء سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا زمینی سفر ہے جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں کیا گیا ہے جب کہ معراج کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے وہ آسمانی سفر تھا جس میں رویت ملائکہ سے لے کر جنت ودوزخ کی سیر اور مناجات باری کا واقعہ پیش آیا۔

یہ سفر اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کی ضیافت اور عزت افزائی کے بطور ہوا تھا۔ اس کے ذریعہ آپ ﷺ کی دل داری ودلنوازی کی گئی تھی، طائف کے زخموں کو مندمل کیا گیا۔

معراج سے واپسی پر آپ ﷺ نے تبلیغ ودعوت کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ اب آپ ﷺ مکہ مکرمہ کے اطراف میں دیگر قبائل کے پاس تشریف لے جاتے اور انھیں اسلام کے پیغام سے آگاہ کرتے۔ حج کے موسم میں آنے والوں کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ آپ ﷺ کی ان دعوتی سرگرمیوں کا کسی نے نرمی واخلاق سے کسی نے اجڈ پن اور سختی سے اس کا انکار کر دیا۔

انھیں تبلیغی سرگرمیوں کے دوران آپ ﷺ کی ملاقات عقبہ میں قبیلۂ خزرج کے چھ آدمیوں سے ہوئی۔ آپ ﷺ کی دعوت پر وہ سب حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے۔ ان کی کوششوں سے آئندہ سال مزید سات افراد اسلام لائے۔ وہ سب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت سے سرفراز ہوئے۔ اس واقعہ کو کتب سیرت میں بیعت عقبہ اولی کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا افراد کی کوششوں سے سنہ بارہ نبوی میں تہتر مرد اور دو عورتیں مسلمان ہو گئے۔ حسب معمول آپ ﷺ ان سے عقبہ کے مقام پر دوبارہ ملے جہاں انھوں نے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور آپ ﷺ کی حفاظت کرنے کا وعدہ کیا۔ ان کی پیش کش کے نتیجہ میں آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ آپ ﷺ کی اجازت کی وجہ اکثر مسلمان مدینہ پہلے ہی ہجرت کر چکے تھے۔

ہجرت کے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ تھے جن کی دانائی اور منصوبہ بندی کی وجہ سے آپ ﷺ بخیر وخوبی مدینہ پہنچ گئے۔ حکم الہی کے مطابق حضرت ابو ایوبؓ کے گھر پر قیام کیا نیز ایک قطعہ اراضی خرید کر مسجد نبوی کی تعمیر کی اور اپنے اہل خانہ کے لیے کمرے بنوائے پھر مکہ سے انھیں یہاں بلا لیا۔

15.15 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. خاندان نبوی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. اولین وحی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تحریر کریں۔
3. ہجرت حبشہ پر روشنی ڈالیے۔
4. عام الحزن کسے کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. جزیرۃ العرب میں بعثت کے اسباب کیا تھے؟ تحریر کیجئے۔
2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجارت کے عمل پر مختصر نوٹ لکھئے۔
3. سفر طائف پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. بیعت عقبہ اولی وثانیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجئے۔
5. ہجرت نبوی کی تفصیلات بیان کیجئے۔

15.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرت النبی : علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
2. رحمۃ للعالمین : قاضی سلیمان منصور پوری
3. نبی رحمت : حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
4. اصح السیر : مولانا عبدالرؤف جاناپوری
5. محسن انسانیت : ڈاکٹر نعیم صدیقی
6. تاریخ تہذیب اسلامی (عہد جاہلی وعہد اسلامی) : پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
7. عہد نبوی کے میدان جنگ : ڈاکٹر حمید اللہ
8. اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ محمد ﷺ، لاہور
9. نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور

اکائی 16 : سیرت نبوی (مدنی دور)

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

16.2 تمہید

16.3 مدنی زندگی

16.4 عربوں سے جنگیں

16.5 قریش و یہود کے علاوہ دیگر قبائل کے ساتھ لڑی جانے والی جنگیں

16.6 یہودی قبائل سے ہونے والی جنگیں

16.7 بیرون عرب میں ہونے والی جنگیں

16.8 اقوام وقبائل کے ساتھ معاہدے

16.9 وفود کا سال

16.10 حجۃ الوداع

16.11 مرض وفات

16.12 وفات اقدس

16.13 سماج کی تشکیل

16.14 بیرونی تعلقات

16.15 تعلیم وتربیت

16.16 اخلاق نبوی

16.17 ازواج واولاد

16.18 عادات وشمائل

16.19 مدنی زندگی میں حضور کا طرز عمل

16.20 خلاصہ

16.21 نمونے کے امتحانی سوالات

16.22 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

16.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ کو معلوم ہو گا کی آپ ﷺ کی مدنی زندگی کیا تھی؟ اس زندگی کا آغاز کس طرح ہوا۔ آپ ﷺ مدینہ میں اسلامی معاشرہ کی تعمیر کس طرح کی۔ مدنی زندگی میں مشرکین اور منافقین و یہودیوں کے ساتھ کون کون سی جنگیں پیش آئیں اور ان کے کیا نتائج بر آمد ہوئے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ حجۃ الوداع کا پیغام کیا تھا؟ آپ ﷺ کے وصال کی کیا کیفیت تھی؟ ساتھ ہی ساتھ ازواج مطہرات کی اولاد کے متعلق بھی معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

16.2 تمہید

آپ ﷺ کے مدینہ میں قیام اور وہاں گذرنے والی زندگی کو ''مدنی زندگی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیات طیبہ کو دو ادوار-مکی زندگی اور مدنی زندگی- میں تقسیم کرنے کی بنیادی وجہ یہ قرار دی جاسکتی ہے کہ مکہ میں آپ ﷺ نبوت جیسے منصب سے سرفراز کیے گئے جہاں آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کی حتی الامکان کوشش کر لی تھی۔ اس نئی دعوت کے علمبردار ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو سخت ترین حالات سے گذرنا پڑا۔ آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے والوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام کو مکہ میں وہ بلند مقام و مرتبہ اور سماج میں وہ قبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ ﷺ بھی اپنے شفیق چچا ابو طالب کے انتقال کے بعد بے دست و پا بن کر رہ گئے تھے کہ ہر کس و ناکس آپ ﷺ کو ستانے کی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ حالات کے پیش نظر آپ ﷺ کو نئی حمایت و جوار کی شدید ترین ضرورت تھی تاکہ اسلام کے پیغام کو عام کیا جاسکے۔ اللہ کو اسلام کو سربلند کرنے اور رسول اکرم کے میزبان بننے کی سعادت سے اہل مدینہ کو سرفراز کرنا تھا لہذا دھیرے دھیرے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ آپ ﷺ اپنے محبوب شہر سے بیگانوں کی طرح نکل پڑے اور سرزمین مدینہ میں پناہ لی۔

مدنی زندگی دراصل اسلام کے غلبہ کی داستان ہے جہاں آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ بغیر کسی رکاوٹ اور پریشانی کے کی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہاں کے حالات مکمل طور نارمل اور بہتر تھے۔ اگر مکہ میں قریش کی اسلام مخالفانہ سرگرمیاں عروج پر تھیں تو مدینہ میں منافقین و یہود کی ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خارجی حملوں کا مقابلہ کرنا تھا لیکن چونکہ اللہ تعالی کو ہر حال میں اسلام کو سربلند کرنا لہذا آپ ﷺ نے تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کے پیغام کو عام کیا اور بطور آخری مذہب کے اس کی تکمیل کی۔ اسلام کے حقیقی خدوخال چونکہ مدینہ میں ہی ظاہر ہوئے تھے اور اس کے پیغام کی تکمیل بھی وہیں ہوئی تھی لہذا اسے مدنی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

16.3 مدنی زندگی

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کے ساتھ ہی حیات نبوی کا مدنی دور شروع ہو جاتا ہے۔ مدنی دور دس سال 12 ربیع الاول 1ھ/ 24 ستمبر 622ء تا 12 ربیع الاول 11ھ/ 8 جون 632ء پر محیط ہے جسے چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور: سنہ 1 تا 2ھ/ سنہ 622 تا 624ء۔ تقریباً اٹھارہ مہینے پر مشتمل اس عہد کو ابتدائی مدنی دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے جو ہجرت نبوی سے لے کر غزوہ بدر کے عرصے پر محیط ہے۔

دوسرا دور: سنہ 2 تا 5ھ/ سنہ 624 تا 626ء۔ اس دور کو قریشی حملوں کے زمانہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ دور غزوۂ خندق پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا دور: سنہ 6 تا 8ھ/ سنہ 628ء تا 630ء۔ یہ دور خندق سے فتح مکہ کا دور ہے جسے غلبہ اسلام کے دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

چوتھا دور: سنہ 9 تا 11ھ/ سنہ 630 تا 632ء۔ تقریباً سوا دو سال کا یہ عرصہ فتح مکہ سے لے کر آپ ﷺ کی وفات تک کے عرصے پر محیط ہے۔ جسے غلبہ اسلام کے دور ثانی اور تکمیل اسلام کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

جس وقت آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت کی تھی اس وقت تک اہل مدینہ کی اکثریت کا حلقہ بگوش ہو چکی تھی۔ جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو وہ حمایت و نصرت از خود حاصل ہوگئی جس کے آپ ﷺ اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ آپ یہاں شب و روز اسلام کی دعوت و تبلیغ میں کوشاں ہوگئے۔ مدنی زندگی کے اہم پڑاؤ حسب ذیل ہیں:

☆ سنہ 1 ہجری/ 622 عیسوی: مدینہ آمد، مسجد نبوی اور مکانات کی تعمیر، مواخاۃ یعنی مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کا معاہدہ، میثاق مدینہ۔

☆ سنہ 2 ہجری/ 623 عیسوی: تحویل قبلہ، فرضیت روزہ و زکوۃ و جہاد، سریہ عبداللہ بن جحش، غزوۂ ابواء، غزوۂ بدر۔

☆ سنہ 3 ہجری/ 624 عیسوی: غزوۂ احد، حرمت شراب، غزوۂ سویق، غزوۂ بنو قینقاع۔

☆ سنہ 4 ہجری/ 625 عیسوی: حکم حجاب، غزوۂ بنو نضیر اور ان کی جلاوطنی، غزوۂ ذات الرقاع۔

☆ سنہ 5 ہجری/ 626 عیسوی: غزوۂ دومۃ الجندل، غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب، غزوۂ بنو قریظہ۔

☆ سنہ 6 ہجری/ 627 عیسوی: غزوۂ بنی مصطلق، واقعۂ افک، صلح حدیبیہ، سلاطین و امراء کو دعوت اسلام۔

☆ سنہ 7 ہجری/ 628 عیسوی: غزوۂ خیبر، عمرۃ القضاء۔

☆ سنہ 8 ہجری/ 629 عیسوی: غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوۂ طائف۔

☆ سنہ 9 ہجری/ 630 عیسوی: غزوۂ تبوک، عام الوفود، فرضیت حج و پہلا حج۔

☆ سنہ 10 ہجری/ 631 عیسوی: حجۃ الوداع۔

☆ سنہ 11 ہجری/ 632 عیسوی: بیماری اور وفات۔

16.3.1 صلح وجنگ

دشمنوں کے خلاف آپ ﷺ کو مدینہ میں چھوٹی بڑی 74 جنگی مہمات سر کرنی پڑیں۔ان جنگوں کو اصطلاحی طور پر غزوہ اور سریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔سریہ کی جمع سرایا ہے۔اس اصطلاح سے مراد وہ جنگی مہمیں ہیں جن میں آپ ﷺ نے بذات خود شرکت کی۔ان کی مجموعی تعداد 47 ہے۔

غزوہ کی جمع غزوات ہےاس سے مرادہ جنگی مہمیں ہیں جن میں آپ ﷺ بذات خود شریک ہوئے ہوں۔ان کی مجموعی تعداد 27 ہے۔

آپ ﷺ کے غزوات کو چند ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

☆ پہلا دور مکی اعلان جنگ سے شروع ہو کر غزوۂ بدر پر ختم ہوتا ہے۔

☆ دوسرا دور صرف غزوۂ احد پر مشتمل ہے۔

☆ تیسرا دور احد کے بعد شروع ہوتا ہے اور غزوۂ خندق پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

☆ چوتھا دور صلح حدیبیہ سے لے کر غزوۂ خیبر کا واقعہ پیش آنے تک ہے۔

☆ پانچواں دور خیبر کے بعد سے لے کر فتح مکہ تک کے عرصے پر مشتمل ہے۔

☆ چھٹا دور فتح مکہ کے بعد ہونے والے غزوات پر مشتمل ہے۔

غزوات وسرایا کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. **عربوں سے جنگیں**: ان جنگوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

☆ وہ جنگیں جو کفار قریش و دیگر قبائل عرب اور اسلامی افواج کے درمیان ہوئیں جیسے غزوہ بدر واحد اور غزوہ حنین وغیرہ۔

☆ وہ جنگیں جو یہود اور اسلامی افواج کے درمیا نپیش آئی جیسے غزوہ بنونضیر وغیرہ۔

2. **بیرون عرب سے ہونے والی جنگیں**

درج ذیل سطور میں مذکورہ بالا تقسیم کے اعتبار سے مشہور غزوات وسرایا کا ذکر کیا جائے گا۔

16.4 عربوں سے جنگیں

16.4.1 اہل مکہ وقریش سے ہونے والی جنگیں

ہجرت کے وقت آپ ﷺ کے قتل کی سازش گویا قریش کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔قریش کو آپ ﷺ کا سکون واطمینان کے ساتھ میں قیام کسی بھی صورت میں قبول نہیں تھا اور وہ برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بھی آپ ﷺ کو مدینہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا جائے۔ہجرت سے پہلے جو مدینہ بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا قیام نبوی کی وجہ سے قریش نے اس کو اپنے نشانے پر لے لیا۔

ہجرت کا پہلا سال کسی طرح خیر وخوبی سے گذر گیا۔ البتہ کچھ ایسے واقعات ضرور پیش آئے جس میں ذرا سی بداحتیاطی جنگ وجدل کا سبب بن سکتی تھی لیکن اہل اسلام نے سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے جنگ وجدل سے خود کو محفوظ رکھا۔ ہجرت کے پہلے سال میں آپ ﷺ نے مدینہ کے اندرونی استحکام پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ بیرونی خطرات کے مقابلے کا سامان بھی کر لیا تھا۔ لیکن سنہ 2 ہجری میں دو اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے پہلا واقعہ تحویل قبلہ کا ہے چنانچہ شعبان سنہ 2 ہجری میں اللہ تعالی کے حکم سے بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ دوسرا واقعہ سلسلہ غزوات کا آغاز ہے کہ دشمنان اسلام نے اسی سال اسلام کے خلاف تلوار کھینچ لی تھی اور مسلمان بھی مدافعت کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

قریش نے چونکہ مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور انھوں نے اس ضمن میں عبداللہ بن ابی کو خط بھی لکھا تھا کہ وہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ اس زمانہ میں قریش کے حملہ کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا جس کی وجہ سے ایک مدت تک آپ ﷺ نے جاگ جاگ کر راتیں بسر کی تھیں۔ آپ ﷺ نے قریش کے حملہ سے محفوظ رہنے کے لیے دو تدبیریں اختیار کیں۔ پہلی تدبیر یہ تھی کہ قریش کی شامی تجارت کے راستہ کو روک دیا جائے تاکہ ان کی معیشت لڑکھڑا جائے اور وہ صلح پر مجبور ہو جائیں۔ دوسری تدبیر آپ ﷺ نے یہ اختیار کی تھی کہ قرب وجوار کے قبائل سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے تاکہ قریش سے جنگ کی صورت میں اندرون سے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے غزوہ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں۔ صفر 2 ہجری میں پیش آنے والی مہم ابواء سے پہلے آپ ﷺ کسی مہم میں بذات خود شریک نہیں ہوئے تھے۔

ابواء کی مہم سے پہلے تین مہمیں - سریۂ حمزہ، سریۂ عبیدہ بن حارث اور سریۂ سعد بن ابی وقاص - روانہ کی جا چکی تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی کشت وخون نہیں ہوا تھا یا۔ یہ سرایا قریش کی شامی تجارت میں رخنہ اندازی کے لیے بھیجے گئے تھے۔

16.4.2 اولین غزوہ

صفر 2 ہجری میں پیش آنے والی مہم ابواء میں آپ ﷺ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء کے مقام تک گئے جہاں آپ ﷺ نے بنوضمرہ معاہدہ کیا۔ اس مہم کے تقریبا ایک ماہ بعد کُرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے آپ ﷺ کے کچھ مویشی لوٹ لیے۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔

16.4.3 غزوۂ ذوالعشیرہ

مذکورہ بالا واقعہ کے تقریبا تین مہینے بعد جمادی الثانی سنہ 2 ہجری میں آپ ﷺ دو سو مہاجرین کے ساتھ نکلے اور ذوالعشیرہ کے مقام پر بنومدلج سے معاہدہ کیا۔ چونکہ بنومدلج بنوضمرہ کے حلیف تھے لہذا انھوں نے آپ ﷺ کی تمام شرطیں آسانی کے ساتھ قبول کر لیں۔

16.4.4 سریہ نخلہ

رجب سنہ 2 ہجری میں آپ ﷺ نے عبداللہ بن جحش کی قیادت میں 12 آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ نخلہ نامی مقام کی جانب روانہ کیا تاکہ قریش کے حالات کا پتہ لگایا جاسکے۔ اتفاق سے قریش کے چند اشخاص شام کے سفر تجارت سے واپس آرہے تھے۔ عبداللہ بن جحشؓ نے ان پر حملہ کر کے عمرو بن حضرمی کو مار گرایا۔ عثمان اور نوفل کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ مال غنیمت اور گرفتار شدگان کے ساتھ مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ سخت برہم ہوئے آپ نے فرمایا میں نے تمہیں صرف حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا نہ کہ حملہ کرنے کے لیے۔ آپ ﷺ کی سخت برہمی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے مال غنیمت بھی لینے سے منع کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی یہ لغزش غزوہ بدر کا سبب بن گئی اس لئے مقتول اور گرفتار شدگان کا تعلق قریش کے معزز ترین خانوادوں سے تھا۔

16.4.5 غزوۂ بدر

جمادی الآخرۃ سنہ 2 ہجری میں قریشی کارواں خاص جنگی نقطۂ نظر سے تجارت کے لیے شام گیا۔ قریش کے خطرناک ارادوں کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے مکہ کی تمام آبادی نے اپنی تمام جمع پونجی اس تجارتی سفر میں لگا دی تھی۔ تین ماہ بعد ابھی وہ قافلہ شام سے روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا جس نے قریش کے غیظ وغضب کو شدید کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ واپسی کے وقت یہ خبر اڑ گئی کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ اس خبر کو سن کر بقول علامہ شبلی ''قریش کا غیظ وغضب کا بادل بڑے زور وشور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا''۔

قریش کی تیاریوں کو سن کر آپ ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے صورت حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ آپ ﷺ خاص طور سے انصار کا نقطۂ نظر جاننا چاہ رہے تھے۔ انصار نے آپ ﷺ کو مایوس نہیں کیا اور اپنی مکمل حمایت ونصرت کا یقین دلایا۔

انصار کا نقطہ نظر جاننے کے بعد آپ ﷺ نہایت کسمپرسی کی حالت میں تین سو تیرہ مجاہدین کے ساتھ نکل کر بدر میں قیام پذیر ہوگئے۔ ادھر ابوسفیان نے کارواں کا راستہ تبدیل کر کے اپنے آپ کو امکانی مڈبھیڑ سے بچا لیا۔ لیکن چونکہ اس نے مکہ سے کمک منگائی تھی اس لئے خاص طور سے ابوجہل، کارواں کے سلامتی کے ساتھ پہنچ جانے کے بعد بھی مسلمانوں سے جنگ کرنے پر بضد رہا۔ لہٰذا مشرکین مکہ کی فوج بھی بدر کے مقام پر قیام پذیر ہوئی۔ ان کے لشکر کی تعداد 950 تھی جب کہ مسلمانوں کی تعداد صرف 313 تھی۔ سخت گیر مشرکین نے جب مسلمانوں کی اتنی تھوڑی تعداد دیکھی تو انھیں لگا کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کا اس سے اچھا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا لہٰذا وہ کچھ سرداروں کی مخالفت کے باوجود جنگ کرنے پر اڑے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 17 رمضان 624 ہجری/ 23 مارچ 623 عیسوی کو دونوں فریقوں کے درمیان بدر کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں خاص رحمت الٰہی کی وجہ سے مسلمانوں کو زبردست فتح کے ساتھ خاصی مقدار میں مال غنیمت بھی حاصل ہوا۔ اس جنگ میں کل 14 مسلمان شہید ہوئے جب کہ قریشی لشکر کے 70 افراد مارے گئے جن میں ان کے بڑے بڑے سردار جیسے ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ 70 لوگ قیدی بنائے گئے جنھیں۔ دو لوگوں کو چھوڑ کر۔ بعد میں فدیہ کے عوض رہا کر دیا گیا۔

مسلمانوں کی اس جنگ میں عظیم کامیابی کے نتیجے میں قریش کی ساکھ کمزور ہوگئی۔مسلمانوں کا رعب و دبدبہ بڑھ گیا۔آس پاس کے قبیلوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے۔اسلام کی اشاعت میں تیزی آئی جس کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کی سرحدیں مزید پھیل گئیں۔لیکن اس کامیابی نے اسلام دشمن طاقتوں خاصی طور پر یہودی کو بہت زیادہ چوکنا کردیا۔

قریش مزید جانی دشمن بن گئے۔مسلمانوں کی اندرونی صفوں میں منافقین کی ریشہ دوانیاں مزید بڑھ گئیں گویا اب آپ ﷺ کو بیرونی دشمنوں کے ساتھ ساتھ اندرونی دشمنوں اور منافقین کی سازشوں کا سامنا کرنا تھا اس طرح آپ کو کئی سطحوں پر دشمنوں کے مقابلہ کرنا پڑا۔

16.4.6 غزوۂ سویق

بدر میں شکست کے بعد قریش نے ابوسفیان کی ماتحتی میں مدینہ کے اطراف میں حملہ کر کے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی۔ان کے تعاقب میں آپ ﷺ نکلے لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔غزوۂ بدر کے بعد جب جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ ﷺ نے قریشی تجارت کی ایسی سخت ناکہ بندی کی کہ پھر اس راستے سے کوئی مکی کارواں شام نہ جاسکا۔اہل مکہ نے اگرچہ متبادل راستہ کھول رکھا تھا لیکن مدینہ سے جانے والے راستہ کی ناکہ بندی ان کے لیے موت و زندگی کا سوال بن گئی لہذا انھوں نے آر یا پار کی جنگ کرنے کا ارداہ کرلیا۔

16.4.7 غزوۂ احد

شوال 3 ہجری/ مارچ 625 عیسوی میں تین ہزار کی تعداد پر مشتمل قریش کی فوج ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ آدھمکی۔احد کے میدان میں اس نے پڑاؤ ڈال دیا۔آپ ﷺ اور دیگر اصحاب کی رائے تھی کہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ شہر بند ہو کر کرنا زیادہ مناسب ہے لیکن چند جوشیلے نوجوان اس بات پر مصر رہے کہ دشمن کی فوج کا مقابلہ شہر سے باہر نکل کر کرنا چاہیئے۔آپ ﷺ نے ان کے اصرار کے پیش نظر ان کی بات مان لی اور اسلامی لشکر کے ساتھ احد میں خیمہ زن ہوگئے۔آپ ﷺ نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے تیراندازوں کے ایک دستہ کو ایک ایسے درے پر متعین کیا جہاں عقب سے حملہ کیا جاسکتا تھا۔آپ ﷺ نے اس دستہ کو حکم دیا تھا کہ لڑائی کا نقشہ چاہے جیسا ہو وہ اس درے کو خالی نہیں کریں گے لیکن ان کی حکم عدولی ہی غزوہ احد میں مسلمانوں کی شکست فاش کا سبب بن گئی۔

لڑائی کی ابتداء میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور لشکر قریش پیچھے ہٹنے لگا یہ دیکھ کر درے پر متعین افراد میں سے اکثر نے یہ سمجھ لیا کہ فتح ہو چکی ہے لہذا وہ لوگ آپ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود درے سے ہٹ گئے۔خالد بن ولید نے جب درے کو خالی پایا تو اسی جانب سے اس شدت کے ساتھ حملہ آور ہوئے کہ مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔اسلامی لشکر کو سخت جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ستر مجاہدین نے جام شہادت نوش فرمایا جن میں حضرت حمزہ اور مصعب بن عمیر جیسے صحابہ کرام شامل تھے۔متعدد افراد بشمول آپ ﷺ کے سخت زخمی ہوئے۔ان حالات میں بھی آپ ﷺ نے ہوش کا دامن نہیں چھوڑا اور اسلامی لشکر کی دوبارہ ایسی صف بندی کی کہ قریشی لشکر کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

16.4.8 غزوۂ بدر ثانی

قریشی لشکر نے جاتے جاتے یہ اعلان کیا تھا کہ آئندہ سال پھر بدر میں مقابلہ ہوگا۔ لہذا آپ ﷺ ذی قعدہ 4 ہجری/ اپریل 626 عیسوی میں بدر کے میدان جنگ میں تشریف لے گئے لیکن قریشی لشکر نہ آیا۔ آپ ﷺ چند روز انتظار کر کے وہاں لگنے والے سالانہ تجارتی میلے سے استفادہ کر کے اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ واپس آ گئے۔

16.4.9 غزوۂ ذات الرقاع

ہجرت کے چوتھے سال میں آپ ﷺ نے نجد کے علاقہ کو غزوہ کے لیے منتخب کیا۔ مدینہ سے روانہ ہو کر نجد کے ایک نخلستان میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کی مختصر سی جماعت تھی۔ اس غزوہ میں حالانکہ جنگ کی نوبت نہیں پیش آئی لیکن راستہ کی مشکلات و شدائد کے نتیجے میں صحابہ کرام کے پیر چھلنی ہو گئے حتی کہ ناخن تک گر گئے۔ مزید تکلیف سے بچنے کے لیے لوگوں نے پیروں پر چیتھڑے اور پٹیاں باندھ لیں۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ ذات الرقاع پڑ گیا تھا۔

16.4.10 غزوۂ خندق

شوال 5 ہجری/ مارچ 627 عیسوی میں غزوۂ خندق پیش آیا۔ چھوٹی موٹی مہموں سے جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو قریش نے ایک بڑا متحدہ محاذ بنا کر مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اس محاذ میں قریش کے علاوہ غطفان، بنو سلیم اور بنو اسد جیسے قبائل شامل تھے۔ ادھر مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ نے بھی اس لشکر کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ لشکر کئی لشکروں اور فوجوں پر مشتمل تھا لہذا اسے غزوۂ احزاب سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لشکر دس ہزار مسلح و تجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھا اور اسلامی لشکر کی تعداد محض تین ہزار تھی۔

مذکورہ لشکر کی پیش قدمی کو سن کر آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی کے مشورے پر مدینہ کے شمال میں ایک خندق کھود کر مدینہ کو دشمنوں سے چاروں سے محفوظ کر لیا کہ اس کے باقی ماندہ تین اطراف لاوے کے ٹیلوں کی وجہ سے ناقابل عبور تھے۔ دشمنوں کا لشکر آپ ﷺ کی حکمت عملی دیکھ کر دنگ رہ گیا اس کو کوئی راستہ ایسا نہیں دکھائی دیا کہ اس کی مدد سے خندق کو عبور کر لے۔ چھوٹ پٹ کوششیں ہوئیں لیکن مسلم تیراندازوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی لہذا وہ محاصرہ کر کے بیٹھ گئے۔ تیز ہواؤں، سردی کے جھکڑوں اور دوسری مصیبتوں کے علاوہ حرمت کے مہینے آ جانے کی وجہ سے قریشی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ محض نصرت خداوندی کے باعث ابوسفیان محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا اور ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گیا۔ یہ جنگ ذی قعدہ 5 ہجری/ اپریل 627 عیسوی کو ختم ہوئی تھی۔

اس غزوہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے احزاب کے واپسی کے بعد فرمایا تھا کہ اب وہ مدینہ پر کبھی بھی حملہ نہیں کر سکیں گے بلکہ اب ہم ان پر حملہ کریں گے۔ آپ ﷺ کا فرمانا بالکل برحق ثابت ہوا چنانچہ پھر قریش مدینہ پر حملہ نہ کر سکے کیونکہ اتنے بڑے حملہ کی ناکامی کے بعد ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی، ان کا اعتماد جاتا رہا اور ان کی ساکھ کمزور پڑ گئی اور ان کی جارحیت کا دور نہ صرف ختم ہو گیا بلکہ وہ مدافعانہ پوزیشن میں آ گئے۔

16.4.11 صلح حدیبیہ

ذوقعدہ 6 ہجری میں آنحضرت ﷺ اپنے پندرہ سو اصحاب کے ساتھ عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے لیکن قریش نے آگے بڑھ کر اس قافلہ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیا۔ آپ ﷺ نے قریش کو یہ یقین دلانے کے لیے متعدد سفارتیں بھیجیں کہ آپ ﷺ صرف عمرہ کی غرض سے مکہ آنا چاہتے ہیں مگر قریش اس بات پر اڑے رہے کہ آپ ﷺ واپس لوٹ جائیں۔ متعدد سفارتوں کی ناکامی کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بطور سفیر مکہ بھیجا کہ وہ ابوسفیان کے قریبی رشتہ دار تھے لیکن ان کی بات بھی سنی ان سنی کردی گئی۔ ادھر اسلامی لشکر میں یہ افواہ اڑ گئی کہ انھیں شہید کردیا گیا ہے۔ اس خبر کو سن کر آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے موت کی بیعت لی کہ جان کی پروا کیے بغیر لڑیں گے اور کسی بھی حال میں راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

بیعت رضوان کے بعد صورتحال زیادہ گھمبیر ہوگئی۔ معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اب قریش نے سہیل بن عمرو جیسے بردبار شخص کو مصالحت کی خاطر بھیجا۔ طویل گفت وشنید کے بعد طے ہوا کہ وہ آپس میں دس سال تک جنگ نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ اس سال عمرہ کیے بغیر واپس جائیں اور آئندہ سال صرف تین دنوں کے لیے عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئیں۔ اگر کوئی مسلمان مکہ آجاتا ہے تو وہ اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے لیکن کوئی مکہ سے آپ ﷺ کے پاس چلا جائے تو آپ ﷺ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ ہر فریق خلوص دل سے صلح کا احترام کرے گا اور معاملات میں غیر جانب دار رہے گا۔ دیگر قبائل اپنے اپنے منشاء کے حساب سے کسی بھی فریق کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

ان میں کچھ شرائط خاص طور پر چوتھی شرط پر مسلمانوں کو خاصی تشویش تھی حتیٰ کی حضرت عمر جیسے زیرک و جہاندیدہ شخص کو ان شرائط پر اعتراض تھا چنانچہ وہ اس پر برملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر بیٹھے لیکن چونکہ یہ آپ کی تربیت کا کرشمہ تھا کہ آپ ﷺ کی رضا کو دیکھتے ہوئے وہ ان سخت شرائط پر بھی راضی ہوگئے۔

قرآن کے مطابق یہ صلح مسلمانوں کے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی اور اسلام کا پیغام چہار سو پھیلنے لگا۔ حسب معاہدہ ایک سال کے بعد آنحضرت ﷺ مکہ عمرہ کرنے گئے اور معاہدہ کی شرائط کی پاس داری کرتے ہوئے مناسک عمرہ ادا کیا اور قریش کو کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔

اسی سال آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ اور ابوسفیان کی بیوہ بیٹی ام حبیبہؓ سے نکاح کیا جس سے ابوسفیان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

اسی سال اسلام کے حلقۂ ارادت میں دو بطل جلیل شامل ہوئے جنھوں نے اسلامی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا ان کا نام حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ ہے۔

16.4.12 فتح مکہ

شعبان 8 ہجری میں بنوخزاعہ و بنوبکر میں کچھ جھگڑے کی بنا پر خون ریزی ہوئی۔ اہل مکہ نے چھپ چھپا کر بنوبکر کی اسلحہ سے مدد کی جو صلح حدیبیہ کی صریحا خلاف ورزی تھی۔ مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ نے آپ ﷺ سے شکایت کی اور آپ ﷺ نے ان کی مدد کا

وعدہ فرمایا قریش کے پاس سفارت بھیجی اور ان کے سامنے تین شرائط رکھیں: مقتولین کی دیت ادا کی جائے یا بنوبکر سے قریش معاہدہ توڑ لیں یا صلح حدیبیہ کو ختم کر دیا جائے۔ قریش کے نمائندے قُرط بن عمر نے صلح حدیبیہ کو ختم کرنے کی شرط قبول کر لی۔ لیکن قریش کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انھوں نے صلح کی تجدید کے لیے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا لیکن وہ وہاں سے ناکام لوٹ آئے۔ اس دوران آپ ﷺ نے اہل مدینہ کو ایک مہم کے لیے تیار رہنے کے لیے کہا۔

آنحضرت ﷺ نے ایک طرف یہ انتظام کیا کہ مدینہ سے کوئی بھی شخص باہر نہ جانے پائے۔ حاطب بن بلتعہؓ نے اہل مکہ سے قرابت داری کی بنا پر انھیں آپ ﷺ کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنا چاہا لیکن ان کا خط پکڑ لیا گیا۔ آپ ﷺ نے انھیں ان کی سابقہ خدمات کی بنا پر معاف کر دیا۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے تمام حلیف قبائل کو خفیہ اطلاع بجھوائی کہ وہ سب لوگ ایک بڑی مہم کے لیے تیار رہیں۔

جب آپ ﷺ نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں تو دشمنوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک مہم بطن اضم بھیجی۔ نامانوس راستوں سے مکہ کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں حلیف قبائل کی افواج کو ساتھ لیتے گئے حتیٰ کہ مرالظہران پہنچ گئے لیکن اس وقت اسلامی فوج کے اکثر افراد اس بات سے بے خبر تھے کہ آپ ﷺ کا قصد کہاں کا ہے۔ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ رمضان 8 ہجری کو مکہ کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے درمیان آپ ﷺ نے پڑاؤ ڈال دیا اور حکم دیا کہ رات میں ہر سپاہی الگ الگ آگ جلائے۔ ابوسفیان نے بلندی سے اسلامی لشکر کا نظارہ دیکھا انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ لشکر کم از کم پچاس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ حالات کا مزید جائزہ لینے وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک گشتی دستہ نے انھیں گرفتار کر کے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں حفاظت سے رکھنے کا حکم دیا تاکہ وہ واپس نہ جا سکیں۔

صبح کو آپ ﷺ نے فوج کو چار مختلف جہات سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا اور نیز فرمایا کہ صرف اپنی مدافعت کی جائے اور حتی الامکان خونریزی سے بچا جائے۔ آپ ﷺ بڑی شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا جس سے متاثر ہو کر متعدد لوگ اسی وقت اسلام لے آئے حتیٰ کہ جو لوگ اسلام آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے وہ بھی آپ ﷺ کے حسن سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اسلام کے حلقہ میں فوراً ہی یا کچھ دنوں بعد داخل ہو گئے۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے کعبے میں موجود تمام بتوں کو مسمار کروا دیا۔ متعدد دستے آس پاس کے علاقوں میں بھیجے کہ وہ وہاں موجود بتوں کو زمین بوس کر دیں تاکہ حرم کعبہ کی تطہیر کے عمل کو پورا کیا جا سکے۔

16.5 قریش و یہود کے علاوہ دیگر قبائل کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ

16.5.1 غزوۂ حنین و طائف

بنو ہوازن کا شمار قریش کے بعد سب سے بڑے طاقتور قبیلہ میں ہوتا تھا۔ قریش نے اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے، لیکن بنو ہوازن اسلام کی بیخ کنی کر کے اپنا سر بلند کرنا چاہتے تھے اور اپنے متعلق یہ بات مشہور کرانا چاہتے تھے

کہ جو کام قریش نہ کر سکے اسے انھوں نے انجام دے دیا۔لہذا فتح مکہ کے کچھ دنوں بعد ہی یہ خبر آئی کہ اہل طائف اور بنو ہوازن مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔خبر کی تصدیق کرنے کے بعد آپ ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ یکم شوال 8 ہجری کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے۔ابھی آپ ﷺ حنین کی گھاٹی سے گذر رہی رہے تھے کہ دشمنوں نے اتنی شدید تیراندازی کی کہ اسلامی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن آنحضرت ﷺ کی بہادری وثابت قدمی کی وجہ سے اسلامی لشکر نے دوبارہ اپنے قدم جمالیے اور پلٹ کرا تنا شدید حملہ کیا کہ دشمن کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔اسلامی لشکر نے ان کے پڑاؤ پر قبضہ کرلیا اور بہت سے جانور تقریبا چھ ہزار عورت و بچے قید کر لیے گئے۔ان میں آپ ﷺ کی رضاعی بہن شیماء بھی تھیں جن کے ساتھ کمال محبت والفت کا سلوک کرتے ہوئے آپ ﷺ نے انھیں رہا کر دیا۔عام قیدیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ ﷺ دشمن کے تعاقب میں بڑھے اور طائف شہر کا محاصرہ کرلیا جہاں بنو ثقیف کے باقیماندہ دستوں نے پناہ لی تھی اور سال بھر کی رسد اکٹھا کر کے خود قلعہ بند کرلیا تھا۔لیکن اسے مضبوط قلعہ اور فصیلوں کی وجہ سے کوششوں کے باوجود فتح نہیں کیا جاسکا۔دشمنوں نے اسلامی لشکر پر اتنی سخت تیراندازی کی تھی جس سے تیر نہیں ٹڈیوں کا لشکر ان پر ٹوٹ پڑا ہو۔صورت حال دیکھ آپ ﷺ نے ثقیف کے انگور کے باغات کاٹنے کا حکم دیا جن پر ان کی معیشت کا دارومدار تھا۔یہ صورت حال دیکھ کر انھوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے باغات کو اللہ کے واسطہ اور طائف سے اپنی رشتہ داری وقرابت کو دیکھتے ہوئے نہ کاٹا جائے۔آپ ﷺ نے ان کی بات مان لی اور یہ منادی کروائی کہ جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آئے گا وہ آزاد ہے۔یہ اعلان سن کے دس یا اس سے زائد غلام آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو گئے اور آپ ﷺ نے ان سب کو وعدہ کے مطابق آزاد کر دیا۔

چونکہ آپ ﷺ کو طائف فتح کرنے کا حکم اللہ کی جانب سے نہیں ملا تھا لہذا آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ واپسی کا اعلان فرمادیں۔اعلان سن کر لوگوں نے کہا کہ طائف کو فتح کیے بغیر واپسی کیونکر ہوسکتی ہے۔آپ ﷺ نے انھیں قتال کرنے کے لیے کہا۔انھوں قتال کا آغاز بھی کیا لیکن انھیں سخت چوٹیں آئیں۔اس موقعہ پر آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ کل صبح انشاء اللہ واپس چلیں گے۔مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور سفر کی تیاری کرنے لگے۔یہ منظر دیکھ کر آپ ﷺ ہنسنے لگے۔

طائف سے واپسی کے بعد جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت اور قیدیوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ان قیدیوں میں آپ ﷺ کی دودھ پلائی کا خاندان بھی تھا۔وہ کچھ دنوں بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے اپنے مال اور قیدیوں کو واپس کرنے کی التجا کی۔آپ ﷺ نے ان کی خواہش کے مطابق ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا۔

غزوہ حنین کے فورا بعد اہل طائف نے اسلام قبول کرلیا۔مکہ کی طرح طائف بھی سیاسی،سماجی،اجتماعی اور دینی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔جب مکہ و طائف نے اسلام قبول کرلیا اور اسلامی نظام سے منسلک ہو گئے تو باقی عرب کے لیے اسلام قبول کرنا بہت آسان ہو گیا چنانچہ ایک سال کے اندر اندر لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے اور آنکھوں نے ﴿**يدخلون في دين الله أفواجا**﴾ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے گئے کی عملی تفسیر دیکھ لی۔اسلام لانے کے لیے وفود ایک تسلسل کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف کوچ کرنے اور دربار نبوی میں حاضر ہو کر اسلام کے حلقہ میں شامل ہونے لگے جس کے نتیجہ میں اسلام کی بیرون عرب کامیابیوں کا راستہ کھل گیا۔

16.6 یہودی قبائل سے ہونے والی جنگیں

عربوں کے یہودیوں سے تعلقات کی تاریخ کافی پرانی ہے۔عرب کے مختلف مقامات پر وہ آباد تھے۔شمال عرب میں وہ مقنا، تیما اور خیبر میں رہتے تھے جب کہ وسط عرب میں ان کی آبادی مدینہ وطائف میں تھی۔عرب کے جنوب میں ان کی بستیاں یمن وعمان میں موجود تھیں۔مکہ میں ان کی کوئی آبادی تو نہیں تھی لیکن وہ تجارت کی غرض سے وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

اسلام سے یہود کا واسطہ مدینہ میں پڑا۔مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبائل: بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ آباد تھے جن کی مجموعی تعداد تقریباً مدینہ کی نصف آبادی کے برابر تھی۔انھوں نے مدینہ میں آباد عرب قبائل پر ہر لحاظ سے اپنی برتری قائم کر رکھی تھی۔انھوں نے بہت حکمت عملی سے اپنا سودی کاروبار پھیلا رکھا تھا کہ ان کے چنگل میں جو ایک مرتبہ پھنس جاتا وہ اس سے باہر نہ آپاتا تھا۔انھوں نے عرب قبائل کو آپس میں لڑانے کی پالیسی بنا رکھی تھی تاکہ ان کا سودی کاروبار پھلتا پھولتا رہے۔

جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ اب ان کی بالادستی ختم ہو جائے گی لہذا انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔مستزاد یہ کہ قرآن شریف میں ان کے عیوب اور اخلاقی برائیاں بھی بیان کی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے جہاں ان کی مذہبی حیثیت متاثر ہو رہی تھی وہیں ان کی دنیاوی حیثیت بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی کیونکہ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر ان کی سودی تجارت کا گویا بالکل خاتمہ ہی کر دیا تھا۔ان دونوں امور کی وجہ سے ان کی ناراضگی اور زیادہ بڑھ گئی تھی اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے درپے ہو گئے۔ان کے نازیبا سلوک واخلاق کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ فرمایا تھا۔

میثاق مدینہ کے نتیجہ میں وہ اسلامی مملکت کا ایک حصہ بن گئے تھے اور معاہدے کی شرائط پر عمل کرنے کے پابند لیکن چونکہ سرکشی ان کی عادت میں شامل ہے لہذا انھوں نے تھوڑے دنوں بعد ہی بال و پر نکالنے شروع کر دیے حتی کہ غزوہ بدر کے بعد وہ مکہ جا کر قریش کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے بھی لگے۔تاہم آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کوئی سخت سلوک نہیں کیا لیکن ان کی جارحانہ کارروائیاں جاری ہیں جس کے نتیجہ میں ان سے آپ ﷺ کو کئی مرتبہ نبرد آزما ہونا پڑا جس کی تفصیلات حسب ذیل سطور میں بیان کی جا رہی ہیں۔

16.6.1 غزوۂ بنوقینقاع

مدینہ کے یہودی قبائل میں سے بنوقینقاع سب سے زیادہ بہادر تھے۔اسلحہ کے لحاظ سے بھی انھیں تفوق حاصل تھا غالبا اسی زعم کے نتیجے میں انھوں نے سب سے پہلے میثاق مدینہ کی دفعات کو نظر انداز کیا اور آپ ﷺ سے جنگ پر آمادہ ہو گئے۔بنوقینقاع پیشے کے لحاظ سے زرگر تھے۔ان کا پیشہ ہی مذکورہ غزوہ کا سبب بنا تھا کہ ایک مسلمان عورت بنوقینقاع کے کسی زرگر کی دکان پر گئی جس نے اس عورت کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا۔اس اہانت کو ایک انصاری مسلمان برداشت نہ کر سکا اور اس نے زرگر کا سر قلم کر دیا۔دوسرے یہودیوں نے مل کر اس مسلمان کو مار ڈالا۔آپ ﷺ نے ان کی فہمائش کی اور کہا کہ بدر والوں کے انجام سے عبرت پکڑو۔انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں۔ہم سے معاملہ ہو گا تو پتہ چلے گا کہ جنگ کس کو کہتے ہیں۔اس طرح یہودیوں سے

پہلی جنگ شروع ہوئی لیکن چند دنوں کے بعد ہی انھیں اندازہ ہوگیا کہ ان کی اسلامی لشکر کے آگے ایک نہ چلے گی لہذا پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد چار سو زرہ پوش اور تین سو جنگجوؤں کی موجودگی کے باوجود انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آنحضور ﷺ نے ان کی جان بخشی کردی اور وہ فلسطین کے مضافات میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اس واقعہ سے بعد باقی یہودیوں کی عداوت اور بڑھ گئی۔

16.6.2 غزوۂ بنی نضیر

بنو نضیر اور نجد کے بنو عامر ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ بنو عامر نے مسلمانوں کی ایک تبلیغی جماعت کو بلا کر دھوکے سے قتل کردیا۔ ان میں صرف عمرو بن امیہ ضمریؓ اپنی جان بچا کر مدینہ پہنچے۔ راستے میں انھوں نے بنو عامر کے دو افراد کو سوتے میں غلط فہمی میں قتل کردیا حالانکہ وہ مسلمان تھے۔ اس صورت حال کو سن کر آنحضرت ﷺ نے سخت خفگی اور افسوس کا اظہار کیا اور ان کی دیت ان کے رشتہ داروں کو بھیجی۔

حلیف ہونے کی بنا پر آپ ﷺ دیت میں حصہ لینے کے لیے بنو نضیر کے پاس بھی گئے۔ بظاہر انھوں نے آپ ﷺ کے مطالبہ کو مان لیا لیکن درپردہ آپ ﷺ کی قتل کی سازش کی تھی چنانچہ جہاں آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اوپر سے پتھر گرا کر آپ ﷺ کو ہلاک کردیا جائے۔ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو بروقت اس سازش سے آگاہ کردیا اور آپ ﷺ وہاں سے واپس آگئے۔ آپ ﷺ نے ان سے تجدید معاہدہ کی دعوت دی لیکن انھوں نے منع کردیا نتیجتا ان سے بھی جنگ چھڑ گئی لیکن دو ہفتوں کے محاصرہ کے بعد ہی صلح کرنے پر مجبور ہوگئے۔ آپ ﷺ نے انھیں جلاوطن کردیا اور ان کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے صرف ان کے اسلحہ و اراضی کو ضبط کرلیا۔

بنو نضیر کی آبادی کا بڑا حصہ خیبر میں جا کر آباد ہوگیا کچھ لوگوں نے فلسطین میں سکونت اختیار کی اور ان میں سے چند ایک مسلمان بھی ہوگئے۔ خیبر میں بسنے والے بنو نضیر کے یہودیوں نے غزوۂ خندق کو برپا کرانے میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔

16.6.3 غزوۂ بنو قریظہ

مدینہ میں بسے ہوئے یہودی قبائل میں بنو قریظہ کی سماجی حیثیت سب سے کمزور تھی انھیں دو نمبر کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ مدینہ میں اپنی آمد کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے ان کی سماجی حیثیت دیگر یہودی قبائل کی طرح کردی۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کافی مہربانیاں کی تھیں لیکن انھوں نے احسان فراموشی کا ثبوت دیتے ہوئے غزوہ خندق کے دوران بنو نضیر کے ورغلانے پر مسلمانوں کی صفوں میں اندر سے حملہ کردیا۔

آپ ﷺ کو ان کے خلاف جنگی کاروائی کرنی پڑی۔ اسلامی لشکر کے سخت محاصرہ کی وجہ سے انھوں نے بھی آخر کار صلح کر لی۔ آپ ﷺ نے بنو نضیر کے ساتھ بھی کافی رعایت کی تھی لیکن غزوۂ خندق میں ان کا بھی رول تھا۔ ان کے ساتھ مزید رعایت کا خطرناک برتاؤ ہونے لگا تھا۔ بہر حال خود۔ انھوں نے ہی آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے بارے میں ان کے حلیف بنو اوس کا کوئی بھی فیصلہ منظور ہوگا۔ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ نے یہودی قانون کے مطابق ان کے تمام جنگجو افراد کے قتل کرنے اور عورتوں بچوں کو غلام بنانے کا فیصلہ دیا۔ فیصلہ کے سخت ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے حَکَم کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے نافذ کردیا۔ اس فیصلہ سے وہ لوگ مستثنی تھے جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

بنوقریظہ کی قسمت کا فیصلہ ہونے کے بعد مدینہ میں یہودیوں کی تعداد کم ضرور ہوگئی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی باقی یہودیوں میں بنوعریض وغیرہ کے قبائل شامل تھے۔

16.6.4 غزوۂ خیبر

جلاوطنی کے باوجود بنونضیر اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ان کی وجہ سے غزوۂ خندق وغزوۂ بنوقریظہ پیش آیا تھا۔سنہ 7 ہجری میں آپ ﷺ ان کی قوت کو توڑنے اوران کے فتنہ کا سر کچلنے لیے ایک مہم لے کر نکلے اورانھیں کچھ اس طرح زیر کیا کہ پھر کبھی وہ اسلامی حکومت کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکے۔

غزوۂ خیبر کے دوران تیماء وفدک کے یہودی بھی لڑے بغیر مطیع ہوگئے اوراہل خیبر کی شرائط پر ہی اطاعت کے لیے راضی ہوگئے یعنی یہ کہ وہاں کی زمینیں سرکاری سمجھی جائیں گی اوروہ زمینوں پر زراعت کرکے سالانہ نصف پیداوار لگان میں دیا کریں گے۔

16.7 بیرون عرب سے ہونے والی جنگیں

16.7.1 غزوۂ موتہ

صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے مختلف سلاطین وحکماء وامراء کو اسلام کی دعوت کا پیغام بھیجا۔اسی ضمن میں آپ ﷺ نے حارث بن عمیر ازدیؓ کو اپنے مکتوب عالی کے ساتھ بصری کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی کے پاس بھیجا۔اس نے سفیر نبوی کا احترام کرنے کے بجائے انھیں شہید کردیا۔سفراء وقاصدین کے قتل کا کبھی بھی دستور نہیں رہا تھا لہذا آپ ﷺ نے حاکم بصری کی گستاخی کی وجہ سے اس کی سرکوبی اور صحابی جلیل کی شہادت کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔یہ قدم اٹھانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرسکے اور سفراء کے خون کا احترام باقی رہے۔

سنہ آٹھ ہجری میں آپ ﷺ نے بصری کے حاکم کی سرکوبی کے لیے تین ہزار فوج پر مشتمل ایک لشکر روانہ فرمایا جس میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ شامل تھے۔اس لشکر کے امیر حضرت زید بن حارثہؓ مقرر کیے گئے۔ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ نے ان کی شہادت کے بعد بالترتیب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو سردار لشکر متعین کرنے کی ہدایات بھی جاری فرما دیں۔یہ رومی علاقوں میں اسلامی لشکر کی پہلی پیش قدمی تھی۔

معان نامی مقام پر اسلامی لشکر نے پڑاؤ ڈالا جہاں انھیں یہ خبر ملی کی بلقاء نامی مقام پر ہرقل ایک لاکھ افواج کے ساتھ خیمہ زن ہے۔دشمنوں کی تعداد کے بارے میں سن کر مسلمانوں نے صورت حال پر غور وفکر کرنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا کہ صورت حال سے آپ ﷺ کو باخبر کردیا جائے اور آپ ﷺ جیسا فیصلہ فرمائیں اس پر عمل کیا جائے۔اس موقعہ پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے مجاہدین کو ہمت دلائی کہ ہم دشمنوں کا مقابلہ تعداد اور قوت کی بنیاد پر نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ نے ہمیں سرفراز کیا ہے۔مزید برآں ہر حال میں ہمارا ہی فائدہ ہے اگر جیت گئے تو کیا کہنا اوراگر اللہ کی راہ میں

شہید ہوگئے تو گویا منھ مانگی مراد حاصل ہو جائے گی۔ ان کی تقریر اتنی زود اثر ثابت ہوئی کہ مجاہدین اسی وقت کوچ کرنے کے لیے تیار ہوگئے اور موتہ نامی مقام پر پڑاؤ ڈالا۔

حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں رومیوں کے لشکر جرار سے جنگ کا آغاز ہوا اور جلد ہی انھوں نے جام شہادت نوش فرمالیا۔ ہدایت نبوی کے مطابق علم کو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے تھام لیا۔ انھوں نے کمال شجاعت سے کام لیتے ہوئے اسلامی علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا اور اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اسلامی لشکر کی کمان سنبھالی اور داد شجاعت دیتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔ ان کی شہادت کے بعد اتفاق رائے سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو امیر منتخب کیا گیا۔ انھوں نے موقعہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کئی اہم فیصلے کیے جس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ اس دوران رات ہوگئی اور جنگ کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ دوسری صبح اسلامی فوج نے اتنی بلند آواز میں نعرے لگائے کہ دشمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مدینہ سے نئی کمک آگئی ہے۔ انھوں نے سوچا کہ تین ہزار فوجیوں پر مشتمل جب اسلامی لشکر نے اتنا غضب ڈھایا ہے تو کمک کے بعد ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر رومیوں کی ہمت پست ہوگئی اور انھوں نے مقابلہ کا اردہ ترک کر دیا اور اسلامی لشکر لڑائی کی زحمت و تکلیف سے بچ گیا۔ اسلامی لشکر کی واپسی پر آپ ﷺ نے ان کا آگے بڑھ کا استقبال کیا اور ان کی ہمت بڑھائی اور انھیں بھاگنے والوں کے بجائے حملہ کرنے والا قرار دیا۔

غزوۂ موتہ کے حالات آپ ﷺ مدینہ میں یوں بیان فرمارہے تھے گویا کہ آپ ﷺ وہاں موجود ہیں اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ غالبا اسی وجہ سے اس غزوہ میں آپ ﷺ کی غیر موجودگی کے باوجود اسے غزوہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ورنہ اصولی طور پر اسے سریہ کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیئے تھا کیونکہ آپ ﷺ اس غزوہ میں بذات خود شریک نہیں تھے۔

16.7.2 غزوۂ تبوک

قریش و عرب و یہودیوں سے ہونے والی جنگوں کے علاوہ آپ ﷺ کو بیرون عرب کی طاقتوں اور حکومتوں سے دو دو ہاتھ کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا جن میں سب سے مشہور جنگ غزوۂ تبوک ہے۔ یہ غزوہ رجب 9 ہجری میں پیش آیا تھا۔ اس کا سبب کتب سیرت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ رومی عرب کی شمالی سرحدوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں لہذا ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آپ ﷺ مدینہ سے نکلے۔ وہ زمانہ سخت گرمیوں کا تھا اور باغات میں کھجور پک کر تیار ہو چکے تھے۔ منافقین اس موقعہ پر مختلف بہاؤں جیسے طاقتور دشمن کا خوف، سخت موسم، مسافت کی دوری کا اظہار کر کے گھر میں بیٹھ گئے لیکن آپ ﷺ نے اس سفر کی بہت اہتمام سے تیاری فرمائی اور مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو آپ ﷺ تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لیے روانہ ہوئے۔ مختلف مقامات پر پڑاؤ کرتے ہوئے اور متعدد پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے آپ ﷺ نے تبوک میں قیام کیا جہاں ایلہ کا حاکم یوحنا بن روبہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صلح کا درخواست گذار ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کی درخواست قبول فرمالی اور اس نے جزیہ کی ادا کر دیا۔ اسی موقعہ پر کچھ دیگر قبائل کے لوگ بھی حاضر خدمت ہوئے اور آپ ﷺ نے انھیں بھی پروانۂ امان عنایت کر دیا۔ اس صلح کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ واپس آنے کے لیے اسلامی فوج کو کوچ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

اس غزوہ کے کافی گہرے اثرات مرتب ہوئے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ بیرون عرب ممالک پر اس کے وہی اثرات مرتب ہوئے تھے جو اندورن عرب کے قبائل پر فتح مکہ کے بعد مرتب ہوئے تھے۔ اس غزوہ کا سب سے الگ فائدہ یہ ہوا کہ بیرونی طاقتوں کو یہ پیغام پہنچ گیا کہ مسلمان کوئی لقمۂ تر نہیں ہیں جسے جو چاہے گا ہضم کر لے گا۔ دوسرا اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ عربوں کے دلوں میں رومی افواج کی جو ہیبت بیٹھی ہوئی وہ بالکل جاتی رہی۔

غزوۂ تبوک کے ساتھ ہی غزوات وسرایا کا سلسلہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

16.7.3 غزوات پر ایک نظر

عہد نبوی میں پیش آنے والے سرایا وغزوات کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات ظاہر ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان میں جس قدر کم خون بہا ہے اس کی مثال جنگوں کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان غزوات وسرایا میں شہید ہونے والے مسلمان اور مارے جانے والے دیگر افراد کی مجموعی تعداد ایک ہزار اٹھارہ (1018) ہے جس میں دونوں فریق شامل ہیں۔ اس قلیل تعداد نے انسانوں کے خون کی جس ارزانی سے انسانیت کو بچایا تھا اس کا مکمل سروے کرنا تقریبا ناممکن ہی ہے۔ ان کے نتیجہ میں پورے عرب میں امن وامان کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جس کا ماضی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ان غزوات کے مقابلے صرف دونوں عالمی جنگوں میں مارے جانے والے افراد کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ مزید یہ کہ ان جنگوں سے عالم انسانیت کو کچھ بھی فیض نہیں پہنچا جب کہ اسلام نے صرف دس سال کے اندر عربوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا اور انسانیت کو ایک ایسے پیغام سے روشناس کرا دیا جس کی پیروی فلاح وکامیابی کی ضامن تھی۔

معلومات کی جانچ:

1. مدنی دور کو کتنے حصہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟
2. صلح حدیبیہ کی ضرورت کیونکر پیش آئی تھی اور اس کے بنیادی فوائد کیا سامنے آئے؟

16.8 اقوام وقبائل کے ساتھ معاہدے

مدینہ منورہ کے داخلی امن کے مستحکم ہو جانے کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ کے باہر آباد قبائل سے رابطہ پیدا کیا اور ان سے معاہدے کیے۔ آپ ﷺ نے خاص طور پر ان قبائل سے معاہدہ کیا تھا جن کے علاقوں سے گذر کر قریشی تاجروں کے قافلے عراق، شام یا مصر کی طرف آتے جاتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ اس بات کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ بیرونی حملوں کے وقت آپ ﷺ کا ساتھ دیں گے۔ معاہدہ کے مطابق مسلمانوں کے فوجی دستے ان علاقوں کا گشت کر سکتے تھے لیکن کفار کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

آپ ﷺ نے ضمرہ، جہینہ اور مزینہ نامی قبائل اور ان کی متعدد شاخوں جیسے بنو غفار، بنو ربعہ، بنو مدلج اور بنو اسلم وغیرہ کے ساتھ معاہدے کیے جو بالترتیب مدینے کے جنوب، شمال اور مغرب میں آباد تھے۔

مذکورہ بالا قبائل اور ان کی مختلف شاخوں کے ساتھ کیے جانے والے دفاعی معاہدوں کے ذریعہ رسول اکرم ﷺ نے ''اسلامی ریاست مدینہ'' کی سلامتی اور دفاع کو مضبوط سے مضبوط ترین کر دیا۔ ان معاہدوں کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہوا کہ ان علاقوں میں پر امن طریقے سے کام کرنے کی راہیں ہموار ہوئیں اور ان قبائل میں اسلام بہت تیزی سے پھیلنے لگا۔

مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے دفاعی اور دوستانہ معاہدوں کی تکمیل کے بعد ان سے یہ فائدہ اٹھایا کہ آپ ﷺ نے کفار مکہ پر اقتصادی دباؤ بنانے کا فیصلہ کیا اسی طرح کہ ان علاقوں سے قریش کے تجارتی قافلوں کو نہ گذرنے دیا جائے تاکہ ان کی معیشت بری طرح متاثر ہوسکے اور وہ اسلامی ریاست کے خلاف اپنی سرگرمیوں سے باز آسکیں۔ آپ ﷺ نے یہ فیصلہ صرف اس لیے کیا تھا کہ قریش اپنی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں اور اسلامی ریاست کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں صرف کر رہے تھے۔

مدینہ کے اردگرد بسے قبائل سے دفاعی معاہدوں کے بعد آپ ﷺ نے عرب میں پائے جانے والے دیگر قبائل کی جانب توجہ کی۔ ان میں سے بعض طاقت میں قریش سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں تھے اور قریش کی طرح بت پرست بھی تھے۔ ان میں سے بعض اسلام سے بلا وجہ عناد بھی رکھتے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کو کافی نقصان بھی پہنچایا تھا لیکن آپ ﷺ نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ان قبائل کو بالآخر اسلام کے حلقہ میں شامل کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض کے ساتھ جنگ وجدل بھی ہوئی لیکن اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی نہ کے برابر تھی۔ ان قبائل کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ان علاقوں میں بہت تیزی سے اسلام پھیل گیا۔ ایسے قبائل میں مدینہ کے شمال مغرب میں بسنے والے بنو غطفان و بنو فرازہ، مشرق میں قیام پذیر بنو سُلیم اور جنوب مشرق میں رہنے والے بنو ہوازن شامل تھے۔ یہ سب قبائل ایک ہی مورث اعلیٰ قیس کی اولاد تھے اور عم زاد قبائل تھے۔

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اطمینان وسکون کی مدت میں آپ ﷺ مختلف ممالک کے سلاطین کے پاس سفارتیں روانہ کیں تاکہ اسلام کا پیغام ان تک پہنچا دیا جائے کیونکہ آپ ﷺ صرف عرب ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی عالم گیر حیثیت کے اعتبار سے ملوک عجم جیسے شاہ حبشہ، شاہ روم، شاہ ایران، پاپائے روم، شاہ دمشق، والی یمامہ اور متعدد گورنروں کو خطوط روانہ فرمائے اور انھیں اسلام کی دعوت قبول کرنے کی دعوت دی۔

سنہ 7 و 8 ہجری میں آپ ﷺ نے قیصر و کسریٰ، شاہ حبشہ، والی مصر کے نام مراسلے ارسال کیے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ آپ ﷺ نے قبیلۂ غسان، گورنر معان، یمن، عمان، بحران، سماوہ ترکستان اور چین وغیرہ کے حاکموں ووالیوں اور قبیلوں کو بھی اسلام کی دعوت کے خطوط کے ذریعہ اپنے فرض منصبی سے سبک دوش ہوگئے۔ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا، بعض نے سے انکار کر کے اپنی دنیا و عاقبت دونوں خراب کر لی جب کہ بعض نے خاموشی اختیار کر لی اور اس پالیسی پر عمل پیرا ہونا زیادہ مناسب سمجھا کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

16.9 وفود کا سال

فتح مکہ سے پہلے جو لوگ جو گومگو کی حالت میں تھے کہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں یا اسلام کی ناکامی کا خواب دیکھ رہے تھے فتح مکہ کے بعد ان کا تذبذب ختم ہو گیا اور ان کے لیے اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ لہٰذا چاروں طرف سے وفود مدینہ منورہ پہنچنے لگے لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے اور اپنے اپنے علاقوں میں اس حال میں واپس گئے کہ ایمان واسلام کے نشہ سے سرشار، شرک و بت پرستی اور اس کے نشانات وعلامات اور جاہلیت اور اس کے اثرات سے شدید نفرت کرنے والے بن گئے تھے۔ ان وفود میں وفد بنو تمیم، وفد بنو عامر، وفد بنو سعد، وفد بنو حنیفہ، وفد بنو طے، وفد بنو زبید،، وفد بنو فزارہ، وفد بنو اسد، وفد ازد، سلاطین حمیر کا وفد، وفد بنو عبدالقیس، وفد اشعریین واہل یمن، وفد مزینہ، وفد اہل نجران، وفد تُجیب، وفد بہراء وعذرہ وغیرہ کا نام آتا ہے۔

مذکورہ بالا وفود کے لیے اکثر مسجد نبوی میں خیمہ لگا دیا جاتا۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین سیکھتے، مسائل معلوم کرتے، آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کا مشاہدہ کرتے، صحابہ کرامؓ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے۔ قرآن مجید سنتے، مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے۔ ان کے دل میں جو کچھ آتا بڑی سادگی سے آپ ﷺ سے دریافت فرما لیتے اور آپ ﷺ کمال حکمت سے ان کے سوالوں کا جواب دیتے اور ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دور کرتے جس سے ان کا ایمان مزید پختہ ہو جاتا۔

16.10 حجۃ الوداع

فتح مکہ کے سوا سال بعد ذوالحجہ 9 ہجری میں حج کے موقع پر سورہ توبہ کا نزول ہوا جس میں آئندہ سال سے مشرکین کے حج پر پابندی لگائے جانے کا حکم نازل ہوا۔ آپ ﷺ کی طرف سے اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اس سے کسی کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت تک سارا عرب اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو چکا تھا۔

سنہ 10 ہجری میں جب آپ ﷺ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک لاکھ چالیس ہزار کا غیر معمولی اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ آپ کی نبوت کا مشن تکمیل کو پہنچ رہا تھا اس تعلق سے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿**اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا**﴾۔ اس اعلان خداوندی سے بڑھ کر مسلمانوں کو کس چیز سے خوشی حاصل ہو سکتی تھی۔

حجۃ الوداع آنحضرت ﷺ کا ہجرت کے بعد پہلا اور آخری حج تھا۔ آپ ﷺ کے حج کی خبر کو سن کر تمام مسلم علاقوں سے مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے کے لیے آئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے مناسک حج ادا کر کے امت کے سامنے ایک عمدہ مثال پیش کی۔ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیا اور وقوف عرفات کے موقع پر جبل رحمت پر چڑھ کر اپنا شہرۂ آفاق خطبہ ''خطبہ حجۃ الوداع'' دیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے ارد گرد ایسے افراد مقرر کیے گئے تھے جو آپ ﷺ کے ہر ہر جملے کو مکبّروں کی طرح بآواز بلند

دہراتے تھے۔اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ حاضرین اس تاریخی خطبہ کو سن رہے تھے جسے بنیادی طور پر اسلام کا حقیقی منشور کہا جا سکتا ہے۔ یہ خطبہ بلاغت نبوی کے اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ اسلامی قانون واخلاق کا جامع بھی ہے۔

16.11 مرض وفات

سفر حج سے واپسی کے دو مہینے بعد 18 یا 19 صفر 11 ہجری کی شب آپ ﷺ یکا یک بستر سے اٹھے اور خادم کے ساتھ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ وہاں اپنے اصحاب کے لیے دعائے خیر کی اور خادم سے فرمایا کہ اگر اللہ مجھے اپنے پاس آنے اور دنیا میں تا قیامت رہنے کا اختیار دے گا تو میں اس کے پاس جانے کو ترجیح دوں گا۔ وہاں سے واپس لوٹے تو سر درد سے مرض وفات کی ابتدا ہو چکی تھی۔طبیعت مضمحل ہوتی گئی اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا لیکن معمولات نبوی بدستور اسی طرح جاری رہے جس طرح صحت کی حالت میں جاری تھے۔ جب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تو ازواج مطہرات کے پاس باری باری جانے کے بجائے آپ ﷺ نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ تیمارداری ایک جگہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔سب نے اسے قبول کر لیا۔ وفات سے قبل ازواج مطہرات کی مرضی واجازت سے حضرت عائشہؓ کے گھر میں قیام پذیر ہو گئے کہ اس کا دروازہ مسجد کی صف اول کے عین مقابل کھلتا تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی آپ ﷺ نمازوں کی امامت فرماتے رہے۔آپ ﷺ نے آخری نماز مغرب کی اس حال میں پڑھائی تھی کہ سر کے درد کی وجہ سے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔

وفات سے غالباً پانچ روز قبل آپ ﷺ کی خواہش پر آپ کو غسل دیا گیا۔ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے اور زندگی کا آخری خطبہ دیا جس میں آپ ﷺ نے شہدائے احد کے لیے دعائے مغفرت کی اور اپنے وصال کی جانب اشارہ کیا جسے اکثر لوگ سمجھ نہ سکے لیکن حضرت ابوبکرؓ آپ کی مراد کو سمجھ کر بلا اختیار رو پڑے۔ آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی اور ان کے اخلاق و کردار کی تعریف کی اور ان کی جانشینی کی طرف اشارہ کیا۔اپنے آخری خطبہ میں انھوں نے مجمع سے پوچھا کہ اگر کسی کے آپ ﷺ پر واجبات ہیں تو اسے وصول لے اور اگر کسی کو آپ ﷺ کے رویہ سے تکلیف پہنچی ہو تو اس کا بدلہ لے لے یا معاف کر دے۔ایک شخص نے تین درہم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تو اسی وقت اس شخص کو ادا کرنے کا حکم دیا۔اس خطبہ میں انصار کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کی اور اسامہؓ کے لشکر کو تاکید کے ساتھ روانہ کرنے کی ہدایت کی۔

اسی دن جب آپ ﷺ نے عشاء کی نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہا تو آپ ﷺ پر غشی طاری ہو گئی۔ چوتھی مرتبہ جب ہوش آیا تو حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔انھوں نے آپ ﷺ کی موجودگی میں سترہ نمازیں پڑھائیں۔

16.12 وفات اقدس

جمہور کے نزدیک آپ ﷺ نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے پر پیر کے دن 12 ربیع الاول 11 ہجری کو اس دنیا سے رحلت فرمائی اور دوسرے دن تجہیز و تکفین ہوئی۔

16.13 سماج کی تشکیل

اسلام نے جو معاشرہ مدینہ وعرب میں پروان چڑھایا تھا وہ اخوت ومساوات، عدل وانصاف کی بنیادوں پر قائم تھا جہاں ایک طرف اس کے ہر فرد کے دل میں اللہ کی خشیت بیٹھی ہوئی تھی تو دوسری طرف تمام مسلمان ہم رتبہ وہم پلہ تھے۔ساتھ ہی ساتھ اس معاشرہ کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ہر فرد کے دل میں تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا جذبہ کارفرما تھا۔

آپ ﷺ نے جو سماج تشکیل کیا تھا اس کی نظیر ملنا ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالی کے آخری نبی ﷺ کے تربیت یافتہ اصحاب کرام کا معاشرہ تھا۔اس معاشرہ کی خصوصیات میں بات شامل تھی کہ اس معاشرہ کے افراد قرآن وحدیث کے مطابق زندگی گزارتے تھے،ان کے جذبات وخیالات اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع تھے۔اس معاشرہ کے افراد میں اتحاد ویگانگت، خیر سگالی،محبت وایثار کا بے پناہ جذبہ تھا جو اسلام اور اسلامی ریاست کے لیے سب کچھ تج دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔اس کے افراد میں تقوی وخشیت الہی پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے شر کا تناسب کم تھا۔اس معاشرہ کے کسی فرد کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا تھا تو وہ فورا اس کی اصلاح کر لیتا تھا۔گویا یہ معاشرہ پوری طرح خیر پر مبنی معاشرہ تھا۔

اسلامی سماج مسلم اور غیر مسلم سماج میں منقسم تھا۔اسلامی سماج مہاجرین وانصار، بدوی قبائل اور منافقین پر مشتمل تھا جب کہ غیر مسلم سماج کی اکثریت یہود پر مشتمل تھی اس کے علاوہ اس سماج کا حصہ عیسائی ومجوسی بھی تھے لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔

مکہ کے برعکس مدینہ میں کوئی شہری نظام نہیں تھا۔وہاں متعدد قبیلے الگ الگ مقام پر رہتے تھے جن کا آپس میں کوئی ربط نہ تھا۔باہمی رشتہ کے باوجود آپس میں خون خرابہ ہوتا رہتا تھا۔مدینہ میں یہودیوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔اس مخلوط آبادی میں مکہ سے آئے ہوئے بیروزگار اور بے وسائل مہاجرین کی اچھی خاصی تعداد تھی جن کی آبادکاری ایک کٹھن اور مشکل کام تھا۔ان سب کے علاوہ بیرونی مداخلت کا سامنا تھا۔

اس مشترکہ سماج میں آپ ﷺ نے معاشرہ کی تشکیل کے لیے حسب ذیل اقدامات اٹھائے:

16.13.1 مسجد نبوی کی تعمیر

مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اسلامی سماج کی تشکیل اور مسلمانوں کی تنظیم کا تھا۔اسلام نے پوری سماجی زندگی کا مرکز مسجد کو قرار دیا ہے۔لہذا آپ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی تعمیر کی۔مسجد کی تعمیر کے لیے جیسا کہ اوپر اس کا ذکر آچکا ہے' آپ ﷺ نے وہ قطعہ اراضی کا انتخاب کیا تھا جہاں آپ ﷺ کی اونٹنی جا کر بیٹھی تھی۔وہ زمین دو یتیم بھائیوں کی تھی جہاں اسعد بن زرارہؓ مسلمانوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔آپ ﷺ نے وہ زمین اس کے مالکان سے قیمتاً خریدی جب کہ وہ خوشی خوشی اسے بطور ہدیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے۔

اس زمین کو صاف کر کے ستر ہاتھ لمبی اور ساٹھ ہاتھ چوڑی مسجد تعمیر کی گئی۔مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے خود اس کی تعمیر میں عملا حصہ لیا۔چونکہ اس وقت تک تحویل قبلہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا لہذا اس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا۔تحویل قبلہ کے احکام نازل ہونے کے بعد اس کا رخ کعبہ کی طرف کیا گیا۔

مسجد نبوی سے لگ کر ہی آپ ﷺ نے دو چھوٹے چھوٹے مکانات اپنے اہل خانہ کے لیے بنائے تھے جن میں حضرت سودہؓ وحضرت عائشہؓ نے مکہ سے آنے کے بعد قیام فرمایا تھا۔

16.13.2 مؤاخات

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ ﷺ نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے عملی قدم اٹھایا اور وہاں بھی مواخات کے اصول کو آزمایا جس کا کامیاب تجربہ آپ ﷺ مکہ میں کر چکے تھے۔ مواخات کے اصول کے مطابق آپ ﷺ نے انصار سے کہا کہ ان میں سے ہر شخص ایک مہاجر خاندان کی ذمہ داری قبول کر لے۔ دونوں مل کر کام کریں اور کمائی مل کر کھائیں۔ انصار نے ایثار سے کام لیتے ہوئے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ہماری آدھی زرعی زمینیں مہاجرین کو مستقل طور پر دے دیجیے لیکن مہاجرین نے اس فراخدلانہ پیشکش کو قبول نہیں کیا۔

انصار نے مواخات کے فرمان نبوی کو انتہائی خوشدلی سے قبول کیا اس سلسلہ میں انھوں نے ہر قسم کا ایثار روا رکھا۔ آپ ﷺ مواخات پالیسی کی وجہ سے سینکڑوں بے روزگار مہاجرین کا مسئلہ ایک ہی دن میں حل ہو گیا۔

16.13.3 میثاق مدینہ

مہاجرین کا مسئلہ حل کرنے کے بعد آپ ﷺ شہری تنظیم کی جانب متوجہ ہوئے لہذا آپ ﷺ نے سارے مسلم وغیر مسلم قبائل کے نمائندوں کو حضرت انسؓ کے والد مالک کے گھر میں اکٹھا کیا اور ان کے سامنے مدینہ کی صورت حال بیان کی۔ وہاں موجود نمائندوں نے آپ ﷺ کی اس تجویز کو اتفاق رائے سے قبول کر لیا کہ بیرونی حملوں کے دفاع اور اندرونی بین القبائل جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے ایک تنظیم بنائی جائے اور کسی ایک شخص کو اس کا سربراہ متعین کیا جائے۔

اس تنظیم پر عائد ہونے والے فرائض وحقوق کو تحریری طور پر مرتب کیا گیا۔ یہ دستاویز دنیا کی پہلی دستاویز ہے جس میں کسی مملکت کے لیے دستور مدون کیا گیا تھا اسے ''میثاق مدینہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سنہ شعبان 1 ہجری/فروری 623 عیسوی میں اس کی تدوین عمل میں آئی۔ اس میثاق کی دفعات کامل رواداری، مذہبی آزادی اور حسن تعاون پر مبنی تھیں۔

اس میثاق کی رو سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی آپ ﷺ کو بحیثیت سربراہ قبول کر لیا۔ یہ آپ ﷺ کی پہلی سیاسی فتح تھی جو عظیم نتائج پر منتج ہوئی۔

16.14 بیرونی تعلقات

مسلمانوں کا قریش مکہ کے علاوہ کسی اور سے جھگڑا نہیں تھا۔ بیرونی دشمن سے نپٹنے کے لیے اندرونی تنظیم اور استحکام لازم تھا۔ اس لیے ایک طرف تبلیغ دین کا سلسلہ جاری ہوا تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً نئے احکام نازل ہوتے گئے اور اسلامی قانون وشریعت کی تکمیل بتدریج ہوتی چلی گئی۔

اندرونی استحکام کی جانب توجہ کرنے کے بعد آپ ﷺ بیرونی معاملات جیسے قریش کے جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنے کی جانب متوجہ ہوئے لہذا جب شہری مملکت مدینہ کے قیام سے کسی حدتک اندرونی استحکام واطمینان حاصل ہوگیا تو آپ ﷺ نے مدینہ کے اطراف میں بسنے والے قبائل کی جانب توجہ کی اورانھیں فوجی حلیف بنالیا۔ بنوجہینہ اور بنوضمرہ وغیرہ سے ایسے معاہدے ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

16.15 تعلیم وتربیت

حیات نبوی میں تعلیم وتربیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اولین وحی کا پہلا لفظ ''اقـرأ'' (پڑھ) تھا۔ساتھ ہی ساتھ قلم کی تعریف کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ سارا انسانی علم یعنی تہذیب وتمدن سب قلم کے مرہون منت ہیں کیونکہ اگلوں کے تجربوں سے پچھلوں کا استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔قرآن کریم میں آپ ﷺ کے فرض منصبی میں تعلیم وتربیت بھی شامل ہے۔فرمان الٰہی ہے﴿ويعلمكم الكتٰب والحكمة ويعلمكم ما لم تكونوا تعلمون﴾ وہ تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اورایسی چیزوں سے ہم کو باخبر کرتے ہیں جوتم نہیں جانتے تھے۔اس کے علاوہ خودآپ کا ارشاد ہے کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

تعلیم وتربیت کی طرف آپ ﷺ نے بطور خاص توجہ فرمائی۔اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جلد از جلد مسلمان زیورتعلیم سے آراستہ ہوجائیں اورایک ایسی جماعت تیار جواللہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوجس کا انداز گفتگو،کردار،نشست وبرخاست،قول وفعل،کھانا پینا،چال ڈھال،وضع قطع،سونا جاگنا سب کچھ تعلیم نبوی کے نور سے منور ہوتا کہ وہ سب کے لیےنمونۂ عمل بن جائیں۔

عہد جاہلیت اورعہد مکی میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھااور بہت تھوڑے سےلوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔آپ ﷺ تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے بدر کے کچھ قیدیوں کا زرفدیہ یہ متعین کیا کہ وہ مسلمان بچوں کوتعلیم کے زیور سے آراستہ کردیں۔آپ ﷺ بچوں کوعلم سیکھنے کی تاکید کرتے تھے۔جہاں مسجد تعمیر ہوتی وہاں تعلیم وتربیت کا نظام بھی قائم کرتے تھے۔

آپ ﷺ خودبھی اسلام قبول کرنے والوں اورقدیم صحابہؓ کی تعلیم وتربیت میں مصروف ومشغول رہتے تھے چنانچہ قبائل سے جماعتیں آتیں اورآپ ﷺ سے دینی تعلیم حاصل کرتیں اوراپنے اپنے قبائل میں جاکرتعلیم کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتی تھیں۔

عہدنبوی میں تعلیم وتربیت کے کئی طریقے رائج تھے۔ایک طریقہ یہی تھا کہ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک مدت تک حاضر رہ کر قرآن وسنت کی ضروری تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔بعدازاں اپنے اپنے علاقوں میں جاکراس تعلیم کوعام کیا جاتا تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کوقرآن مجید کی پوری پوری سورتوں کی تعلیم دیتے،کلام الٰہی کوواضح کرتے اوراپنے عمل سے احکام وہدایات الٰہی پرعمل کرنے کا طریقہ بتلاتے اورزندگی میں پیش آنے والے مختلف مراحل سے کس طرح گذرا جائے اس کی وضاحت فرماتے،نیک اوراچھے کاموں کی تلقین کرتے اور برائیوں سے بچنے پرابھارتے تھے۔اچھے اخلاق سے متصف ہونے اور بدخلقی سے دور رہنے کی ہدایت کرتے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا کہ تعلیم وتربیت کا خلاصہ یہ ہوتا تھا کہ نیکی کروگےتو کامیاب

ہو جاؤ گے اور جنت مل جائے گی اور برائی کرو گے تو جہنم کا حصہ بن جاؤ گے۔ حضرت حنظلہؓ نے تعلیم وتربیت نبوی کی مجالس کا اثر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''جب ہم وہاں سے باہر آتے تو آنکھوں کے سامنے ایک طرف جنت رہتی تھی اور دوسری طرف دوزخ''۔

تیسرا طریقہ مستقل درس گاہ کا تھا کی ایک جماعت ہر وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتی تھی اور آپ ﷺ کے تمام اقوال وافعال کو دیکھتی رہتی تھی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ اس جماعت کو ''اہل صفہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ وہ صفہ یعنی مسجد نبوی میں بنے ایک چبوترہ پر ساری دنیا سے منہ موڑ کر ہر وقت موجود رہتے تھے اور آپ ﷺ سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اس تعلیمی ادارہ میں لکھنے پڑھنے جیسی سادہ تعلیم سے لے کر دین، قانون، سلوک اور اخلاق کی اعلی تعلیم دی جاتی تھی۔

تعلیم وتربیت کے تیئں آپ ﷺ کی ذاتی دلچسپی کے نتیجہ میں عربوں میں بہت جلد پڑھنے لکھنے کا رواج ہوگیا۔ آپ ﷺ سے پہلے عربی زبان کا دائرہ بہت محدود تھا اور لکھنے پڑھنے کا رواج محدود تر لیکن اسلام کی تعلیمی روح کے باعث صرف دوسو سال میں عربی زبان، تحریری ادب میں دنیا کی سب سے زیادہ باثروت علمی زبان بن گئی اور اس کا دامن ساری دنیا کے علوم وفنون کی کتابوں سے بھر گیا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے اسلامی معاشرہ کے افراد کی عمدہ تربیت کی اور انھیں اعلی اخلاق وکردار کا مالک بنایا۔ آپ ﷺ کی تربیت کے نتیجہ میں عمومی طور پر معاشرہ میں برائیوں کی طرف رجحان کم تھا، خیر کا بول بالا تھا، اگر کسی سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوجاتی تو وہ اس کو دور کرنے اور اس کی تلافی کرنے کے لیے بے چین وبے تاب ہوجاتا تھا۔

آپ ﷺ نے بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی تھی کہ کل کا معاشرہ انھیں پر مشتمل ہوگا۔ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے، انھیں اچھی اچھی باتوں کی تلقین کرتے تھے، ان کی تعلیم وتربیت پر ان کے والدین کو ابھارتے تھے اور انھیں اجر عظیم کی بشارت دیتے تھے۔

16.16 اخلاق نبوی

انسان کے اوپر لازم ہونے والے حقوق وفرائض کو اچھی طرح سے ادا کرنے کا نام اخلاق ہے۔ یہ لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں محبت وشفقت، عدل وانصاف، دیانت وامانت، جرأت وہمت، تواضع واحسان، عفو ورحم، حسن معاشرت، حسن سلوک وغیرہ سب شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے جملہ اغراض اس میں شامل ہیں۔ ہر مذہب کے رہنماؤں نے ان صفات عالیہ کی تعلیم دی ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے۔

اللہ تعالی کی جانب سے مبعوث کیے جانے والے تمام انبیاء ورسل اخلاق وکردار کا عمدہ نمونہ تھے لیکن چونکہ آپ ﷺ پر نبوت کا خاتمہ ہونا تھا لہذا آپ ﷺ کی ذات اقدس میں تمام انبیاء ورسل کے اخلاق عالیہ کو یکجا کردیا گیا تھا۔ آپ ﷺ کو بھی اس منصب کا احساس تھا لہذا آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہوں۔

آپ ﷺ اخلاق عالیہ کا عمدہ نمونہ تھے۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ حلیم تھے، برائی کرنے والے سے درگذر فرماتے تھے، جو شخص آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا آپ ﷺ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے، جو آپ ﷺ کو ایذا دیتا تھا آپ ﷺ اسے معاف کردیتے تھے۔ آپ ﷺ کی انھیں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے آپ ﷺ کے اخلاق وکردار کی گواہی ان لفظوں میں دی ہے کہ: آپ نہایت اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔

آپ ﷺ کے بلند اخلاق کے قائل صرف دوست ہی نہ تھے، دشمن بھی آپ ﷺ کے اعلی کردار کے معترف تھے حتی کہ آپ ﷺ کا لقب ہی الامین اور الصادق پڑ گیا تھا۔ اخلاق وکردار کے حوالے سے اس کی گواہی زیادہ معتبر مانی جاتی ہے جس نے ممدوح کے ساتھ کچھ وقت گذارا ہو۔ آپ ﷺ کے ساتھ زندگی کا ایک طویل حصہ گزارنے والی ازواج مطہرات میں سے حضرت خدیجہؓ وحضرت عائشہؓ وغیرہ نے آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق وکردار کی گواہی دی ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے اخلاق کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے ''......خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی غمگین نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبت میں لوگوں کے کام آتے ہیں'' جب کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ '' آپ ﷺ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا''۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انھوں نے فرمایا کہ '' آپ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے عمدہ اخلاق والے تھے۔ آپ ﷺ نہ تو قصداً اور نہ بلا قصد فحش گوئی کرتے، نہ بازاروں میں شور وغوغا کرتے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دیتے، بلکہ آپ ﷺ انھیں معاف کرنے والے اور درگذر کرنے والے تھے''۔

ازواج مطہرات کے علاوہ حضرت علی، حضرت انس، حضرت عمرو بن عاص اور ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے اخلاق وکردار کا ذکر عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ ان کے اقوال کی روشنی میں آپ ﷺ کو روئے زمین پر پائے جانے والے تمام افراد میں سے سب سے عمدہ اخلاق وکردار کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے اور ایک جیسا رویہ اختیار کرتے تھے۔ تواضع وانکساری، نرم مزاجی، سخاوت وفیاضی، عدل وانصاف، استقلال وشجاعت، صبر واستقامت، شکر واحسان، مہمان نوازی، آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کے روشن ترین ابواب ہیں۔ مزید برآں آپ ﷺ جانوروں پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے تھے اور ان کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

16.17 ازواج واولاد

آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں گیارہ شادیاں کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو چھوڑ کر تمام ازواج مطہرات بیوہ تھیں۔ آپ ﷺ کے نکاح میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ نو بیویاں رہیں۔ سنہ دس نبوی (ہجرت سے تین سال قبل/ 619ء) میں حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کو مختلف اسباب کی بنا پر کئی شادیاں کرنی پڑیں۔ اللہ تعالی نے سورہ احزاب (آیت نمبر 50) میں آپ ﷺ کو چار سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس کی وجہ غالباً دین کی تفہیم وتشریح خصوصاً عورتوں کے متعلق مسائل کو بیان کرنا تھی تاکہ عورتیں عورتوں سے بہتر طور پر مسائل سیکھ لیں۔ ایک روایت کے مطابق تنہا حضرت عائشہؓ سے ایک تہائی دین منقول ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا پہلا نکاح حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہوا تھا۔اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک اکثر روایات کے مطابق پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی۔آپ ﷺ کو اپنی پہلی بیوی سے بے انتہا الفت و محبت تھی اور حضرت خدیجہؓ بھی آپ ﷺ پر ہر وقت اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔آپ ﷺ کے مزاج و عادات سے واقف تھیں اور آپ ﷺ کو آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔آپ ﷺ ان کی محبتوں کے اسیر تھے لہذا ان کی زندگی میں آپ ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی۔حضرت خدیجہ سے آپ ﷺ کے ازدواجی تعلقات کی مدت پچیس برس پر محیط ہے۔انھیں کے بطن سے ابراہیم کے سوا ساری اولادیں ہوئیں جن میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہے۔

آپ ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے۔

1. حضرت سودہ بنت زمعہ عامریؓ: حضرت خدیجہؓ کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت سودہ کو اپنی زوجیت میں لیا تھا۔آپ ﷺ نے ان سے شادی ہجرت سے تین سال قبل رمضان سنہ دس نبوی میں کی۔ان کا انتقال حضرت عمرؓ کی خلافت میں ذوالحجہ 23ھ/ اکتوبر 643ء میں ہوا۔

2. حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح آپ ﷺ سے اس وقت ہوا جب وہ نو برس کی تھیں اور عمر نبوی پچاس برس تھی گویا حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ سے نکاح ہجرت سے تین سال قبل سنہ دس نبوی میں ہوا۔حضرت عائشہؓ کی رخصتی شوال سنہ 2 ہجری میں ہوئی۔ انتقال 66 سال کی عمر میں سنہ 57 ہجری/ 676 عیسوی میں ہوا گویا وہ آپ ﷺ کے ساتھ نو برس رہیں اور 45 سال بیوگی کے گذارے۔

3. حضرت حفصہ بنت عمرؓ: آپ ﷺ نے ان سے رمضان سنہ 3 ہجری/ 625 عیسوی میں نکاح کیا تھا جب کہ وہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ان کا انتقال سنہ 45 ہجری/ 665 عیسوی میں ہوا۔وہ انتہائی نیک، پرہیزگار، عبادت گذار ہونے کے ساتھ ساتھ علم وفضل کی بھی مالک تھیں۔

4. حضرت زینب بنت خزیمہؓ: ان کے پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کے انتقال کے بعد سنہ 4 ہجری/ 626 عیسوی میں آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا لیکن صرف دو ماہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔اس وقت ان کی عمر صرف 30 سال تھی۔ان کا لقب ام المساکین تھا کیونکہ بہت زیادہ خیرات کرتی تھیں۔

5. حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ: مذکورہ ام المؤمنین سے ان کے شوہر کے انتقال کے بعد سنہ 4 ہجری/ 626 عیسوی میں آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔امہات المؤمنین میں سے ان کی وفات سب سے آخر میں 84 سال کی عمر میں سنہ 61 ہجری/ 680 عیسوی میں ہوئی۔

6. حضرت زینب بنت جحشؓ: سنہ 5 ہجری/ 627 عیسوی میں آپ ﷺ نے حضرت زینبؓ سے رشتۂ ازدواج قائم فرمایا۔وہ آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن ہونے کے علاوہ آپ ﷺ کے لے پالک حضرت زید بن حارثؓ کی بیوی رہ چکی تھیں۔ 53 سال کی عمر میں سنہ 20 ہجری/ 641 عیسوی میں ان کی وفات ہوئی۔وہ انتہائی سخی، فیاض، عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔

7. حضرت جویریہ بنت حارثؓ: مذکورہ ام المؤمینن غزوہ مریسیع میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے آزاد کر کے سنہ 5 ہجری/ 627 عیسوی میں نکاح فرمایا تھا۔سنہ 56 ہجری/ 676 عیسوی میں ان کا انتقال ہوا تھا۔اس نکاح کے نتیجے میں بنو مصطلق کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔

8. حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ: آپ ﷺ نے ان سے سنہ 6 یا 7 ہجری/ 628 یا 629 عیسوی میں نکاح کیا۔آپ ﷺ نے ان سے شادی ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش کے نصرانی ہونے کے بعد کی۔ان کا غائبانہ نکاح حضرت نجاشی نے پڑھایا اور مہر کی رقم ادا کی تھی۔ان کی وفات سنہ 44 ہجری/ 664 عیسوی میں ہوئی۔

9. حضرت صفیہ بنت حیی: مذکورہ ام المؤمنین آپ ﷺ کے نکاح میں سنہ 7 ہجری میں آئیں۔وہ یہودی تھیں لیکن اسلام قبول کر لیا تھا۔آپ ﷺ نے انھیں آزاد کر کے اپنی شرف زوجیت سے سرفراز کیا۔اس نکاح کے فیوض و برکات میں سے آپ ﷺ کا یہودی قبائل سے تعلقات کا استوار ہونا تھا۔ان کا انتقال سنہ 50 ہجری/ 670 عیسوی میں ہوا۔

10. حضرت میمونہ بنت حارث: آپ ﷺ نے ان سے سنہ 8 ہجری/ 630 عیسوی میں فتح مکہ کے بعد نکاح کیا تھا۔وہ آپ ﷺ کی آخری اہلیہ تھیں۔ان کا انتقال سنہ 51 ہجری/ 671 عیسوی ''سرف'' میں ہوا تھا اور تدفین مکہ میں ہوئی تھی۔ان کے علاوہ تمام دیگر امہات المؤمنین کی تدفین جنت البقیع، مدینہ منورہ میں ہوئی۔

مذکورہ بالا ازواج مطہرات کے علاوہ آپ ﷺ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ سے بھی نکاح کیا تھا۔ان کا تعلق مصر سے تھا اور وہ باندی تھیں۔وہ سنہ 6 ہجری میں بطور ام ولد آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

تمام ازواج مطہرات آپ ﷺ کے نکاح میں تاعمر رہیں۔ان میں سے حضرت خدیجہؓ کی وفات ہجرت سے قبل مکہ میں ہی ہو گئی تھی اور ہجرت کے بعد حضرت ام المساکین زینب بنت خزیمہ اپنی شادی کے صرف دو تین ماہ بعد وفات پا گئیں۔باقی نو ازواج مطہرات آپ ﷺ کے بعد بھی کافی دنوں تک زندہ رہیں اور امت کی ماؤں کی حیثیت سے اسلام کی خدمت کرتی رہیں۔تمام ازواج مطہرات کا شمار نہایت اعلی درجہ کی عابدہ، زاہدہ اور عالمہ خواتین میں ہوتا ہے۔امہات المؤمنین سے احادیث کا اچھا خاصا حصہ مروی ہے جن کی روشنی میں آگے چل کر اسلامی فقہ کی مختلف دفعات خاص طور سے عورتوں کے متعلق مسائل کی تشکیل عمل میں آئی۔

روایات کے مطابق آپ ﷺ نے بعض دیگر خواتین سے بھی نکاح کیا تھا مگر وہ مکمل نہیں ہوا۔اس لیے آپ ﷺ کی کل ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ اور حضرت ماریہؓ سمیت بارہ ہے۔

ان تمام ازواج مطہرات میں سے صرف حضرت خدیجہؓ اور حضرت ماریہ کے بطن سے آپ ﷺ کی اولادیں ہوئیں باقی تمام ازواج مطہرات لاولد رہیں۔

16.17.1 اولاد

آپ ﷺ کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. حضرت قاسم: یہ آپ ﷺ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے جن کی پیدائش 11 قبل از نبوی میں ہوئی تھی۔ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کے بقول وہ صرف سات روز زندہ رہے جب کہ ابن سعد کے نزدیک ان کی کل مدت حیات دو سال ہے۔ آپ ﷺ کی کنیت ابو القاسم انھیں کی جانب منسوب ہے۔

2. حضرت زینبؓ: یہ آپ ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ ان کی پیدائش 3 قبل ہجری/ 01-600 عیسوی میں ہوئی تھی۔ ان کا نکاح ابو العاص بن ربیع سے ہوا تھا۔ ان کے بطن سے ایک بیٹے حضرت علی اور ایک بیٹی حضرت امامہ پیدا ہوئے تھے۔ ان کی وفات سنہ 8 ہجری/ 630 عیسوی میں ہوئی تھی۔

3. حضرت رقیہؓ: یہ آپ ﷺ کی دوسری بیٹی ہیں۔ ان کا نکاح عہد نبوت سے قبل ابولہب کے بیٹے عقبہ سے ہوا لیکن اس نے اپنے والد کے کہنے پر رخصتی سے قبل ہی طلاق دے دی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے ان کی شادی حضرت عثمان بن عفانؓ سے کر دی۔ ان کے بطن سے حضرت عبد اللہ پیدا ہوئے لیکن ان کا دو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

حضرت رقیہ نے اپنے شوہر کے ساتھ دونوں ہجرتوں- ہجرت حبشہ و ہجرت مدینہ- کا ثواب حاصل کیا۔ رمضان 2 ہجری/ 624 عیسوی میں غزوۂ بدر کے دوران ان کا انتقال ہوا۔

4. حضرت ام کلثوم: آپ ﷺ کی تیسری بیٹی تھیں۔ ان کا نکاح آپ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب سے کیا تھا لیکن اس نے بھی اپنے بھائی کی طرح والد کے کہنے پر رخصتی سے قبل ہی طلاق دے دی۔ آپ ﷺ نے حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد شوال 3 ہجری میں ان کا نکاح حضرت عثمان بن عفانؓ سے کر دیا اسی وجہ سے حضرت عثمان کا لقب ذو النورین پڑ گیا تھا۔ وہ لاولد رہیں۔ ان کی وفات 9 ہجری/ 631 عیسوی میں ہوئی۔

5. حضرت فاطمہؓ: یہ آپ ﷺ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی آپ ﷺ نے 2 ہجری/ 624 عیسوی میں اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالبؓ سے کر دی تھی۔ ان کے بطن سے تین بیٹے حضرت حسن (3-59ھ)، حضرت حسین (4-61ھ) اور حضرت محسن (پیدائش 6ھ/ 628ء) اور دو بیٹیاں حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

حضرت فاطمہ کا انتقال آپ ﷺ کی وفات کے چھ ماہ بعد سنہ رمضان 11 ہجری/ دسمبر 632 عیسوی میں ہوا۔ ان کے علاوہ آپ ﷺ کی تمام اولاد کا انتقال آپ ﷺ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔

6. حضرت ابراہیم: تاریخ پیدائش کے اعتبار سے وہ آپ ﷺ کی آخری اولاد تھے۔ ان کی پیدائش آنحضرت ﷺ کی ام ولد حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے سنہ 8 ہجری/ 630 عیسوی میں ہوئی۔ ان کا انتقال ڈیڑھ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔

ابن سعد نے مزید دو صاحبزادوں- حضرت طیبؓ و حضرت طاہرؓ- کا ذکر اپنی کتاب ''الطبقات الکبری'' میں کیا ہے۔ ان کا انتقال بچپن میں ہی مکہ میں ہو گیا تھا۔

16.18 عادات وشمائل

آپ ﷺ کی بعثت رہتی دنیا تک کے لیے ہوئی تھی لہذا اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو ہر لحاظ سے مکمل بنا کر مبعوث کیا تھا۔ آپ ﷺ کی عادات واطوار بہت عمدہ تھے۔آپ ﷺ کے مزاج میں سختی نہیں پائی جاتی تھی اور نہ ہی بول چال میں کرختگی کا شائبہ پایا جاتا تھا،نمود ونمائش سے آپ ﷺ کوکبھی دلچسپی نہیں رہی بلکہ ایسی چیزوں کو دیکھ کر انقباض کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔آپ ﷺ کو ہر وہ کام اچھا لگتا تھا جس میں گناہ کا شائبہ نہ پایا جاتا ہو۔طہارت ونفاست،سادگی وصفائی،حیا وعصمت آپ ﷺ کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔آپ ﷺ بدنامی سے بچنے کی ہر وقت کوشش کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بدنامی سے بچنے کی تلقین فرماتے تھے۔آپ ﷺ کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ یکساں رہتا تھا اور آپ ﷺ ہر قسم کے معاملات میں مساوات کو قائم رکھنے کے علمبردار تھے۔آپ ﷺ اپنا کام خود کرنے کے قائل تھے دوسروں سے کام کرانا پسند نہیں فرماتے تھے۔آپ ﷺ شگفتہ مزاج وخوش طبع تھے،مزاح کو پسند فرماتے تھے،غیبت وبدگمانی سے خود بھی بچتے تھے اور دوسروں کو بھی ان جیسی قبیح عادات سے بچنے پر ابھارتے تھے۔آپ ﷺ کا انداز گفتگو بہت پیارا اور دل موہ لینے والا تھا جس کے اثر سے ہر شخص حتی کی مخالفین بھی مسحور ہو جاتے تھے۔دوران گفتگو آپ ﷺ مخاطب کے مقام ومرتبہ اور دل ودماغ کو سامنے رکھ کر گفتگو فرماتے تھے جس کی وجہ سے گفتگو میں ایک خاص قسم کی تاثیر پیدا ہو جاتی تھی۔شان وشوکت اور بے جا تکلیف وتصنع سے آپ ﷺ اجتناب فرماتے تھے۔اسی طرح سوال کرنے اور گداگری کو ناپسند فرماتے تھے۔آپ ﷺ کے کسی بھی عمل سے رہبانیت کی بو نہیں آتی تھی اور آپ ﷺ اسے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے ناپسند فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کا شمار دنیا کے حسین ترین افراد میں ہوتا تھا۔جسمانی تناسب،اعضاء کی دل کشی،شکل وصورت کی دل آویزی انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔آپ ﷺ سے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کا عالم یہ تھا کہ انھوں آپ ﷺ کے حلیہ مبارک،جسمانی اوصاف کی الفاظ میں ایسی دلکش وخوبصورت تصویر کشی کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم آپ ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔احادیث میں آپ کے شمائل کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

آپ ﷺ میانہ قد اور موزوں اندام تھے۔چہرۂ مبارک بڑا بارعب تھا اور سورج اور چاند کی طرح گولائی لئے ہوئے تھا۔جب آپ ﷺ خوش ہوتے تو چہرۂ مبارک ایسا چمکتا گویا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔پیشانی کی شکنیں بجلی کی طرح چمکتی تھیں۔ہنستے وقت آپ ﷺ تمام لوگوں سے حسین معلوم ہوتے تھے۔رنگ گورا لیکن ملاحت آمیز تھا۔نہ بہت زیادہ سفید اور نہ بہت زیادہ گندم گوں۔خوش الحانی میں آپ ﷺ کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔آپ ﷺ کے تمام انسانی اعضاء متناسب تھے جیسے سر بڑا تھا لیکن اس میں اعتدال اور مناسبت پائی جاتی تھی،گردن پتلی اور لمبی تھی،چوڑا سینہ،گٹھا ہوا جسم،بھرے ہوئے بازو،گھنے بال ہلکے سے گھونگھریالے پن کے ساتھ،آنکھیں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے اور گھنی ولمبی پلکیں لیے ہوئے تھا،باریک وآبدار دانت،ہلکی ایڑیاں،بھری بھری ہتھیلیاں لمبی وبھاری انگلیوں کے ساتھ،پاؤں کی انگلیاں بھی ہاتھ کی انگلیوں کی طرح لمبی اور بھاری تھیں۔

16.19 مدنی زندگی میں حضور کا طرز عمل

آپ ﷺ کی مکی زندگی کی طرح مدنی زندگی بھی ہمارے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔مدینہ میں آپ ﷺ کا طرز عمل صرف

ایک حکومت کے سربراہ کا نہ تھا بلکہ ایک داعی اور مربی کا تھا۔ آپ ﷺ کو مدینہ میں یہودیوں اور منافقوں سے واسطہ پڑا اور آپ نے ﷺ ان کے ساتھ ان کی بدعہدی کے باوجود حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ مشرکین مکہ کے ساتھ آپ ﷺ کو متعدد جنگیں لڑنی پڑیں اور تقریباً ساری جنگوں میں فاتح ہونے کے باوجود کسی میں بھی آپ ﷺ نے اپنے آپ کو فاتح کے طور پر نہیں پیش کیا بلکہ ہر موقع پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ فرمایا۔ آپ ﷺ کے حسن اخلاق کا سب سے عمدہ نمونہ فتح مکہ کے موقعہ پر نظر آتا ہے۔

داعی ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے مدنی زندگی میں ایک سربراہ مملکت کے فرائض بھی انجام دیے اور اپنی اس حیثیت میں نمایاں اور اہم کارنامے انجام دیے اور ایسے دانشمندانہ فیصلے کیے جن کے گہرے اثرات اسلامی تاریخ پر مرتب ہوئے۔ اس کی عمدہ مثالیں میثاق مدینہ، خطبۂ حجۃ الوداع اور مختلف اقوام وقبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہیں۔

معلومات کی جانچ:

1. مواخات کسے کہتے ہیں؟

2. آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد کتنی تھی اور ان کے کیا اسمائے گرامی تھے؟

16.20 خلاصہ

آپ ﷺ کے مدینہ میں قیام اور وہاں گذرنے والی زندگی کو ''مدنی زندگی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مدنی دور دس سالوں پر محیط ہے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنے اہل خانہ کے لیے مکانات بھی بنوائے۔ بعد ازاں انھیں مکہ سے بلاکر وہاں قیام پذیر ہوئے۔

ہجرت کے پہلے سال آپ ﷺ نے مدینہ کے اندرونی استحکام پر توجہ دیا سنہ 2 ہجری میں دو اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے پہلا واقعہ تحویل قبلہ کا ہے اور دوسرا واقعہ سلسلہ غزوات کا آغاز ہے چنانچہ دشمنان اسلام نے اسی سال اسلام کے خلاف تلوار کھینچ لی اور مسلمان بھی مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔

مدنی دور میں آپ ﷺ کو متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔ دشمنوں کے خلاف آپ ﷺ کو چھوٹی بڑی 74 جنگی مہمات سر کرنا پڑیں۔ ان جنگوں کو اصطلاحی طور پر غزوہ اور سریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مشہور غزوات میں غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوہ حنین، غزوہ بنو نضیر، غزوۂ خندق، غزوۂ موتہ، غزوۂ تبوک وغیرہ شامل ہیں۔ غزوات کا سلسلہ تقریباً پورے مدنی دور پر محیط ہے۔

مدنی دور کے دیگر اہم واقعات میں سے سنہ 6 ہجری میں صلح حدیبیہ اور سنہ 8 میں فتح مکہ کا وقوع پذیر ہونا ہے۔ دونوں واقعات کے گہرے اثرات اسلامی معاشرہ پر مرتب ہوئے۔ پہلے واقعے کے نتیجہ میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ بہت تیزی سے ہوئی اور آپ ﷺ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف سربراہان مملکت وامراء کو خطوط لکھے اور انھیں اسلام کا پیغام قبول کرنے کی دعوت دی جب کہ فتح مکہ کے بعد پورے عرب میں اسلام کا غلبہ ہو گیا۔

سنہ 10 ہجری میں آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کیا جس میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار افراد آپ کے ساتھ شریک تھے۔ اس موقعہ پر آیت ﴿**اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا**﴾ نازل ہوئی اور اسلام کی تعلیمات تکمیل کو پہنچیں۔ اور آپ ﷺ نے جبل رحمت پر چڑھ کر اپنا شہرۂ آفاق خطبہ ''خطبہ حجۃ الوداع'' دیا۔ یہ خطبہ بلاغت نبوی کے اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ اسلامی قانون و اخلاق کا جامع بھی ہے۔

سفر حج سے واپسی کے دو مہینے بعد 18 یا 19 صفر 11 ہجری سر درد سے مرض وفات کی ابتدا ہوئی۔ جمہور کے نزدیک آپ ﷺ نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے پر پیر کے دن 12 ربیع الاول 11 ہجری کو اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی۔ آپ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی تعمیر کی۔ مسجد نبوی سے لگ کر ہی آپ ﷺ نے دو چھوٹے چھوٹے مکانات بھی اپنے اہل خانہ کے لیے بنائے تھے۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ ﷺ نے مہاجرین کی آباد کاری کے عملی قدم اٹھایا اور مواخات کا فارمولا آزمایا۔ انصار نے مواخات یعنی ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنانے کے فرمان نبوی کو انتہائی خوشدلی سے قبول کیا اس سلسلہ میں انھوں نے ہر قسم کا ایثار روا رکھا۔

مہاجرین کا مسئلہ حل کرنے کے بعد آپ ﷺ شہری تنظیم کی جانب متوجہ ہوئے لہذا آپ ﷺ نے سارے مسلم و غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کو اکٹھا کر کے ایک ایسی تنظیم بنانے کی تجویز پیش کی جو بیرونی حملوں کے دفاع اور اندرونی جھگڑوں کو نمٹا سکے۔

اس تنظیم پر عائد ہونے والے فرائض و حقوق کو تحریری طور پر مرتب کیا گیا۔ یہ دستاویز دنیا کی پہلی دستاویز ہے جس میں کسی مملکت کے لیے دستور مدون کیا گیا تھا اسے ''میثاق مدینہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میثاق کی دفعات کامل رواداری، مذہبی آزادی اور حسن تعاون پر مبنی تھیں۔

آپ ﷺ نے میثاق مدینہ کو مرتب کرنے کے علاوہ آس پاس کے قبائل سے بھی معاہدے کیے جن کی وجہ سے آپ ﷺ کو مکمل طور پر استحکام حاصل ہو گیا تھا۔

حیات نبوی میں تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اولین وحی کا پہلا لفظ ''اقرأ'' (پڑھو) تھا۔ قرآن کریم میں آپ ﷺ کے فرض منصبی میں تعلیم و تربیت بھی شامل کیا گیا تھا۔ فرمان الٰہی ہے ﴿**ويعلمكم الكتٰب والحكمة و يعلمكم ما لم تكونوا تعلمون**﴾۔

آپ ﷺ اخلاق عالیہ کا عمدہ نمونہ تھے۔ قرآن نے آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کی گواہی دی ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کو سب سے اچھا اور بہتر قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق کی گواہی حضرت عائشہ نے ان الفاظ میں دی ہے کہ ''آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا''۔

آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں گیارہ شادیاں کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو چھوڑ کر تمام ازواج مطہرات بیوہ تھیں۔ آپ ﷺ کے نکاح میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ نو بیویاں رہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا پہلا نکاح حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہوا تھا۔ان کی زندگی میں آپ ﷺ نے کسی اور سے نکاح نہیں کیا۔انھیں کے بطن حضرت ابراہیم کے سوا ساری اولادیں ہوئیں۔ان کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات میں حضرت سودہ بنت زمعہ عامریؓ،حضرت عائشہ صدیقہؓ،حضرت حفصہ بنت عمر،حضرت زینب بنت خزیمہؓ،حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ،حضرت زینب بنت جحشؓ،حضرت جویریہ بنت حارثؓ،حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ،حضرت صفیہ بنت حییؓ،حضرت میمونہ بنت حارثؓ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا ازواج مطہرات کے علاوہ آپ ﷺ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ سے بھی نکاح کیا تھا۔آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

آپ ﷺ کی اولاد میں حضرت قاسم،حضرت زینبؓ،حضرت رقیہؓ،حضرت ام کلثومؓ،حضرت فاطمہؓ اور حضرت ابراہیم شامل ہیں۔

آپ ﷺ کا شمار دنیا کے حسین ترین افراد میں ہوتا تھا۔جسمانی تناسب،اعضاء کی دل کشی،شکل وصورت کی دل آویزی انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔آپ ﷺ سے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کا عالم یہ تھا کہ انھوں آپ ﷺ کے حلیہ مبارک،جسمانی اوصاف کی ایسی دلکش وخوبصورت تصویر کشی کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم آپ ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔احادیث میں آپ کے شمائل کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

16.21 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. میثاق مدینہ کیا ہے؟
2. مواخات کا مفہوم بیان کیجئے۔
3. غزوہ تبوک پر روشنی ڈالیے۔
4. عہد نبوی میں تعلیم وتربیت کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. غزوہ بدر کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اثرات کا جائزہ پیش کیجئے۔
2. غزوہ احد کی تفصیلات بیان کیجئے۔
3. فتح مکہ کی تفصیلات بیان کیجئے۔
4. غزوات نبوی کا عمومی جائزہ لیجئے۔
5. ازواج مطہرات پر ایک نوٹ لکھیے۔

1. اسلامی سماج کی تشکیل کیونکر ہوئی؟ وضاحت کیجیے۔

16.22 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. سیرت النبی : علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، دارالمصنفین ،اعظم گڑھ

2. رحمۃ للعالمین : قاضی سلیمان منصور پوری

3. نبی رحمت : حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

4. اصح السیر : مولانا عبدالرؤف دانا پوری

5. محسن انسانیت : ڈاکٹر نعیم صدیقی

6. تاریخ تہذیب اسلامی (عہد جاہلی وعہد اسلامی) : پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

7. اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ محمد ﷺ لاہور

8. نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور

اکائی 17 : سیرت نبوی بحیثیت اسوہ حسنہ

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

17.2 تمہید

17.3 نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ

17.4 عادات واطوار نبوی ﷺ

17.5 اخلاق حسنہ

17.6 حسن معاشرت

17.7 معاملات

17.8 خلاصہ

17.9 نمونے کے امتحانی سوالات

17.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ بتانا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی تمام بنی نوع انسان خاص طور سے مسلمانوں کے لیے اسوہ ونمونہ ہے جس کی پیروی کر کے انسان دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی اس لیے اسوہ قرار دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کا عملی نمونہ تھی گویا آپ ﷺ کی اتباع و پیروی کرنا قرآن کی اتباع و پیروی کرنا ہے۔

17.2 تمہید

سرور کائنات حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول و نبی تھے لیکن نبی کا اسلامی تصور یہ نہیں ہے کہ وہ عقائد، عبادات اور احسان (تصوف) کی تعمیل تک خود کو محدود رکھے بلکہ اسلامی تصور میں نبی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے حسنات کا عملی راستہ بتائے اسی لیے آپ ﷺ نے دین بھی سکھایا اور ایک مملکت بھی چلا کر دکھائی۔ شادی کر کے گھریلو زندگی کا ایک عمدہ نمونہ امت کے لیے چھوڑا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے کثیر پہلوؤں میں سے ہر ایک کے تعلق سے بحث یہاں ممکن نہیں ہے البتہ آپ ﷺ کی عظیم

شخصیت کے ان چند پہلوؤں کی طرف اشارے کرنا مناسب ہوگا جو ہم سب کے لیے اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان پر عمل کر کے اور آپ ﷺ کے بتائے راستے پر چل کر ہر انسان دنیاوی واخروی زندگی میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

17.3 نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ

اللہ تبارک وتعالی کی یہ سنت رہی ہے کہ رسول کو مبعوث کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے صحیفۂ ہدایت بھی نازل کرتا ہے۔رسول اس صحیفہ کو لوگوں تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس پر عمل کرتا ہے۔بعثت سے قبل بھی رسول ابنائے زمانہ میں بہترین اخلاق وکردار کا حامل ہوتا ہے۔اس کو جب وحی کی تعلیم ملتی ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند تر درجہ کمال حاصل کر لیتا ہے اور قول وفعل کا وہ بہترین ماڈل پیش کرتا ہے جو اللہ کو پسند ہوتا ہے۔اسی لیے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ رسول کے پیش کردہ نمونہ کو اپنے لیے معیار بنائیں۔یہ نمونہ اسوۂ حسنہ کہلاتا ہے۔قرآن مجید میں اہل ایمان کو مخاطب ہو کر فرمایا گیا ہے کہ ﴿**لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الأخر و ذكر الله كثيرا**﴾ ''تم میں سے ہر اس شخص کے لیے، جو اللہ سے ملاقات اور روز آخرت کے محاسبہ کی توقع رکھتا ہو اور اللہ کو زیادہ یاد کرتا ہو، رسول اللہ ﷺ کے عمل میں بہترین نمونہ ہے''(احزاب:۳۳:۲۱) ہر صاحب ایمان کے سامنے یہ ہدف ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی اسی کامل نمونہ کے مطابق ڈھال لے کیونکہ زندگی کا یہی نہج اللہ تعالی کو پسند ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا مزاج، کریمانہ اخلاق، صبر وشکر، توکل علی اللہ، استقامت، صدق وانابت جیسی اعلی انسانی صفات آپ ﷺ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ سے ظاہر ہیں۔

مکی زندگی میں دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ آپ کے حسن اخلاق کی قرآن نے اس طرح تعریف کی کہ آپ اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔اس عظیم کردار کی تعلیم آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو دی اور انھیں اچھے برے کردار میں فرق کرنا سکھایا۔

آپ ﷺ کی پوری زندگی سراسر قرآن کی عملی تفسیر ہے کہ ایک طرف قرآن اہل ایمان کو عقائد ونظریات اور اصول وکلیات کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری طرف آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے عملی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ایک طرف قرآن اہل ایمان کو پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیتا ہے تو دوسری طرف حضور ﷺ خود اپنی عملی زندگی کا نمونہ اہل ایمان کے سامنے قرآن کی زبان میں یوں پیش کرتے ہیں ﴿**ان صلاتي ونسكي ومماتي ومحياي ومماتي لله رب العٰلمين لا شريك له وبذلك أمرت وأنا أول المسلمين**﴾ (کہو بے شک میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا سب کچھ صرف اس اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مربی وپروردگار، آقا ومالک اور حاکم ومنتظم ہے۔ان تمام امور میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔مجھے یہی حکم ملا ہے اور سب سے پہلے سر تسلیم خم کرنے والا میں ہوں)۔

مذکورہ بالا آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہو اور دنیائے انسانیت کے لیے ایک جامع، مکمل اور قابل تقلید نمونہ کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

آپ ﷺ کی زندگی اس لیے بھی قابل تقلید نمونہ تھی کہ آپ ﷺ اپنے معاشرہ میں کوئی نو وارد اور عجمی نہ تھے، اور نہ کہیں سے اچانک وارد ہوئے تھے کہ اہل مکہ آپ ﷺ سے واقف نہ ہوتے، بلکہ آپ ﷺ کی پرورش، تربیت اور بود و باش انھیں کے درمیان ہوئی تھی اور وہ سب آپ ﷺ کے شب و روز کی مصروفیات سے اچھی طرح واقف تھے، آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کے گواہ اور معترف تھے، ان کے درمیان رہ کر آپ ﷺ نے اجرت پر بکریاں بھی چرائیں اور بحیثیت ایک تاجر کامیاب تجارت بھی کی۔ اسی ماحول و معاشرہ میں آپ ﷺ نے شادی بھی کی اور صاحب اولاد بھی ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کی پوری مکی و مدنی زندگی اس قدر صالح و پاکیزہ تھی کہ آپ بہترین سیرت و کردار کے مالک کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

آپ ﷺ کی زندگی تمام لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ ہے خواہ وہ بچے ہوں یا نوجوان، معلم ہوں یا متعلم، مزدور ہوں یا تاجر، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، صاحب اولاد ہوں یا بے اولاد، تحریک اسلامی کے داعی ہوں یا واعظ و خطیب، بشیر و نذیر ہوں یا مربی، قائد و رہنما ہوں یا حاکم و فرمانروا، مہاجر و انصار ہوں یا فاتح و غالب، جنگ میں زخم خوردہ ہوں یا حملہ آور، مجاہد ہوں یا سپہ سالار، مطیع ہوں یا جن کی اطاعت کی جائے، زاہد و عابد ہوں یا متقی و محسن، مقیم ہوں یا مسافر، اکیلے ہوں یا باجماعت۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی حیات پاک نوع انسانی کے تمام طبقوں کے لیے تا قیامت ایک بہترین نمونہ ہے اس لیے تمام بنی نوع انسان خاص طور سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں کو خدا کی بندگی اور حضور اکرم ﷺ کی پیروی میں استوار کریں کیونکہ اسی میں ان کی کامیابی ہے۔

معلومات کی جانچ:

1. اسوہ نبوی سے کیا مراد ہے؟
2. آپ ﷺ کے اخلاق کو قرآن اور حضرت عائشہؓ نے کن الفاظ میں بیان کیا ہے؟

17.4 عادات و اطوار نبوی ﷺ

حضور ﷺ کی عادات و اطوار آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس لیے ان سے واقف ہونا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔ مثلاً جب آپ ﷺ چلتے تھے تو قدم جما کر ایسے چلتے تھے جیسے گہرائی میں اتر رہے ہیں یا چڑھائی پر چڑھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی چال عظمت، وقار، شرافت اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ کسی طرف متوجہ و ملتفت ہوتے تو پوری طرح ہوتے تھے، دزدیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بقول ام معبدؓ ''گفتگو موتیوں کی لڑی جیسے پروئی ہوئی، الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ، نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو''۔ گفتگو میں عام طور سے ایک مسکراہٹ بھی شامل رہتی جو مخاطب کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی تھی، دوران گفتگو ضرورت کے حساب سے ہاتھوں سے اشارہ بھی فرماتے تھے۔ لباس میں کرتہ، تہہ بند، عمامہ، ٹوپی، چادر و جبہ شامل تھے۔ عام طور سے لباس میں سفید رنگ کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ جوتا، جرابیں و موزے بھی آپ ﷺ کے استعمال میں رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی کا استعمال بھی کیا ہے۔ سر

وداڑھی کے بال کوسنوار کر رکھتے تھے، سفر وحضر میں ہمیشہ سات چیزیں: تیل کی شیشی، کنگھا، سرمہ دانی، قینچی، مسواک، آئینہ، لکڑی کی ایک پتلی سی کھپچی ساتھ رکھتے تھے۔ سرمہ وخوشبو لگانے کا اہتمام کرتے تھے۔ عام سماجی روابط کو قائم رکھنے اور انھیں پورا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، علاحدگی پسندی یا کبر کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ آپ ﷺ سلام میں پہل کرتے تھے، مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی تھی وہاں بیٹھ جاتے تھے، کسی کے گھر جاتے تو اجازت کے لیے تین مرتبہ سلام کرتے، اگر جواب نہ ملتا تو بغیر کسی تکدر کے واپس چلے جاتے، بیمار کی عیادت کا اہتمام کرتے تھے، سفر سے واپس آنے والا مسافر اگر آپ ﷺ سے ملنے آتا تو اس سے معانقہ کرتے اور بسا اوقات پیشانی پر بوسہ دیتے تھے۔

آپ ﷺ کی خانگی زندگی بالکل عام انسانوں جیسی تھی بقول حضرت عائشہؓ ھو بشر من البشر (آپ ﷺ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے)۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود کرتے تھے حتی کہ ان میں پیوند بھی لگا لیا کرتے تھے۔ بکری کا دودھ بھی دوہ لیا کرتے تھے۔ اپنی نجی ضرویات خود ہی پوری کرلیا کرتے تھے مثلاً جوتوں کی خود ہی مرمت کرلیا کرتے تھے۔ بازار سے سودا سلف لایا کرتے تھے۔ خادم کے ساتھ مل کر کام لیا کرتے تھے۔ گھر کا ساز وسامان بہت ہی مختصر اور معمولی تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو آپ ﷺ کی عسرت و پریشانی دیکھ کر رونا آیا۔ آپ ﷺ نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کیا کہ ''قیصر وکسری تو عیش کریں اور آپ ﷺ کا یہ حال ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا عمر کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ وہ لوگ دنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے۔

آپ کھانے پینے میں بھی سادگی پسند تھے۔ گوشت سے خاص رغبت تھی۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خربوزہ، ککڑی، لوکی، کھچڑی، مکھن وغیرہ شامل تھے۔ دودھ وکھجور کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ اکھٹے ہوکر کھانے کی تلقین فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کی نشست وبرخاست کے مختلف ڈھنگ تھے۔ کبھی اکڑوں بیٹھتے، کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ کرلیتے، کبھی ہاتھوں کی بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔ سیدھی کروٹ سونا پسند کرتے تھے، کبھی کبھار چت بھی لیٹ جاتے تھے، پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا اور اس سے منع فرماتے تھے۔ وضو کرکے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنا معمولات میں شامل تھا۔ قرآن کی آخری تین سورتوں کو پڑھ کر بدن پر دم بھی کرلیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے اتنی دور تک چلے جاتے تھے جہاں بے پردگی کا خطرہ باقی نہیں رہتا تھا۔ قضائے حاجت کے وقت منھ یا پشت قبلہ کی طرف نہ کرتے تھے۔ غسل کے لیے پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔

آپ ﷺ سفر کے لیے الگ سے تہہ بند رکھتے تھے۔ جمعرات کو روانگی زیادہ محبوب تھی۔ سواری کو تیز چلانا اور پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمولات میں شامل تھا۔ سفر میں درپیش اجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سفر سے رات کو گھر واپس آنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ اگر آ بھی گئے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد جاتے، نفل نماز کی ادائیگی کرتے اور گھر میں اطلاع پہنچ جانے کے بعد تشریف لاتے تھے۔

آپ ﷺ عام انسانوں کی طرح انسانی جذبات واحساسات رکھتے تھے۔ خوشیوں سے خوش ہوتے تھے اور غم کے مواقع پر رنج وغم کا اظہار آپ ﷺ کے چہرے بشرے سے ہوتا تھا۔ مزاح کی باتوں پر زیرلب مسکراہٹ آجاتی تھی بچوں وبچیوں کی معصومانہ

حرکتوں پر خوش ہوتے تھے۔اہل خانہ کے رویوں کے نتیجہ میں کبھی مغموم نظر آتے تھے تو کبھی شاداں و فرحاں۔گویا آپ ﷺ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے اور زندگی کے مختلف حالات واقعات کے اثرات آپ ﷺ پر مرتب ہوتے تھے۔

17.5 آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ

انسان کے اوپر لازم ہونے والے حقوق وفرائض کو اچھی طرح سے ادا کرنے کا نام اخلاق ہے۔یہ لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں محبت وشفقت،عدل وانصاف،دیانت وامانت،جرأت وہمت،تواضع واحسان،عفو ورحم،حسن معاشرت،حسن سلوک وغیرہ سب شامل ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے جملہ اغراض اس میں شامل ہیں۔ہر مذہب کے رہنماؤں نے ان صفات عالیہ کی تعلیم دی ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت رہتی دنیا تک لیے ہوئی تھی لہذا باری تعالی نے آپ ﷺ کو ہر لحاظ سے مکمل بنا کر مبعوث کیا تھا۔اخلاق وکردار کے ضمن میں بھی آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے تمام انبیاء کے اخلاق وکردار کو آپ ﷺ کی ذات اقدس میں جمع کر دیا گیا تھا اور تمام رسولوں کی اعلی صفات سے آپ ﷺ کی بلند وبالا شخصیت متصف تھی۔آپ اس ارشاد کا مکمل نمونہ تھے کہ میں دنیا میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

مذکورہ فرمان نبوی سے آپ ﷺ کی بعثت ونبوت کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی سامنے آتا ہے لوگوں کے اخلاق ومعاملات درست ہوں۔ان کے اندر انسانیت کی اعلی صفات پیدا ہوں کیونکہ اعلی اخلاقی صفات وکردار کا حامل ہونا ایسی چیز ہے جس کو اختیار کر کے انسان خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔فرمان نبوی ہے''اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''۔

آپ ﷺ اخلاق کے پیکر تھے،سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے اور ایک جیسا رویہ اختیار کرتے تھے۔تواضع وانکساری،نرم مزاجی،سخاوت وفیاضی،عدل وانصاف،استقلال وشجاعت،صبر واستقامت،شکر واحسان،مہمان نوازی،آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کے روشن ترین ابواب ہیں۔مزید برآں آپ ﷺ جانوروں پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے تھے اور ان کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک نے اچھے اخلاق کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے''حسن اخلاق نام ہے خوش روئی،مال خرچ کرنے اور کسی کو تکلیف نہ دینے کا''۔آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل کا نمونہ پیش فرما کر مذکورہ بالا اخلاقی قدروں کی نشاندہی فرمائی ہے۔جیسا کہ اوپر مذکور ہوا' قرآن نے آپ کے اعلیٰ اخلاق کی گواہی دی جس کی وضاحت وتفسیر ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ''اللہ نے اپنے کلام پاک میں جس کام کو جس طرح کرنے کا حکم دیا اور جس بات کو جس طرح کرنے کی ہدایت دی،حضور اکرم ﷺ نے اس پر اسی طرح عمل کیا۔چاہے آپ ﷺ گھر میں ہوتے یا مسجد میں،بازار میں ہوتے یا میدان جنگ میں،دوست سے بات کرتے یا دشمن سے،ذاتی حیثیت سے کوئی کام کرتے یا جماعتی،اپنے سے ملتے یا غیر سے،غرض ہر جگہ ہر کام اور ہر بات میں اخلاق نبوی نمایاں نظر آتا۔جو بھی آپ ﷺ سے ملتا اخلاق کی خنکی محسوس کرتا اور دل سے آپ ﷺ کا ہو رہتا''۔

آپ ﷺ کے بلند اخلاق کے قائل صرف دوست ہی نہ تھے، دشمن بھی آپ ﷺ کے اعلیٰ کردار کے معترف تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کا لقب ہی الامین اور الصادق پڑ گیا تھا۔ اخلاق و کردار کے حوالے سے اس کی گواہی زیادہ معتبر مانی جاتی ہے جس نے ممدوح کے ساتھ کچھ وقت گذارا ہو۔ آپ ﷺ کے ساتھ زندگی کا ایک طویل حصہ گزارنے والی ازواج مطہرات میں سے حضرت خدیجہ وحضرت عائشہ وغیرہ نے آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کی گواہی دی ہے۔ ازواج مطہرات کے علاوہ حضرت علی، حضرت انس، حضرت عمرو بن عاص حضرت ابوسلمہ اور ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کا ذکر عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ ان کے اقوال کی روشنی میں آپ ﷺ کو روئے زمین پر پائے جانے والے تمام افراد میں سے سب سے عمدہ اخلاق و کردار کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عالیہ، اوصاف کریمہ اور خصائل شریفہ کا ذکر ہند بن ابی ہالہ نے بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''رسول اللہ ﷺ ہر وقت آخرت کی فکر اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے ...... اکثر طویل سکوت فرماتے، بلاضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہن مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے اور اسی طرح اختتام فرماتے۔ آپ ﷺ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی، نہ زیادہ اختصار'' ...... آپ ﷺ نرم مزاج و نرم گفتار تھے۔ درشت خو اور بے مروت نہ تھے، نہ کسی کی اہانت کرتے اور نہ اپنے لیے اہانت پسند کرتے تھے۔ نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل کیوں ہو، اور اس کی برائی نہ فرماتے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے نہ تعریف، دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی اس پر آپ ﷺ کو کبھی غصہ نہ آتا، لیکن جب خدا کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کا بدلہ لے لیتے۔ آپ ﷺ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا نہ اس کے لیے انتقام لیتے، جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ سے فرماتے، جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو اس کو پلٹ دیتے، گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ و ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے۔ آپ ﷺ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا جس سے صرف آپ ﷺ کے دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وصاف تھے، ظاہر ہوتے''۔

حضرت ابوسلمہؓ کے ہی بقول ''حضرت نبی ﷺ ایسے اخلاق والے تھے کہ اپنے گھر کے خادموں کی بیماریوں کا علاج فرماتے تھے، ان کی خدمت کرتے تھے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدتے اور صحابہ وخدام کی موجودگی کے باوجود خود ہی انھیں اٹھا لاتے۔ ہر کسی سے مصافحہ فرماتے، مصافحہ کر لینے میں امیر وغریب، بچہ بوڑھا سب کو برابر تصور فرماتے۔ سلام پہلے خود کرتے تھے۔ ہر کسی کی دعوت قبول فرماتے خواہ وہ جو یا کھجور کھلاتا۔ انکساری سے ہر کسی سے ملتے۔ نرم مزاج، سخی

طبیعت، ہر کسی کو اچھی طرح برتنے والے، خندہ پیشانی سے ملنے والے، نہ زیادہ ہنستے نہ قہقہے لگاتے، نہ تنگ مزاج، نہ چڑچڑی عادت والے، نہ ترش رو، بلکہ متواضع تھے اور ہر کسی سے تواضع سے پیش آنے والے تھے''۔

حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کی گواہی ان الفاظ میں دی ہے'' آپ ﷺ طبعاً بدکلامی اور بے حیائی اور بے شرمی سے دور تھے اور تکلفاً بھی ایسی کوئی بات آپ ﷺ سے سرزد نہیں ہوتی تھی۔ بازاروں میں آپ ﷺ کبھی آواز بلند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے۔ آپ ﷺ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی، سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقعہ ہو، کسی خادم یا عورت پر آپ ﷺ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا......لوگوں کی دلداری فرماتے اور ان کو متنفر نہ کرتے تھے۔ اپنے اصحاب کے حالات کی برابر خبر رکھتے تھے، لوگوں سے ان کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے......''۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہا لیکن اس عرصہ میں آپ ﷺ نے بیزاری اور نفرت کا کوئی کلمہ کبھی نہیں کہا اور اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تو آپ ﷺ نے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے یہ غلطی کیوں کی؟ کس کام کے نہ کرنے پر کبھی نہیں کہا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔

آپ ﷺ صرف خود ہی اخلاق عالیہ کے پیکر نہیں تھے بلکہ آپ ﷺ نے امت کے افراد کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ بھی اخلاق و کردار کا پیکر بنیں۔ حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' کوئی عمل میزان عمل میں حسن خلق سے زیادہ وزنی نہیں ہوگا''۔ دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا'' اللہ کے بندوں میں سب سے اچھا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''۔

17.6 حسن معاشرت

زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن میں ماں باپ، بھائی بہن، اولاد، میاں بیوی، پاس پڑوس اور دیگر طبقات کے چھوٹے بڑے لوگ شامل ہیں۔ ان سے اور معاشرہ کے مختلف اشخاص و افراد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آنے کو حسن معاشرت کہتے ہیں۔ زندگی کے دیگر معاملات کی طرح آپ ﷺ کی سیرت طیبہ، حسن معاشرت کی عملی تصویر ہے۔ آپ ﷺ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور ہر شخص کے اس کے معیار و مرتبہ و حیثیت کے مطابق سلوک کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب کرام سے الگ تھلگ نہیں رہتے تھے بلکہ ان سے میل جول رکھتے تھے، ان سے باتیں کرتے، ان کے بچوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے بسا اوقات انھیں گود میں بھی بٹھا لیتے اور انھیں پیار کرتے، غلاموں باندیوں تک کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا جس سے بھی تعلق ہوا اس کو اچھی طرح سے نبھایا، اس سے بہتر سے بہتر سلوک کیا اور اپنے اصحاب کرام کو بھی اس بات کی تلقین کی کہ وہ باہم تعلقات کا لحاظ رکھیں تاکہ ایک صالح وصحت مند معاشرہ پروان چڑھ سکے۔

17.6.1 والدین کے حقوق

آپ ﷺ کے والدین کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا اور آپ ﷺ کو ان کی خدمت کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ لیکن جب آپ ﷺ بڑے ہوئے تو اپنے آپ کو اپنے شفیق چچا کے سایۂ عاطفت میں پایا۔ آپ ﷺ نے ان کا اور دیگر چچاؤں کا احترام والد کی طرح کیا۔

آپ ﷺ اپنی رضاعی ماں کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔حضرت ابوطفیلؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جعرانہ کے مقام پر گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا۔اسی دوران ایک معمر خاتون تشریف لے آئیں اور آپ ﷺ کے بالکل قریب پہنچ گئیں۔آپ ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر بچھا دی جس پر وہ بیٹھ گئیں۔میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحبہ ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ نبی ﷺ کی وہ ماں ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا تھا''۔

آپ ﷺ کے والدین کا انتقال چونکہ بچپن میں ہی ہو گیا تھا لہٰذا ان کی خدمت کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن آپ ﷺ کو والدین کی اہمیت اور ان کے مقام و مرتبہ کا بخوبی اندازہ تھا لہٰذا متعدد احادیث میں ان کی خدمت گذاری، ان کی عزت و احترام اور ان کی قدر کرنے پر ابھارا گیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ''خدا کی خوشنودی والدین کی خوشنودی ہے اور خدا کی ناراضی والدین کی ناراضی ہے''۔آپ ﷺ نے خدمت والدین کو جہاد جیسی عظیم عبادت پر بھی ترجیح دی اور ایک صحابی کو جہاد میں شریک ہونے کے بجائے والدین کی خدمت کرنے کی تاکید فرمائی۔

آپ ﷺ نے والدین کی خدمت، عزت و توقیر، احترام وقدر کو غیر مشروط قرار دیا ہے کہ ان کی عزت و توقیر ہر حال میں کی جائے گی وہ چاہے کیسے بھی ہوں۔اس کا عملی نمونہ آپ ﷺ نے اپنے باپ جیسے چچا حضرت ابوطالب کا احترام و اکرام کر کے پیش کیا کئی ایک احادیث میں ان کی خدمت و عزت کرنے پر غیر مشروط طریقہ پر ابھارا۔صحیحین میں حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ انھوں آپ ﷺ سے پوچھا کہ میری والدہ میرے پاس حالت کفر و شرک میں تشریف لاتی ہیں تو کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ہاں۔

17.6.2 بچوں کے ساتھ حسن سلوک

آپ ﷺ بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، ان کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا گزر کچھ ایسے بچوں کے پاس سے ہوا جو کھیل رہے تھے۔آپ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ان ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے گھلے ملے رہتے تھے۔میرے ایک چھوٹے بھائی سے آپ ﷺ فرماتے تھے''اے ابوعمیر نُغیر (ایک چھوٹی چڑیا) کا کیا ہوا؟

آپ ﷺ کے بچوں سے محبت کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ'' آپ لوگ اپنے بچوں سے اس قدر پیار کرتے ہیں، ہم تو ان کو پیار نہیں کرتے۔رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالے نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہو تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں''۔نواسوں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔آپ ﷺ اگر انھیں نہ دیکھتے تو حضرت فاطمہؓ سے انھیں بلانے کو کہتے۔آپ ﷺ کی آمد کو سن کر وہ آتے تو آپ ﷺ ان سے منہ ملاتے اور ان کو اپنے سینے سے لگاتے۔ایک مرتبہ حسن دوڑتے ہوئے آئے اور آپ ﷺ کی گود میں گر گئے، پھر آپ ﷺ کی ریش مبارک میں انگلیاں ڈالنے لگے۔آپ ﷺ نے اپنا دہن مبارک کھول دیا تو وہ اپنا منہ آپ ﷺ کے دہن مبارک میں ڈالنے لگے۔

17.6.3 صحابہ کرام کے ساتھ رویہ

صحابۂ کرام کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت عمدہ تھا۔آپ ﷺ ان سے گھلے ملے رہتے تھے۔ان سے باتیں کرتے ،ان کے بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت ،خوش طبعی وخوش مذاقی کے ساتھ پیش آتے اورانھیں اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرتے تھے۔آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کی موجودگی میں کبھی پیرنہیں پھیلایا تاکہ کسی کوتنگی ودشواری محسوس نہ ہو۔عبداللہ بن حارثؓ سے مروی ہے کہ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ خندہ رواورمتبسم کسی کونہیں دیکھا''۔حضرت جابر بن سمرہؓ نے بیان فرمایا ہے کہ''مجھے رسول اللہ ﷺ کی مجلس مبارک میں سومرتبہ سے زائد بیٹھنے کا موقع ملا۔میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے اصحاب کرامؓ ایک دوسرے سے اشعارسن رہے ہیں اورسنارہے ہیں، جاہلیت کی بعض باتوں اورواقعات کا تذکرہ بھی کررہے ہیں اورآپ ﷺ ساکت ہیں،کبھی کوئی ہنسی کی بات ہوتی توان کے ساتھ آپ بھی تبسم فرماتے''۔حضرت شریدؓ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے امیہ بن صلت کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اورمیں نے آپ ﷺ کی فرمائش پوری کرتے ہوئے آپ ﷺ کواشعار سنائے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ''زید بن حارثہؓ (جوآپ ﷺ کے غلام تھے) آپ ﷺ سے ملنے مدینہ آئے۔اس وقت آپ ﷺ گھر پرتشریف فرماتھے۔ان کی آمدکوسن کرآپ ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اوران سے اس حال میں ملے کہ جسم مبارک سے چادرگری جارہی تھی۔ان کودیکھ کرآپ ﷺ نے ان سے معانقہ فرمایا اوربوسہ لیا۔

17.6.4 رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ رویہ

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ہمارے فرائض میں شامل ہے۔اس سے خاندان میں یکجہتی پیدا ہوتی ہے۔اسی بنیاد پرآپ ﷺ نے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا۔آپ ﷺ کے معمولات میں شامل تھا کہ جب کبھی آپ ﷺ کے لیے کوئی تحفہ آتا تو آپ ﷺ اس میں دوسروں کوبھی شریک فرماتے۔تقسیم نقدوجنس میں عزیزوں کا حصہ بڑھادیا کرتے تھے اوررشتہ داروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔فرمان نبوی کے مطابق آپ ﷺ کورشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا پسند تھا۔ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ''جوشخص بدلہ میں رشتہ داروں کا خیال رکھتا ہے وہ مکمل درجہ کا صلۂ رحمی کرنے والانہیں ہے۔کمال درجہ کی صلۂ رحمی یہ ہے کہ جب دوسرے رشتہ داراس کے ساتھ بےتعلقی کریں تو یہ ان کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے اوران کا حق دے''۔ایک اور حدیث میں تنبیہ کے انداز میں بیان فرمایا کہ''قرابت کے حق کو پامال کرنے والا اوراپنے برتاؤ میں رشتے ناطوں کا لحاظ نہ کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا''۔حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ''میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جسے اپنی روزی میں کشادگی اورعمر کی درازی مطلوب ہواسے رشتہ داروں سے عمدہ سلوک کرنا چاہیے''۔

رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ اپنے پڑوسیوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اوران کے ساتھ خوشگوارتعلقات بنائے رکھتے تھے۔حالانکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو اسلام نہیں لائے تھے۔اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کریمانہ برتاؤ فرمایا اوران کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا حتیٰ کہ ایک حدیث میں فرمایا کہ''وہ مسلمان نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اوراس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا رہے''۔ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ''وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کی شرارتوں سے اس

کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں''۔حضرت عائشہؓ وحضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ''جبرئیل مجھے پڑوسی کے حق کے بارے میں برابر تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے''۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ''لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایک پڑوسی کے حقوق دوسرے پڑوسی پر کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ قرض مانگے تو مدد کرے، اگر بیمار ہو تو مزاج پرسی کرے، اگر محتاج ہو تو اس پر بخشش کرے اور اگر فقیر ہو جائے تو اس کو دلاسا دے اور اگر کوئی اچھی چیز اس کو ملے تو مبارک باد دے، اگر کوئی مصیبت اس کو پیش آئے تو تعزیت کرے اور جب مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جائے، مکان کی تعمیر اتنی اونچی نہ کرے کہ اس کی ہوا رک جائے، ہانڈی کی خوشبو سے اسے تکلیف نہ پہنچے، ہاں اس ہانڈی میں سے اسے تھوڑا سا دے دے۔تم اگر میوہ خریدو تو اس کو ہدیہ کرو اور اگر نہ دو تو اس میوہ کو پوشیدہ طریقے سے گھر میں لے جاؤ اور تمہارا بچہ وہ پھل لے کر باہر نہ نکلے کہ کہیں پڑوسی کا بچہ رنجیدہ نہ ہو جائے''۔

مذکورہ ہدایات پر آپ ﷺ نے تاحیات عمل فرمایا کہ آپ ﷺ پڑوسیوں کے کام آتے ،ان کا بار اٹھاتے تھے، ان کو قرض دیتے ،ان سے قرض لیتے ، بیماری میں ان کی عیادت کرتے ۔ ہر وقت ان کے حقوق کا خیال رکھتے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

17.6.5 غلاموں کے ساتھ سلوک

آپ ﷺ کا رویہ تمام انسانی طبقات کی طرح غلاموں کے طبقہ سے بھی بہت اچھا اور ہمدردانہ تھا۔ بڑے لوگ چھوٹوں کو اپنے پاس بٹھانا کسر شان سمجھتے ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کے دربار میں امیر وغریب، دولت مند وفاقہ کش، شامی وحبشی، مالک ومزدور، چھوٹا وبڑا سب برابر تھے۔سب کے ساتھ آپ ﷺ یکساں برتاؤ فرماتے تھے۔آپ ﷺ کی بارگاہ میں ایک طرف حضرت ابوبکرؓ وعثمانؓ جیسے امراء موجود رہتے تھے تو اسی شان سے حضرت ابوہریرہؓ وابوذرؓ جیسے مفلس اور حضرت بلالؓ وسلمانؓ جیسے غلام بھی موجود رہتے تھے۔کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے مالداروں کو غریبوں پر ترجیح دی ہو بلکہ آپ ﷺ غرباء کو زیادہ پسند فرماتے تھے اور انھیں اپنے پاس بٹھاتے تھے۔آپ ﷺ کا غلاموں کے ساتھ کس قدر بہتر رویہ ہوتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ حضرت بلالؓ کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا کرتے تھے اور اس بات سے منع فرماتے کہ غلاموں اور لونڈیوں کو غلام ولونڈی کہہ کر پکارا جائے۔اس کے مقابلہ میں آپ ﷺ کو یہ بات زیادہ پسند تھی کہ انھیں آپ ﷺ کا بچہ یا بچی کہہ کر پکارا جائے۔

اسلام سے پہلے غلاموں کے ساتھ لوگ حیوانات سے بدتر سلوک کرتے تھے۔انھیں نہ تو ٹھیک سے کھانا دیا جاتا تھا اور نہ کپڑا۔اس لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کریں اور ان کے بنیادی حقوق کی پامالی نہ کریں۔فرمان نبوی ہے''غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی انھیں بھی پہناؤ''۔

آپ ﷺ نے امت اسلامیہ بلکہ تمام انسانوں کو اس بات پر ابھارا کہ غلاموں کی غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے ۔ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی بار معاف کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ستر بار۔

آپ ﷺ کو غلاموں کے حقوق کا کس قدر خیال تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا کہ مرض الموت میں جو آخری وصیت آپ ﷺ نے فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ ''غلاموں کے معاملے میں اللہ سے ڈرا کرو''۔

17.6.6 اہل خانہ کے ساتھ تعلقات

آپ ﷺ کا رویہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ آپ ﷺ گھر میں عام انسانوں کی طرح رہتے تھے اور عام انسانوں کی طرح اپنے ذاتی کام جیسے کپڑوں کی صفائی اور ان میں پیوند لگانا، بکری دوہنا، جوتا گانٹھنا خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''آپ ﷺ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔ گھر کے اندر اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت اور کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے حضرت انسؓ کے بقول میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے اہل وعیال پر شفیق ورحیم ہو''۔

آپ ﷺ سبھی بیویوں کے ساتھ برابری کے سلوک کا اہتمام فرماتے تھے۔ سفر میں جاتے تو قرعہ ڈالتے اور قرعہ میں جس بیوی کا نام آتا اسی کو ساتھ لے جاتے تھے اور ان کے مزاج کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان باری لگا رکھی تھی دوسرے حقوق کی ادائیگی میں مکمل عدل وانصاف برتتے اور دعا فرماتے کہ اے اللہ یہ منصفانہ تقسیم تو میرے بس کی بات ہے، مگر دل کی محبت میرے اختیار سے باہر ہے۔ اس لیے اگر میں کسی بیوی سے تعلق خاطر زیادہ رکھتا ہوں تو اس پر مجھ سے مواخذہ مت فرما''۔

متعدد روایات میں آپ ﷺ سے اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہتر ہو اور میں تم میں سے اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہوں''۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''میں نبی ﷺ کے یہاں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی۔ میرے ساتھ میری سہیلیاں بھی کھیل مین شریک ہوا کرتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لاتے تو سب ادھر ادھر چھپ جاتیں۔ آپ ﷺ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک کو میرے پاس بھیجتے تا کہ وہ میرے ساتھ کھیلیں''۔

آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کا بہت خیال رکھتے تھے بلکہ بسا اوقات ان کے ساتھ مثل بچپن کی باتیں کیا کرتے تھے تا کہ وہ خوش رہیں مثلاً اگر وہ کچھ کھا رہی ہیں تو ان سے لے کر وہیں سے کاٹ کر کھا لیا جہاں سے انھوں نے کھایا تھا، اگر کسی برتن سے پانی پی رہی ہیں تو اسی پیالے سے خود بھی پی لیا کرتے تھے۔ کبھی ان کی پشت سے پشت لگا کر اس طرح بیٹھ جاتے تھے جیسے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھا جاتا ہے۔ دو مرتبہ ان کے ساتھ دوڑ بھی لگائی ایک مرتبہ ہارے اور ایک مرتبہ جیتے۔ جیتنے کے بعد حضرت عائشہؓ سے فرمایا ''یہ اُس ہار کا بدلہ ہے''۔

آپ ﷺ اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، اور ان کی ضرویات کا خیال رکھتے تھے اور ان کو خوش کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے گھر پر خرچ کی جانے والی رقم کو سب سے اچھا مصرف قرار دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''ایک دینار وہ ہے جو تم نے خدا کی راہ میں خرچ کیا۔ ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی غلام کو آزاد

کرنے میں صرف کیا ہے۔ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی فقیر کو صدقہ میں دیا اور ایک دینار وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا۔ان میں سے سب سے زیادہ اجر وثواب اس دینار کے خرچ کرنے کا جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا ہے''۔

حضرت معاویہؓ نے ایک مرتبہ آپ ﷺ سے پوچھا کہ''بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس کا حق یہ کہ جب کھائے تو کھلائے اور جب پہنے تو اسے پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور اسے بد دعا نہ دے اور اگر اس سے ترک تعلق کرے تو صرف گھر میں کرے''۔

آپ ﷺ صرف خود ہی اہل وعیال کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے طرز عمل سے لوگوں کو اس بات ابھارتے کہ وہ لوگ بھی اہل وعیال کے ساتھ اچھا سلوک کیا کریں۔فرمان نبوی ہے''تم میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے معاملہ میں تم سب سے بہتر ہوں''۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار، پاکیزہ اور مثالی تھی۔حضور اقدس ﷺ بیویوں کے ساتھ اچھے سلوک کے ساتھ زندگی گزارتے۔اور ان کے حقوق کو کشادہ دلی سے ادا فرماتے تھے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

17.6.7 کفار ومشرکین اور دشمنوں کے ساتھ رویہ

عام طور پر انسان صرف ایسے لوگوں کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ کرتا ہے جو اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوں اور اس کی سوچ فکر سے متفق ہوں لیکن چونکہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے اور تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ ﷺ کی رحم وکرم کا ابر ہر شخص پر برستا تھا۔اس ابر رحمت سے صرف اپنے ہی سیراب نہیں ہوتے تھے بلکہ دشمن اور بیگانہ بھی نے اس سے مستفید ہوتے رہے تھے۔جیسا سلوک آپ ﷺ نے اپنے کٹر دشمنوں اور کفار ومشرکین کے ساتھ کیا تاریخ انسانی میں شاید اس کی کوئی نظیر نہ مل سکے۔

کفار ومشرکین کے ساتھ آپ ﷺ کا برتاؤ انتہائی لطف وکرم کا ہوتا تھا۔ہجرت سے پہلے مکہ میں بھی جن لوگوں سے آپ ﷺ کا واسطہ پڑا وہ آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق عالیہ کے قائل تھے۔کفار مکہ جیسے حکم بن عاص،عقبہ بن ابی معیط، ابولہب اور اس کی بیوی کا رویہ آپ ﷺ کے ساتھ نہایت ہی جارحانہ اور تضحیک آمیز ہوا کرتا تھا لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا بلکہ ان کا اس اعتبار سے خیال رکھا کہ وہ آپ ﷺ کے پڑوسی ہیں۔ابوجہل نے متعدد بار ناروا سلوک کیا لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی اس کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی بلکہ اس کے حق میں دعائے خیر کی کہ اللہ اس کے ذریعہ اسلام کو سربلند کرے لیکن چونکہ وہ سعادت حضرت عمرؓ کی نصیب میں تھی لہذا وہ نامراد ہی اس دنیا سے چلا گیا۔رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بار بار آپ ﷺ کو زک پہنچائی لیکن آپ ﷺ نے اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا حتی کہ اس کی وفات کے بعد اس کے کفن میں رکھے جانے کے لیے اپنی قمیص عنایت فرمائی۔

فتح مکہ کے بعد جب وفود کی آمد شروع ہوئی تو ان میں سے بعض ایسے تھے جن سے آپ ﷺ کو سخت تکلیف وایذا پہنچی تھی لیکن آپ ﷺ نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ ان کا ان کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ بسا اوقات مشرکین کے وفد کے سردار کے لیے چادر بچھا دیا کرتے تھے۔ انفرادی طور پر بھی کوئی کافر حاضر خدمت ہوتا تو آپ ﷺ اس سے محبت کا سلوک کرتے اور اس سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔

حضرت ابوسفیان کا شمار زمانہ کفر میں آپ ﷺ کے جانی دشمنوں میں ہوتا تھا لیکن جب فتح مکہ کے موقع پر انھیں گرفتار کر کے بارگاہ رسالت میں پیش کیا گیا تو وہ خوف کے مارے کانپ رہے تھے کہ آج میری خیر نہیں ہے لیکن آپ ﷺ ان کے ساتھ بہت لطف وکرم سے پیش آئے اور ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کی جس کی وجہ سے ان کا خوف دور ہوگیا اور انھیں اپنی جان بچنے کی امید ہوگئی۔ آپ ﷺ ان کے ساتھ صرف حسن سلوک سے سے ہی پیش نہیں آئے بلکہ ان پر لطف وکرم کی بارش کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جو بھی ان کے گھر میں پناہ لے گا وہ مامون ہوگا۔ آپ ﷺ کے اس طرز عمل نے انھیں آپ ﷺ کا گرویدہ بنا دیا اور آخر کار وہ اسلام کے حلقہ میں شامل ہوگئے۔ حضرت ابوسفیانؓ کے علاوہ حضرت کعب بن زہیر، ابوجہل کے لڑکے حضرت عکرمہؓ وغیرہ کے واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

عام کفار ومشرکین کے ساتھ آپ ﷺ کے حسن سلوک کی سب سے بڑی مثال فتح مکہ کے بعد ان کی عام معافی کا اعلان ہے جب کہ اس دن ان میں سے اکثر اس بات سے لرزاں وترساں تھے کہ آج محمد ﷺ ان سے گن گن کر بدلہ نکالیں گے لیکن آپ ﷺ نے ان کے خوف ودہشت کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ (آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ، تم سب کے سب آزاد ہو)۔

17.6.8 جانوروں کے ساتھ آپ ﷺ کا طرز عمل

آپ ﷺ کی شفقت ومحبت صرف انسانوں کے ساتھ نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ بے زبان جانوروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ حضرت شداد بن اوسؓ سے مروی ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے ہر چیز کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے اور نرم برتاؤ کرنے کا حکم دیا، اس لیے اگر قتل بھی کرو تو اچھی طرح کرو، ذبح کرو تو اچھی طرح کرو، تم میں سے جو ذبح کرنا چاہے وہ اپنی چھری پہلے تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام دے“۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ”ایک شخص نے ایک بکری زمین میں ذبح کرنے کے لیے لٹائی، اس کے بعد چھری تیز کرنا شروع کیا، رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا کیا تم اس کو دوبار مارنا چاہتے ہو، اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہیں کر لی“۔

آپ ﷺ صحابۂ کرام سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ جانوروں کو چارہ پانی دیا کریں، ان کو پریشان نہ کیا کریں اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ لادا کریں۔ آپ ﷺ نے جانوروں کی تکلیف کو دور کرنے، ان کو آرام پہنچانے کو اجر وثواب کا باعث اور تقرب اللہ کا ذریعہ قرار دیا ہے چنانچہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ کیا جانوروں کے معاملہ میں اجر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اس مخلوق میں جو تر وتازہ جگر رکھتی ہے، اجر ہے۔ جانوروں کے ساتھ ظلم وزیادتی کو اللہ کے عذاب کا سبب سمجھتے تھے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک انصاری نوجوان جو اپنے اونٹ کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کیا کرتا تھا، سے فرمایا کہ ”کیا تم اس

جانور کے معاملے میں جس کا مالک اللہ تعالی نے تم کو بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے، وہ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ تم اس کو تکلیف دیتے ہو اور اسے ہر وقت کام میں لگائے رہتے ہو''۔

معلومات کی جانچ:

1. بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟
2. جانوروں کے ساتھ آپ ﷺ کا کیا طرز عمل تھا؟

17.7 معاملات

آپ ﷺ تمام انسانیت کے لیے اسوہ ونمونہ بنا کر مبعوث کیے گئے تھے لہذا آپ ﷺ کی شخصیت کا ہر ہر پہلو اپنی جگہ کاملیت کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملات کے ضمن میں آپ ﷺ کا طرز عمل بھی اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاملات میں سچائی کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ ہمیشہ سچائی کو پسند کرتے تھے اور سچائی کو دل سے عزیز رکھتے تھے۔ نبوت سے پہلے بھی کسی نے آپ ﷺ کو جھوٹ بولتے ہوئے نہیں دیکھا اس لیے آپ ﷺ کا لقب ہی ''الصادق'' پڑ گیا تھا اور مکہ کا کوئی فرد یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ ﷺ جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی راست گوئی کا اعتراف سب کو تھا یہی وجہ ہے کہ جب ہرقل نے حضرت ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا کبھی تم نے ان کو جھوٹ بولتے ہوئے پایا تو انھوں نے نفی میں جواب دیا تھا۔ متعدد احادیث نبوی میں سچ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور جھوٹ کی خرابیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق مومن بزدل وبخیل ہوسکتا ہے لیکن جھوٹا نہیں ہوسکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جھوٹ کو منافق کی چار نشانیوں میں سے ایک نشانی بتایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جھوٹ بولنا کسی بھی حال میں جائز نہیں، نہ تو سنجیدگی کے ساتھ اور نہ ہی مذاق کے طور پر۔ یہ بھی جائز نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بچہ سے کسی چیز کے دینے کا وعدہ کرے اور پھر پورا نہ کرے''۔

17.7.1 ایفائے عہد

معاملات میں ایفائے عہد کی بہت اہمیت ہے۔ اگر آپ ﷺ کسی سے کوئی وعدہ کرتے تو اسے ضرور پورا کرتے۔ سیرت طیبہ کے واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں جس کے مطابق آپ ﷺ نے کسی سے کوئی وعدہ کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کی ہو۔ آپ ﷺ اپنے رفیق تجارت عبداللہ بن العمساء کا ایک ہی جگہ تین دن تک انتظار کرتے رہے کیونکہ وہ آپ ﷺ سے یہ کہہ کر گئے تھے میں ابھی واپس آتا ہوں، لیکن دوسرے کاموں کی وجہ سے بھول گئے کہ وہ آپ ﷺ سے کیا کہہ کر آئے ہیں۔ تیسرے روز جب ان کا اتفاق سے ادھر گذر ہوا تو انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ آپ ﷺ کو جہاں چھوڑ کر گئے تھے وہیں کھڑے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ آپ ﷺ نے فرمایا ''عبداللہ تم نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی''۔

ایفائے عہد کے ضمن میں معاہدات کی پابندی بھی آتی ہے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان معاہدات خاص طور سے اپنے دشمنوں کے حوالے سے، پورا نہیں کرتا لیکن آپ ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو بھی بہت روشن ہے کہ آپ ﷺ کا واسطہ کسی فرد سے ہو یا

قبیلہ سے، دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے، آپ ﷺ نے مکمل طور پر معاہدات کا احترام کیا۔ اس ضمن میں صلح حدیبیہ کی مثال سب سے واضح ہے معاہدہ کی تکمیل سے پہلے ہی حضرت ابوجندل تشریف لائے لیکن آپ ﷺ نے انھیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ''ابوجندل صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کر سکتے، اللہ عنقریب تمہارے لیے کوئی سبیل پیدا کرے گا''۔

17.7.2 امانت ودیانت

امانت ودیانت کا معاملات کی بنیاد اوران کی کامیابی کی شرط ہے۔ اگر انسان امین ودیانت دار نہ ہوا سے معاشرہ میں کبھی بھی اچھا مقام ومرتبہ نہیں مل سکتا۔ آپ ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو بھی بہت روشن وتابناک ہے چنانچہ عہد مکی میں ہی اپنی امانت ودیانت کی وجہ سے ''الامین'' کے لقب سے سرفراز ہو چکے تھے۔ جب آپ ﷺ نے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا تو محنت اور دیانت داری آپ ﷺ کے کاروبار کی بنیاد تھی لہذا تھوڑے ہی عرصہ میں آپ ﷺ کی ساکھ بازار میں جم گئی۔ آپ ﷺ کا نام نامی ہی امانت، دیانت اور حسن معاملگی کا ضامن تھا۔ آپ ﷺ کی امانت ودیانت کی خبر سن کر ہی حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو اپنے سامان تجارت کے ساتھ بھیجا تھا جن سے انھیں توقع سے زیادہ نفع ہوا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کے بھی تجارت کے سلسلہ میں آپ ﷺ سے واسطہ پڑا تھا وہ آپ ﷺ کے حسن معاملہ اور امانت ودیانت کی تعریف کیا کرتے تھے کاروبار میں عام طور سے لوگ جھوٹ بولنا اور آنکھ میں دھول جھونکنا جائز سمجھتے ہیں لیکن اللہ کے رسول نے بتایا کہ یہ طریقہ اللہ کے غضب کو بھڑکانے والا ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے لوگو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو اور روزی کی تلاش غلط طریقہ سے مت کرو اس لیے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک اسے پورا رزق نہ مل جائے۔ اگرچہ اس کے ملنے میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے۔ تم اللہ سے ڈرتے رہنا اور روزی کی تلاش میں اچھا طریقہ اختیار کرنا۔ حلال روزی حاصل کرو اور حرام روزی کے قریب نہ جاؤ''۔

آپ ﷺ نے تجارت اور سوداگری میں دھوکہ دہی اور فریب کرنے سے منع فرمایا اور دھوکہ دینے والوں کے متعلق فرمایا ''جو دھوکہ سے کام لے وہ ہم میں سے نہیں''۔ آپ ﷺ نے ہر حال میں حرام کمائی سے بچنے کی تلقین کی اور حلال روزی کمانے پر ابھارا ہے۔ حرام کمائی کو موجب عذاب قرار دیا۔ ارشاد نبوی ہے ''کوئی بندہ حرام مال کمائے، پھر اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرے تو یہ صدقہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر اپنی ذات اور گھر والوں پر خرچ کرے گا تو برکت سے خالی ہوگا اور اگر وہ اسے چھوڑ کر مرا تو وہ اس کے جہنم کے سفر میں زادراہ بنے گا''۔

17.7.3 مزدورں کی اجرت

معاملات کے ضمن میں مزدوروں کو ان کی اجرت وقت پر دینا۔ انھیں پریشان نہ کرنا، ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لینا اور ان کی عزت نفس وغیرہ کا خیال رکھنا شامل ہے۔ احادیث نبوی میں مزدور کی کمائی کو بہترین کمائی قرار دیا گیا ہے اور اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت کی ادائیگی پر لوگوں کو ابھارا گیا ہے۔

17.7.4 قرض

آپ ﷺ نے معاملات میں خاص طور سے قرض کے سلسلہ میں نرمی کا رویہ اختیار کرنے پر بھی زور دیا۔ارشادنبوی ہے’’خدا اس شخص پر رحم فرمائے جوخرید وفروخت اور تقاضہ کرنے میں نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لیتا ہے‘‘۔ایک اور موقع پر فرمایا’’جس شخص کو یہ بات پسند ہوکہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن غم وگھٹن سے بچائے تو اسے چاہیے کہ تنگدست قرض دار کو مہلت دے یا قرض کا بوجھ اس کے اوپر سے اتار دے‘‘۔آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی جب قرض ادا کرتے تو جس قرض سے زیادہ ادا کرتے تھے اور ادائیگی کے بعد دعا بھی کرتے تھے کہ خدایا اس کے اہل وعیال ومال ودولت میں برکت دے۔آپ ﷺ قرض کو اچھی طرح سے ادا کرنے پر لوگوں کو آمادہ کیا کرتے تھے۔ارشادنبوی ہے’’تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو بہترین طریقے پر قرض ادا کرے‘‘۔

17.8 خلاصہ

تمام انبیاء ورسل ابنائے زمانہ میں بہترین اخلاق وکردار کے حامل ہوتے ہیں۔ان کو جب وحی کی تعلیم ملتی ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بلندتر درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں اور قول وفعل کا وہ بہترین ماڈل پیش کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہوتا ہے۔اسی لیے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ رسول کے پیش کردہ نمونہ کو اپنے لیے معیار بنائیں۔یہ نمونہ اسوۂ حسنہ کہلاتا ہے۔

آپ ﷺ کی زندگی تمام بنی نوع انسان خاص طور سے مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے جس کی پیروی کرکے انسان دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوسکتا ہے۔آپ ﷺ کی زندگی اس لیے اسوہ قرار دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کا عملی نمونہ ہے گویا آپ ﷺ کی اتباع وپیروی کرنا قرآن کی اتباع وپیروی کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام انبیاء کو عمدہ واچھے اخلاق سے متصف کرکے مبعوث فرماتا ہے۔چونکہ آپ ﷺ آخری نبی تھے لہذا آپ ﷺ کو تمام انبیاء کے اخلاق وعادات کا مرکب بنا کر مبعوث کیا گیا اپنی اس صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔آپ ﷺ کی پوری زندگی سراسر قرآن کی عملی تفسیر ہے چنانچہ ایک طرف قرآن اہل ایمان کو عقائد ونظریات اور اصول وکلیات کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری طرف آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے عملی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہو اور دنیائے انسانیت کے لیے ایک جامع ،مکمل اور قابل تقلید نمونہ کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

آپ ﷺ کی زندگی تمام لوگوں کے لیے اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ بچے ہوں یا نوجوان ،معلم ہوں یا متعلم ،مزدور ہوں یا تاجر ،شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ،صاحب اولاد ہوں یا بے اولاد ،تحریک اسلامی کے داعی ہوں یا واعظ وخطیب ،قائد ورہنما ہوں یا حاکم وفرمانروا ،حاکم ہوں یا محکوم ،جنگ میں زخم خوردہ ہوں یا حملہ آور ،مطیع ہوں یا جن کی اطاعت کی جائے ،مقیم ہوں یا

مسافر، اکیلے ہوں یا باجماعت۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی حیات پاک نوع انسانی کے تمام طبقوں کے لیے تا قیامت ایک بہترین نمونہ ہے۔

حضور ﷺ کی عادات واطوار، اخلاق حسنہ، اہل خانہ، بچوں، بڑوں، غلاموں، جانوروں، صحابہ کرام اور مشرکین وکفار اور دشمنوں کے ساتھ آپ ﷺ کی حسن معاشرت، تجارت اور دیگر دنیاوی معاملات میں آپ ﷺ کا طرز عمل سب کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اور آپ ﷺ کی جانب سے متعین کردہ رہنما خطوط کی پیروی کر کے پوری انسانیت کامیاب وکامران ہوسکتی ہے۔

آپ ﷺ کی عادات واطوار پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے اور زندگی کے مختلف رنگ وروپ کے اثرات آپ ﷺ پر مرتب ہوتے تھے۔

آپ ﷺ اخلاق عالیہ کے نمونہ تھے صحابہ کرام، ازواج مطہرات نے آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کا ذکر عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ آپ ﷺ صرف خود ہی اخلاق عالیہ کے پیکر نہیں تھے بلکہ آپ ﷺ نے امت کے افراد کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ بھی اخلاق وکردار کا پیکر بنیں۔ ارشاد نبوی ہے ''کوئی عمل میزان عمل میں حسن خلق سے زیادہ وزنی نہیں ہوگا''۔ دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''۔

زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن میں ماں باپ، بھائی بہن، اولاد، میاں بیوی، پاس پڑوس اور دیگر طبقات کے چھوٹے بڑے لوگ شامل ہیں۔ ان سے اور معاشرہ کے مختلف اشخاص وافراد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آنے کو حسن معاشرت کہتے ہیں۔ زندگی کے دیگر معاملات کی طرح آپ ﷺ سیرت طیبہ، حسن معاشرت کی عملی تصویر ہے۔ آپ ﷺ کا جس سے بھی تعلق ہوا اس کو اچھی طرح سے نبھایا، اس سے بہتر سے بہتر سلوک کیا اور اپنے اصحاب کرام کو بھی اس بات کی تلقین کی کہ وہ باہم تعلقات کا لحاظ رکھیں تا کہ ایک صالح وصحت مند معاشرہ پروان چڑھ سکے۔

آپ ﷺ تمام انسانیت کے لیے اسوہ ونمونہ بنا کر مبعوث کیے گئے تھے لہذا آپ ﷺ کی شخصیت کا ہر ہر پہلو اپنی جگہ کاملیت کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملات کے ضمن میں آپ ﷺ کا طرز عمل بھی اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاملات کے سلسلہ میں سچائی، ایفائے عہد، معاہدات کی پابندی، امانت ودیانت کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے ہر پہلو سے یہ بات عیاں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں مذکورہ بالا امور کی پوری پوری رعایت رکھی۔ آپ ﷺ نے تجارت اور سوداگری میں دھوکہ دہی اور فریب کرنے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے ہر حال میں حرام کمائی سے بچنے کی تلقین کی اور حلال روزی کمانے پر ابھارا۔ احادیث نبوی میں مزدور کی کمائی کو بہترین مزدوری قرار دیا گیا ہے اور اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت کی ادائیگی پر ابھارا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے معاملات میں خاص طور سے قرض کے سلسلہ میں نرمی کا رویہ اختیار کرنے پر بھی زور دیا۔ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ جب قرض ادا کرتے تھے تو زیادہ دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ قرض کو اچھی طرح سے ادا کرنے پر لوگوں کو آمادہ کیا کرتے تھے۔ ارشاد نبوی ہے ''تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو بہترین طریقے پر قرض ادا کرے''۔

17.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں ایک نوٹ لکھیں۔
2. بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟
3. غلاموں کے ساتھ آپ ﷺ کے طرزِ عمل پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. آپ ﷺ کی عادات و اطوار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟
2. آپ ﷺ کے اسوہ اور اس کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھئے۔
3. حسنِ معاشرت کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں؟ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے بارے میں تحریر فرمائیں۔
4. حسنِ معاملہ کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں؟ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے بارے میں تحریر فرمائیں۔
5. کفار و مشرکین کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟
6. رشتہ دار اور پڑوسیوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟

17.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. سیرت النبی : علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ
2. رحمۃ للعالمین : قاضی سلیمان منصور پوری
3. نبی رحمت : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ
4. اصح السیر : مولانا عبدالرؤف دانا پوری
5. اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ سیرت و مادہ محمد ﷺ لاہور
6. اسوۂ حسنہ قرآن کی روشنی میں : محمد شریف قاضی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
7. معاشرۃ النبی ﷺ : متین طارق باغپتی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
8. عصر حاضر میں اسوۂ نبوی کی معنویت : پروفیسر سعود عالم قاسمی، علی گڑھ
9. نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور

بلاک:4 خلافت راشدہ

فہرست

اکائی نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
.18	حضرت ابوبکر صدیقؓ	387-415
.19	حضرت عمر ابن خطابؓ	416-441
.20	حضرت عثمان ابن عفانؓ	442-465
.21	حضرت علی ابن ابی طالبؓ	466-484

اکائی 18 : حضرت ابوبکر صدیقؓ

اکائی کے اجزاء

18.1 مقصد

18.2 تمہید

18.3 ذاتی احوال

18.4 اسلام کے بعد مکی زندگی

18.5 حضرت ابوبکر مدینے میں

18.6 خلافت صدیقی

18.7 نظم ونسق

18.8 علم وفضل

18.9 خلاصہ

18.10 نمونے کے امتحانی سوالات

18.11 فرہنگ

18.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

18.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوانح اور اسلام کے لئے ان کی خدمات اور قربانیوں سے طالبان علم کو مطلع کرنا ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کی صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں گے بلکہ اس مشکل دور میں حضرت ابوبکرؓ کے اس عظیم کردار کو بھی جان سکیں گے۔ جس نے امت مرحومہ کی کشتی کو بغاوت وارتداد کے طوفان سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا۔

18.2 تمہید

40 ؁ میلادی مطابق 610ء کو آفتاب رسالت فاران کی چوٹی سے طلوع ہوا۔ اور اس کی کرنیں کفار مکہ کے دلوں کے

دروازوں پر دستک دینے لگیں۔لیکن انھوں نے اپنے دلوں کو روشن کرنے کے بجائے آفتاب ہدایت کی روشنی کو اپنے ظلم وستم کے غبار سے ڈھک دینے کی کوشش شروع کر دیں۔اور ایذا درسانی کے ایسے لا تناہی سلسلے کا آغاز کیا جس نے مکہ کی زمین کو اپنی وسعتوں کے باوجود اللہ کے رسول اور ان کے ماننے والوں پر تنگ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدینہ کی شکل میں نہ صرف ایک پناہ گاہ مہیا کی بلکہ اسے اسلام کا ایسا مرکز بنا دیا جہاں سے توحید کی روشنی پوری دنیا میں پھیلی۔

دعوت اسلامی کا پھیلاؤ راور اسلامی حدود کی توسیع جس قدر سرعت اور تیزی سے ہوئی وہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے جو اللہ کی رحمت' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت اور اصحاب کی بے مثال محنت وشجاعت سے وجود میں آیا۔رسول اللہ کے پاکباز صحابہ انسانی تاریخ کی ایک ایسی جماعت تھے جس سے بہتر رسول جماعت چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا۔اور خلفائے راشدین اس جماعت میں سب سے نمایاں تھے۔

18.3 ذاتی احوال

18.3.1 نام ونسب

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ' تین سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ایک' رفیق ہجرت' یار غار' وزیر ومشیر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم' ان کی حیات طیبہ میں مسلمانوں کی امامت میں ان کی نیابت کرنے والے' اول خلیفہ ٔراشد اور اسلامیان اہل سنت کے نزدیک افضل البشر بعد الانبیاء ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق کا نام عبد اللہ اور کنیت ابو بکر تھی۔آپ کے والد کا نام عثمان اور ان کی کنیت ابو قحافہ تھی۔آپ کی والدہ کا نام سلمی اور ان کی کنیت امّ الخیر تھی۔مرہ بن کعب پر جا کر آپ کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ان کا سلسلہ نسب ہے: ابو بکر بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ۔جد خامس تمیم بن مرہ کے نام پر آپ کے قبیلے کا نام قبیلۂ تمیم بن مرہ تھا۔یہ قبیلہ قریش کے اہم قبیلوں میں سے تھا۔دیت اور خون بہا جمع کرنا اس قبیلے کی ذمہ داری تھی چنانچہ بڑے ہونے کے بعد حضرت ابو بکر نے بھی ایک عرصہ تک اس ذمہ داری کو ادا کیا۔آپ کی والدہ ام الخیر سلمی اور ایک دوسری روایت کے مطابق ام الخیر لیلی کا نسب بھی وہی ہے جو آپ کے والد کا ہے کیونکہ دونوں باہم عم زاد تھے۔

آپ کا نام عبد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ہے کیونکہ جاہلیت میں آپ کا نام عبد الکعبہ تھا جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کے یہاں اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔اس لئے آپکی والدہ نے یہ نذر مانی کی اگر آپ کی کوئی اولاد نرینہ زندہ رہی تو وہ اسے کعبہ معظّمہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گی چنانچہ جب حضرت ابو بکر پیدا ہوئے اور زندہ سلامت رہے تو ان کی والدہ نے اپنی نذر کی پاسداری میں ان کا نام عبد الکعبہ رکھا۔اسلام کے بعد اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشرکانہ نام کو تبدیل کر دیا۔لیکن نام کے بجائے آپ کو کنیت سے شہرت حاصل ہوئی

18.3.2 کنیت، لقب اور حلیہ

مؤرخین نے آپ کی کنیت کی متعدد توجیہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ آپ نے اسلام لانے میں سبقت فرمائی اور کسی چیز کی طرف سبقت کے لئے ''بکر الی'' لہٰذا آپ کی یہ کنیت پڑی۔ دوسری توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ اونٹوں کی افزائش و پرورش اور ان کی بیماریوں اور علاج کے فن میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اور چونکہ عربی زبان میں ''بکر'' جوان اونٹ کو کہتے ہیں اس لئے آپ کی یہ کنیت پڑی، اور اس توجیہ کے پیش نظر ابوبکرؓ کا معنی ہوا ''اونٹوں کا باپ''۔

آپ کا سب سے مشہور لقب صدیق ہے۔ آپ کا یہ لقب واقعہ اسراء و معراج کے بعد پڑا جب کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی ادنیٰ تردد کے بغیر تصدیق فرمائی اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب پوری مشرک سوسائٹی آپ کی تکذیب کر رہی تھی بلکہ اس واقعے کو مزاح اور استہزاء کا موضوع بنائے ہوئے تھی۔ امام حاکم کی مستدرک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ مشرکین مکہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور بولے کہ: ''کیا تمھیں اس بات کی خبر ہے کہ تمہارے صاحب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ گمان ہے کہ وہ رات میں بیت المقدس کی سیر کر کے آئے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا: کیا انھوں نے ایسا کہا ہے؟ مشرکین نے کہا ہاں، تو آپ نے فرمایا کہ میں تو اس سے زیادہ دور کی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں۔ صبح و شام آسمان کی خبر کی تصدیق کرتا ہوں۔ اسی سبب سے آپ کا لقب صدیق پڑا۔

آپ کا دوسرا مشہور لقب عتیق ہے۔ ابن جوزی نے صفة الصفوة میں اس لقب کے بارے میں تین قول نقل کئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دیکھا اور فرمایا: ''هذا عتيق الله من النار'' یعنی یہ آگ سے اللہ کا آزاد کردہ ہے۔ دوسرا قول یہ کہ یہ ان کی ماں کا دیا ہوا لقب ہے کیونکہ یہ ان کی پہلی اولاد تھی جس نے موت سے آزادی پائی تھی۔ تیسرا قول ہے کہ آپ کی خوبصورتی اور جمال کے سبب آپ کا یہ لقب پڑا۔ آپ گورے چٹے اور دبلے پتلے تھے، آپ کے چہرے پر گوشت بہت کم تھا، آپ کی پیشانی بہت بلند اور چوڑی تھی۔ آپ کے بال گھنگھرالے تھے۔ گالوں پر ریش کے بال قدرے ہلکے تھے اور آنکھیں بے حد گہری تھیں۔ آپ مہندی اور کَتم (ایک قسم کی نبات) سے خضاب کرتے تھے۔ آپ کا یہ حلیہ آپ کو متانت اور وقار عطا کرتا تھا۔

18.3.3 خاندان

آپ کا خاندان قبیلۂ تمیم بن مرہ کا معزز ترین خاندان تھا۔ آپ کے قبیلے کا منصب، خون بہا اور دیت اکٹھا کرنا، آپ ہی کے خاندان میں تھا۔ چنانچہ آپ کے بڑے ہونے پر یہ منصب آپ کو وراثت میں ملا اور اس کے تحت قریش کے مختلف قبائل اور خاندانوں کے خون بہا اور دیت سے متعلق مقدمات آپ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ آپ کا خاندان بھی قریش کے دوسرے سربرآوردہ خاندانوں کی طرح، شجاعت، مروت ایفائے عہد اور مہمان نوازی جیسے صفات عالیہ سے متصف تھا۔

آپ کے والد ابوقحافہ عثمان بن عامر کو مکہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور قریش کے باوقار اور صاحب عزت لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد آپ اسلام لائے، اور 16ھ میں عہد فاروقی میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 97 سال تھی۔

آپ کی والدہ ام الخیر سلمی بنت صخر دعوت کے ابتدائی عہد ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئیں ۔ حضرت ابوبکر اہل مکہ کو عموماً اور بنوتمیم اور اپنے اہل خانہ کو خصوصاً دعوت اسلام دیا کرتے تھے۔ آپ کے والد اپنے آبائی دین پر سختی سے قائم رہے۔ لیکن ماں پر ان کا اصرار کام کر گیا چنانچہ ایک دن وہ انھیں لے کر ارقم ابن ابی ارقم کے مکان پر لائے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور وہ اسلام لے آئیں۔ آپ کی والدہ کو بھی لمبی عمر ملی اور خلافت صدیق کے اخیر تک زندہ رہیں۔

18.3.4 ولادت، بچپن اور جوانی

حضرت ابوبکر کی ولادت واقعہ فیل کے تقریباً تین سال بعد مکہ میں ہوئی۔ رؤسائے قریش کے بچوں کی طرح آپ کی پرورش ہوئی آپ کا بچپن مکہ کی گلیوں میں گزرا۔ اس عہد کی تفصیلات کتابوں میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ آپ بچپن اور جوانی دونوں میں اپنے ہم عمروں سے مختلف رہے۔ عنفوان شباب سے ہی آپ فکر وعمل میں اپنے معاصرین اور رفقاء سے ممتاز و منفرد نظر آنے لگے۔ وہ بیشتر مشرکانہ اعمال و رسوم سے علاحدہ رہتے تھے۔ آپ کی فطرت سلیمہ ان افکار و معتقدات کو قبول کرنے سے انکار کرتی تھی۔ اس کی ایک مثال شراب ہے، تمام اہل مکہ، بلا اختلاف خرد و کلاں اور بلا امتیاز مرد و زن، جس کے والہ و شیدا تھے۔ لیکن حضرت صدیق نے کبھی شراب کو چکھا تک نہیں۔ جاہلیت میں بھی پاکیزگی کی زندگی گزاری اور اخلاقی طور پر ایک انتہائی پست معاشرے میں جوانی کے ایام عفت و پارسائی کے ساتھ گزارے۔

18.3.5 ازواج واولاد

آپ کی پہلی شادی قتیلہ یا قتلہ بنت عبدالعزی سے ہوئی۔ مکے میں آپ کی دوسری شادی امّ رومان بنت عامر سے ہوئی۔ تیسری شادی آپ نے مدینے میں حبیبہ بنت خارجہ سے کی۔ چوتھی اور آخری شادی آپ نے اسماء بنت عمیس سے کی۔ قتیلہ بنت عبد العزی سے آپ کی دو اولادتھیں۔ عبداللہ اور اسماء رضی اللہ عنہ ام رومان سے عبدالرحمان اور عائشہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئے۔ اسماء سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے اور حبیبہ سے ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

18.3.6 پیشہ اور معاش

عرب کی تجارت پر قریش کا کنٹرول تھا بلکہ تجارت شرقیہ یعنی یورپی ممالک اور جنوب مشرق ایشیاء کے درمیان ہونے والی تجارت کا بڑی حد تک دار و مدار ان ہی قریش تاجرین پر تھا۔ جاڑوں میں یہ لوگ جنوب کا سفر کرتے تھے جہاں یمن اور عمان کی بندرگاہوں سے ہندوستان، سری لنکا اور چین تک سے آئے ہوئے سامان کو خریدتے تھے پھر انھیں مکہ لاتے تھے اور گرمیوں میں اسے شام کی بندرگاہ انطاکیہ وغیرہ لے جاتے اور مغربی تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ اور پھر وہاں سے یورپ سے لائے گئے سامان کو لے کر آتے تھے اور گرمیوں میں یمن وعمان کی بندرگاہوں پر لے جا کر جنوبی مشرق سے آنے والے تاجروں سے فروخت کرتے تھے۔ جاڑے اور گرمی میں ہونے والے قریش کے ان اسفار کا ذکر قرآن کریم کی سورۂ قریش میں وارد ہوا ہے۔ شہر مکہ کو ''یجبیٰ الیه ثمرات کل شیئی ءٍ رزقا'' (القصص:157) کا مصداق بنانے میں قریش کے ان دونوں اسفار کا نمایاں کردار تھا۔

قریش کے دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ نے بھی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اور کپڑے کی تجارت شروع کی پیشہ ورانہ مہارت کے علاوہ آپ کے حسن کردار وعمل نے آپ کو جلد ہی ایک نمایاں مقام تک پہنچا دیا اور آپ کا شمار قریش کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔ اسلام کے بعد آپ کی تجارت جاری وساری رہی۔ اور اس تجارت کا فائدہ ان کے اہل عیال کے ساتھ اسلام کو بھی پہنچتا رہا۔ امام احمد حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کسی مال نے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر کے مال نے پہنچایا ہے۔ جس وقت آپ نے اسلام قبول کیا تھا اس وقت آپ کے پاس چالیس ہزار درہم کی خطیر رقم تھی اور ایک بڑا کاروبار تھا۔ لیکن آپ نے یہ سب تبلیغ ودعوت اور کمزور مسلمانوں کی حمایت اور گلوخلاصی میں صرف کردی اور جب آپ مکہ سے ہجرت کے لئے نکلے تو اس وقت آپ کے پاس صرف پانچ ہزار درہم باقی بچے تھے۔ ہجرت کے بعد مکان بدلا مگر معاش حسب سابق رہا۔ تجارتی غرض سے آپ نے متعدد اسفار بھی کئے۔ ان کا آخری تجارتی سفر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت سے ایک سال پہلے پیش آیا جس میں آپ شام کے شہر بُصریٰ تشریف لے گئے تھے۔ خلافت کے بعد بھی آپ نے اس مشغلے کو جاری وساری رکھنا چاہا لیکن صحابہ کے مشورے سے اسے ترک کر دیا اور ان کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

18.3.7 اخلاق وکردار

حضرت ابوبکر کی شخصیت۔ جاہلیت ہو یا اسلام۔ ایک اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کی حامل شخصیت تھی۔ اسلام سے قبل بھی پورا مکہ آپ کے اخلاق وکردار کا معترف تھا۔ اور اہل مکہ آپ کی ذہانت وفطانت، قوت فیصلہ اور صحت رائے، سچائی وحق گوئی اور راست بازی کے مداح وقدرداں تھے۔ اور ان صفات کے سبب بقول ابن ہشام: ''......وہ اپنی قوم میں بہت ہردل عزیز تھے۔ علم انساب کے بڑے ماہر تھے۔ قریش کے جملہ خاندانوں کے نسب انھیں زبانی یاد تھے۔ وہ تمام قبیلوں کے فضائل ونقائص سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس وصف میں قریش کا کوئی فرد آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ با اخلاق' ملنسار اور دیانت دار تاجر تھے۔ قریش کے تمام لوگ آپ کے کمال اخلاق اور حسن سلوک ومعاملت کے معترف تھے اور ان ہی اوصاف کے سبب ان سے محبت کرتے تھے۔''

آپ ایام جاہلیت میں بھی فکری اور عملی برائیوں سے دور رہے۔ وسیع الاخلاق اور کثیر الاحباب ہونے کے باوجود بھی صرف نیکیوں میں اپنے احباب ومتعلقین کے شریک ہوتے تھے۔ تجارت، معاصرت، ہمسائیگی، قریش کے عادات ومعتقدات سے بیزاری اور حسن اخلاق وکردار جیسی صفتیں وہ مشترکہ امور اور خصوصیات تھیں جو آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑتی تھیں۔ اور مشہور روایتوں کے مطابق بعثت سے قبل ہی آپ کے تعلقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استوار ہوگئے تھے۔ بلکہ ایسی بھی روایتیں ملتی ہیں جن کے مطابق آپ کو بچپن سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں حضرت ابوبکرؓ نے کئی تجارتی اسفار بھی کئے۔

غرباء ومساکین کی امداد، یتیموں کی غمخواری، حاجتمندوں کی دستگیری، بیماروں کی مزاج پرسی وتیمارداری اور مظلوموں کی نصرت وحمایت، حق گوئی اور بیباکی وغیرہ آپ کے نمایاں اخلاقی اوصاف تھے۔ ان اوصاف نے عہد جاہلیت میں آپ کو معاشرے

میں ایک بلند مقام دلایا اور بعد بعثت یہ اسلام کی نشر واشاعت کا باعث بنے۔ یہ مظلوموں کی مدد کرنے کا آپ کا جذبہ ہی تھا جس نے آپ کو حضرت بلال، عامر بن فہیرہ، نزیرہ نہذیہ وغیرہ کئی غلام اور باندیوں کو ان کے ظالم آقاؤں کے پنجۂ ظلم سے نکالنے پر آمادہ کیا۔

آپ کا حسن اخلاق وکردار مکے اور قریش کے درمیان مشہور ومعروف تھا بلکہ قرب وجوار کے قبائل بھی اس سے واقف تھے۔ جس کا ثبوت ابن الدغنہ کے ذریعے آپ کو امان دئے جانے والے واقعے میں لکھا ہے۔ جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کے کتاب کفالت میں ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اہل مکہ کی ایذا رسانی کے سبب جتنہ ہجرت کرنے کے لئے رخت سفر باندھا اور مکہ سے نکل کر بَرک الغماد پہنچے تو وہاں کے قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے آپ کی ملاقات ہوئی' آپ کے احوال وارادے کو سننے کے بعد ابن الدغنہ نے کہا کہ:

> '' آپ جیسا شخص نہ ترک وطن کرتا ہے اور نہ جلا وطن کیا جاتا ہے۔ آپ تہی دستوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خاطر داری کرتے ہیں۔ مصیبت کے ماروں کی مدد کرتے ہیں''۔

بعد ازیں ابن الدغنہ حضرت ابوبکرؓ کو مکہ واپس لائے انھیں امان دینے کا اعلان کیا اور جب اہل مکہ کے ساتھ ان کی مذکورہ بالا صفات کا ذکر کیا تو کسی نے بھی ان کی تکذیب نہیں کی۔ آپ کی رحم دلی اور عفد ورگذر کا ایک مظاہرہ غزوۂ بدر کے بعد ہوا جب آپ نے مشرکین قیدیوں سے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔

18.4 اسلام کے بعد کی زندگی

18.4.1 قبول اسلام

مؤرخین نے حضرت ابوبکرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں کئی قصے ذکر کئے ہیں جن میں سے زیادہ تر فرضی کہانیوں پر مبنی ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر اور اہل مکہ کی روش سے بیزار اور نالاں تھے۔ وہ قبولیت حق کی صلاحیت سے پہلے ہی سے متصف تھے چنانچہ جیسے ہی آفتاب رسالت طلوع ہوا' وہ آپ کے قلب ونظر کے تمام دریچوں کو منور کر گیا۔ آپ نے نہ صرف بلاکسی تردد کے اسلام قبول کیا بلکہ فوراً ہی پوری شد ومد کے ساتھ اسلام کی نشر واشاعت میں لگ گئے۔ آپ کی پرخلوص دعوت کی بنیاد پر قریش کے کئی باحیثیت اور معزز افراد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جن میں سرفہرست حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبد الرحمان بن عوف، حضرت طلحہ بن عبد اللہ، حضرت ابوعبیدہ، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت ابوسلمہ وغیرہ ہیں۔

متعدد ایسی روایتیں ہیں جن کے مطابق آپ مطلقاً سب سے پہلے اسلام لائے۔ چنانچہ امام شعبی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ' سے پوچھا گیا کہ سب سے پہلے کون اسلام لایا؟ تو آپ نے فرمایا کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ' کیا تم نے حسان بن ثابتؓ کا شعر نہیں سنا؟

والثانی التالی المحمود شیمته

واَول الناس منهم صدق الرسلا

(وہی ثانی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد آتے ہیں اور قابل تعریف عادت والے ہیں اور وہی پہلے انسان ہیں جنھوں نے رسولوں کی تصدیق کی ہے)

اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ افراد خانہ کے علاوہ ایمان لانے والوں میں سے پہلے ہیں کیونکہ ایسی کئی صحیح روایتیں بھی ہیں جن کے مطابق حضرت علیؓ حضرت خدیجہؓ یا حضرت زید بن حارثہؓ سب سے پہلے ایمان لائے۔

بعض علماء نے ان روایتوں میں یوں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ خواتین میں سیدہ خدیجہؓ بچوں میں حضرت علیؓ غلاموں میں حضرت زیدؓ اور آزاد مردوں میں حضرت ابوبکرؓ سب سے پہلے ایمان لائے اس تطبیق کو بے حد قبولیت حاصل ہوئی اور عام طور پر اسے قبول کرلیا گیا۔

عام ازیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت صحیح ہے یا دوسری روایتیں، حضرت حسانؓ کی بیان کردہ اولیت حقیقی ہے یا غیر حقیقی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کے قبول اسلام کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ آپ سے پہلے یا آپ کے ساتھ جو لوگ بھی ایمان لائے یا تو وہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے افراد خانہ میں سے تھے یا پھر سماج کے دبے کچلے لوگوں میں سے تھے۔ آپ پہلے فرد ہیں جنھوں نے اپنی سماجی اور اقتصادی حیثیت کو پوری طرح داؤ پر لگا کر اسلام قبول کیا۔ تمام تر خطرات کو نظر انداز کر کے دین جدید کو قبول کیا اور بغیر کسی ادنی تردد کے کیا۔ جان و مال اور عزت و آبرو سب کو خطرے میں ڈال کر کیا۔ آپ ایک بلند سماجی حیثیت رکھتے تھے اور قبیلے کے متمول ترین افراد میں سے ایک تھے۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر، شریک عمل اور محرم راز تھے۔ لہٰذا آپ کا ایمان لانا اسلام کی صداقت وحقانیت کی دلیل بن گیا اور درجنوں ذہنوں کو اسلام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔ اسلام کی حقانیت کے سوا آپ کے اسلام کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

18.4.2 ابتلاء وآزمائش

حضرت ابوبکر قبول اسلام کے بعد تقریباً تیرہ سال مکے میں رہے اور یہ پورا عرصہ ابتلاء و آزمائش سے بھرا تھا۔ اپنی ذاتی شخصیت اور خاندانی وجاہت کے باوجود آپ کو بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ صرف آپ کو اپنی سماجی حیثیت کے زیاں اور تجارت کے خسارے کو برداشت کرنا پڑا بلکہ آپ جسمانی اذیتوں کا بھی شکار ہوئے چنانچہ جب طلحہ بن عبداللہ آپ کی تبلیغی مساعی کے سبب حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو اُن کے چچا نوفل بن خویلد نے طلحہ کے ساتھ آپ کو بھی جسمانی اذیت دی۔ مقاطعہ کی کوششیں، سماجی و کاروباری حصار، سب وشتم اور پھبتیاں اور دشنام طرازیاں اور نہ جانے کیسی کیسی نفسانی اذیتوں کا ہمہ وقت سامنا رہتا تھا۔ جب ان اذیتوں کا سلسلہ دراز تر ہوا تو آپ نے مکہ چھوڑ دینے کا قصد کیا اور حبشہ کے لئے عازم سفر ہوئے مگر ابن دغنہ کی طرف سے امان دئے جانے کے بعد پھر مکہ واپس تشریف لائے لیکن کچھ عرصہ بعد ظلم وستم کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا یہاں تک کہ بیعت عقبہ کے بعد جب مسلمان مدینے کی جانب ہجرت کرنے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدینہ ہجرت کی خواہش کا

اظہار کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں منع کیا اور فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ ہجرت کے لئے تمھارا کوئی ساتھی بنا دے۔ غرض یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی مکی زندگی اذیتوں اور مصیبتوں سے بھری ہوئی لیکن آپ پورے عزم و استقلال کے ساتھ اسلام کی دعوت، مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور مدافعت میں لگے رہے۔

18.4.3 ہجرت

کفار مکہ کے تمام ظلم وستم کے باوجود آفتاب اسلام کی شعائیں تاریک دلوں کو روشن کرتی رہیں تمام رکاوٹوں اور ظلم وستم کے باوجود روشنی کا یہ سفر آگے بڑھتا رہا۔ ایک سال حج کے موقع پر یثرب سے بنوخزرج کے کچھ لوگ مکہ آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوئے۔ جب وہ لوگ واپس ہونے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کو ان کے ساتھ کر دیا تا کہ اہل یثرب ان سے قرآن اور اسلامی احکام سیکھ سکیں۔ قرآن کی سحر انگیزی اور اس کی تعلیمات کی اثر آفرینی سے جلد ہی یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور اوس وخزرج کے بہت سارے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ادھر مکہ میں مومنین پر عرصۂ حیات تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم وستم کا شکار مسلمانوں کو یثرب ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اور اس طرح خفیہ طور پر اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی ہجرت ہونے لگی۔ کفار مکہ ایک تو اس بات پر غضبناک تھے کہ اسلام کا پیغام ان کے روکے نہیں رُک رہا تھا۔ دوسرے مسلمانوں کی ہجرت اور یثرب میں ان کے امن و راحت کی خبریں سنکر ان کا غیظ وغضب دو آتشہ ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے مکہ میں اپنی مشاورت گاہ دارالندوہ میں سردارانِ قریش کی ایک مجلس طلب کی تا کہ کوئی آخری فیصلہ لیا جا سکے۔ کسی نے نبی اسلام کے اخراج کا مشورہ دیا کسی نے آپ کو قید کر دینے کی تجویز رکھی لیکن ابوجہل نے معاذ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی رائے دی اور اس کی یہی رائے ندوہ کی اس میٹنگ میں فیصلہ کن قرار پائی اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا۔ یہ طے پایا کہ اس عمل میں ہر قبیلے کا ایک ایک فرد تیار رہوا اور سب مل کر یہ کام سرانجام دیں تا کہ بنو ہاشم کسی ایک سے بدلہ نہ لے سکیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس مکر وفریب سے اپنے رسول علیہ السلاۃ والسلام کو مطلع فرما دیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن کی سورت انفال کی آیت 30 میں ہوا ہے۔

چنانچہ سازش کے مطابق ایک شب کفار مکہ نے جب رسول اللہ کے گھر کو محاصرے میں لیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کے ذریعے آپ کو اس کی اطلاع دی اور ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لیٹنے کا حکم دیا اور خود سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں پڑھتے ہوئے مکان سے باہر آئے پھر ایک مشت خاک محاصرین کی جانب اچھالا اور انھی کے درمیان سے نکلے مگر ان کو خبر تک نہ ہوئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا کہ انھیں ہجرت کا حکم مل گیا ہے اور تمھیں بھی ساتھ چلنا ہے حضرت ابوبکرؓ تو اس مژدۂ جاں فزا کا نہ صرف انتظار کر رہے تھے بلکہ اس کے لئے انھوں نے تیاری بھی کر رکھی تھی چنانچہ دونوں حضرات یثرب کی جانب نکلے جسے ہمیشہ کے لئے مدینۃ الرسول ہونے کا شرف ملنے والا تھا۔ منزل مقصود اگر چہ شمال میں تھی لیکن آپ مکے سے جنوب کے سمت نکلے اور چند میل کے فاصلے پر واقع غار ثور میں اپنے یار غار کے ساتھ اقامت گزیں ہوئے۔ اس سفر میں حضرت ابوبکر کی محبت و جاں نثاری کے ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جنھیں چشم فلک نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غار میں داخل ہونے سے روکا اور پہلے خود داخل ہوئے تا کہ اس غار کو اچھی طرح سے

صاف کرسکیں ۔اور کوئی ضرر رساں شے غار میں باقی نہ رہنے پائے ۔ غار کو اچھی طرح سے صاف کرنے اور اس کے سوراخوں کو بند کرنے کے بعد اللّٰد کے رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے غار میں داخل ہونے کی گزارش کی ۔آپ اندر تشریف لائے اور تھوڑی دیر بعد آپ حضرت ابوبکر کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے اس درمیان ایک سوراخ جو بند ہونے سے رہ گیا تھا اس میں سے ایک زہریلے سانپ نے اپنا سر نکالا تو حضرت ابوبکر نے اس سوراخ پر اپنا پیر رکھ دیا تا کہ رسول اللّٰد کے آرام میں خلل نہ واقع ہو۔سانپ نے انھیں ڈس لیا لیکن پوری طاقت کے ساتھ انھوں نے خود کو سنبھالے رکھا لیکن جب تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ایک قطرہ رسول اللّٰد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر بھی پڑا اور آپ بیدار ہو گئے آپ نے حضرت ابوبکر کے چہرے پر کرب الم دیکھ کر ماجرا پوچھا تو انھوں نے عرض کیا میرے والدین آپ پر قربان غالبًا کسی سانپ نے کاٹ لیا ہے ۔ یہ سن کر آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اپنا لعاب دہن لگا دیا ۔خدا کی قدرت سے زہر کا اثر جاتا رہا۔

اس غار میں آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ نے تین دن اور تین راتیں گزاری ۔اس قیام کا مقصد یہ تھا کہ کفار مکہ کی کدوکاوش اور دوڑ بھاگ کم ہو تو سفر کیا جائے ۔ ہجرت کے اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ کا پورا خاندان شریک تھا ۔ان کے صاحبزادے عبداللّٰد روز شام کو اہل مکہ کی کاروائیوں کی رپورٹ فراہم کرتے تھے ۔ان کے غلام عامر بن فہیرہ غار کے آس پاس بکریاں چراتے تھے تا کہ بکریوں کا دودھ بطور غذا استعمال ہو اور حضرت عبداللّٰد کے پیروں کے نشان بھی مٹ جائیں ۔حضرت اسماء بنت ابی بکر کھانا لایا کرتی تھیں ۔حضرت ابوبکر کا گھرانہ ’’ایں خانہ ہمہ آفتاب است‘‘ کی مثال تھا۔

دوسری طرف جب کفار مکہ کو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے مکہ سے نکل جانے کی خبر ملی تو وہ سب غیظ وغضب میں آگئے ۔ ابوجہل سیدھا حضرت ابوبکرؓ کے گھر گیا اور حضرت اسماءؓ سے ان کے بارے میں دریافت کیا جب انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے حضرت اسماءؓ کو زدوکوب بھی کیا۔

قریش اپنی اس شکست فاش پر بیک وقت شرمندگی‘ صدمے اور جنوں کا شکار ہو گئے ۔ چاروں طرف لوگوں کو دوڑایا اور پیغمبر اسلام صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے لانے والے کے لئے سو سرخ اونٹوں کا انعام مقرر کیا ۔قریش کے بہت سارے نوجوان و بہادر آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق ہجرت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ۔ان میں سے کچھ کا مقصد دینی فریضے کی ادائیگی تھا تو کچھ دوسرے کا مطمح نظر طالع آزمائی اور سو اونٹوں کا انعام تھا۔ان میں سے بعض غار ثور کے قریب تک پہنچ گئے ایک نوجوان نے غار میں اترنا بھی چاہا لیکن اس نے دیکھا کہ غار کے منہ پر مکڑی کا جالا ہے لہٰذا اس نے اس میں اترنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔اس وقت غار کے اندر حضرت ابوبکرؓ پر عجیب اضطرابی کیفیت طاری تھی ۔آپ نے عرض کیا یارسول اللّٰد اگر ان میں سے کسی نے جھک کر دیکھا تو ہم نظر آجائیں گے۔آپ نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ:’’اے ابوبکرؓ ایسے دو کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللّٰد بھی ہے‘‘۔ یہاں اللّٰد کے ساتھ ہونے سے مراد اس کی نصرت وحمایت ہے نہ کہ خدا کا اس جگہ ساتھ ہونا، کیونکہ اللّٰد تعالیٰ زمان ومکان اور معیت سے پاک ومنزہ ہے۔اس کے بعد حضرت ابوبکر کا اضطراب جاتا رہا دوسری طرف رسول اللّٰد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے غیر معمولی اطمینان وسکون نے ان کے قلب کو تقویت پہنچائی ۔اللّٰد تعالیٰ نے اس واقعے کی حکایت سورۂ توبہ میں فرمائی ہے:

''دو میں سے دوسرے جب دونوں غار میں تھے جب وہ (رسول صلی اللہ علیہ وسلم)
اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے ان پر
سکینہ نازل فرمایا..........''

چوتھے دن جب اہل مکہ کی تگ و دو کم ہوگئی تو حضرت ابو بکرؓ پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی معیت میں غار ثور سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ بھی خدمت کے لئے شریک سفر ہوگئے تھے۔حضرت ابو بکرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے کبھی آگے بڑھ جاتے تھے کبھی پیچھے رہ جاتے تھے۔ جب پیغمبر اسلام نے کبھی آگے اور کبھی پیچھے ہونے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے محبت میں ڈوب کر فرمایا:''یارسول اللہ جب تعاقب کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو آپ کے پیچھے چلنے لگتا ہوں اور جب گھات لگانے والوں کا تصور پیدا ہوتا ہے تو آپ سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔راستے میں آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی صدق نبوت پر دلالت کرنے والے ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے حضرت ابو بکرؓ کے یقین کو مزید پختگی عطا کی۔آخر میں حضرت ابو بکرؓ پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی ہمرکابی میں بروز دوشنبہ بارہ ربیع الاول 16 نبوی میں مدینہ کے قریب قبا پہنچے اور سعد بن خثیمہ کے گھر مقیم ہوئے۔قبا کے مسلمان بھی صبح وشام آپ کا انتظار کررہے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار دن قبا میں مقیم رہے۔مقامی اور مدینے سے آنے والوں سے ملاقات کرتے رہے اس درمیان آپ نے قبا میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جسے اسلام کی پہلی مسجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔قبا میں ہی حضرت علیؓ بھی آکر شریک ہجرت نبوی ہوگئے۔ چوتھے دن یہ قافلہ مدینے پہنچا جہاں لوگوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت ابوبکر کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟
2. حضرت ابوبکرؓ کی کنیت کی وجہ بیان کیجئے۔
3. حضرت ابوبکرؓ واقعہ فیل سے تقریباً کتنا بعد پیدا ہوئے؟
4. حضرت ابوبکرؓ کے غلام کا کیا نام تھا جو غار ثور کے پاس بکریاں چراتے تھے؟

18.5 حضرت ابوبکر مدینہ میں

18.5.1 مدنی زندگی

مدینہ منورہ میں حضرت ابوبکرؓ نے تقریباً ساڑھے بارہ سال گزارے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں دس سال تک ان کے وزیرو مشیر کی حیثیت سے اور باقی عرصہ ان کے خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے' مدینے میں آپ کا قیام بنوخزرج کے ایک معزز فرزند خارجہ بن زید کے مکان پر ہوا۔یہ گھر مدینہ سے تھوڑا فاصلے پر تھا۔کچھ دنوں بعد حضرت طلحہ کے ساتھ آپ کے اہل خانہ بھی

مدینہ پہنچ گئے۔حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں مواخات اور بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت حارثہ بن زہیر انصاریؓ کو آپ کا بھائی بنایا۔حضرت ابوبکرؓ کو ابتدا میں مدینے کی آب وہوا راس نہیں آئی اور آپ شدید بیمار ہوگئے یہاں تک کہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مدینے کی ہوا خوشگوار ہوگئی۔اور مدینے آنے والے تمام مہاجرین آرام وراحت کے ساتھ وہاں رہنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا اور اس کے لئے انتخاب ایک ایسی زمین کا ہوا جو دو یتیموں کی تھی وہ دونوں اوران کے گھر والے اس زمین کو مفت دینا چاہتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کی زمین مفت لینا پسند نہیں کیا اور حضرت ابوبکر سے اس کی قیمت ادا کروائی۔انھوں نے نہ صرف زمین کی قیمت ادا کی بلکہ اس کی تعمیر میں بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔

18.5.2 غزوات

مدینہ میں حضرت ابوبکرؓ ہر مسئلے اور ہر معاملے کے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔کوئی بھی غزوہ ایسا نہ تھا جس میں شریک نہ ہوئے ہوں اور داد شجاعت نہ دی ہو۔غزوہ بدر اسلام کی تاریخ میں ایک خط فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس غزوے میں نہ صرف آپ نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مواسات اور غمگساری فرمائی بلکہ بہادری اور پامردی کے ساتھ کفار قریش کا مقابلہ بھی کیا۔

معرکہ کے آغاز میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گریہ زاری کے ساتھ فتح ونصرت کے لئے اپنے رب سے دعا کررہے تھے حضرت ابوبکر برہنہ تلوار کے ساتھ ان کی حفاظت کررہے تھے۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے قراری کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اورعرض کرتے:''یا رسول اللہ آپ پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کامیابی اور مدد کا وعدہ کیا ہے وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا''۔حالت سجدہ میں رسول اللہ کی چادر بار بار گر جاتی تھی آپ اسے اٹھا کر ان کے کاندھوں پر ڈالتے تھے۔

2ھ ہجری میں ہونے والا بدر کا معرکہ بے حد پر خطر تھا۔طاقت کا توازن پوری طرح سے کفار مکہ کے حق میں تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ کو نصرت الٰہی کا ایسا یقین تھا کہ انھوں نے کفار کی عددی کثرت اور اسلحہ جاتی فوقیت کو کوئی اہمیت نہ دی۔نوجوانوں سے جوش و جذبہ کے ساتھ شریک جنگ ہوئے۔اپنی تمام تر نرمی ورقت کے باوجود حق کے معاملے میں کسی رشتہ وتعلق کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ان کے بیٹے عبدالرحمان اس معرکے میں کفار مکہ کے ساتھ تھے بعد میں جب اسلام لے آئے تو ایک دن اپنے والد سے کہنے لگے کہ جنگ بدر میں کئی بار آپ میرے نشانے پر آئے لیکن میں نے نظر انداز کردیا۔ابوبکرؓ انھوں نے فرمایا کہ اگر تم میرے نشانے پر آتے تو میں تمہیں ہرگز نظر انداز نہ کرتا۔غزوۂ بدر کے پورے عرصے میں آپ پیغمبر اسلامؐ کے لئے سینہ سپر رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والے کفار کے کئی حملوں کا دفاع کیا۔

معرکے کے بعد جب اسیران بدر کے بارے میں رسول اللہ نے صحابہ سے مشورہ لیا تو حضرت عمرؓ کے برخلاف حضرت ابوبکرؓ نے فدیہ لے کر انھیں چھوڑنے کی رائے دی اور بارگاہ نبوت میں آپ کی رائے پسند کی گئی جس میں بے شمار مصلحتیں اور فائدے تھے۔

3ھ میں غزوہ احد میں جب مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر خالد بن ولید نے اچانک حملہ کیا تو اکثر مسلمانوں کے پیر اکھڑ گئے تھے اور صرف چند جانثار ہی ثابت قدم رہ سکے ان جان نثاروں میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ بھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے 4ھ میں غزوۂ بنی نضیر اور 5ھ میں ہونے والے غزوۂ مصطلق میں بھی شرکت فرمائی اور اسی سال ہونے والے غزوۂ خندق وغزوۂ بنو قریظہ میں بھی شریک ہوئے۔ مؤخرالذکر تینوں غزوات یہودیوں کی شرانگیزی اور ان کی جانب سے معاہدہ شکنی کے سبب پیش آئے۔ 6ھ میں صلح حدیبیہ میں بھی آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وہمرکابی میں رہے۔ صلح حدیبیہ کی شرطیں مسلمانوں کو سخت ناگوار گزریں حضرت عمر نے تو اپنی ناگواری کا اظہار بھی کر دیا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے نہایت انشراح وطمانیت سے رسول اللہ کے اس فیصلے کو قبول کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ صلح حدیبیہ فتح مبین ثابت ہوئی۔ نہ صرف اگلے سال مسلمانوں نے یہود کی فتنہ سامانیوں کو کچل کر اس فتنے کا سدباب کیا بلکہ اسلام کی نشرواشاعت میں بھی غیرمعمولی اضافہ ہوا۔ 7ھ میں غزوہ خیبر پیش آیا حضرت ابوبکرؓ اس میں بھی شریک رہے۔

جب قریش نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو اللہ کے رسولؐ نے مکہ کی طرف کوچ فرمایا۔ اس فتح عظیم میں بھی حضرت ابوبکرؓ رسول خدا کی رفاقت اور رکاب میں تھے۔ حتیٰ کہ جب 8ھ میں رسول خدا مکہ میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ مکہ ہی میں حضرت ابوبکرؓ اپنے والد ابوقحافہ کو لے کر حضور کے پاس آئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال ہونے والے غزوۂ حنین میں بھی حضرت ابوبکرؓ نے مجاہدانہ شرکت کی اور ان معدودے افراد میں اپنا نام درج کرایا جنھوں نے صبروثبات کا مظاہرہ کیا اور شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔

اللہ کے رسولؐ نے 9ھ میں غزوہ تبوک کی تیاری کے لئے مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی۔ مہاجرین وانصار نے اس دعوت کو بڑھ چڑھ کر لبیک کہا۔ حضرت عثمانؓ صاحب ثروت تھے۔ انھوں نے ایک خطیر رقم پیش کی' حضرت عمرؓ اپنا نصف مال لے کر حاضر ہوئے۔ انھیں یہ خیال تھا کہ آج وہ ابوبکرؓ سے سبقت لے جائیں گے۔ مگر جب حضرت ابوبکر تشریف لائے تو اس شان کے ساتھ کہ گھر کا سارا اثاثہ ان کے ساتھ تھا اور جب اللہ کے رسولؐ نے ان سے پوچھا کہ: اہل خانہ کے لئے کیا چھوڑا تو انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔

اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی امارت وقیادت میں حجاج کا ایک وفد روانہ کیا۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے ایک غیرمعمولی شرف تھا۔ چنانچہ آپ کی قیادت میں مسلمانوں نے حج کیا اور میدان منیٰ میں رسول خدا کی نیابت کرتے ہوئے آپ نے اعلان کر دیا کہ آئندہ سے اب مشرکین کو حج کی اجازت نہ ہوگی۔ نہ ہی کسی کو جاہلی رسم کے مطابق برہنہ طواف کرنے دیا جائے گا۔

آئندہ سال یعنی دس ہجری کو جب کعبہ اور مسجد حرام مشرکانہ علامتوں سے خالی ہوگئے تو نبی کریم عازم حج ہوئے۔ اس مبارک تاریخی سفر میں بھی آپ رسول خدا کے ہمرکاب رہے اور اپنے محبوب نبی کی معیت میں حج ادا کیا۔ اسی موقع پر نبی اسلام نے وہ تاریخی خطبہ دیا جسے خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جسے بلاشبہ حقوق انسانی کا پہلا عالمی منشور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔
تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو
بطور دین پسند کیا ہے۔ (آیت:2)

18.5.3 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت اور وصال

دین مکمل ہو چکا تھا اور حجت تمام ہو چکی تھی۔ اواخر صفر 11ھ میں آپ بیمار ہوئے۔ اسی دوران حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں آپ نے ایک لشکر شام کی طرف روانہ کیا لیکن آپ کی علالت کے پیش نظر یہ لشکر مدینہ کے باہر ہی رُکا رہا۔ اپنی علالت سے قبل ایک بار آپ مسجد میں تشریف لائے اور خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ نے فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا و آخرت میں سے ایک کو اختیار کا حق دیا تو اس بندے نے جو اللہ کے پاس ہے یعنی قرب و آخرت کو اختیار کیا''۔

حضرت ابوبکرؓ جیسے مزاج نبوی شناس کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ محبوب سے فراق کی گھڑی قریب آ گئی ہے چنانچہ آپ زار و قطار رونے لگے۔ حضرت سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں ابوبکرؓ کے رونے پر تعجب ہوا کیونکہ ہمارے خیال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بندے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن ابوبکرؓ ہم سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس وقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن ان سے میرا محبت و دینی اخوت کا تعلق ہے۔ اور اس مسجد میں جتنے دروازے ہیں سب بند کر دیئے جائیں سوائے ابوبکر کے دروازے کے''۔

حضرت ابوبکر کا دروازہ اس لئے کھلا رکھا گیا کہ مستقبل قریب میں انھیں نماز کی امامت میں رسول کی نیابت کرنی تھی۔ اس کے بعد آپ علیل ہوئے اور آپ کی علالت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن جب حضرت بلالؓ نماز کے لئے اطلاع دینے آئے تو پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کی امامت کریں۔ حضرت عائشہؓ نے براہ راست یا حضرت حفصہؓ کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ابوبکرؓ بہت رقیق القلب ہیں وہ آپ کی جگہ کھڑے ہو کر امامت نہ کر سکیں گے۔ گریہ و بکا کے سبب وہ قرآت بھی نہ کر سکیں گے، بعض روایت میں ہے انھوں نے یہ بھی عرض کیا کہ عمرؓ کو حکم دیجئے کہ وہ نماز پڑھائیں لیکن آپ نے باصرار ابوبکرؓ کی امامت کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نمازوں میں صحابہ کی امامت کرنے لگے۔ اسلام میں سبقت' ہجرت میں رفاقت اور حج کی امارت کے ساتھ ساتھ صحابہ کی امامت ابوبکر رضی اللہ عنہ' کی قبائے عظمت میں لگنے والا نیا تمغہ تھا۔ ایک روز حضرت ابوبکر لوگوں کی امامت کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کی آمد کا احساس کر کے انھوں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا اور ان کے بغل میں بیٹھ کر نماز ادا کی۔

دوشنبہ 12/ربیع الاول 11ھ کو فجر کے وقت حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ نے اپنے حجرے کا پردہ اٹھا کر دیکھا اور مسلمانوں کو باجماعت نماز پڑھتے دیکھ کر تبسم فرمایا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مرض نے اچانک شدت اختیار کر لی اور آپ کی روح پاک ملأ اعلیٰ کی جانب پرواز کر گئی۔ وصال کے وقت آپ کی زبان پر ''بل الرفیق الاعلی'' کے کلمات تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت مقام سخ میں اپنی زوجہ حضرت خارجہؓ کے مکان پر تھے آپ کو اطلاع ملی تو آپ مسجد نبوی تشریف لائے جہاں ایک کہرام برپا

تھا لوگ اپنے ہوش وحواس میں نہ تھے۔ آپ سیدھے حجرۂ عائشہؓ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور سے نقاب اٹھائی' پیشانی کا بوسہ لیا اور عرض کیا:

''میرے ماں باپ آپ پر قربان اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ آپ پر دو
موتیں جمع نہیں فرمائے گا۔ جو موت آپ کے لئے مقدر تھی وہ آ گئی
اب اس کے بعد آپ کو کبھی کوئی موت نہیں آئے گی''

پھر آپ حجرۂ عائشہؓ سے باہر تشریف لائے جہاں غم واندوہ کا ایک عجیب عالم تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے قوی عزم وارادہ شخص ہوش حواس سے بے گانہ تھے۔ ننگی تلوار لے کر لوگوں کو ڈرار ہے تھے اور اعلان کر رہے تھے کہ:

''جو یہ کہے گا کہ حضور انتقال کر گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا......
خدا کی قسم ان کا انتقال نہیں ہوا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ انھیں ضرور
مبعوث فرمائے گا پھر وہ لوگوں کے ہاتھ پیر قطع کریں گے''

مسجد میں آ کر حضرت ابوبکر نے لوگوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا:

''سنو! جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور جو
اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہ آئے گی''

پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی:

''ومامحمد الارسول' قد خلت من قبله الرسلُ أفاِن مات أو قتل
انقلبتم على أعقا بكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا و
سيجزى الله الشاكرين'' (آل عمران:194)

(اور محمد تو رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے ہیں تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم اُلٹے پیر پھر جاؤ گے' اور جو اُلٹے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا اور عنقریب اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو صلہ عطا فرمائے گا۔)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ: ''ایسا لگا کہ جیسے لوگ جانتے ہی نہ ہوں کہ اللہ نے یہ آیت بھی نازل کی ہے اور اس کے بعد تو ہر شخص کی زبان پر یہی آیت تھی''۔

دوسری طرف حضرت عمرؓ نے یہ خطاب سنا تو وہ بھی وارفتگی سے باہر نکلے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا یقین ہو گیا اور اس یقین کے بعد ان کی ٹانگیں ان کا اپنا بوجھ نہیں اُٹھا سکیں اور وہ زمین پر گر پڑے۔ اس پورے واقعہ سے حضرت ابوبکرؓ کی غیر معمولی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق کا صدمہ حضرت عمرؓ سے کہیں زیادہ ان کو ہوا ہو گا لیکن ان کے صبر وثبات اور عزم واستقامت نے انھیں وارفتہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ انھوں نے دوسروں کو بھی وارفتگی اور بے ہوشی سے باہر نکالا۔ حضرت ابوبکرؓ کی معروف رقت ونرمی کے ساتھ یہ استقلال اور پختگی حیرت میں ڈال دینے والی ہے۔

18.5.4 سقیفۂ بنوساعدہ کا اجتماع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے دن ہی انصار سقیفۂ بنوساعدہ میں جمع ہوئے اور آپ کی خلافت اور جانشینی پر گفتگو کرنے لگے۔ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ رسول اللہ کی خلافت ان کا حق ہے کیونکہ انھوں نے ہی مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی تلواروں کے زور پر اسلام کا دفاع ہوا اور ان کی نصرت وحمایت سے اسلام کی نشر واشاعت ہوئی۔

''سقیفہ'' عربی میں چھت دار نشست گاہ یا چوپال کو کہتے ہیں۔ یہ چوپال مسجد نبوی سے شمال مغرب میں خزرج کے ایک قبیلے بنوساعدہ کے محلے میں تھی۔اس جماعت کی قیادت حضرت سعد بن عبادہؓ کر رہے تھے۔انھوں نے انصار کی فضیلت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خلافت کے استحقاق کا دعوی کیا۔حاضرین نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے انھیں کو خلافت کا مستحق قرار دیا۔ انصار نے یہ ساری باتیں کر لی تھیں لیکن انھیں اس امر کا احساس تھا کہ ان کا موقف اتنا مضبوط نہیں ہے۔ان میں قبائلی اختلاف بھی تھے اوس وخزرج کا تنازعہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان میں خود ہی باہمی اختلاف شروع ہوگیا۔کسی نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ عرب ان کی قیادت کو قبول نہ کریں گے تو کسی نے امامت میں شراکت کی تجویز رکھی۔ دوسری طرف جب یہ اطلاع مہاجرین کو ملی تو وہ بھی اپنے استحقاق کی بات کرنے لگے لہٰذا ضروری تھا کہ اس نزاع کا فوراً سدباب کیا جائے تا کہ وہ اسلام کے بے خطرے اور کمزوری کا باعث نہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ اس وقت حجرۂ عائشہؓ میں ہی تھے۔حضرت عمرؓ نے انھیں بلوایا اور سقیفۂ بنوساعدہ میں ہونے والے اجتماع کا ذکر کیا چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کو لیکر بنوساعدہ کی طرف روانہ ہوئے حضرت ابوعبیدہ بن جراح بھی شریک ہوگئے۔جب یہ حضرات سقیفہ پہنچے تو انصار کی گفتگو چل رہی تھی اور وہ حضرات اپنی فضیلت اور استحقاق کا ذکر کر رہے تھے۔حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کرنا چاہا تو حضرت ابوبکر نے انھیں اس عمل سے باز رکھا کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں عمر سختی سے کام نہ لیں جبکہ موقع انتہائی نرمی اور مصلحت پسندی کا متقاضی تھا چنانچہ آپ خود کھڑے ہوئے اور ایک بے حد موثر اور جذباتی خطاب فرمایا۔حمد وثناء کے بعد اسلام کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے پھر فرمایا:

> ''عربوں کے لئے اپنے اجداد کا دین ترک کرنا بے حد دشوار تھا۔وہ اس کام کے لئے کسی طور پر آمادہ وتیار نہ تھے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم میں مہاجرین کو یہ توفیق دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں۔آپ کی دلجوئی کریں اور اپنی قوم کے ظلم وستم کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ ہر شخص ان کے خلاف تھا' ان پر مظالم ہو رہے تھے۔انھیں شدید تکلیفیں دی جا رہی تھیں لیکن وہ اپنی قلت اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود ہراساں نہیں ہوئے۔ وہ اس زمین کے اولین لوگ ہیں جنھیں خدا ورسول پر ایمان لانے اور خدا کے سچے اور حقیقی بندے بننے کی توفیق حاصل ہوئی۔ وہ رسول اللہ سے محبت کرنے والے اور ان کے رشتہ دار ہیں۔اس لئے صرف وہی ان کی جانشینی کے حق دار ہیں۔اور اس مسئلے میں صرف ظالم ہی ان سے نزاع کرسکتا ہے۔اور اے گروہ انصار! تمہاری دینی فضیلت اور اسلام میں تمہاری سبقت واولیت مسلم ہے۔اللہ تعالیٰ نے تم

لوگوں کو اپنے دین اور اپنے رسول کا حامی و ناصر بنایا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کی طرف ہجرت فرمائی ۔ اُن کی بیشتر ازواج اور اکثر صحابہ تمھیں لوگوں میں سے ہیں ۔ مہاجرین اولین کے بعد تم لوگوں کا ہی مقام و مرتبہ ہے ۔اس لئے امیر ہم ہوں گے اور وزیر تم ہو گے ۔''

حضرت ابو بکر کے اس پر اثر اور معقول خطاب سے انصار کا ایک بڑا طبقہ مطمئن ہو گیا لیکن بعض حضرات کو اب بھی قناعت نہیں تھی چنانچہ حضرت حباب بن منذر انصاری نے طرفین سے ایک ایک امیر کی تجویز پیش کی لیکن حضرت عمرؓ نے اس غیر معقول تجویز کو فوراً رد کر دیا اور انصار کو دوبارہ یاد دلایا کہ عرب قریش کے علاوہ کسی کی قیادت کو تسلیم نہ کریں گے ۔لیکن اس کے باوجود بھی سعد بن عبادہ' حباب بن منذرؓ اور بعض دوسرے احباب اپنے مطالبے سے دست کش ہونے پر تیار نہیں ہوئے تو حضرت ابو عبیدہؓ کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب کر کے بڑی رقت اور دل سوزی کے ساتھ کہا کہ: ''اے گروہ انصار تمھیں لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس دین کی نصرت و حمایت کی اور تمھیں لوگ سب سے پہلے اس کے مٹانے پر آمادہ ہو' ۔حضرت ابو عبیدہؓ کے اس دردمندانہ خطاب پر قبیلہ بنو خزرج کے ایک سردار حضرت بشیر بن سعد کھڑے ہوئے اور انصار سے کہا کہ: تم لوگ اپنی جن خدمات کا ذکر کر رہے ہو تم نے وہ خدمات خدا کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کی تھیں ان پر مفاخرت کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور نہ ہی ان کے بدلے میں ہمیں دنیا طلب کرنی چاہئے ۔ انھوں نے اپنے لوگوں کو یاد دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے اور ان کی جانشینی قریش ہی کا حق ہے ۔

انصار کے دلوں پر حضرت بشیر کی اس حقیقت افروز تقریر کا بہت اثر ہوا اور ان کی بھاری اکثریت مہاجرین کی امامت کے لئے راضی ہوئے ۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس وقت حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کے نام کی تجویز رکھی لیکن حضرت عمرؓ دیکھ رہے تھے کہ یہ وقت تجاویز اور انتخاب میں گنوانے والا نہیں ہے ۔ حالات کسی وقت بھی دوبارہ بگڑ سکتے ہیں ۔ منافقین نے بھی ریشہ دوانی شروع کر دی تھی ۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ وہاں مہاجرین میں حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ قابل قبول کوئی شخصیت نہیں تھی ۔ انھوں نے حضرت ابو بکرؓ کا نام پیش کرنے کے بجائے ان سے ان کا ہاتھ مانگا اور فوراً ان کی بیعت کر لی ۔

معلومات کی جانچ

1. مدینہ میں حضرت ابو بکر کا قیام کہاں تھا؟
2. کس سن میں حضرت ابو بکر امیر حج بنے؟
3 انصار کسے خلیفہ بنانا چاہتے تھے؟

18.6 خلافت صدیقی

18.6.1 حضرت ابو بکر کی بیعت

حضرت عمرؓ کی بیعت کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے مناقب و فضائل بیان کرتے ہوئے آپ کی بیعت کی اس کے بعد

بشیر بن سعد انصاری آگے بڑھے اور اپنے قبیلے کے ساتھ بیعت کی۔ حضرت حباب سے ان کی سخت کلامی بھی ہوئی لیکن ان پر اس کا کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے بعد فوراً ہی اوس کے سردار اسید بن حضیر کھڑے ہوئے اور پورے قبیلے کو حضرت ابو بکر کی بیعت کی دعوت دی اور سب کے ساتھ بیعت ہوئے۔

سقیفہ میں موجود سبھی لوگوں نے بیعت کر لی سوائے حضرت سعد بن عبادہ کے۔ بعض روایت کے مطابق بعد میں انھوں نے بھی بیعت کر لی تھی۔ اور بعض دوسرے روایتوں کے مطابق انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور بیعت نہیں کی۔ ان کی کبر سنی اور دینی خدمات کی رعایت کرتے ہوئے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ سقیفے کی اس بیعت کے ساتھ ہی ایک بڑا فتنہ جو اسلام کی بیخ کنی کرنے پر آمادہ تھا سرد ہو گیا۔ اگر یہ فتنہ پروان چڑھنے میں کامیاب ہو جاتا تو خدا کو معلوم اس کا انجام کیا ہوتا۔

سقیفۂ بنو ساعدہ میں مہاجرین بالخصوص اہل بیت موجود نہیں تھے۔ مہاجرین کی بڑی تعداد مسجد نبوی میں تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز میں مصروف تھے چنانچہ بقیہ لوگوں نے دوسرے دن مسجد نبوی میں بیعت کی۔ حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت ابو بکرؓ کے فضائل و مناقب بیان کئے اور لوگوں کو ان کی بیعت کی دعوت دی۔ دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مسلمانوں نے عمومی سطح پر آپ کی بیعت کی۔

اس کے بعد آپ نے اپنی خلافت کا پہلا خطبہ دیا:

> ''امابعد! اے لوگو! مجھے تمہارا امیر بنایا گیا ہے جب کہ میں تم لوگوں سے بہتر نہیں ہوں اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کرو۔ صدق امانت اور کذب خیانت ہے۔ تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور طاقتور کمزور ہے جب تک اس کے ذمے جو حق ہے اس سے حاصل نہ کر لوں۔ جب کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ اور جب کسی قوم میں بے حیائی بڑھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب مسلط کر دیتا ہے۔ جب تک میں اللہ و رسول کا مطیع رہوں میری اطاعت کرو اور اگر میں اللہ و رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔''

اس خطبے کے بعد نماز ہوئی، نماز کے بعد باقی ماندہ لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔ البتہ حضرت علیؓ حضرت زبیر بن عوامؓ اور چند دوسرے حضرات نے بیعت نہیں کی تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں اس واقعے کو لے کر بے حد مختلف اور متضاد روایتیں ہیں لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے بیعت عام یعنی 13/ربیع الاول 11ھ سے ہی بغیر کسی روک وٹوک کے امور خلافت انجام دینا شروع کر دئے۔ بیعت نہ کرنے والوں میں سب سے اہم شخصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تھی۔ ان کی بیعت کو لیکر تین روایتیں ہے: پہلی روایت جسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے وہ یہ کہ انھوں نے سیدہ فاطمہ کے انتقال کے بعد یعنی چھ ماہ بعد بیعت کی' دوسری یہ کہ بیعت عام کے چند دن بعد بیعت کی۔ اور تیسری روایت کے مطابق آپ نے بیعت عام کے دن ہی بیعت کر لی تھی۔ خواہ ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح ہو لیکن اس امر کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کہ بنو ہاشم عموماً اور حضرت علی بطور خاص

خلافت رسول کو اپنا حق سمجھتے تھے اور اس دلیل سے سمجھتے تھے جس دلیل سے حضرات شیخین اور حضرت ابوعبیدہ نے قریش کا استحقاق ثابت کیا تھا۔ لیکن نہ لوگ حضرت ابوبکر کے فضائل کے منکر تھے اور نہ اس دشوار گزار مرحلے میں مسلمانوں کی طاقت وشوکت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ اسی صورت میں جب کہ چاروں طرف ارتداد کا فتنہ پھوٹ چکا تھا اور مدعیان نبوت کی ہنگامہ آرائی جاری تھی ایسی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ بنو ہاشم نے امور خلافت میں کسی قسم کی رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ہر مرحلے میں انھوں نے خلیفۃ المسلمین کی معاونت کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خلافت پر اپنا دعوی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قربت وقرابت اور دین کے لئے اپنی خدمت کی بنیاد پر کر رہے تھے۔ نہ کہ کسی دینی بنیاد پر یا کسی نص کے سبب حتیٰ کے بعض لوگوں نے بنو ہاشم کو ورغلانے کی کوششیں بھی کیں اور ان کے اور خلیفۃ المسلمین کے درمیان ٹکراؤ بھی پیدا کرنا چاہا لیکن بنو ہاشم نے ایسی کوششوں پر توجہ نہیں دی۔

بعض ایسی روایتیں ملتی ہیں جنھیں حضرت صدیق کی خلافت کے لئے بطور نص پیش کیا جاتا ہے جن میں سرفہرست نماز میں ان کی امامت اور حج میں ان کی امارت وغیرہ ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بہت واضح اور فیصلہ کن نص موجود نہیں ہے بلکہ خلیفہ کے انتخاب میں اہل مدینہ کے اجتہاد سے کام لیا گیا۔

18.6.2 عہد خلافت

حضرت ابوبکر کا انتخاب خواہ کسی طور پر ہوا ہو لیکن اس انتخاب میں اللہ کی رحمت اور مرضی ضرور شامل تھی۔ کیونکہ آفتاب رسالت کے وصال کے فوراً بعد ہی اسلام کے افق پر ارتداد و نفاق کے سیاہ اور مہیب بادل چھانے لگے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی طرح جامع صفات ذات کی ضرورت تھی جس میں سادگی وشدت' نرمی وپختگی' حکمت واستقامت سب مجتمع ہوں۔

لشکر اسامہ: خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد حضرت ابوبکر کے سامنے جو بڑے مسائل تھے ان میں مدعیان نبوت' مرتدین اور مانعین زکاۃ کے مسائل سرفہرست تھے۔ جیش اسامہ کی روانگی بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ بڑے بڑے صحابہ کی رائے تھی کہ ابھی اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے اور جب جھوٹے نبیوں' ارتداد اختیار کرنے والوں اور زکاۃ دینے سے انکار کرنے والوں کی شورش کم ہو جائے تو اس لشکر کو روانہ کیا جائے اور ایسے پرخطر ماحول میں مدینے کو فوج سے خالی نہ کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر نے یہ گوارا نہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدلا یا ملتوی کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے پورے عزم واستقامت کے ساتھ حکم رسول کی تنفیذ کا ارادہ کیا اور تمام صحابہ کی رائے کو نظر انداز کر دیا۔ یہ آپ کا بڑا مبارک فیصلہ تھا۔ اس نے مخالفین کو یہ پیغام دیا کہ اہل مدینہ اور اصحاب رسول بے حد مضبوط پوزیشن میں ہیں ورنہ اس قسم کی فوجی کاروائی نہ کی جاتی۔ چنانچہ اس اقدام سے مخالفین کی ہمتیں پست ہوئیں۔ اور یہ لشکر چالیس دن میں اپنے مقاصد کو پورا کر کے فتح یاب واپس ہوا جس سے تمام باغیوں اور شورش پسندوں پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو گیا۔ اس لشکر کی روانگی کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ کو دس ہدایتیں دیں جو اسلام کی جنگی سیاست کی وضاحت کرتی ہیں۔ یہ دس نصیحتیں مندرجہ ذیل ہیں: 1. خیانت نہ کرنا 2. عہد کی خلاف ورزی نہ کرنا 3. چوری مت کرنا 4. مردوں کی بے حرمتی مت کرنا 5. بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل مت کرنا 6. پھل دار درخت مت کاٹنا 7. کسی گائے،

بھیڑ یا اونٹ کو کھانے کے علاوہ ذبح مت کرنا 8. جو لوگ اپنی عبادت گاہوں میں معتکف ہوں ان سے تعرض مت کرنا 9. جب بھی لوگ تمھیں کھانا پیش کریں تو اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرنا 10. تمھیں ایسے لوگ ملیں گے جن کے سر کا درمیانی حصہ منڈا ہوگا اور کنارے بڑے بڑے بال ہوں گے انھیں قتل کر دینا۔

18.6.3 مدعیان نبوت

اس فتنے کا آغاز عہد رسالت سے ہی ہو چکا تھا مسیلمہ کذاب نے 10ھ میں ہی دعویٰ نبوت کیا تھا۔ یمن میں اسود عنسی بھی اواخر عہد نبوی میں ہی مدعی نبوت بن بیٹھا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نبوت کے کئی اور جھوٹے دعوے دار پیدا ہوگئے۔ اور یہ وباء ایسی عام ہوئی کہ خواتین بھی اس میں شریک ہوگئیں۔ چنانچہ سجاح نے بھی علم نبوت بلند کیا۔ نبی اسد میں طلیحہ بن خویلد نبی بن بیٹھا۔ حضرت ابوبکر نے اس فتنے کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا اور حضرت علی کو اس مہم کی قیادت سونپنے کا فیصلہ ہوا لیکن ان کی گوشہ نشینی کے سبب حضرت خالد بن ولید کو اس مہم کا ذمہ دار بنایا گیا۔

حضرت خالد نے سب سے پہلے طلیحہ اور اس کے گروہ پر حملہ کیا اور ان کا شیرازہ منتشر کرایا۔ مسیلمہ کی سرکوبی کے لئے حضرت شرحبیل بن حسنہ کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن حضرت خالد بھی ان کے شریک ہوگئے۔ اور ایک زبردست معرکے میں مسیلمہ مارا گیا اور اس کی بیوی سجاح جو خود بھی نبوت کی دعوے دار تھی بصرہ بھاگ گئی' اس جنگ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہید ہوئی جن میں حفاظ قرآن کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ یہ معرکہ مسلمانوں پر بے حد شاق گزرا۔

اسود عنسی ایک کاہن تھا جو مسجع عبارت میں گفتگو کرتا تھا اس نے نبوت کا دعوی کیا۔ یمن اور نجران کے بہت سارے جہلاء اس کے ساتھ ہوگئے تھے اس نے دھیرے دھیرے طاقت حاصل کی۔ یمن کے مسلم عاملین کو شہید کر کے یا انھیں بھگا کر وہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ لیکن بعد میں یہ مدعی نبوت اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

18.6.4 مرتدین

وفات نبوی کے بعد مدعیان نبوت کے علاوہ چاروں طرف بغاوت وارتداد کا طوفان بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ مدینہ، مکہ اور طائف جیسے شہروں کے علاوہ چند قبیلے ایسے بچے تھے جہاں اس طوفان کے تھپیڑے نہیں پہنچ سکے ورنہ پورا عرب بغاوت و سرکشی پر آمادہ تھا۔ یہ ایک بڑی ہوش ربا صورت حال تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ بڑی حکمت، قوت اور استقامت کے ساتھ اس طوفان بلاخیز کا مقابلہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ ان مہمات کی قیادت خود کرنا چاہتے تھے اور آپ اس جہاد کے لئے تیار بھی تھے لیکن حضرت علی نے آپ کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرب کے مختلف حصوں میں مرتدین کی سرکوبی کے لئے لشکر روانہ کئے۔ اہم لشکر مندرجہ ذیل تھے:

1. لشکر خالد بن ولید۔ بنو اسد' تمیم اور پھر یمامہ کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت خالد تمام اسلامی لشکروں کے سپہ سالار اعظم تھے۔
2. لشکر عکرمہ بن ابی جہل۔ بنو حنیفہ میں مسیلمہ کذاب کی طرف پھر عمان' حضرموت اور یمن کی طرف بھیجا گیا۔
3. لشکر شرحبیل بن حسنہ۔ حضرت عکرمہ کے پیچھے حضرموت روانہ کیا گیا۔

4. لشکر طریفہ بن حاجر۔اس لشکر نے نبو سلیم اورھوازن کا قصد کیا۔

5. لشکر عمرو بن عاص۔قضاعہ کی جانب روانہ ہوا۔

6. لشکر خالد بن سعید بن عاص۔شام کی سرحدوں کی طرف متوجہ ہوا۔

7. لشکر علاء بن حضرمی۔بحرین بھیجا گیا۔

8. لشکر حدیفہ بن محصن۔عمان بھیجا گیا۔

9. لشکر عرفجہ بن ھُرثمہ۔مہرہ روانہ کیا گیا۔

10. لشکر سوید بن مقرن۔یمن کی طرف بھیجا گیا۔

ان لشکروں کے ساتھ حضرت ابوبکر نے ورشگاف الفاظ میں ان قبائل کو پیغام بھیجا کہ ارتداد و بغاوت سے باز آنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔اسلامی لشکر کو بھی صریح حکم دیا کہ وہ جہاد کا آغاز قتال سے نہیں بلکہ دعوت سے کریں۔

مستشرقین اور غیر مسلم مصنفین نے فتنۂ ارتداد کی مختلف توجیہات کی ہیں جن میں بیشتر خلاف واقعہ ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے علاوہ جزیرۂ عرب کے مختلف علاقوں میں اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بالکل آخری دور میں پھیلا۔نہ انھیں رسول اللہ کی صحبت حاصل ہوئی اور نہ ہی ان کی تعلیم وتربیت ہوسکی لہٰذا ان کی اکثریت جاہ پسندوں کے ورغلانے میں آگئی۔اس ارتداد میں خارجی سیاسی قوتوں اور مذہبی جماعتوں کی شمولیت کو بھی مستبعد نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔یہ تمام لشکر مجموعی طور پر اپنے مقاصد میں کامیاب رہے۔

18.6.5 مانعین زکاۃ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ چونکہ اب رسول اللہ نہیں رہے اس لئے تو زکاۃ بھی دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔یہ دین میں ایک بڑا رخنہ تھا۔اسلام کی ایک بنیاد مسمار ہورہی تھی۔حضرت ابوبکر نے صحابہ کو مشورے کے لئے بلوایا۔تمام صحابہ نے زکاۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے لڑائی کرنے کو منع کیا۔حضرت عمرؓ ان لوگوں سے جہاد کے لئے کسی طور پر راضی نہیں تھے کیونکہ یہ لوگ کلمہ بھی پڑھ رہے تھے' نماز بھی ادا کررہے تھے اور خود کو مسلمان بھی مانتے تھے۔ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کیسے کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہاں بھی حضرت ابوبکر کی عزیمت اور رائے کی صحت کام آئی۔آپ نے نہایت سختی سے حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کی رائے ماننے سے انکار کردیا اور فرمایا:

> ''خدا کی قسم اگر انھوں نے مجھے ایک رسّی بھی دینے سے انکار کیا جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا .... میں نماز و زکاۃ میں فرق کرنے والوں سے ضرور جہاد کروں گا۔''

زکاۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے والوں کا زیادہ تعلق مدینے کی گردونواح سے تھا۔انھوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنی بات خلیفہ تک پہنچائی جب حضرت ابوبکرؓ نے اسے سختی سے انکار کردیا تو انھوں نے طاقت کے ذریعے اپنی بات منوانے کے لئے مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔لیکن خلیفۃ المسلمین کو ان کے ارادوں کی خبر مل گئی اور اس سے پہلے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور ہوتے مسلمانوں نے ان پر حملہ کردیا۔جو لوگ حضرت اسامہ کے لشکر کی روانگی کے سبب مدینہ کو مجاہدین سے خالی سمجھتے تھے ان کے اوسان خطا ہوگئے۔اور وہ سب شکست کھا کر لوٹے۔یہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا پہلا معرکہ تھا لیکن بے حد دوررس نتائج کا حامل۔اور حضرت ابوبکر کی ایمانی جرأت اور رائے کی صحت کی دلیل تھا۔

18.6.6 فتوحات

حضرت ابوبکر کے مختصر عہد خلافت میں نہ صرف مدعیان نبوت اور مرتدین کی سرکوبی کی گئی اور مانعین زکاۃ کو زکاۃ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا بلکہ شام و عراق میں فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

حضرت ابوبکر نے خالد بن ولید اور عیاض بن غنم کو پوری جنگی حکمت عملی سمجھا کر عراق روانہ کیا۔بعد میں مثنی بن حارثہ بھی جہاد عراق میں شریک ہوگئے۔عراق میں پہلا معرکہ معرکۂ ذات سلاسل تھا جس میں مسلمانوں کو تاریخ ساز کامیابی ملی۔اس کے بعد مسلمان عراق کے قلعوں کو ایک کے بعد ایک ڈھاتے چلے گئے۔مسلمانوں نے عراق میں حیرہ،انبار،دومتہ الجندل اور فراض کے اہم معرکے سر کئے۔

شام فتح کرنے کے لئے خلیفۃ المسلمین نے حضرت خالد بن سعید بن عاص کو روانہ کیا بعد میں عبیدہ بن جراح، یزید بن ابوسفیان' شرحبیل بن حسنہ اور عمر بن عاص وغیرہ کو بھی لشکر کے ساتھ شام روانہ کیا ان لشکروں کے ساتھ حضرت خالد بن ولید کا لشکر بھی آکر مل گیا۔ان کی قیادت عامہ میں مسلمانوں نے نہ صرف سرحدی علاقے بلکہ جنوبی شام کے بڑے حصے پر فتح حاصل کرلی اور معرکہ اجنادین اور یرموک میں تاریخی کامیابی حاصل کی۔حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں ہی دمشق کا محاصرہ بھی شروع ہوگیا تھا اور عراق شام کے علاوہ بھی کئی فتوحات حاصل ہوئی تھیں۔

18.6.7 جمع قرآن

خلافت صدیقی کا ایک اہم کارنامہ جمع قرآن بھی ہے۔جب یمامہ کی جنگ میں حفاظ قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی تو صحابہ کو ڈر ہوا کہ کہیں اس طرح قرآن ضائع نہ ہوجائے۔لہٰذا حضرت ابوبکر کے حکم سے حضرت زید بن ثابت نے قرآن کے مختلف اجزاء کو مصحف کی صورت میں جمع کیا۔اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن میں پہلے سے کوئی ترتیب نہیں تھی بلکہ عہد نبوی میں ہی قرآن مرتب تھا اور صحابہ اور ان میں سے حفاظ بھی ترتیب قرآن سے واقف تھے لیکن جن اوراق پر عہد نبوی میں قرآن لکھا گیا تھا وہ مرتب نہیں تھے۔عہد صدیقی میں انھیں اوراق میں ترتیب دیکر کتابی شکل دی گئی۔کاتبین وحی اور حفاظ قرآن قرآن کی نبوی اور الہامی ترتیب سے واقف تھے، مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت' آیتیں یا سورت نازل ہوتی تو آپ اپنے کاتبین سے فرماتے کہ اسے فلاں آیت سے پہلے اور فلاں کے بعد لکھو۔ان سورتوں کے نام بھی عہد نبوی ہی میں طے ہوگئے تھے۔

18.6.8 وفات

حضرت ابوبکر جمادی اخری 13ھ میں بیمار ہوئے اور آپ کی بیماری بڑھتی گئی۔ جب ان کو اپنے آخری وقت کے آجانے کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے جانشین کے لئے وصیت کی تا کہ مسلمانوں میں اس کے لئے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو۔ اور حضرت عمر کا نام تجویز کیا۔ اس کے بعد مرض مزید بڑھتا گیا اور تقریباً پندرہ دن کی علالت کے بعد منگل کی شب 22/ جمادی اخری 13ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت ابوبکر کی بیعت کس تاریخ میں ہوئی؟
2. کس خاتون نے نبوت کا دعوی کیا؟
3. حضرت ابوبکر کی خلافت کا پہلا معرکہ کس کے ساتھ تھا؟
4. حضرت ابوبکر کے حکم سے کس صحابی نے قرآن جمع کیا؟

18.7 نظم ونسق

حضرت ابوبکرؓ ملکی نظم ونسق کبار صحابہ کے مشورے سے انجام دیتے تھے۔ اگر چہ ان کے عہد میں کوئی مستقل مجلس شوری نہیں تھی جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی تھی تو آپ صحابہ کو بلا کر ان سے مشورہ کرتے تھے۔ کتاب وسنّت کی کسی نص کی تعیین اور توضیح یا غیر منصوص مسائل میں فقہائے صحابہ سے مشورہ کرتے تھے ان میں حضرت عمر، عثمان، علی، عبدالرحمان بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت وغیرہ شامل تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں آکر عام مسلمانوں کے مشورے بھی حاصل کرتے تھے۔

مختلف علاقوں کے والیوں کے انتخاب میں علم وفضل کے بجائے حضرت ابوبکر نے ان کی صلاحیت وقدرت کو اہمیت دی تھی۔ یہ انتخابی طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تھا۔ چنانچہ عہد نبوی میں عثمان بن ابی العاص، خالد بن ولید اور اسامہ بن زید وغیرہ کا فوجی قیادت اور سیاسی ولایت کے لئے اسی بنیاد پر انتخاب ہوا تھا۔ بیت المال کا انتظام وانصرام ابوعبیدہ بن جراح کے سپرد تھا' نظام عدل عام طور پر حضرت عمر کے زیر نگرانی تھا۔ مجلس شوری کے ارکان بھی فیصلے کرتے تھے۔ حنظلہ بن ربیع، عبداللہ بن ارقم اور عبداللہ بن خلف خزاعی خلیفہ کے کاتب اور سکریٹری کے طور پر کام کرتے تھے۔ حج کے امور عبدالرحمٰن بن عوف کے سپرد تھے۔ زید بن ثابت کاتب بھی تھے اور مفتی وقاضی بھی۔ حضرت ابوبکر کی خلافت میں قاضی کا کوئی مستقل منصب نہیں تھا۔ خلیفہ خود فیصلے کرتا تھا اور اس طرح مختلف علاقوں میں وہاں کے گورنر فیصلے کرتے تھے یا ان کا مقرر کردہ یہ ذمہ داری ادا کرتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اگر کسی کے سپرد کوئی ذمہ داری کرتے تو اسے خوف خدا کی نصیحت کرتے تھے۔ اس کے اختیارات اور حقوق و واجبات کی وضاحت بھی فرماتے تھے۔ تمام عہدیداروں کے قول وفعل کی نگرانی کرتے تھے اور تمام والیوں اور گورنروں پر نظر رکھتے

اور غلطیوں اور لغزشوں پر ان کی سخت تادیب کرتے تھے۔ اپنی تمام تر نرمی کے باوجود حدود اللہ کی تنفیذ میں بے حد سخت رہتے تھے۔ عامہ الناس کے امن و امان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ عبداللہ بن ایاس سلمی ایک بڑا راہزن اور ڈاکو تھا اسے باقاعدہ ایک مہم کے ذریعے گرفتار کرایا اور قرار واقعی سزا دی۔

ذمیوں کا بے حد خیال رکھتے تھے یمامہ کے گورنر مہاجر بن امیہ نے ایک ذمی عورت کو مسلمانوں کو گالی دینے کے عوض سزا دی اور اس سزا میں اس کے ہاتھ کٹوا دیے اور دانت اکھڑوا دئے۔ اس پر حضرت ابوبکر نے ان کی سخت سرزنش کی کہ جب ہم ان کے کفر کو نظر انداز کرتے ہیں تو صرف مسلمانوں کو گالی دینے پر انھیں ایسی سزا کیسے دے سکتے ہیں؟ اور فرمایا کہ اگر یہ تمہاری پہلی خطا نہ ہوتی تو میں تمھیں سزا دیتا۔

ملکی نظام کو چلانے کے لئے تمام مفتوحہ علاقے کو کئی انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر اکائی کے لئے ایک والی یا گورنر ہوتا تھا وہ خلیفۃ المسلمین کی نیابت میں اس علاقے کا نظم و نسق دیکھتا تھا۔ ان والیوں یا گورنروں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. مدینہ منورہ۔ یہ اسلامی حکومت کا دار السلطنت اور ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور یہاں خود خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر رہتے تھے۔
2. مکہ مکرمہ۔ یہاں کے والی و امیر عتاب بن اسید اموی تھے۔ انھیں رسول اللہ نے مقرر کیا تھا حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں بھی وہ اپنے اس عہدے پر برقرار رہے۔
3. طائف۔ عثمان بن ابی العاص ثقفی۔ انھیں بھی رسول اللہ نے یہاں کا والی بنایا تھا۔
4. صنعاء۔ مہاجر بن ابی امیہ مخزومی۔ انھوں نے ہی صنعاء کو فتنۂ ارتداد کے بعد فتح کیا تھا اور انھیں کو اس کا امیر بنا دیا گیا تھا۔
5. حضرموت۔ زیاد بن لبید خزرجی۔
6. زبید (یمن)۔ ابوموسی اشعری
7. خولان۔ یعلی بن ابی امیہ
8. جند۔ معاذ بن جبل خزرجی
9. نجران۔ جریر بن عبداللہ بجلی
10. جرش۔ عبداللہ بن ثور
11. بحرین۔ علاء بن حضرمی
12. عمان۔ حذیفہ بن محصن
13. یمامہ۔ سلیط بن قیس خزرجی
14. شام و عراق۔ ان دونوں ملکوں کے مفتوحہ علاقوں کی امارت و گورنری وہاں کی فوجی قیادت کے پاس ہی رہی۔

زکاۃ جمع کرنے کا ایک مستقل صیغہ تھا۔کہیں کہیں یہ گورنر کے تابع تھا تو کئی جگہ پوری طرح سے مختار اور براہ راست خلیفہ کے زیرنگرانی تھا۔محصلین میں سے کچھ حسب ذیل تھے:

1. انس بن مالک۔ بحرین
2. سعد بن ابی وقاص۔ ھوازن
3. عمرو بن عاص۔ قضاعہ
4. سعد بن ابی ذیاب۔ دوس
5. عدی بن حاتم طائی۔ طے
6. زبرقان بن بدر تمیمی۔ بنوتمیم
7. ھثیم سلمی۔ بنوسلیم وغیرہ

18.7.3 آمدنی کے ذرائع

حضرت ابوبکر کی خلافت میں آمدنی کے عمومی ذرائع چار تھے:

1. جزیہ: یہ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ رقم صرف بالغ مردوں سے لی جاتی تھی۔بچوں اور عورتوں سے نہیں لی جاتی تھی۔
2. مال غنیمت: شرعی نقطۂ نظر سے مال غنیمت وہ مال ہے جس کا تعلق مسلمانوں سے جنگ کرنے والوں سے ہو اور مسلمان ان کو شکست دے کر بزور طاقت اس پر قابض ہوں۔
3. فئی: وہ مال جو دشمن سے بغیر قتال حاصل ہو۔
4. زکاۃ: یہ بھی آمدنی کا اہم ذریعہ تھا اور اس کے لئے محصلین مقرر کئے گئے تھے۔

18.7.4 مصارف واخراجات

حضرت ابوبکر کے عہد میں زکاۃ کا سب سے بڑا مصرف جہاد فی سبیل اللہ تھا۔تالیف قلب کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر نے عدی بن حاتم اور زبرقان بن بدر کو زکاۃ کی رقم میں سے عطا کیا۔فقراء پر بھی یہ رقم خرچ کی جاتی تھی اور کبھی کبھی خود خلیفہ اپنے ہاتھ سے اسے تقسیم کرتے تھے۔غنیمت اور فئی کے مصارف کا ذکر واضح طور پر قرآن میں موجود ہے۔اسی کے مطابق اسے صرف کیا جاتا تھا۔حکومت کے اخراجات بھی انھیں آمدنیوں سے پورے ہوتے تھے۔

18.8 علم وفضل

18.8.1 مکان ومرتبہ

حضرت ابوبکرؓ کے بہت سارے فضائل ومناقب کا بیان گزر چکا ہے۔قرآن کریم نے انھیں صاحب (سورۃ توبہ:40)اورتقی (سورۃ اللیل:17) کا لقب دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عتیق قرار دیا یعنی جہنم سے آزاداورصدیق کا لقب عطا کیا۔صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرحضرت عمراورحضرت عثمان کے ساتھ احد پہاڑ پر چڑھے تو احد ہلنے لگا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے احد ٹھہر جا کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دوشہید ہیں''۔ صحیح بخاری میں ہے کہ'' آپ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ آپ کومحبوب کون ہے؟ فرمایا: عائشہؓ پوچھا گیا مردوں میں؟ فرمایا: اس کے والد''۔ان کے علاوہ بے شماراحادیث وآثارحضرت ابوبکرؓ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

18.8.2 علمی حیثیت

حضرت ابوبکر نے اپنے تمام دوسرے معاصرین کی طرح باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کی فطری ذہانت وفطانت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وصحبت نے انھیں علم وفضل کا چشمہ بنا دیا تھا۔علم الانساب آپ کا خصوصی موضوع تھااورعرب کی قبیلہ جاتی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔اس فن میں کوئی ان کا مقابل نہیں تھا۔ادب اورشاعری میں بھی آپ کی مہارت مسلم ہے۔ آپ کی خطابت بھی بے مثال تھی۔آپ کی تقریریں نہ صرف زبان وبیان کا شاہکار ہیں بلکہ اثرانگیزی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

حضرت ابوبکرعلم تفسیر کے رمز شناس تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمہ وقت کی صحبت نے انھیں قرآن کے مفاہیم و مطالب میں غیرمعمولی ملکہ عطا کیا تھا چنانچہ متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جوان کی قرآنی فہم اوراجتہادی قوت کا پتہ دیتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓشعری ذوق بھی رکھتے تھے۔ایک بارانھوں نے سبط رسول حسین بن علیؓ کوکھیلتے ہوئے دیکھا توانھیں اللہ کے رسول کی یادآگئی اوربے ساختہ کہہ اُٹھے:

بِأبيِ شبيه بالنبيِ

ليس شبيها ًبعليِ

(میرے باپ قربان یہ نبی سے مشابہت رکھتے ہیں علی کے مشابہ نہیں ہیں)

حضرت ابوبکر کے فضائل کے بارے میں جوکچھ بیان کیا گیا وہ عام طور پراہل سنت والجماعت کے فکر کے مطابق ہے۔شیعہ امامیہ حضرات کے نزدیک امامت وخلافت صرف اہل بیت کا حق ہے۔ زیدی شیعہ کے نزدیک حضرت ابوبکراورعمر کی خلافت وامامت درست ہے۔اگرچہ حضرت علی اس منصب کے لئے زیادہ حق دار تھے۔

امریکہ کے مشہورمورخ اورکاتب واشنگٹن ارونگ اپنی کتاب ''محمدؐاوران کے خلفاء''میں حضرت ابوبکر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ ایک عظیم حکومت کے مالک تھے' بے حد محتاط اور بیدار مغز تھے' ایک ماہر منتظم تھے۔ اپنے اہداف و مقاصد میں سچے اور انانیت سے دور تھے۔ یہ مقاصد شخصی کے بجائے عام مصلحت کے لئے ہوتے تھے۔ دنیا کی طلب سے خالی تھے' دولت و جاہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ اپنی خدمات کی قیمت طلب کرتے تھے سوائے اس قدر جتنا ایک سادہ عربی زندگی کے لئے کافی ہو۔ ان کے پاس صرف ایک اونٹ اور ایک سیاہ فام غلام تھا۔ بیت المال کی اضافی آمدنی کو ہر جمعہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس کی تھوڑی رقم جزاء وعطا میں خرچ ہوتی تھی۔ باقی سب فقراء میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور مصیبت زدہ لوگوں کی اپنے مال خاص سے بھی مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔''

18.9 خلاصہ

جانشین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات دوستی ووفاداری، ایمان و یقین صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور جرأت و ہمت کا ایک بے مثال نمونہ تھی۔ آپ نے اسلام کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ہجرت کے پر خطر سفر میں رسول اسلام کے ساتھ رہے اور اسلام و کفر کے تمام معرکوں میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ اسلام کو ان کے حال سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ معتمد علیہ اور سب سے قریبی مشیر تھے۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنی حیات طیبہ میں انھیں حج کی امارت وقیادت عطا فرمائی۔ اور اپنی علالت کے دوران انھیں مسلمانوں کی امامت کرنے کا حکم دیا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمان عقل و خرد سے بے گانہ ہو چکے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرزانگی کا ثبوت دیا اور حالات کو قابو میں کیا سقیفہ بنوساعدہ میں پہنچ کر اگر آپ نے حالات کو قابو میں نہ کیا ہوتا اور انصار صحابہ کو سمجھانے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے تو بیرونی مشکلات کے ساتھ یہ اندرونی مشکل اسلام کے وجود کو ہی مٹا دیتی۔ اللہ کے رسول کے بعد مسلمانوں نے انھیں خلیفۂ رسول کے طور پر منتخب کیا۔ اور آپ نے رسول اللہؐ کے بعد پیدا ہونے والے دشوار ترین حالات کا جس دانائی، حکمت اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا وہ آپ کا ہی حصہ تھا۔ آپ نے باغیوں، مرتدوں اور نبوت کے دعویداروں سے سہ رخی مقابلہ کیا اور سب کو شکست دے کر اسلام کو استقرار اور قوت بخشی اور حضرت عمر کو ایک ایسی پختہ اور ہموار زمین فراہم کی جو ان کے عہد کی عظیم الشان فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ اگر چہ حضرت ابوبکر کا عہد خلافت بے حد مختصر تھا لیکن جو عظیم الشان کارنامے اس مختصر عرصے میں انجام دئے گئے وہ حضرت ابوبکرؓ کی عظمت و کمال، حکمت و دانائی، صحت رائے اور قوت فیصلہ کا بین ثبوت ہے۔

18.10 نمونے کے امتحانی سوالات

نیچے دیئے گئے سوالوں کے جواب لکھئے، کوئی جواب تیس سطروں سے کم نہ ہوں:

1. حضرت ابوبکر کے ذاتی احوال اور ملی زندگی پر ایک مضمون لکھئے۔
2. حضرت ابوبکر کے فضائل ومناقب پر روشنی ڈالئے۔

3. خلافت صدیقی کے کارناموں پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

نیچے دیئے گئے سوالوں کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1 ہجرت نبوی میں حضرت ابوبکر کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

2. وفات رسول کے بعد حضرت ابوبکر کے موقف کو بیان کیجیے۔

3. خلافت صدیقی میں ملکی نظم ونسق پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

18.11 فرہنگ

سوانح	حالات زندگی
مجوب کرنا	پردہ ڈالنا
لامتناہی	نہ ختم ہونے والا
قدسی نفوس	فرشتوں جیسے
ہم زاد	چچازاد
نبات	گھاس
عشائر	عشیرہ کی جمع: قبیلے کا ایک حصہ
عنفوان شباب	نوجوانی
اسفار	جمع سفر
قاسم مشترک	ایک جیسی صفات
تہی دست	خالی ہاتھ
دستگیری	ہاتھ پکڑنا
عمائدین	سرداروں
مخاطر	خطرات
متمول	مالدار
زیاں	نقصان

زدوکوب	مار پیٹ
مقاطعہ	بائیکاٹ
حصار	گھیرابندی
مدافعت	دفاع کرنا
دوآتشہ	دہرا
اساطین	بڑے سردار
مژدۂ جانفزا	دل کوخوش کرنے والی خبر
کدوکاوش	کوشش
ایں خانہ ہمہ آفتاب است	اس گھر کا ہرفرد سورج کے مانند ہے
طالع آزمائی	قسمت آزمانا
تگ ودو	بھاگ دوڑ
مواساۃ	ہمدردی
گریہ والحاح	گریہ وزاری واصرار
سَدِّ باب	دروازہ بندکرنا
شکیب	صبر
مفاخرت	باہم فخر کرنا
بیخ کنی	جڑ کھودنا
درخوراعتناء	قابل توجہ
مہیب	ڈراؤنے
مدعیان نبوت	نبوت کے دعویدار
مرتدین	اسلام سے پھرنے والے
مانعین زکاۃ	زکاۃ دینے سے منع کرنے والے
سجع	شعری انداز کی نثر

ہوش ربا	ہوش اڑانے والی
سرکوبی	سر کچلنا
مہبط	اترنے کی جگہ

18.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الطبقات الکبری (اردو ترجمہ) ابن سعد
2. ابوبکر صدیق (اردو ترجمہ) حسین محمد ھیکل
3. سیر الصحابہ (جلد اول) شاہ معین الدین ندوی
4. AShort History of the Saraceng - Ameer Ali Syed
5. Mahomet(Mohammed) and His Successors Washington Irving

اکائی 19 : حضرت عمر ابن خطابؓ

اکائی کے اجزاء

19.1 مقصد

19.2 تمہید

19.3 ذاتی احوال

19.4 اسلام کے بعد مکی حیات

19.5 مدنی زندگی

19.6 عہد خلافت

19.7 نظم ونسق

19.8 مقام ومرتبہ

19.9 خلاصہ

19.10 نمونے کے امتحانی سوالات

19.11 فرہنگ

19.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

19.1 مقصد

اس اکائی کا بنیادی ہدف فاتح شام وعراق وفاتح ایران، مصر حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کی شخصیت اور سوانح حیات سے طلبہ کو آگاہ کرنا، انھیں ان کی ہمہ جہت ذات اور گوناگوں صفات سے واقف کرانا اور اسلامی حکومت کی توسیع اور اس کے خدوخال کی تشکیل میں ان کے مثالی کردار پر روشنی ڈالنا ہے۔ ان کے طریقہ حکمرانی اور ملکی نظم ونسق کا بیان اور ان کی اولیات کا ذکر بھی اس اکائی کے مقاصد میں سے ہے۔

19.2 تمہید

حضرت ابوبکر کی وفات کے وقت پورا جزیرۂ عرب اسلامی پرچم کے زیر سایہ اسی طرح متحد اور مستحکم تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دور میں تھا۔حضرت ابوبکر کی حکیمانہ قیادت اور صحابہ کرام کے بے لوث جذبہ قربانی وفداکاری نے نہ صرف ارتداد انکار زکاۃ اور دعوی نبوت کے فتنوں کا سدباب کیا بلکہ ایک طاقت ور منظّم اور مضبوط نظام حکومت بھی قائم کیا جس کی اساس اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی ۔ یہ ایک مثالی نظام اور فلاحی ریاست تھی ۔ جب اندرونی فتنوں کا خاتمہ ہوا اور امن وامان پوری طرح سے قائم ہوگیا تو صحابہ کرام اسلام کی نشرواشاعت اور اس کے فیوض وبرکات سے پوری انسانیت کو بہرہ ور کرنے کی طرف متوجہ ہوئے کتاب وسنت میں اسلام کی تبلیغ واشاعت پر جس قدر اجروثواب کی بشارت دی گئی ہے اس نے صحابہ کے دلوں میں جوش وجذبے کا ایک سمندر موجزن کردیا تھا۔مشیّت الٰہی نے اس امن واستقرار کے عہد میں مسلمانوں کو حضرت عمر جیسا امیر عطا کیا۔جن کی حکیمانہ اور عادلانہ قیادت میں مسلمانوں نے دنیا کی تاریخ اور جغرافیا دونوں کو بدل دیا۔

19.3 ذاتی احوال

19.3.1 نام ونسب' کنیت ولقب

حضرت عمر دوسرے خلیفۂ راشد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر ومعتمد، جنت کی بشارت پانے والے دس صحابہ میں سے ایک، عظیم فاتح اور عدل وانصاف میں ایک مثالی شخصیت تھے ۔آپ کا نام عمر تھا اور کنیت ابوحفص تھی ۔ عدل گستری اور انصاف پروری میں یکتا ہونے کے سبب آپ کا لقب فاروق پڑ گیا یعنی حق وباطل اور صحیح وغلط کے درمیان فیصلہ کرنے والا ۔اس لقب کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اپنے اسلام کا بانگ دہل اعلان کیا۔اور اس طرح حق وباطل کے درمیان تفریق کی۔آپ کا سلسلۂ نسب مندرجہ ذیل ہے:

عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزی بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن نضر ۔نضر ہی کو قریش کہتے ہیں ۔کعب بن لؤی پر آپ کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔عدی بن کعب کے نام پر آپ کا قبیلہ بنوعدی کہلاتا تھا۔آپ کے والد کا نام خطاب اور والدہ کا نام حنتمہ تھا۔والدہ کی جانب سے آپ کا نسب یہ ہے: حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی۔

19.3.2 خاندان

حضرت عمر کا خاندان قریش کے معزز خاندانوں میں سے ایک تھا۔قریش کی سفارت اسی خاندان کے پاس تھی اور یہ منصب عدی بن کعب کے زمانے سے آپ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔اس کے علاوہ قریش کے باہمی نزاعات میں اس خاندان کے سربراہ کو حکم بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب رسول اللہ کے دادا عبدالمطلب اور حرب بن امیہ کے درمیان قیادت کا اختلاف ہوا تو حضرت عمر کے دادا نفیل بن عبدالعزی کو حکم بنایا گیا اور انھوں نے عبدالمطلب کے حق میں فیصلہ دیا۔

حضرت عمر کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی عقل وفراست کی روشنی میں بت پرستی کو ترک کرکے توحید کو اپنا لیا تھا اور لوگوں کو دین ابراہیمی کی دعوت دیا کرتے تھے۔حضرت عمر کے والد بھی قریش کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ان کے نانا ہشام بن مغیرہ بھی بلند مرتبہ شخص تھے۔

19.3.3 ولادت وپرورش

حضرت عمر کی ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تیرہ سال بعد ہوئی۔بچپن کے زیادہ احوال معلوم نہیں ہیں۔ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ بچپن میں اونٹ چرایا کرتے تھے۔انھوں نے شرفاء کے بچوں کی طرح کشتی، گھڑ سواری اور سپہ گری کی تعلیم پائی۔شعر گوئی اور خطابت میں بھی حصہ پایا کیونکہ ان کے خاندان میں سفارت اور ثالثی کے مناصب اور ان دونوں کے لئے خطابت میں مہارت بے حد ضروری تھی۔علاوہ ازیں حضرت عمر قریش کے ان چند نوجوانوں میں سے تھے جنھیں لکھنا پڑھنا آتا تھا۔

عرب کے بازاروں جیسے عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز میں کثرت سے آیا جایا کرتے تھے جہاں انھوں نے شاعری میں مہارت پیدا کی۔تجارت کا ہنر سیکھا اور بطور تاجر قابل ترقی کی۔گرمیوں میں شام اور جاڑوں میں یمن کا تجارتی سفر کرتے تھے۔مشرکانہ اور جاہلی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں پرورش و پرداخت ہوئی چنانچہ اپنی قوم ہی کا دین اختیار کیا سختی وشدت مزاج کا حصہ بھی تھی اور باپ سے وراثت میں بھی پایا تھا جو حضرت عمر کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انھیں سخت سزائیں دیتے تھے۔

19.3.4 حلیہ

حضرت عمر طویل قامت اور بھاری بدن کے تھے۔رنگ بے حد گورا اور سرخی مائل تھا۔مونچھیں بے حد گھنی تھیں۔داڑھی میں مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔سر پر بال بے حد کم تھے۔داڑھی کے سامنے کے بال کافی لمبے تھے۔جب کہ گالوں پر بال کم لمبے تھے۔ اپنے طویل قد کے سبب جب گھوڑے پر بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا زمین پر کھڑے ہوں۔آپ بے حد تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے۔ رونے کی کثرت سے دونوں گالوں پر دو سیاہ لکیریں نمایاں تھیں۔

19.4 اسلام کے بعد مکی حیات

19.4.1 قبول اسلام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 40 میلادی اور 610 عیسوی میں ہوئی۔ابتدائی تین سالوں تک اسلام کی دعوت وتبلیغ خفیہ طور پر ہوتی رہی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اعلانیہ دعوت کا حکم دیا گیا تو قریش نے اس دین جدید کی مخالفت شروع کر دی اور مسلمانوں کو ایذا دینے لگے۔حضرت عمر دشمنی وایذا رسانی میں سب سے آگے تھے۔ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔جب انھوں نے اس کی اطلاع پائی تو اس مظلوم عورت پر بے حد ظلم وتشدد کیا۔اسے باندھ کر صبح سے شام تک مارتے اور صرف اس وقت مارنا بند کرتے جب پوری طرح تھک جاتے۔یہی نہیں جس مسلمان کو بھی پاتے اس سے مار پیٹ کرتے اور انھیں ڈراتے دھمکاتے۔

یہ ان کی دینی سختی تھی یا قومی عصبیت ہر وقت اسلام کو مٹانے کے لئے کوشاں رہتے اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت پر غضبناک رہتے۔ایک طرف تو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پوری قوت سے سرگرم عمل تھے تو دوسری طرف ان کے اندر ایک عجیب کشمکش بھی جاری تھی۔عصبیت اور معقولیت کی کشمکش۔اگر ان کی عصبیت انھیں اسلام دشمنی کی طرف لے جاتی تھی تو ان کی معقولیت انھیں

دعوت فکر دیتی تھی کہ شاید مسلمان برحق ہوں ۔ان کے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ ان کی استقامت اور ہمت عجیب وغریب ہے ۔ یہ لوگ جو کلام پڑھتے ہیں وہ کتنا شیریں اور دل نشیں ہے ۔اور خود ان کے سردار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنی شرافت ونجابت اور اپنے اخلاق وکردار میں بے مثل ہیں ۔ یہاں تک کہ ان کے دشمن بھی انھیں صادق وامین مانتے ہیں ۔اس سے پہلے کہ ان کی معقولیت ان کی عصبیت پر غالب آتی مادیت کی کمک ان کی عصبیت کو طاقت پہنچا دیتی تھی وہ انھیں یاددلاتی کہ وہ سفیر قریش اور قریش کے بڑے سرداروں میں سے ایک ہیں ۔اگر اسلام کامیاب ہوتا ہے تو یہ جاہ ومنصب جاتا رہے گا ۔ان کی یہ داخلی اور فکری کشمکش عرصے تک جاری رہی ۔

ان کے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں عام طور پر جو قصہ بیان کیا جاتا ہے صرف اسی کو تنہا ان کے اسلام لانے کا سبب سمجھنا معقول ومناسب نہیں ۔حضرت عمر جیسے عقلمند اور مستقل مزاج شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ کسی ایک واقعے یا حادثے نے ان کے اندر اتنی بڑی تبدیلی پیدا کردی صحیح نہیں لگا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت ان کے دل کے دروازے میں عرصے سے دستک دے رہی تھی ۔اور ان کے اندر زمانے سے ایک ذہنی وفکری کشمکش جاری تھی ۔ چنانچہ خاص واقعے نے معقولیت کو عصبیت پر اور حقانیت کو مادیت پر غالب کردیا۔علاوہ ازیں ان سب پر مستزاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تھی جو حضرت عمر کے قبول اسلام کا سبب بنی امام ترندی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ:

''اے اللہ عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما''

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اسلام کے خلاف حضرت عمر کے غصے کو مزید بھڑکا دیا۔ ہوایوں کی ایک دن حضرت حمزہ نے جو کہ اسلام لا چکے تھے' ابوجہل کی زبردست تذلیل کی ۔ چونکہ ابوجہل اسلام دشمنوں کا سرخیل اور سردار تھا لہٰذا سبھی تلملا اٹھے ۔ابوجہل حضرت عمر کا ماموں تھا لہٰذا وہ بے حد غضبناک ہوئے اور انھوں نے ایک انتہائی خطرناک فیصلہ لے لیا۔اور وہ فیصلہ تھا نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کا ۔(معاذ اللہ)

حضرت عمر یہ فیصلہ کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف بڑھے ۔ان کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی' راستے میں ان کے ہم قبیلہ حضرت نعیم بن عبداللہ ملے ۔انھوں نے پوچھا کہ: اے عمر یہ ننگی تلوار لے کر کہاں جارہے ہو؟ کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کردینا چاہتا ہوں ۔حضرت نعیم نے ان سے کہا: ''یہ تمھارے نفس کی فریب دہی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کے بعد بنوعبدمناف تمھیں چھوڑ دیں گے ۔ پہلے تم اپنے گھر جاؤ اور وہاں کے معاملات درست کرو کیونکہ تمھارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زید بن عمر اور تمھاری بہن فاطمہ بنت خطاب خود مسلمان ہوگئے ہیں ۔'' حضرت نعیم نے یہ ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا کہ حضرت عمر کی توجہ بھٹک جائے اور وہ فوری طور پر اپنے ارادے سے باز آجائیں ۔اور یہی ہوا بھی وہ بہت ہی غیظ وغضب کے ساتھ اپنی بہن کے گھر پہنچے ۔اس وقت حضرت خباب بن ارت ان دونوں کو قرآن کی تعلیم دے رہے تھے ۔حضرت عمر نے سب سے پہلے بہنوئی کو مارا پھر بہن کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ ان کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔اور قرآن کے اوراق ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے ۔حضرت عمرؓ نے ان اوراق کو اٹھا کر پڑھنا چاہا تو ان کی بہن نے تڑپ کر کہا کہ عمر بغیر وضوء کے انھیں ہاتھ مت لگاؤ اور تمھارا جو دل چاہے کرو لیکن اب اسلام کا دامن نہیں چھوٹ سکتا۔ بہرحال حضرت عمر نے وضو کیا اور اس صحیفے کو پڑھنے لگے: اس میں سورہ طہٰ کی ابتدائی آیات تھیں:

طه(1) مَا اَأنزَلنَا علَیَکَ القُرآن لتشقٰی (2) اِلّا تَذکِرۃً لِمَن یَخشیٰ(3) تَنزِ یلًا مّمنَ خَلَقَ الارضَ والسمٰواتِ العُلا (4) الرَّحمٰنُ عَلی العَرشِ استَوَی (5) لَہ مَافِی السَّمٰواتِ وَمَافِی الأَ رضِ ومَا بینَھُمَا وَمَاتَحتَ الثَّرَیٰ(6)

ان آیات کی تاثیر سے حضرت عمر کانپ اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے اسلام لے آئے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔بعض روایات میں سورہ طہ کے بجائے سورہ حدید کی آیات کا ذکر آیا ہے۔

وہاں سے حضرت عمر نے بارگاہ رسول کا قصد کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حضرت ارقم ابن ابی الارقم کے مکان پر تھے جو صفا پہاڑی کے نیچے واقع تھا۔حضرت عمر جب وہاں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو صحابہ کو دروازہ کھولنے میں تامل ہوا کیونکہ وہ شمشیر بکف تھے لیکن حضرت حمزہ نے کہا آنے دو اگر نیک نیتی کے ساتھ آیا تو کوئی بات نہیں ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کردوں گا۔حضرت عمر رسول اللہ کے قریب آئے۔اللہ کے رسول نے ان سے پوچھا: اے عمر! کیوں آئے ہو عرض کیا ایمان لانے کے لئے۔

19.4.2 بعد اسلام

آپ سے پہلے صرف انتالیس لوگ ایمان لائے تھے۔آپ کے قبول اسلام کے سلسلے میں اور بھی روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان روایتوں کے اختلاف کے سبب آپ کو قبول اسلام کے وقت اور اس وقت آپ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔غالب گمان یہ ہے کہ آپ پانچ سے سات سنہ نبوی کے درمیان ایمان لائے اور باختلاف روایت اس وقت آپ کی عمر ستائیس سے تیس سال کے درمیان تھی۔

حضرت حمزہ اور حضرت عمر کے اسلام لانے سے قبل مسلمان کفار قریش کے ظلم وستم سے ڈر کر اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ لیکن ان دونوں نے شروع ہی سے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور بلاخوف خطر کیا اور اصرار کر کے مسلمانوں کے ساتھ علی الاعلان طواف کیا۔مسلمانوں کی دو صفیں دارارقم سے نکلیں ایک کی قیادت حضرت حمزہ کر رہے تھے اور دوسری کی حضرت عمر اور درمیان میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔اس طرح مسلمانوں نے پہلی بار بآواز بلند' تکبیر وتہلیل کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔حضرت عمر سے مروی ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فاروق کا لقب دیا۔

حضرت عمر کا اسلام اسلامی تاریخ کا ایک بے حد اہم واقعہ ہے۔آپ کے اسلام نے اسلام کی طاقت وشوکت میں اضافہ کیا۔ اور مسلمانوں کو ایک طاقتور اور بہادر حمایتی مل گیا۔صہیب رومی فرماتے ہیں کہ: ''جب حضرت عمر اسلام لائے تو اسلام نمایاں ہوا اور اعلانیہ اسلام کی تبلیغ ہونے لگی' ہم لوگ کعبہ کے پاس بیٹھنے اور اس کا طواف کرنے لگے''۔حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ:''ہم لوگ عمر کے اسلام لانے سے پہلے کعبہ کے پاس جاکر نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔''

19.4.3 ہجرت

جب نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 622ء کے قریب مسلمانوں کو مدینہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا۔تو بہت سارے مسلمان مدینہ ہجرت کر گئے۔لیکن یہ سارے مسلمان چھپ کر ہجرت کر رہے تھے۔لیکن حضرت عمر نے چھپ کر ہجرت کرنا گوارا نہ کیا۔رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنے جسم پر تلوار ٹانگی' کمان کو کاندھے پر رکھا' اپنا ترکش پہنا' اپنا مضبوط ڈنڈا اُٹھایا اور مشرکین کے بیچ سے گزر کر کعبہ کے پاس آئے۔ اس کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر آ کر نماز ادا کی پھر وہاں پر موجود مشرکین کے گروہوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں مدینہ کی طرف روانہ ہو رہا ہوں...... ''جو اپنی ماں کی گود سونی کرنا چاہتا ہو وہ اس وادی کے پار مجھ سے ملے''۔ لیکن ان کا تعاقب کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی البتہ بہت سے کمزور اور مظلوم مسلمان آپ کے ساتھ ہو لئے تاکہ آپ کی ہیبت کے سائے میں ہجرت کر سکیں۔ بخاری میں ان کی تعداد 20 ر ذکر کی گئی ہے جن حضرات نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ان کے نام بخاری میں تو نہیں ہیں البتہ ان میں سے بعض کے ناموں کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے گھر والوں میں آپ کے بھائی زید بن خطاب' آپ کے داماد خنیس بن حذافہ جو حضرت حفصہ کے شوہر تھے اور جنت کی بشارت سے سرفراز حضرت سعید بن زید وغیرہ بھی تھے۔ مدینہ پہنچ کر پہلے آپ نے قبا میں قیام کیا اور آپ کا یہ قیام رفاعہ بن منذر کے یہاں تھا۔ قبا ہی کا ایک نام عوالی بھی ہے۔ بعض کتابوں میں قبا کے بجائے عوالی مذکور ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم کرایا تو عتبان بن مالک خزرجی کو آپ کا بھائی بنا دیا۔

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا پہلا سال آرام وراحت کا گزرا۔ مکہ کے برخلاف یہاں مسلمان آزادی کے ساتھ اپنے شعائر پر عمل کر سکتے تھے۔ مسلمان مدینے کے مختلف محلوں میں آباد تھے لہٰذا اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ نماز کے اعلان کا کوئی طریقہ تلاش کیا جائے۔ کسی نے ناقوس کے ذریعہ اعلان کا مشورہ دیا کسی نے آگ جلا کر اعلان کرنے کی بات رکھی۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کام کے لئے کسی کو مقرر کیا جائے اور اس کے لئے کچھ فقرے مقرر کر لئے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند آئی اور آپ نے حضرت بلال کو اذان کے لئے مقرر کیا اور آپ کا یہ مشورہ قیامت تک آپ کے لئے وجہ افتخار بن گیا۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت عمر کا تعلق قبیلۂ قریش کی کس شاخ سے تھا۔
2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے ساتھ اور کس کے ایمان لانے کی دعا کی۔
3. حضرت عمر سے پہلے کتنے لوگ ایمان لائے تھے؟
4. حضرت عمر کے ہمراہ کتنے لوگوں نے ہجرت کی؟

19.5 مدنی زندگی

19.5.1 غزوات

مدینہ میں مسلمانوں نے آرام وراحت کا تھوڑا وقفہ ہی پایا تھا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ معرکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے غزوہ بدر پیش آیا۔ جب کفار مکہ کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی اطلاع ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے

مشورہ کیا' حضرت ابوبکر کے بعد حضور نے انھیں مشورے کی دعوت دی۔اس موقع پر آپ نے نہایت عمدہ گفتگو فرمائی اور مشرکین مکہ سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔آپ کا تعاون صرف مشورے تک ہی نہیں رہا بلکہ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو آپ نے اپنی شجاعت اور جنگی مہارت کے جو ہر بھی دکھائے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے حقیقی ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا۔یہ ان کے ایمان کی پختگی اور یقین کی درستگی کی ایسی دلیل ہے جس کی تردید ممکن نہیں ہے۔

غزوہ بدر میں مسلمان کامیاب ہوئے۔مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے جن میں ابوجہل اور ولید بن مغیرہ جیسے لوگ تھے۔اور کئی بڑے سردار گرفتار ہوئے۔رسول اللہ نے ان ستر گرفتارشدگان کے بارے میں جب صحابہ سے رائے لی تو مختلف لوگوں نے مختلف مشورے دئے۔حضرت ابوبکر کی رائے تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے لیکن حضرت عمر کی رائے تھی سب کو قتل کر دیا جائے۔ اگر چہ عمل حضرت ابوبکر کی رائے پر ہوا لیکن بارگاہ خداوندی میں پذیرائی حضرت عمر کے قول کی ہوئی جس کا ذکر سورۂ انفال کی آیت 67 میں ہوا ہے۔

غزوہ بدر کے بعد مدینے کے یہودیوں سے کئی معرکے ہوئے اور حضرت عمر سب میں پیش پیش رہے۔غزوۂ احد میں جب فتح کے بعد مسلمان غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تو خالد بن ولید جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اچانک حملہ کر کے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔اس غفلت و انتشار سے فائدہ اُٹھا کر کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نشانہ بنا لیا۔اور آپ کی جانب تیراندازی اور پتھر بازی کرنے لگے جس سے آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔اس وقت جن جانثاروں نے آپ کے گرد حصار قائم کیا ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔جنھوں نے چند مہاجرین و انصار کے ساتھ ملکر حملہ آوروں کو بھگایا۔ ابوسفیان نے اس پہاڑی کے نیچے آ کر جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جانثاروں کے ساتھ تھے، آواز دی کے کیا اس گروہ میں محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے جواب دینے سے منع کر دیا۔تو ابوسفیان نے حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کا نام لے کر سوال کیا اس بار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے سے منع کر دیا اس پر ابوسفیان نے کہا کہ لگتا ہے کہ یہ سب مارے گئے۔یہ سن کر حضرت عمر اپنے پر قابو نہ رکھ سکے اور بولے اے دشمن خدا ہم سب لوگ زندہ وسلامت ہیں۔یہ سن کر ابوسفیان نے آواز لگائی ''أعلُ هبل'' یعنی ہبل بلند ہو۔اللہ کے رسول نے حضرت عمر سے فرمایا جواب دو ''اللّٰه أعلى و أجل'' یعنی اللہ بلند و برتر ہے۔بدر واحد کے بعد بھی تمام غزوات میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دئے 5ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا۔خندق کے ایک حصے پر رسول اللہ نے حضرت عمر کو متعین کیا اور انھوں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی۔

195.2 صلح حدیبیہ

6ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی لیکن حضرت عمر صلح سے راضی نہ تھے بلکہ جب قریش نے اللہ کے رسول اور ان کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا تو حضرت عمر اس پر بڑے برافروختہ ہوئے۔صلح کی شرائط نے انھیں بے حد غضبناک کر دیا۔صلح کے بموجب اگر قریش کا کوئی آدمی مدینہ میں پناہ لے تو اسے واپس کرنا پڑے گا لیکن اگر قریش کسی مسلمان کو پکڑ لیں تو اس کو واپس کرنا ضروری نہیں ہوگا۔حضرت عمر کی خودداری اور غیرت مند طبیعت کو شدید غصہ آیا وہ رسول اللہ کے پاس آ کر تیز لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔یہ وہ خود فرماتے ہیں: ''میں اللہ کے نبی کے پاس آیا اور عرض کیا کہ: کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا

بے شک، میں نے کہا: کیا ہم حق پر نہیں اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں، فرمایا: کیوں نہیں، میں نے کہا: پھر ہم اس قدر دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ رسول اللہ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ میرا مددگار ہے‘‘۔

اس کے بعد حضرت عمر حضرت ابوبکر کے پاس آئے‘ مؤخر الذکر نے بھی انھیں سمجھایا اور وہی باتیں کہیں جو اللہ کے رسول نے فرمائی تھیں۔ اگرچہ وہ خاموش ہوگئے اور صلح پر بطور گواہ دستخط بھی کئے لیکن صلح کے حوالے سے ان کا تردد برقرار رہا جب تک کہ سورۂ فتح نہیں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح مکہ کی بشارت نہیں مل گئی حضرت عمر کو صلح کے وقت اپنی تیز کلامی کا خوف و غم ساری زندگی بھر رہا۔ فرماتے ہیں کہ:

’’میں اب بھی اس تیز کلامی کی خطا کی تلافی کے لئے روزے رکھتا ہوں، نفل نمازیں پڑھتا ہوں، صدقات دیتا ہوں اور غلام آزاد کرتا ہوں اور خیر کی امید رکھتا ہوں۔‘‘

7ھ میں حضرت عمر نے غزوۂ خیبر میں شرکت کی۔ ایک دن علم اسلام آپ کو بھی مرحمت ہوا۔ لیکن قسام ازل نے فاتح خیبر ہونے کا شرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپ حضرت ابوعبیدہ کی قیادت میں جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں واقع ان قبائل سے جہاد کے لئے نکلے جو سلطنت روم کے زیر حمایت تھے۔ حضرت عمر اسلامی لشکر کے ساتھ ان قبائل کو شکست دینے کے بعد 8ھ میں فتح مکہ کے لئے روانہ ہونے والی اسلامی فوج میں شریک ہوگئے۔ فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر کو لے کر صفا کے قریب لوگوں سے بیعت لینے لگے۔ اژدحام کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو عورتوں سے بیعت لینے کے لئے مامور کیا چنانچہ تمام عورتوں نے انھی کے ہاتھ پر اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔

فتح مکہ کے بعد 8ھ ہی میں غزوہ حنین پیش آیا جس میں حضرت عمر نے اپنی بہادری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ نویں ہجری میں جب رومیوں کے حملے کی خبر مشہور ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے راہ خدا میں خرچ کرنے کی اپیل کی حضرت عمر نے اپنا آدھا مال لا کر پیش کر دیا۔

10ھ میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج ادا کیا اور آپ کی قربت و معیت سے خوب خوب استفادہ کیا۔

19.5.3 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور دوشنبہ 12/ربیع الاول 11ھ مطابق 7/جون 632ء میں آپ کا وصال ہوگیا۔ حضرت عمر کو اللہ کے رسول سے جو محبت تھی اس کے پیش نظر یہ حادثہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدائی کا خیال بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اُن پر ایک عجیب وارفتگی طاری ہوگئی۔ اُنھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اور چیخ چیخ کر کہنے لگے:

’’خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال نہیں ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ انھیں ضرور مبعوث فرمائے گا پھر وہ ایسا گمان کرنے والوں کے ہاتھ و پیر کاٹیں گے۔‘‘

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمریوں کہہ رہے تھے:

''کچھ منافقین گمان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی ہے۔لیکن رسول اللہ کی وفات نہیں ہوئی ہے وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جس طرح چالیس دن کے لئے حضرت موسیٰ گئے تھے۔''

لیکن جب حضرت ابوبکر نے آکر سورہ آل عمران کی ایک سوچوالیسویں آیت پڑھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اعلان کیا تو حضرت عمر کو اس حقیقت پر یقین کرنا پڑا۔خود فرماتے ہیں:

''خدا کی قسم ابوبکر کی تلاوت سے پہلے یہ آیت ذہن میں ہی نہیں تھی۔ میں بے دم ہو گیا میرے پیر میرے جسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہے اور میں زمین پر گر پڑا اور یقین کرنا پڑا کہ رسول اللہ کا انتقال ہوگیا۔''

19.5.4 سقیفۂ بنوساعدہ

گزشتہ اکائی میں ہم سقیفۂ بنوساعدہ میں ہونے والے واقعات کی تفصیل پڑھ چکے ہیں کہ کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات والے دن ہی انصار سقیفۂ بنوساعدہ میں جمع ہوکر اپنی امارت وخلافت کی تیاری کرنے لگے۔اور ان کا ایسا کرنا ایک فطری امر تھا۔ بدقسمتی سے مورخین نے اس واقعے کو ایسے انداز میں پیش کیا جس سے لگتا ہے کہ خدانہ خواستہ سقیفہ میں اسلام کے خلاف انصار کوئی سازش کر رہے تھے۔اس واقعے کو محض اس طور پر دیکھنا چاہئے کہ مدینہ انصار کا وطن اصلی تھا۔ مدینے کی آبادی کی بھاری اکثریت انصار پر مشتمل تھی انھوں نے ہی مسلمانوں کو پناہ دی اسلام کے دفاع اور اس کے نشرواشاعت میں بے مثال قربانیاں پیش کیں اور اکثر وبیشتر مہاجرین کے مقابلے میں وہ پہلے اسلام لانے والے بھی تھے۔لہٰذا ان کے دلوں میں یہ خیال آنا کہ وہی رسول اللہ کی نیابت وخلافت کے حقدار ہیں ایک فطری بات تھی۔لیکن جب انھیں مہاجرین کے مقام ومرتبے اور حضرت ابوبکرؓ کے فضل وتقدم کے بارے میں بتایا گیا تو انھوں نے فوراً قبول کرلیا بلکہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ بات کہ عرب قریش کے سوا کسی کی امارت وقیادت کو قبول نہیں کریں گے ،انصار کے دلوں میں ایسی بس گئی کہ انھوں نے تاریخ میں کبھی کبھی اقتدار کا مطالبہ نہیں کیا اور یہ سب انصار کی ایمانی حرارت اور اسلام کے لئے ان کے اخلاص ومحبت کی دلیل ہے۔

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فوری فیصلہ نہ کیا ہوتا اور پوری جرأت کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو لے کر سقیفۂ بنوساعدہ نہ پہنچ گئے ہوتے تو شاید صورت حال بے حد سنگین ہو جاتی اور اس کے عواقب ونتائج نہ جانے کیا ہوتے۔ اگر انصار سعد بن عبادہ کی بیعت کر لیتے تو معاملات ہاتھ سے نکل جاتے اور ایسا فتنہ اٹھتا کہ اسلام کو مدینے میں بھی پناہ نہ ملتی نہ مرتدین ومانعین زکاۃ وغیرہ پر قابو پانا ممکن ہوتا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ تھام کر پورے منظرنامے کو بدل دیا۔اب بحث ومناظرے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی چنانچہ چند لوگوں کو چھوڑ کر وہاں موجود تمام انصار نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت لے لی۔اور اس طرح بطور خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کی تعیین میں حضرت عمرؓ کی قوت فیصلہ اور جرأت اقدام کا نمایاں کردار تھا۔

19.5.5 خلافت صدیقی

حضرت ابوبکر کی خلافت کے دوران حضرت عمر خلیفہ کے مشیر اول اور دست راست تھے۔ خلیفۃ المسلمین ان سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے۔ خواہ وہ فوجی امور سے متعلق فیصلے ہوں یا گورنروں کی نامزدگی اور معزولی کے معاملات ہوں۔ خلیفہ ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے چنانچہ جب ایک بار خلیفہ نے سعید بن عاص اموی کو فتح شام کے دوران فوجی قیادت پر مامور کیا تو حضرت عمر نے اس کی مخالفت کی اور ان کی مخالفت کے پیش نظر خلیفہ نے سعید بن عاص کو اس منصب پر فائز ہونے سے پہلے ہی معزول کر دیا۔

وہ صرف فوجی امور اور جہادی سرگرمیوں ہی میں نہیں بلکہ خلافت کے عام نظم و نسق میں بھی خلیفہ کے مددگار رہتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی حکومت قائم ہی ہوئی تھی کہ پے در پے مسائل کھڑے ہونے لگے سب سے پہلا مسئلہ مانعین زکاۃ کا تھا۔ حضرت عمرؓ ان سے قتال کے لئے راضی نہیں تھے۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو مدینہ میں ضروری فوج نہیں تھی۔ اسلامی لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں شام کی طرف گیا ہوا تھا۔ دوسرے حضرت عمر کو زکاۃ ادا کرنے سے منع کرنے والوں سے لڑائی کرنے میں بھی تردد تھا۔ دوسرا مسئلہ ارتداد کا تھا۔ حضور کے وصال کے فوراً بعد عرب کے بیشتر قبائل مرتد ہو گئے۔ ان مرتدین سے جنگ کی حکمت عملی تیار کرنے میں حضرت عمر سب سے نمایاں تھے۔ مرتدین کے خلاف ہونے والی جنگوں میں سب سے خوں ریز یمامہ کی جنگ تھی جس میں بہت سے صحابہ شہید ہوئے اور ان میں ایک بڑی تعداد حفاظ صحابہ کی تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے حافظین قرآن کی تعداد پانچ سو تھی۔ حضرت عمر اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کی شہادت پر کانپ اُٹھے۔ انھیں ڈر ہوا کہ اگر قرآن کے حافظ صحابہ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خدانہ خواستہ قرآن کے کچھ اجزاء ہی نہ ضائع ہو جائیں۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور اس سنگین صورت حال اور مستقبل کے خدشات کو ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ حضرت ابوبکر چونکہ طریقہ رسول پر سختی سے گامزن رہنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے کہا: ''اے عمر تم ایک ایسا کام کیسے کر سکتے ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ: ''خدا کی قسم میں اس میں بھلائی پاتا ہوں'' اور اس موضوع کو لے کر مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی ضرورت و افادیت کو مان لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن کی ذمہ داری کاتب وحی زید بن ثابت انصاریؓ کو دی۔ شروع میں وہ بھی اس کام کو کرنے میں متردد تھے لیکن خلیفہ اول کے سمجھانے پر وہ بھی مان گئے۔ اس طرح قرآن کو جمع کر کے مصحف کی شکل دے دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد یہ مصحف حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسی مصحف کے نسخے کرا کے حکومت اسلامی کے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا۔

خلافت صدیقی میں مدینے کا نظام عدل بھی حضرت عمرؓ کے پاس تھا۔ بلکہ وہی مدینے کے قاضی القضاۃ تھے۔ اور یہ منصب پورے ایک سال تک ان کے پاس تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت بے حد مختصر رہی لیکن اس میں بڑے ہی عظیم الشان کارنامے انجام دیۓ گئے۔ اگر یہ کہا جاۓ تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے عہد میں اسلامی حکومت کا دوبارہ قیام عمل میں آیا۔ آئندہ ادوار میں ہونے والے تمام کاموں کے لئے راہ اسی عہد میں ہموار ہوئی اور حضرت عمرؓ ان سارے کارناموں میں برابر سے شریک رہے۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت عمرؓ نے غزوۂ بدر میں اپنے کس قریبی رشتہ دار کو قتل کیا؟
2. صلح حدیبیہ کس سن ہجری میں ہوئی؟
3. غزوۂ حنین میں حضرت عمرؓ نے اپنا کتنا مال صدقہ کیا؟
4. سقیفہ کے لفظی معنی کیا ہے؟
5. حضرت عمرؓ نے قرآن کو کتابی شکل میں جمع کرنے کا مشورہ کب دیا۔

19.6 عہد خلافت

19.6.1 حضرت عمرؓ کی جانشینی

حضرت ابوبکرؓ جمادی الآخر میں بیمار پڑے اور ان کا مرض بڑھتا گیا۔ جب انھیں اپنی شفایابی کی امید نہ رہی تو انھوں نے کبار صحابہ کو بلایا اور اپنے جانشین کے سلسلے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ موجود صحابہ نے انھی کو فیصلے کا اختیار دے دیا۔ غور وفکر کے بعد ان کی نظر انتخاب حضرت عمرؓ پر پڑی۔ ان کے سلسلے میں انھوں نے بعض صحابہ جیسے عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور عثمان ابن عفانؓ وغیرہ سے مشورہ کیا۔ سبھی نے اس انتخاب کی تائید کی البتہ ان کی سختی کے سبب لوگوں کو قدرے تردد تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کو یقین تھا کہ جب ذمہ داریاں پڑیں گی تو حضرت عمرؓ نرم ہو جائیں گے۔ ان کا دو سالہ تجربہ بھی ان کی اس فکر کی تائید کرتا تھا جب بھی بطور خلیفہ وہ کسی معاملے میں سختی کرتے تھے تو حضرت عمرؓ اس معاملے میں نرم ہو جاتے البتہ جب وہ کسی معاملے میں نرمی برتتے تھے تو اس میں حضرت عمرؓ سختی کا اظہار کرتے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت عثمانؓ کو بلا کر حضرت عمرؓ کی جانشینی کے بارے میں وصیت لکھانے کا ارادہ کیا۔ ابتدائی کلمات ہی لکھے گئے تھے کہ حضرت ابوبکر بے ہوش ہو گئے اور ان کی بے ہوشی کے عرصے ہی میں حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا اور جب حضرت ابوبکرؓ ہوش میں آئے تو حضرت عثمانؓ نے انھیں پوری وصیت سنا دی' جسے سن کر وہ بے حد خوش ہوئے۔

جانشینی کی وصیت لکھوانے کے بعد آپ نے لوگوں کو جمع کروایا اور فرمایا: ''کیا میرے مقرر کردہ جانشیں سے تم لوگ راضی ہو گے۔ میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا جانشیں نہیں بنایا ہے بلکہ عمر کو اپنا جانشیں وخلیفہ بنایا ہے لہٰذا ان کی بات کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔'' حاضرین نے ان کی اطاعت کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت عمرؓ کو خشیت الٰہی اور مومنین کی خیر خواہی

اختیار کرنے کی نصیحت کی اور اس کے چند دن بعد 22 / جمادی آخری 13ھ کو حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ اور لوگوں نے حضرت عمرؓ کی بیعت کی۔

بیعت کے بعد حضرت عمر منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''عرب کی مثال مانوس اونٹ جیسی ہے جو اپنے مالک کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ساربان کی ذمہ داری ہے وہ اسے کدھر لے جاتا ہے اور خدا کی قسم میں تمھیں سیدھے راستے کی طرف لے جاؤں گا''۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اے لوگو! میں تمھیں میں سے ایک آدمی ہوں۔ اگر مجھے خلیفہ رسول اللہ کا حکم ٹالنا ناگوار نہ ہوتا تو میں یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔''

پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دعا کی: ''اے اللہ میں سخت ہوں، مجھے نرم کر دے، میں کمزور ہوں مجھے طاقت عطا کر اور میں بخیل ہوں مجھے سخی بنا دے''۔

19.6.2 فتوحات

بیعت خلافت کے بعد حضرت عمرؓ نے ملکی نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ مدینہ، اس کے آس پاس اور پورے عرب میں امن امان تھا لہٰذا آپ کی توجہ فتوحات کی طرف مبذول ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جس کام کا آغاز ہوا تھا انھوں نے اس کی تکمیل کو اپنا مطمح نظر بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہونے والی وسیع و عریض اور افکار فتوحات انسانی تاریخ کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے۔ اس عہد میں ہونے والی جنگیں تاریخ کے بڑے معرکوں میں شمار ہوتی ہیں جیسے جنگ قادسیہ اور یرموک وغیرہ۔ ان جنگوں نے انسانی تاریخ کے دھاروں کو بدل دیا۔

19.6.3 فتح شام

شام میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ عہد صدیقی سے شروع ہو چکا تھا۔ بصری، اجنادین سمیت بہت سے علاقے فتح ہو چکے۔ حضرت ابوبکرؓ وفات کے وقت اسلامی لشکر نے شام کے ایک اہم قلعے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا جو موجود شام (سیریا) کی راجدھانی ہے۔ شام کی اکثر فتوحات حضرت خالدؓ کے نام تھیں۔ حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر کے حضرت ابوعبیدہؓ کو قائد عام بنا دیا۔ اس معزولی سے تعلق مختلف قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔ مشہور ترین روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کی فتوحات کو کسی فرد واحد سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

بہر کیف ایک طویل حصار اور خون ریز مزاحمت کے بعد مسلمانوں نے دمشق کو فتح کر لیا۔ یہ واقعہ رجب 14ھ میں پیش آیا۔ دمشق کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے عیسائیوں نے ایک بڑی فوج اکٹھا کی اور فحل کے میدان میں ایک زبردست جنگ میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی۔ اس جنگ میں حضرت ابوعبیدہؓ، شرحبیل بن حسنہؓ اور عمرؓو بن عاص کی فوجیں شریک تھیں حضرت خالدؓ بن ولید حضرت

ابو عبیدہؓ کی کمان میں جہاد کررہے تھے۔ یہ تاریخ ساز معرکہ 28/ذوقعدہ 13ھ میں پیش آیا۔اس معرکے میں بتیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جبکہ رومی فوجیوں کی تعداد تقریباً اسی ہزار تھی۔ان میں سے بہت کم لوگ زندہ واپس ہو سکے۔حضرت ابو عبیدہؓ فلسطین، دمشق اور اردن کی ذمہ داری دوسروں کو دیکر حضرت خالدؓ کے ساتھ آگے بڑھے اور حمص کو فتح کیا۔ یہ شہر موجودہ شام میں دمشق کے شمال میں واقع ہے۔بعلبک شہر کی طرف آگے بڑھتے ہوئے بہت سے مقامات کو فتح کیا انھوں نے بعلبک قلعے کا محاصرہ کرلیا جو اس وقت رومی حکومت کا ایک اہم قلعہ تھا آج یہ شہر لبنان میں واقع ہے۔اور یہ قلعہ صلح کے ذریعے ہاتھ آیا۔

شام کی مسلسل شکستوں نے قیصر روم کو بے حد غضبناک کر دیا اور اس نے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔حضرت ابو عبیدہ کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے اپنی حکمت عملی تیار کرنا شروع کر دی اور حکمت عملی ہی کے ایک حصے کے طور پر دمشق کے شمال سے تمام اسلامی فوج کو ہٹا لیا اور وہاں کے ذمیوں سے جو کچھ جزیہ کے نام پر لیا گیا تھا اسے بھی واپس کر دیا۔اس بار لڑائی کے لئے یرموک کا میدان چنا گیا یہ جگہ موجودہ اردن کے شمال مغرب میں واقع ہے۔رومی دو لاکھ چالیس ہزار جنگجو لے کر آئے جن میں ایک بڑی تعداد فدائیین کی تھی۔ چالیس ہزار رومی فوجیوں نے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں تاکہ بھاگنے کا خیال بھی نہ آئے۔ جوش جذبہ دلانے کے لئے بہت سے پادری بھی فوج کے ساتھ تھے۔مسلمانوں کی تعداد بتیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے لیکن یہ سب جذبہ جہاد سے شرابور تھے۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا جسے طے کرنا تھا کہ شام کس کے نام ہوگا۔خلافت اسلامیہ کا حصہ بنے گا یا بدستور بازنطینی سلطنت میں باقی رہے گا۔ یہ معرکہ رجب کی پانچ تاریخ 15ء کے دن شروع ہوا اور چھ دن تک جاری رہا۔رومیوں کی بدترین شکست اور ان کے قائد باہان کی موت پر ختم ہوا۔اس جنگ میں تین ہزار مسلمان اور ایک لاکھ بیس ہزار رومی مارے گئے۔

اس کے بعد مسلمان بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ مہم عمرو بن عاصؓ کے پاس تھی۔انھوں نے بیت المقدس کے آس پاس کے شہروں کو فتح کرنے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا تھا دوسری طرف شرحبیل بن حسنہؓ نے اردن کے باقی ماندہ علاقوں کو فتح کیا۔ یزید بن ابوسفیان نے دمشق سے مغرب کا رُخ کیا جہاں لبنان اور وہاں کے شہروں کو فتح کیا۔ بیت المقدس کی اہمیت کے پیش نظر حضرت ابو عبیدہؓ، عمرو بن عاصؓ سے جا کر مل گئے۔محاصرے سے پریشان ہوکر بیت المقدس کے لوگوں نے صلح کی پیشکش کی اور شرط رکھی کہ شہر کی چابی صرف خلیفۃ المسلمین کے حوالے کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مدینہ سے تشریف لائے اور صلح کی تکمیل کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئے۔عیسائیوں کے چرچ کی بھی سیر کی۔نماز کا وقت ہوا تو عیسائیوں نے انھیں چرچ ہی میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی لیکن انھوں نے باہر نکل کر نماز پڑھی تاکہ اس کو حجت بنا کر بعد میں مسلمان اس جگہ پر قابض ہونے کی کوشش نہ کریں۔ بیت المقدس میں جہاں حضرت عمر نماز پڑھتے تھے وہاں ان کی یادگار میں مسلمانوں نے ایک مسجد بنادی جو انھی کے نام سے آج بھی قائم ہے۔شام کی مفتوحات کا دورہ کرکے حضرت عمرؓ مدینہ لوٹ آئے۔ جہاں ان کی عدم موجودگی میں حضرت علیؓ ان کی نیابت کر رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے کچھ معرکے بعد میں بھی ہوئے۔اور پورا شام مسلمانوں کے زیر نگیں ہوگیا۔

19.6.4 فتح عراق وایران

عراق کی فتح کا آغاز بھی خلافت صدیقی سے ہو چکا تھا اور یہ فتوحات حضرت خالدؓ کی قیادت میں ہوئی تھیں مگر جب وہ اسلامی

لشکر کی مدد کے لئے شام چلے گئے تو فتح عراق کا سلسلہ رُک گیا۔ خلافت صدیقی میں عراق کا آخری معرکہ بابل میں ہوا تھا جسے مسلمانوں نے مثنٰی بن حارثہ کی قیادت میں سر کیا۔ یہ معرکہ ربیع الاول 13ھ میں پیش آیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد عراق کی مہم کی طرف توجہ کی کیونکہ مسلم قائدین میں سے بیشتر شام کی فتوحات میں مشغول تھے چنانچہ کئی دنوں کی کوششوں کے بعد حضرت عمرؓ ایک ہزار فوجیوں کا ایک لشکر تیار کر سکے۔ اسے ابو عبیدہ ثقفی کی قیادت میں عراق روانہ کیا جہاں ابو عبیدہ نے نمارق اور سقاطیہ وغیرہ کے معرکوں میں فارسی افواج کو شکست دی۔ ان کا سپہ سالار جابان حیلے سے جان بچا کر بھاگا اور ایرانی فوج کے بڑے بڑے افسران جنگوں میں مارے گئے۔ ان فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے سردار خود فرماں بردار ہو گئے۔ ابو عبیدہ نے فرات پار کر کے دشمنوں سے مقابلہ کا ارادہ کیا اور یہ فیصلہ انھوں نے فوجی افسروں کے مشوروں کے خلاف لیا چنانچہ اس معرکے میں مسلمانوں کو بڑی شکست ہوئی اور قائد لشکر سمیت ہزاروں مسلمان مارے گئے۔

جب حضرت عمرؓ کو اس شکست کی خبر ملی تو وہ بے حد غمگین ہوئے لیکن پوری شدومد کے ساتھ رضا کاروں کی بھرتی کا کام شروع کرا دیا۔ اور چار ہزار کا لشکر عراق روانہ کیا۔ دوسری طرف مثنیٰ بن حارثہ اپنی فوجوں اور مدینہ سے آنے والی کمک کے سہارے کامیابی حاصل کرتے رہے۔ اس عرصے میں معرکہ بویب میں فتح حاصل کرنا ان کا نمایاں کارنامہ تھا۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کی تعداد ستر ہزار تھی۔ اس ہزیمت کے بعد ایرانی ایک بڑی فوج تیار کرنے میں لگ گئے چنانچہ حضرت مثنیٰ نے مدد کے لئے خلیفہ کو لکھا لیکن جلد ہی حضرت مثنیٰ کی وفات ہو گئی۔ اب حضرت عمرؓ کو صرف رضا کاروں اور مجاہدوں ہی کی نہیں بلکہ ایک سپہ سالار کی بھی ضرورت تھی لیکن بایں ہمہ خلیفۃ المسلمین طے کر چکے تھے کہ ایرانیوں کو ایک فیصلہ کن شکست دی جائے۔ ایک طرف تو وہ پورے جزیرے میں بھرتی کا پروگرام چلا رہے تھے اور دوسری طرف ایک قائد کی بھی تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی نظر انتخاب حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ پر پڑی جو اس وقت نجد میں زکاۃ کی وصول یابی پر متعین تھے۔ انھیں زرود میں رکنے کو کہا اور قبائل میں گھوم گھوم کر جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے لئے لوگوں کو ابھارا اور رضا کاروں کو حضرت سعد کے پاس بھیجتے رہے۔ پوری حکومت میں علماء وخطباء کو بھی رضا کاروں کی بھرتی پر متعین کیا گیا۔ اور جس قدر مجاہدین اور سامان جنگ جمع ہوتا اسے حضرت سعد کے پاس بھیج دیتے تھے۔

دوسری طرف ایرانیوں میں بھی بڑا جوش وجذبہ تھا انھوں نے بھی عربوں سے ایک فیصلہ کن لڑائی کی ٹھانی۔ یزدگرد جو شاہی خاندان کا تنہا وارث تھا اسے تخت نشین کیا گیا اور امراء ووزراء کے باہمی اختلافات کو بھلا کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ اس تیاری کو دیکھ کر تمام مفتوحہ علاقوں میں فارسیوں نے بغاوت کر دی حتیٰ کہ مسلم فوجوں کو اس صورتحال کے پیش نظر مفتوحہ علاقے چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ عراق سے لوٹنے والی مسلم فوجیں اور مدینہ منورہ سے آنے والی امداد اور رضا کار مل کر اسلامی فوج کی تعداد بتیس ہزار ہو گئی۔ یہ لشکر حضرت سعد بن وقاص کی قیادت میں عراق کی طرف روانہ ہوا۔ یہ عراق میں داخل ہونے والا اب تک کا سب سے بڑا اسلامی لشکر تھا۔

ایرانی بھی زبردست تیاری کر کے نکلے۔ ان کے فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی جس میں بڑی تعداد میں ہاتھی بھی تھے۔ دونوں فوجیں قادسیہ کے میدان میں جمع ہوئیں۔ ایرانی لشکر کی قیادت مشہور پہلوان رستم کر رہا تھا۔ پہلے گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن مسلمان اسلام یا جزیہ سے کم پر راضی نہیں تھے۔ رستم جنگ سے گریزاں تھا لیکن اسے بادل ناخواستہ جنگ کے لئے تیار ہونا

پڑا۔ یہ تاریخی جنگ محرم 14ھ میں پیش آئی۔قادسیہ کی یہ جنگ چار دن چلی مسلمانوں نے جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چوتھے دن رستم مارا گیا اور ایرانی لشکر کو شکست فاش ہوئی۔ وہاں سے مسلمانوں نے مدائن کا قصد کیا جو ساسانی سلطنت کا پائے تخت اور کسریٰ کا مرکزی مقام تھا۔مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور دو ماہ میں اہل مدائن نے محاصرے سے تنگ آ کر شکست قبول کر لی۔ یزدگرد فرار ہو گیا۔ باقی ماندہ فارسی لشکر سے کئی معرکے ہوئے۔ان میں جلولاء، حلوان، موصل اور آبلہ وغیرہ شامل ہیں۔عراق پورا کا پورا مسخر ہو چکا تھا۔حضرت عمرؓ جنگ بند کرنا چاہتے تھے لیکن جب تک کیانی خاندان کا وارث یزدگرد زندہ تھا جنگ رو کی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ ایرانی امراء بار بار اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔اس بار یزدگرد نے مرو کو اپنا پائے تخت بنایا اور اس کے تمام مفرور امیر اور فوجی افسروں کے گرد اکٹھا ہو گئے۔نعمان بن مقرن کی قیادت میں اسلامی لشکر نے مرو کا رُخ کیا۔ 21ھ میں نہاوند شہر کے قریب اس کا مقابلہ ایرانی لشکر سے ہوا۔معرکۂ نہاوند میں مسلمان فوجیوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔جبکہ شہنشاہ فارس کی فوج میں ڈیڑھ لاکھ سپاہی تھے۔صرف ایک دن کی جنگ میں ایرانیوں نے سپر ڈال دئے۔اس فتح کا نام فتح الفتوح پڑا کیونکہ اس کے بعد اہل فارس سے کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔اس جنگ میں اسلامی لشکر کے قائد نعمان بن مقرن اور کئی دوسرے صحابہ بھی شہید ہوئے۔

19.6.5 فتح مصر

شام کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ کے شدید اصرار پر حضرت عمرؓ نے انھیں مصر کی جانب پیش قدمی کرنے کی اجازت دے دی۔حضرت عمرو بن عاصؓ نے مرکز سے امداد کا مطالبہ کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے دس ہزار فوجی اور چار قائدین کو روانہ کیا۔ یہ قائدین تھے حضرت زبیر بن عوام، عبادۃ بن صامت، مقداد بن عمر اور سلمہ بن مخلد۔اس مدد کے آنے سے پہلے ہی اسلامی لشکر نے سرحدی قلعوں کو فتح کر لیا تھا۔ بابلیون کے قلعے کا حصار سب سے طویل رہا اور تقریباً چھ ماہ جاری رہا۔حضرت زبیر بن عوامؓ کی حکمت و شجاعت کے نتیجے میں یہ قلعہ فتح ہوا۔مسلمانوں نے اس قلعے کے قریب میں فسطاط نام کا ایک شہر آباد کیا۔ یہ شہر مصر میں مسلمانوں کا پہلا صدر مقام بنا۔ یہ مصر کی موجودہ دارالحکومت قاہرہ سے متصل تھا۔فسطاط کا معنی خیمہ یا کیمپ کے ہوتے ہیں۔فسطاط سے اسلامی لشکر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوا اور ایک خونریز جنگ کے بعد اسلامی فوجوں نے اس تاریخی اور عسکری اہمیت کے حامل شہر پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ساتھ مصر مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ یہ فتوحات اکیسویں بائیسویں ہجری میں ہوئیں۔

19.6.6 فتح لیبیا

اسکندریہ کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ نے عقبہ بن نافع کی قیادت میں ایک ہراول دستہ برقہ کی طرف بھیجا۔ یہ شہر آج لیبیا میں واقع ہے اور ان کی رپورٹ کے بعد اسلامی لشکر اسکندریہ سے برقہ روانہ ہوا۔ 22ھ میں مسلمانوں نے برقہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو فتح کیا پھر وسط لیبیا کے شہر مصراتہ، ودان اور رویلہ کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ نے طرابلس کا قصد کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اس تاریخی شہر کو فتح کر لیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلامی حکومت کی سرحدیں اگر مغرب میں موجودہ ٹیونیشیا تک پہنچ گئی تھیں تو مشرق میں موجودہ تاجکستان تک دراز ہو گئی تھیں۔ دنیا کے دوسرے بڑے فاتحین جیسے سکندر مقدونی، چنگیز خاں اور ہلاکو وغیرہ کے برخلاف یہ فتوحات

پائیدار بھی رہیں بلکہ ان کے تمام مفتوحات ہمیشہ کے لئے عالم اسلامی کا حصہ بن گئے ۔فتوحات کی وسعت اوران کی پائداری میں دنیا کا کوئی فاتح حضرت عمرؓ کا شریک نہیں ہے۔

19.6.7 شہادت

حضرت عمرؓ کے ذریعے قیصر وکسریٰ کی حکومتیں تباہ ہوئی تھیں ان حکومتوں کے بہت سے وفاداروں نے بظاہر اپنا سر تسلیم مسلمانوں کے سامنے خم کر دیا تھا لیکن ان کے دلوں میں اسلام ومسلمانوں کے خلاف جو بغض ونفرت کی آگ بھڑکتی رہی ۔اُن قوم پرستوں میں سے کئی ایک مدینہ میں بھی مقیم تھے اور مسلمانوں کے خلاف عموماً اوران کے خلیفہ کے خلاف خصوصاً سازشیں بھی کررہے تھے۔حضرت عمرؓ کا قاتل فیروز انھی سازش کرنے والوں کا آلہ کار بن گیا۔

فیروز حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا ایرانی غلام تھا جو نہاوند کی جنگ میں گرفتار ہوا تھا۔اس کی کنیت ابولولو تھی ۔اس نے حضرت عمرؓ سے اپنے آقا کی شکایت کی کہ وہ اس سے بہت زیادہ خراج لیتے ہیں ۔حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ تمہاری آمدنی کے پیش نظر یہ خراج کچھ زیادہ نہیں ہے۔اوراس کی شکایت کو رد کردیا اس پر وہ بے حد غصہ ہوا۔رات میں دوسرے مجوسیوں نے اس کے غصے کواور بھڑکایا۔اسی رات کی صبح میں جب حضرت عمر نماز پڑھانے کے لئے مسجد تشریف لائے اور نماز شروع ہی کی تھی کہ فیروز نے ایک دودھاری تلوار سے آپ پر حملہ کردیا۔اس سے پہلے کہ مسلمان کچھ سمجھتے اس نے آپ پر چھ وار کر دئے ۔اس کو پکڑنے میں بعض مسلمان بھی زخمی ہوئے ۔قاتل جانتا تھا کہ فرار کی کوئی صورت نہیں ہے لہذا اس نے خودکوبھی ہلاک کرلیا۔ یہ واقعہ 26 /ذوالحجہ 23 ھ کا ہے۔

حضرت عمرؓ کو لگنے والے زخم بے حد کاری تھے علاج کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں ۔حضرت عمرؓ خود بھی اپنی موت کی آہٹ محسوس کررہے تھے' چنانچہ آپ نے چھ آدمیوں پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ بنائی اوراگلے خلیفہ کے انتخاب کا کام اس کے ذمہ چھوڑ دیا۔اس مجلس شوریٰ میں نہ اپنے گھر کے کسی فرد کو شامل کیا نہ خاندان کے حالاں کہ آپ کے چچازاد بھائی سعید بن زید عشرہ مبشّرہ میں سے تھے۔

انتقال سے پہلے آپ نے حضرت عائشہ سے پہلوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہونے کی اجازت لی۔اوراپنے بیٹے عبداللہ کو وصیت کی کہ وہ ان کا قرض ادا کریں اوراگر مال متروکہ سے وہ قرض ادا نہ ہوسکے تو اہل خاندان اور پھر قریش سے مدد کی درخواست کریں۔

تیسرے دن آپ کا انتقال ہوگیا اور بروز اتوار یکم محرم 22 ھ مطابق 944ء کوآپ کی تدفین ہوئی۔انتقال کے وقت آپ کی عمر چھپن سال تھی۔آپ قریب ساڑھے دس سال خلیفۃ المسلمین رہے۔

19.6.8 ازواج واولاد

حضرت عمر نے متعدد شادیاں کیں ان میں زینب بنت مظعون' قریبہ بنت ابی امیہ اورام کلثوم ملیکہ بنت جرول سے اسلام سے پہلے عقد کیا۔ان میں زینب مشہور صحابی عثمان بن مظعون کی بہن تھیں۔اسلام سے مشرف ہوئیں اور حضرت حفصہ اور حضرت

عبداللہ بن عمرانھیں کےبطن سے تھے۔اسلام کے بعد آپ نے جمیلہ بنت ثابت' عاتکہ بنت زیدام حکیم بنت حارث اورام کلثوم بنت علی سے نکاح کیا۔

حضرت عمرؓ کی مئونث اولاد میں حضرت حفصہ کوحضور کی زوجیت کا شرف حاصل ہوااور مذکر اولاد میں عبداللہ' عبیداللہ اور عاصم کواپنے اپنےعلم وفضل کےسبب امتیاز حاصل ہوا۔

19.6.9 خلافت فاروقی

حضرت عمرؓ کا عہد خلافت عظیم کارناموں اوراہم واقعات سے پر ہے۔مشہورامریکی مورخ مایکل ایچ ہارٹ نے آپ کوتاریخ کی سومئوثر شخصیات میں سے ایک قرار دیا ہے۔اورانھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعداسلام کی سب سے موثر ذات قرار دیا ہے۔ بلاشبہ آپ کی ذات رائے کی صحت ودرستگی حسن تدبیر' قوت فیصلہ' جرأت اقدام' طاقت اجتہاد کے علاوہ عدل وانصاف' زہدو تقوی اوراخلاص وایثار کا مرقع تھی۔ان میں سے ہرایک صفت پر درجنوں واقعات شاہدعدل ہیں۔آپ کی اولیات اسلامی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

19.7 نظم ونسق

19.7.1 دواوین(محکمے)

حضرت عمرؓ کی ملکی سیاست مرکزی نظم ونسق کے نظام پر قائم تھی۔یعنی مدینہ میں مرکزی حکومت کو ہی تمام تر انتظامی اورادارتی اختیارات حاصل تھے۔گورنروں اور والیوں کونظم ونسق میں کچھ بھی اختیار نہیں تھا۔ان کا کام صرف مرکز سے آنے والے احکام کی تعمیل وتنفیذ تھا۔شاید حضرت عمرؓ کے عہد کے حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا۔حضرت عمرؓ کے دبدبہ وانقلاب کا یہ عالم تھا کہ تمام صوبوں کے سارے معاملات کا فیصلہ مدینے ہی میں ہوتا تھا۔معاملات کاتعلق خواہ فوجی امور سے ہوخواہ شہری امور سے۔ ملک کے ہرچھوٹے بڑے مسئلے کاحل مدینے میں ہی ہوتا تھااورسفارت کے ذریعے حضرت عمرؓ تمام علاقوں کی پل پل کی خبر رکھتے تھے۔

تنظیمی لحاظ سے مفتوحہ علاقوں کو پانچ بڑے خطوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔اوران میں سے ہرایک خطے میں کئی کئی تنظیمی مراکز یا صوبے تھے۔ یہ پانچ خطے یہ ہیں: عراق، فارس، شام، فلسطین، افریقہ۔ جزیرہ نماعرب میں حسب سابق بارہ صوبے تھےاور یہ صوبے تھے: مدینہ منورہ، مکہ معظّمہ، طائف، صنعاء، حضرموت، خولان، زبید، مرقع، جند، نجران، جرش اور بحرین۔مفتوحہ علاقوں کے صوبے ہوں یا جزیرہ نمائے عرب کے صوبے ہوں ان میں سے ہرایک میں مختلف اوقات میں متعدد گورنروں یا والیوں کا تقرر ہوا۔ان والیوں کی تقرری میں وہ اپنے صواب دید سے بھی کام لیتے اور کبارصحابہ سے مشورہ بھی کرتے تھے۔وہ اپنے تمام والیوں کوسختی سے نصیحت کرتے تھے کہ وہ رعایا کے ساتھ حسن سلوک کریں' ان کے معاملات میں نرمی برتیں اورانھیں ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ دیں۔علاوہ ازیں حضرت عمرؓ اپنے والیوں سے شریعت اسلامی کے نفاظ کا سختی سے مطالبہ کرتے تھے اوران کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئےعوام سے فرماتے تھے کہ:

''اے لوگو! میں نے ان والیوں کوتمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تمھیں ماریں اورتم سے عشر حاصل کریں بلکہ انھیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ تم کوتمہارا دین سکھائیں اور تمھیں سنت کی تعلیم دیں۔تم میں سے جس کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور سلوک ہوتو وہ مجھ سے شکایت کرے' اوراس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمر کی جان ہے میں اس کا بدلہ والی سے ضرور بالضرور لوں گا۔''

حضرت عمرؓ نے کئی افراد کوان والیوں کے اعمال وافعال کا نگران کار بھی بنایا تھا جومختلف صوبوں کا سفر کرتے رہتے تھے اور وہاں کے والیوں یا گورنروں کے کام کاج پرنظر رکھتے تھے اوراس کی رپورٹ خلیفۃ المسلمین کو پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔ان عاملوں میں عبداللہ بن مسعود' عثمان بن حنیف اور محمد بن مسلمہ شامل ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ملکی نظم ونسق چلانے کے لئے کئی دیوان اور دفتروں کو قائم کیا۔ان میں سے اہم دواوین ودفاتر مندرجہ ذیل تھے:

1. **دیوان انشاء:** یہ دفتر خط وکتابت اور مراسلت کا کام کرتا تھا۔اس دفتر کے ذریعے آپ مختلف والیوں اورعمال کو ہدایت جاری کرتے تھے اور مختلف صوبوں کے احوال وحوادث پرنظر رکھتے تھے۔
2. **دیوان لشکر:** یہ دفتر فوجیوں کا رجسٹر تیار کرتا اوران کی پوسٹنگ اور تنخواہوں کی نگرانی کرتا تھا۔پہلے قریش اور انصار کے رجسٹر تیار کئے گئے بعد میں اسے وسعت دے کرعرب کے تمام قبائل کواس نظام میں شامل کرلیا گیا۔ہرایک کی تنخواہ اس کے قدر ومنصب کے مطابق تھی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس کی جوتنخواہ ہوتی تھی اس کے غلام کی تنخواہ بھی اتنی ہی ہوتی تھی۔
3. **دیوان تحصیل خراج:** یہ دفتر مفتوحہ علاقوں سے حاصل شدہ خراج کا حساب وکتاب رکھتا تھا اور مال خراج کو کہاں اور کیسے خرچ کیا جائے اس کام کی نگرانی کرتا تھا۔اس دفتر نے بعد میں باقاعدہ بیت المال کی شکل اختیار کرلی۔

حضرت عمرؓ مسلمانوں کے مال کو بے حد اہمیت دیتے تھے اوراس کی حفاظت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔سرکاری دولت کے تئیں ان کا رویہ مال یتیم کے نگراں کی مانند ہوتا تھا۔حضرت عمرؓ نے عیسائی اور مجوسی علامتوں والے سونے چاندی کے سکوں کوتو برقرار رکھا لیکن اُن سکوں پرلفظ''جائز'' بھی نقش کروایا تاکہ کھرے اور کھوٹے سکوں میں امتیاز ہوسکے۔اوربعض دوسرے الفاظ بھی ان سکوں پرنقش کروائے۔

4. **دیوان برید:** یہ ڈاک کا دفتر تھا۔حکومت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس دفتر کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ڈاک کے نظام کو چست ودرست بنانے کے لئے حضرت عمرؓ نے کئی اقدام کئے۔ہرراستے پردس دس میل کے فاصلے پرڈاک اسٹیشن بنائے گئے۔جہاں نگران کار رہوتے تھے اور کھانے پینے کا انتظام ہوتا تھا۔

19.7.2 شوریٰ

اسلام نے باہمی مشورے کو غیرمعمولی اہمیت دی ہے۔اسی کے پیش نظر ہرمسئلے میں مہاجرین وانصار میں بڑے صحابہ سے مشورے کیا کرتے تھے بالخصوص ان مسائل میں جن میں کتاب وسنت کی نص موجود نہ ہو۔اورمشورے کی اسی ضرورت کی تکمیل کے

لئے آپ نے بڑے صحابہ پر مدینہ سے باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔آپ نوجوانوں اور بعض خواتین سے بھی مشورے کرتے تھے۔مشاورت مجموعی بھی ہوتی تھی اور خاص بھی۔ان مشاورتی مجلسوں میں لوگوں کو بلاخوف وخطر اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملتا تھا۔خواہ وہ رائے خلیفہ کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو بلکہ متعدد بار ایسا ہوا کہ مردوں اور عورتوں نے انھیں ''اتق اللّٰہ یا عمر '' یعنی اے عمر خدا سے ڈرو کہہ کر مخاطب کیا اور حضرت عمرؓ نے ان کی باتوں کو پوری خندہ پیشانی سے سنا اور اگر وہ باتیں صحیح رہیں تو اپنی رائے کو چھوڑ کر ان باتوں پر عمل کیا۔

19.7.3 فوجی نظم

حضرت عمرؓ نے فوج کی جانب خصوصی توجہ کی؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کی اسلامی حکومت کی بقا اور توسیع دونوں کا دارومدار فوج پر ہی ہے۔عہدے کے اعتبار سے فوج کی ترتیب میں سب سے اوپر''امیر الجیش'' ہوتا تھا جس کے ماتحت دس ہزار یا اس سے زیادہ فوجی ہوتے تھے اس کے نیچے''امیر الکردوس'' ہوتا تھا جو ایک ہزار فوجیوں کا افسر ہوتا تھا پھر قائد ہوتا تھا جس کے کمان میں سو فوجی ہوتے تھے۔ہر فوجی کو پیدل چلنے' گھڑسواری' تیراندازی اور تیراکی کی ٹریننگ لینی ہوتی تھی۔حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق، اردن اور فسلطین میں فوجی چھاؤنیاں بنائی تھیں جن میں فوجیوں کے لئے بیرکیں تھیں۔ ہر چھاونی میں بڑے بڑے اصطبل تعمیر کئے گئے تھے جن میں چار چار ہزار گھوڑوں کو رکھنے کی گنجائش تھی۔فوجی گھوڑوں کی پرورش پر درخت کا بھی ایک شعبہ تھا۔ان کے لئے باضابطہ چراگاہیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔

فوج میں لڑنے والوں کے علاوہ، محاسب، خزانچی، جاسوس، مترجم، طبیب وغیرہ کے بھی عہدے تھے۔حضرت عمرؓ کے عہد میں محاصرے کے آلات کا بھی استعمال شروع ہو گیا تھا چنانچہ دمشق کے محاصرے میں منجنیق اور دبابہ کا استعمال کیا گیا تھا۔فوجیوں کے لئے مفتوحہ ممالک میں تجارت یا زراعت کرنے پر سخت پابندی تھی۔محنت وجفاکشی کی عادت کو برقرار رکھنے کے لئے فوجیوں کو نرم کپڑے پہننے اور حمام میں نہانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔فوجیوں کے لئے کوچ اور قیام' جنگ اور آرام سب کے قواعد مقرر تھے۔

19.7.4 احتسابی نظام

حسبہ یا احتسابی نظام اگرچہ عہد رسالت سے قائم تھا لیکن اس شعبے کی باضابطہ تنظیم حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی اس شعبہ کا کام حکام وعوام دونوں کی دینی واخلاقی نگرانی کرنا تھا۔یہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا بے حد اہم شعبہ تھا اور اس کی سربراہی خود خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں میں تھی۔اس شعبہ کے افراد محتسب کہلاتے تھے اور ان کے دائرہ کار میں کئی چیزیں شامل تھیں جیسے: شریعت کے احکام اور شعائر اسلام کا نفاذ' لوگوں کے معاملات کی نگرانی' خرید وفروخت اور ناپ وتول کے پیمانوں کی نگہداشت' جانوروں اور غلاموں کے ساتھ لوگوں کے سلوک وعمل کا معائنہ وغیرہ۔اسلامی حکومت کا کوئی فرد اس احتسابی نظام سے باہر نہیں تھا۔ حضرت عمر نے خالد بن ولید، ابوموسی اشعری، سعد بن وقاص اور عمرو بن عاص جیسے بڑے حضرت صحابہؓ اور فوجی قائدین کا سختی سے احتساب فرمایا اور کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

مصر کے عامل عیاض بن غنم کے بارے میں رپورٹ ملی کی وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر یہ الزامات صحیح پائے گئے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں مدینے بلوایا۔ انھیں بے حد کھردرا کپڑا پہنوایا اور مصر کی گورنری کے بجائے بیت المال کی بکریاں چرانے پر مامور کر دیا۔ ہجویہ اور عشقیہ شاعری کے اظہار پر پابندی لگوادی۔ وہ عوام کو پرتعیش زندگی سے بھی منع کرتے تھے تا کہ ان کا فوجی جوہر ختم نہ ہونے پائے۔

مشہور روایت ہے کہ حضرت عمروؓ بن عاص کے بیٹے اور ایک قبطی کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں قبطی نوجوان جیت گیا۔ حضرت عمروؓ بن عاص کے بیٹے نے اس قبطی کو کوڑے سے پیٹا۔ یہ قضیہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو مدینے بلوایا اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اس معمولی قبطی نوجوان کے ہاتھوں سے گورنر مصر کے بیٹے کو کوڑے لگوائے اور عمرو بن عاص سے مخاطب ہو کر یہ تاریخی جملہ فرمایا:

متى استعبد تم الناس و قدولد تهم امها تهم أحرارا

''تم لوگوں نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا جب کہ ان کی
ماؤں نے انھیں آزاد پیدا کیا تھا۔''

19.7.5 عدلیہ

حضرت عمرؓ کا عہد خلافت عدل وانصاف کے نقطۂ نظر سے ایک زریں اور مثالی عہد ہے۔ اور انصاف کے حوالے سے ہر عہد میں ان کے عہد کی مثال دی گئی۔ ابتداء میں حضرت عمرؓ خود اور ان کے عمال ہی منصب قضا سنبھالتے تھے لیکن جب حکومت میں غیر معمولی توسیع ہوئی تو اس کے لئے مستقل شعبہ قائم کیا گیا۔ اور تمام بڑے شہروں میں قاضیوں کو مقرر کیا گیا۔ ابودرداء مدینے میں' شریح کندی کوفے میں' عثمان بن ابی العاص مصر میں' ابوموسی اشعری بصرہ میں قاضی تھے۔ اور ان قاضیوں کے لئے آپ نے ایک دستور عمل بھی تیار کروایا۔ قاضیوں کی مدد کرنے اور انھیں ثبوت فراہم کرنے کے لئے ایک مخصوص دستہ تیار کیا گیا جو راتوں میں گشت کرتا تھا اور معلومات فراہم کرتا تھا۔ ملزمین کے لئے ایک قید خانہ بھی تمام مرکزی مقامات پر بنوایا گیا۔ مدینہ منورہ میں اس دستے کی قیادت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھوں میں تھی۔

19.8 مقام ومرتبہ

19.8.1 ذاتی اوصاف

حضرت عمرؓ کی ذات علم وفضل اور اخلاق وکردار کی جامع تھی۔ قبل اسلام قریش میں صرف سترہ لوگوں کو لکھنا آتا تھا' آپ ان میں سے ایک تھے۔ آپ کی تحریر کے جونمونے ملتے ہیں یا تاریخ کی کتابوں میں آپ کے جو خطبات منقول ہوئے ہیں اس سے آپ کے علم وفضل' ذہانت وفطانت اور پختگی عقل اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کو شاعری اور علم انساب میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ کی شخصیت عقل وحکمت، فکر وتدبر، شجاعت و بہادری، ایمان، غیرت اور حق کے معاملے میں غیر معمولی جرأت سے متصف تھی ۔ قرآن کی متعدد آیات آپ کی رائے اور موقف کے مطابق نازل ہوئیں خواہ مقام ابراہیم کو مصلیٰ (نماز کی جگہ) بنائے جانے کی بات ہو، شراب کی تحریم کا معاملہ ہو یا ازواج مطہرات کے پردے کا مسئلہ ہو۔ ان مسائل سے متعلق قرآنی احکام حضرت عمرؓ کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے۔ امام مالک اپنی مؤطا میں سعید ابن مسیّب سے روایت کرتے ہیں کہ: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان اللّٰہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبه''

(اللہ نے حق کو عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں رکھ دیا ہے)

بخاری ومسلم میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری امت میں کسی پر الہام ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

خوف خدا اور خشیت الٰہی سے ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے تھے۔ زہد اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جسم پر کبھی بھی نرم وملائم کپڑا نہیں ڈالا کپڑے پیوند سے بھرے ہوتے تھے۔ اسی حالت میں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کرتے تھے۔ انھیں ذمہ داری کے بوجھ اور خدا کے حضور جواب دہی کا ہمہ وقت خیال رہتا تھا فرماتے تھے:

''خدا کی قسم اگر فرات کے ساحل پر کسی خچر کا پاؤں بھی پھسلا تو میں اس کے لئے جوابدہ ہوں گا اور ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا کہ اے عمر! تم نے اس کے لئے راستہ کیوں نہیں بنوایا''۔

کھانا اس قدر معمولی ہوتا کہ لوگ آپ کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک بار جب حفص بن ابی عاص نے یہ کہتے ہوئے آپ کی ہم طعامی سے انکار کیا کہ: میرے گھر کا کھانا اس کھانے سے اچھا اور لذیذ ہے۔ تو آپ نے فرمایا:

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اچھے کھانے پر قدرت واختیار نہیں ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مجھے خوف آخرت نہ ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح دنیاوی عیش وعشرت میں مشغول ہوتا''۔

حق کے معاملے میں ان کی شدت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کے اسی وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''خدا کی قسم (اے عمر) شیطان جب بھی تمھیں کسی راستے پر چلتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔''

حضرت عمرؓ کی شخصیت دینی معاملات میں شدت پسندی کا رویہ اختیار کرنے کے لئے معروف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل اللہ کے بندوں کے لئے رحمت ومحبت سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سال جب مدینہ اور اس کے آس پاس قحط پڑا تو آپ شب وروز رعایا اور بے زبان جانوروں کے لئے پریشان رہتے تھے۔ قحط اس قدر شدید تھا کہ زمین سیاہ ہوگئی تھی۔ اس مناسبت سے اس سال کا نام

عام رمادہ یعنی راکھ والا سال ہو گیا تھا۔آپ نے عراق وشام سے غلہ اور چارہ منگا کر لوگوں میں تقسیم کرایا۔لوگوں کا حال جاننے کے لئے آپ راتوں میں گلیوں میں گھوما کرتے تھے اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

آپ نے ایک مرتبہ مدینے کی گلیوں میں ایک مفلوک الحال ذمی کو دیکھا تو بے حد رنجیدہ ہوئے اور بیت المال سے اس کی مدد کی۔مدینے میں ایک اندھی ضعیف عورت رہتی تھی حضرت عمر پابندی سے اس کی خبر گیری کرتے تھے۔آپ بے حد متواضع تھے اور خود کو عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے۔ایک بار آپ مدینہ کے قاضی زید بن ثابت کی عدالت میں بطور مدعا علیہ تشریف لے گئے قاضی نے انھیں تعظیم دینا چاہا تو آپ نے فوراً فرمایا کہ مقدمہ شروع نہیں ہوا لیکن تم نے ناانصافی شروع کردی۔یہ کہہ کر آپ فریق ثانی کے برابر جا کر بیٹھ گئے۔

عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اپنے کندھے پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے دیکھا تو ان سے کہا: امیر المومنین یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس غیر ملکی وفود آئے تھے جو پوری طرح سننے اور اطاعت کرنے پر راضی تھے۔اس لئے میرے دل میں تھوڑا تکبر پیدا ہو گیا تھا۔چنانچہ میں نے چاہا کہ اس کو ختم کروں۔

19.8.2 اولیات

حضرت عمرؓ کے دینی، عسکری، تہذیبی اور رفاہی کارناموں کو جمع کرنے کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہونگے۔صرف ایسے کارنامے جن میں انھیں اولیت حاصل ہے، کی فہرست بھی طویل ہے۔تاریخ وسوانح کی کتابوں میں ان کی دینی، تہذیبی اور سماجی اہمیت وافادیت خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔یہ اولیات حضرت عمرؓ کی فہم وفراست، دانائی اور دور بینی کی دلیل ہیں۔ان میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

1. سب سے پہلے امیر المومنین کے لقب سے ملقب ہوئے۔
2. ہجری تقویم کی ابتداء کی۔
3. بیت المال قائم کیا۔
4. تراویح باجماعت کا آغاز کیا۔
5. رعایا کی خبر گیری کے لئے راتوں میں گشت شروع کیا۔
6. ہجو کرنے پر سزا مقرر کی۔
7. مختلف دفاتر کی ایجاد کی۔
8. مسلم فوجیوں کی رہائش کے لئے نئے نئے شہر تعمیر کئے تاکہ وہ دینی اور عسکری تشخص کے ساتھ رہ سکیں۔ان شہروں میں کوفہ، بصرہ اور موصل عراق میں اور فسطاط اور جیزہ مصر میں واقع ہیں۔
9. باہری تاجروں پر دس فیصد ٹیکس عائد کیا۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں اہل سنت کی رائے اسی طرح کی ہے جیسے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں ہے۔ اہل سنت کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کے بعد امت کی سب سے محترم ذات حضرت عمرؓ کی ہے۔ امام بخاری حضرت علیؓ بن ابی طالب کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ:

> ''میں نے اپنے والد (یعنی حضرت علی) سے پوچھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اچھا انسان کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ابوبکرؓ میں نے کہا: ان کے بعد فرمایا: عمرؓ......''

شیعہ امامیہ حضرت عمرؓ کے بارے میں مخالف رائے رکھتے ہیں البتہ شیعہ زیدیہ کی رائے میں ان کی خلافت تو صحیح ہے لیکن حضرت علی ان سے زیادہ حقدار تھے۔ مغربی مصنفین اور مفکرین نے حضرت عمرؓ کی شخصیت کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے اور ان کی عظمتوں کا خوب خوب اعتراف کیا ہے۔ ان میں سرفہرست ایڈورڈ گبن' ولیم میور اور واشنگٹن ارونگ وغیرہ ہیں:

مؤخرالذکر اپنی کتاب ''محمد اور ان کے خلفاء'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''عمرؓ کی (حیات اور کارناموں) پر مشتمل تاریخ سے یہ پوری طرح ظاہر ہے کہ وہ عقل کی گہرائی و ندرت' معاملات کی پاکیزگی اور سختی کے ساتھ انصاف کو عمل میں لانے والے تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ اسلامی شہنشاہیت کے بانی مبانی تھے۔ وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کا اثبات اور اس کو عملی طور پر نافذ کرنے والے تھے وہ ابوبکرؓ کی مختصر خلافت کے دوران ان کے وزیر و مشیر تھے۔ وہ ایسے نظاموں اور اصولوں کی تشکیل کرنے والے تھے جو پوری مملکت اور تیزی کے ساتھ بڑھنے والے مفتوحہ علاقوں میں نظم و نسق اور قانون کی بالا دستی قائم رکھنے میں معاون ہوں۔ جس سختی اور ارادے کی مضبوطی کے ساتھ انھوں نے اپنے عاملوں اور فوجی قائدین کے ساتھ سلوک کیا وہ فوجوں میں ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔ فتوحات پر بھی اس کا گہرا اثر مرتب ہوا۔ ان کی یہ سیاست حکومت کرنے کی ان کی غیر معمولی قدرت کی دلیل ہے۔''

معلومات کی جانچ

1. یرموک کہاں واقع ہے؟
2. حضرت عمرؓ کے قاتل کا کیا نام تھا؟
3. مشہور ایرانی پہلوان رستم کس جنگ میں مارا گیا؟
4. حضرت عمرؓ کے عہد میں مراسلت کے دفتر کا کیا نام تھا؟
5. حضرت عمرؓ کی تین اولیات بتایئے۔

19.9 خلاصہ

حضرت عمرؓ دوسرے خلیفۂ راشدؓ دنیا کے عظیم ترین فاتح اور عدل وانصاف میں ایک مثالی شخصیت تھے۔آپ کا تعلق قریش کی بنوعدی شاخ سے تھا۔ یہ مکہ کا ایک معزز خاندان اور قریش کی جانب سے سفارت کا ذمہ دار تھا۔اس خاندان کے بعض افراد پہلے سے ہی دین ابراہیمی کے پیروکار تھے۔حضرت عمرؓ کی ولادت عام فیل کے تقریباً تیرہ سال بعد ہوئی۔فنون حرب اور شہسواری کے ساتھ ساتھ انھیں لکھنا پڑھنا بھی آتا تھا۔اور وہ فن خطابت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔مزاج بے حد سخت اور درشت تھا۔ چنانچہ اسلام کی مخالفت میں بھی انھوں نے بے حد شدت سے کام لیا لیکن جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کی وہی شدت اور درشتگی اسلام اور مسلمانوں کے لئے خیر وبرکت کا موجب بنی۔ان کے اسلام نے اسلام کی طاقت وشوکت میں اضافہ کیا۔انھوں نے کھلے عام ہجرت کی اور بہت سارے غریب مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ مدینہ لے گئے جنھیں کفار مکہ ہجرت کرنے سے روکتے تھے۔حضرت عمرؓ نے تمام اسلامی غزوات میں شرکت کی، رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے مشیر و وزیر کی حیثیت سے بھی اور ایک جانباز مجاہد اور بہادر شہسوار کی حیثیت سے بھی۔آپ نے اپنی اصابت رائے اور دینی فراست میں ممتاز تھے قرآن کے کئی احکام آپ کی رائے کے مطابق نازل ہوئے۔اسلام سے وابستگی اور نبی اسلام سے غیر معمولی محبت بھی آپ کا نمایاں وصف تھا۔غزوۂ حنین میں آپ نے اپنا آدھا مال راہ خدا میں پیش کر دیا تھا۔اور محبت رسول کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت آپ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گئے تھے اور رسول اللہ کے وصال کی بات کرنے والوں کو قتل کر دینے کی دھمکی دینے لگے تھے۔

سقیفۂ بنوساعدہ میں حضرت عمرؓ کے حسن تدبیر سے ہی امن وامان کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا فیصلہ ہوا۔خلافت صدیقی میں بھی ان کا بے حد نمایاں کردار رہا اور ہر اہم معاملے اور فیصلے میں وہ شریک رہے۔حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد مسلمانوں کی تاریخ میں عہد رسالت کے بعد سب سے سنہرا دور تھا۔آپ کے عہد میں ہونے والی فتوحات اور اسلام کی نشر واشاعت مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بے نظیر باب ہے۔عدل وانصاف میں آپ کی شخصیت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔زہد وتقوی، فہم وفراست قیادت وسیاست اور ہمت وشجاعت آپ کے نمایاں اوصاف تھے۔آپ کی اولیات، آپ کے ملکی نظم ونسق اور آپ کی جنگ وامن کی پالیسیوں کی بنیاد پر ہی آنے والی مسلم حکومتوں نے اعتماد کیا۔ایک ایرانی غلام ابولولو فیروز کے ہاتھوں آپ کی شہادت ہوئی۔ یہ واقعہ اواخر ذی الحجہ سنہ 23 ہجری کا ہے۔

19.10 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب کم از کم تیس سطروں میں دیجئے:

1. حضرت عمرؓ کی شخصیت ان کے اخلاق وکردار اور ان کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالئے۔
2. حضرت عمرؓ کی ہجرت اور ان کی مدنی زندگی کا جائزہ لیجئے۔
3. اسلام کے لئے حضرت عمرؓ کی خدمات پر ایک مقالہ تحریر کیجئے۔

4. عہد فاروقی کے نظم ونسق اور فتوحات کو بیان کیجئے۔

5. حضرت عمرؓ کی اولیات پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب کم از کم پندرہ سطروں میں دیجئے:

1. حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے واقعہ کو بیان کیجئے۔

2. عہد رسالت میں ہونے والے غزوات میں حضرت عمر کے کردار وشجاعت کا جائزہ لیجئے۔

3. حضرت عمرؓ کے دواوین کا تعارف کرائیے۔

4. حضرت عمرؓ کی شہادت اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالئے۔

19.11 فرہنگ

معتمد	بھروسہ مند
عدل گستری	انصاف کرنا
مناصب	جمع منصب: عہدے
طویل قامت	دراز قد
بکاء	رونا
ایذا رسانی	تکلیف پہنچانا
عصبیت	(غیر معقول) طرفداری
نجابت	خاندانی بزرگی
سرخیلی	سردار
فریب دہی	دھوکہ دینا
شعائر	ارکان دین جیسے نماز وغیرہ
داد شجاعت	بہادری کا مظاہرہ
برافروختہ	غصہ
نیابت	قائم مقامی
تقدم	آگے ہونا

عواقب	نتائج
قرارات	فیصلے
ساربان	اونٹ چلانے والا
مطمع نظر	مقصد
زیرنگیں	قبضے میں/ زیر اقتدار
گریزاں	گریز کرنا/ ٹالنا/ بچنا
گفت وشنید	گفتگو/ بات چیت
عسکری	فوجی
اولیات	ایسے کام جو سب سے پہلے کئے گئے
انتداب	غلبہ، دبدبہ
حوادث	جمع حادثہ: واقعات
دَبّابہ	ایک آلہ جنگ جس میں چھپ کر فوج اور اسلحہ دشمن کے قلعے کے نزدیک پہنچایا جائے
علی رؤس الاشہاد	سب کے سامنے
ضرب المثل	جس کی مثال دی جائے
صرامت	سختی وپختگی
مدعا علیہ	جس کے خلاف مقدمہ کیا گیا ہو
عساکر	فوجیوں
مؤسس	بنیاد ڈالنے والے

19.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الطبقات الکبریٰ (اردو ترجمہ) ابن سعد
2. الفاروق شبلی نعمانی
3. سیر الصحابہ (جلد اول) شاہ معین الدین ندوی

AShort History of the Saraceng - Ameer Ali Syed .4

Mahomet(Mohammed) and His Successors Washington Irving .5

اکائی 20 : حضرت عثمان ابن عفانؓ

اکائی کے اجزاء

20.1 مقصد

20.2 تمہید

20.3 ذاتی احوال

20.4 اسلام کے بعد مکی زندگی

20.5 مدنی زندگی

20.6 عہد خلافت

20.7 نظام حکومت

20.8 جمع قرآن

20.9 شہادت

20.10 فضائل ومناقب

20.11 خلاصہ

20.12 نمونے کے امتحانی سوالات

20.13 فرہنگ

20.14 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

20.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفانؓ کی سوانح حیات اور ان کے کارناموں سے طلبہ کو مطلع کرنا ہے۔ اسلام کی نصرت وحمایت میں ان کی بے مثال خدمات پر روشنی ڈالنا ہے۔ ان کے عہد خلافت سے طلبہ کو واقف کرانا ہے اور اس عہد میں ہونے والی تعمیرات اور فتوحات اور شورشوں کا جائزہ لینا ہے تاکہ طلبہ منافقین اور اسلام دشمنوں کی ان سازشوں سے باخبر ہوسکیں جن کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت ہوئی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ملکی نظم ونسق اور حکومتی انتظام وانصرام کا جائزہ اس اکائی کا حصہ ہوگا۔

20.2 تمہید

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ربع معمور کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا تھا لیبیا سے لے کر چین کی سرحدوں تک اسلامی حکومت پھیل چکی تھی۔ دنیا کی دو عظیم شہنشاہیت نیست و نابود ہو چکی تھیں۔ مما لک و بلدان کی فتح کے ساتھ ساتھ قلوب و اذہان کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک مجوسی کے ہاتھوں حضرت عمر شہید ہو گئے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے آئندہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے ذریعے حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آیا۔ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی چھ سال تو بڑے امن وسکون سے گزرے لیکن ان کی فطری نرمی و رحم دلی اور سادگی و تواضع کے سبب مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ ان کے بعض عمال من مانی کرنے لگے جس کے نتیجے میں عامتہ المسلمین میں یک گونہ بے چینی پیدا ہونے لگی منافقین اور اسلام دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر افواہ بازی اور پروپگنڈے کا بازار گرم کر دیا۔ اور نیک وصالح مسلمانوں میں سے بھی بہت سارے لوگ غلط فہمی کا شکار ہونے لگے۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان پر لگائے جانے والے تمام الزامات بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہیں۔ لیکن ان کے عمال' گورنروں اور افسروں میں سے ہر ایک کی صفائی دینا ممکن نہیں ہے جنھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور محلات بنا لئے تھے اور فارسیوں ورومیوں کے طرز پر زندگی گزارنے لگے تھے۔ جس کے سبب عوام اور امراء کے درمیان خلیج بہت وسیع ہوگئی۔ جن لوگوں نے حضرت عمرؓ کے عہد کے عدل و مساوات سادگی و تواضع کو دیکھا تھا۔ ان کے لئے یہ سب کچھ نا قابل قبول تھا۔ بہت سارے سادہ لوح لوگ فتنہ پردازوں کا شکار ہو گئے اور شورش کی آگ ایسی پھیلی جس میں مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق خاکستر ہو گیا۔ خلیفہ راشد، ذوالنورین لشکر اسلام کے مددگار رسول اسلام اور ان کے دونوں وزیروں کے رفیق کار، بشارت جنت سے شرف یاب، عابد شب زندہ دار، غنی و پرہیز گار، کتاب اللہ کے جامع حضرت عثمان اس شورش کے نتیجے میں شہید ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت اور اس میں ہونے والے فتنوں اور شورشوں کے سلسلے میں تاریخی روایتوں میں اس قدر اختلاف اور تضاد ہے کہ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ چونکہ حضرت عثمانؓ کے فضائل ومناقب ثابت شدہ حقیقت ہے لہٰذا اسلامی تاریخ کے اس سب سے بڑے المیے کی ذمہ داری اسلام دشمن طاقتوں اور منافقین پر عائد ہوتی ہے جنھیں حضرت عثمانؓ کے بعض عاملین کی جاہ پسندی اور دنیا داری سے تقویت حاصل ہوئی۔

20.3 ذاتی احوال

20.3.1 نام ونسب اور کنیت ولقب

آپ کا نام عثمان، کنیت ابوعبداللہ وابوعمر اور لقب غنی اور ذوالنورین ہے۔ اسلام کے لئے آپ کی سخاوت و دریا دلی کے سبب آپ کو غنی کا لقب ملا اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آپ کی زوجیت میں آئیں اس لئے آپ کا لقب ذوالنورین پڑا یعنی دو نور والا۔ والد کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عثمان بن عفان بن ابی العاص ابن امیہ بن عبد

شمس بن عبد مناف، بن قصی بن کلاب بن مرہ بن لوئی بن غالب بن فہر۔ آپ کا نسب عبد مناف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے متصل ہو جاتا ہے۔

والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے: اروی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس۔ حضرت عثمان کی نانی ام حکیم حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی جڑواں بہن تھیں اور ان کا نام بیضاء تھا۔ ام حکیم کنیت تھی۔

20.3.2 خاندان

آپ کا خاندان بنوامیہ قریش کے دو معزز ترین خاندانوں میں سے ایک تھا اور بنو ہاشم کے علاوہ کوئی دوسرا خاندان بنوامیہ کا حریف نہ تھا۔ خلفائے بنوامیہ اسی خاندان سے تھے اور امیہ کی نسبت سے ہی اموی کہلاتے تھے۔ قبل اسلام بھی اس خاندان کو بڑی عزت اور بلند مقام حاصل تھا۔ قریش کا فوجی علم عقاب اسی خاندان کے پاس تھا۔ قریش میں فوجی قیادت بھی اسی خاندان کو حاصل تھی۔ فجار کی جنگ کی قیادت حرب بن امیہ نے کی تھی۔ یہ خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنو ہاشم کا شروع سے ہی حریف ومقابل تھا چنانچہ جب آفتاب رسالت طلوع ہوا تو یہ خاندان اسلام کے مخالفین کی صف اول میں شامل ہو گیا بلکہ یہی خاندان اسلام کی مخالفت کی قیادت کر رہا تھا۔ عقبہ بن معیط نے اسلام کو شدید نقصان پہنچایا اور مسلمانوں کو عرصے تک اذیت میں رکھا۔ اسی طرح ابوسفیان جو اس خاندان کے نمایاں شخص تھے، اسلام لانے سے قبل انھوں نے اسلام کے خلاف متعدد جنگوں کی قیادت کی تھی۔ حرب وضرب میں مہارت، شجاعت و بہادری اور سیاست وحکومت اس خاندان کے بنیادی اوصاف تھے۔ قبیلہ قریش کی یہ فرع بنو ہاشم سے دینی وسماجی مقام ومرتبے میں پیچھے تھی لیکن طاقت واقتدار اور دولت وثروت میں ان سے کافی آگے تھی۔ حضرت عثمان کے والد عفان سفیان بن حرب کے ساتھ تجارت کرتے تھے اور قریش کے صاحب ثروت اور ممتاز افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کی والدہ اروی کا خاندان بھی قریش کے اہم خاندانوں میں سے تھا اور عبد شمس پر جا کر آپ کا ننھیالی اور ددھیالی خاندان مل جاتا ہے۔ عفان کے انتقال کے بعد اروی نے عقبہ بن ابی معیط سے دوسری شادی کر لی تھی۔ عفان سے ان کی دو اولادیں تھیں: حضرت عثمان اور آمنہ جب کہ عقبہ بن ابی معیط سے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی: ولید بن عقبہ، خالد بن عقبہ، عمرو بن عقبہ اور ام کلثوم بنت عقبہ اور یہ سب حضرت عثمان کے ماں شریک بھائی بہن تھے۔

20.3.3 پیدائش، پرورش اور پیشہ

حضرت عثمانؓ کی پیدائش اور بچپن ونوجوانی کے احوال یقین سے معلوم نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ آپ کی پیدائش عام فیل کے چھٹے سال اور ہجرت نبوی سے سینتالیس سال قبل ہوئی اور عیسوی سنہ کے اعتبار سے آپ 577ء یا 576ء میں پیدا ہوئے۔ مشہور روایت کے مطابق آپ کی جائے پیدائش مکہ معظّمہ ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کی ولادت طائف میں ہوئی۔

عرب کے شریف زادوں کی طرح آپ کی پرورش وپرداخت ہوئی اور خوب آرام وراحت کے ساتھ بچپن گزرا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی آپ نے مروجہ فنون میں مہارت حاصل کی۔ عام رواج کے خلاف آپ نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔

جب تھوڑا اور بڑے ہوئے تو تجارت کو اپنا پیشہ بنایا اور خوب ترقی کی۔حسن معاملہ اور دیانت داری کے سبب آپ کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا اور دیکھتے دیکھتے مکہ کے کامیاب تاجروں اور بڑے مالداروں میں آپ کا شمار ہونے لگا۔

20.3.4 ظاہری اور باطنی حلیہ

حضرت عثمانؓ درمیانہ قد وقامت کے تھے۔آپ کا چہرہ خوبصورت تھا اور داڑھی طویل اور گھنی تھی۔ بدن کی ہڈیاں خوب چوڑی تھیں اور شانے کشادہ تھے۔رنگ صاف تھا۔پیر خوب بھرے بھرے اور ہاتھ لمبے تھے جن پر بہت زیادہ بال تھے۔داڑھی میں پیلا خضاب لگاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ اپنی طبیعت وفطرت کے اعتبار سے پاکباز،حق گو اور دیانت دار تھے۔عفت وحیا ان کی عادت ثانیہ تھی وہ بے حد رحم دل اور نرم طبیعت کے تھے۔جس ماحول میں فسق وفجور عزت وافتخار کی بات تھی اس ماحول میں بھی وہ برائیوں سے دور رہے۔جہاں شراب نوشی لوگوں کی فطرت ثانیہ تھی آپ وہاں بھی اس سے آلودہ نہیں ہوئے۔جس سماج میں ظلم وستم اور وحشت و بربریت عظمت واقتدار کا لازمی حصہ تھے۔اس سماج میں بھی آپ رحم دلی اور مروت کے پیکر بن کر رہے۔آپ بے حد سخی، حلیم الطبع اور ملنسار تھے۔

20.3.5 ازواج واولاد

حضرت عثمانؓ نے کئی شادیاں کیں۔پہلی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ تھیں، 2ھ میں ان کا انتقال ہوگیا تو 3ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی بیٹی حضرت ام کلثوم سے آپ کا نکاح ہوا۔ چھ سال بعد 9ھ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔حضرت رقیہ سے عبداللہ نام کے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے تھے جن کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ام کلثوم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔بعد میں بھی آپ نے کئی عقد کئے۔شہادت کے وقت آپ کی اہلیہ حضرت نائلہ آپ کے پاس تھیں اور آپ کو بچانے کی سلسلے میں ان کی انگلیاں بھی کٹ گئی تھیں۔

آپ کے صاحبزادگان میں حضرت ابان کافی مشہور ہوئے اور عہد بنوامیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

معلومات کی جانچ

1. ذوالنورین کا کیا معنی ہے؟
2. قریش کے فوجی علم کا کیا نام تھا؟
3. حضرت عثمانؓ کی پیدائش کب ہوئی؟
4. مکے میں حضور کی کس بیٹی سے حضرت عثمانؓ کا نکاح ہوا؟
5. حضرت عثمانؓ کا تعلق قریش کے کس خاندان سے تھا؟

20.4 قبول اسلام

حضرت عثمانؓ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اسلام دشمنی میں سب سے نمایاں تھا۔لیکن آپ اپنی فطری شرافت اور مزاج کی نیکی کے سبب اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کے مزاج میں قبول حق کی جو صلاحیت ودیعت کی گئی تھی اس نے آپ کو جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل کر دیا۔ان کا اسلام اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تھے جو نہ صرف دین جدید کی مخالفت کی قیادت کر رہا تھا بلکہ نسلوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا حریف تھا۔تاہم جب حضرت ابوبکرؓ نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور ان سے کہا:

> ''اے عثمان! تم ایک مضبوط رائے والے انسان ہو حق و باطل تم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بت تمھاری قوم جن کی پرستش کرتی ہے' بے جان پتھر ہیں۔ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں' نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع دے سکتے ہیں تو حضرت عثمان اس کی تائید کی۔حضرت ابوبکر نے کہا: اللہ نے محمد بن عبد اللہ (علیہ الصلاۃ السلام) کو نبوت و رسالت کے ساتھ بھیجا ہے' اور اپنی تمام مخلوق کی طرف انھیں مبعوث کیا ہے تو کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کے پاس آؤ اور ان کی گفتگو سنو! حضرت عثمان نے کہا کہ کیوں نہیں ہم روز سنیں گے''۔

اس گفتگو سے دو باتیں ظاہر ہیں ایک تو یہ کہ ان کا دل خاندانی اور قبیلہ جاتی تعصب سے خالی تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اسلام کے بارے میں غور وخوض کر رہے تھے اور ان کے دل میں اسلام کے لئے ایک گونہ میلان پیدا ہو چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ حضرت ابوبکر کی دعوت پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے' اللہ کے رسول خود ان کے پاس پہنچ گئے اور ان سے فرمایا:

> ''اے عثمان خدا کی جنت تمھیں بلا رہی ہے اس کی طرف قدم بڑھاؤ' میں تمھارے اور تمام مخلوق کے لئے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔''

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ اس کلام کو سنتے ہی میں بے قابو ہو گیا اور اسلام لے آیا اور گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔حضرت عثمانؓ کے قبول اسلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت رقیہ سے ان کا عقد کر دیا۔حضرت رقیہ کی شادی ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوئی تھی لیکن اس نے اسلام دشمنی میں ان کو طلاق دے دی تھی۔اسلام قبول کرنے کے وقت حضرت عثمانؓ کی عمر تقریباً چونتیس سال تھی اور آپ سے پہلے محض پینتیس یا چھتیس لوگ ہی اسلام لائے تھے۔

20.5 ہجرت

باوجودیکہ حضرت عثمانؓ کا گھرانہ بڑی وجاہت وعزت والا تھا خود حضرت عثمانؓ بے حد عزت و مرتبے والے انسان تھے لیکن

اسلام لانے کے بعد وہ بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکے بلکہ خود ان کا خاندان ہی ان کا سب سے بڑا دشمن بن گیا اور ان کے چچا نے انھیں باندھ کر پیٹا اور کہا کہ: ''کیا تم اپنے باپ اور دادا کا دین چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر رہے ہو' خدا کی قسم جب تک تم اپنا یہ نیا دین چھوڑ نہ دو گے میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا''۔ یہ سن کر حضرت عثمان نے اپنے چچا حکم بن ابی عاص سے واضح لفظوں میں فرمایا کہ: ''خدا کی قسم اب میں یہ دین کبھی بھی ترک کرنے والا نہیں ہوں''۔ ان کا خاندان اسلام دشمنی میں سب سے آگے تھا بھلا اسے یہ کیسے گوارا ہوتا کہ اسی خاندان کا کوئی فرد اسلام قبول کرلے چنانچہ پورا خاندان اور تمام اہل مکہ ان کے خلاف صف آرا ہوئے اور انھیں طرح طرح سے اذیت دینے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے بڑی ہمت و عزیمت کے ساتھ ان مظالم کا سامنا کیا لیکن ہر برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوگیا اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر آپ نے مکہ چھوڑنے اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی تیاری شروع کردی اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کا سب سے پہلے شرف آپ کو حاصل ہوا۔ اپنے گھر' وطن اور تجارت کو چھوڑنے کا فیصلہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن ان کے دل میں اسلام کی محبت ایسی بس گئی تھی کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر ہر چیز چھوڑنے کے لئے تیار ہوگئے تھے۔ آپ کی یہ ہجرت نبوت کے پانچویں سال میں ہوئی۔ آپ کے ساتھ حضرت رقیہ کے علاوہ گیارہ افراد اور بھی شریک ہجرت تھے۔ ''**الاصابة فی تمییز الصحابه**'' میں ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''عثمان اس امت کے پہلے فرد ہیں جنھوں نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کی''۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ابراہیم ولوط علیہما السلام کے بعد عثمان اور رقیہ نے ہجرت کی۔

حضرت عثمانؓ ہجرت کے بعد چند سال حبشہ میں رہے۔ اچانک وہاں یہ خبر پھیل گئی کہ قریش نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ خبر سن کر حضرت عثمان اور دوسرے بہت سے صحابہ مکہ واپس آگئے۔ یہ خبر غلط تھی چنانچہ کچھ لوگ واپس حبشہ لوٹ گئے لیکن حضرت عثمانؓ مکہ میں ہی رہ گئے۔ مکہ میں اب بھی مسلمان مامون نہیں تھے بلکہ پہلے سے زیادہ ظلم وستم کا شکار ہو رہے تھے اور مکہ کی زمین ان پر پہلے سے زیادہ تنگ ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک سبیل پیدا کردی اور عقبہ کی بیعت کے بعد مدینے کی جانب ہجرت کا راستہ ہموار ہوگیا۔ حضرت عثمانؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کرگئے۔

20.5 مدنی زندگی

20.5.1 قیام مدینہ

مدینے میں آپ کا قیام اوس بن ثابت انصاری کے یہاں ہوا۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات کے درمیان مواخات کا رشتہ بھی قائم کردیا۔

مدینے میں مسلمانوں کو پانی کی بڑی قلت ہوتی تھی۔ وہاں پر رومہ نام کا ایک کنواں تھا جو کسی یہودی کی ملکیت تھا اور وہ اس کنویں کے پانی کو فروخت کرتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس یہودی سے بارہ ہزار درہم میں آدھا کنواں خرید لیا اس طرح وہ کنواں ایک

دن اس یہودی کی ملکیت ہوتا اور دوسرے دن حضرت عثمان کی ۔جس دن وہ کنواں حضرت عثمانؓ کی ملکیت میں ہوتا اس دن مسلمان اپنی دو دن کی ضرورت کے مطابق اس میں سے پانی نکال لیا کرتے تھے ۔اور یہودی کی ملکیت والے دن کوئی مسلمان اس سے پانی نہیں خریدتا تھا۔ چنانچہ آدھا کنواں اپنے پاس رکھنے کا اس کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔مجبور ہوکر اس نے اپنا باقی حصہ بھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں فروخت کردیا جنھوں نے اس کنویں کو مسلمانوں کے لئے وقف کردیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنویں کے پانی کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔

غزوہ بدر سے پہلے حضرت رقیہؓ بیمار پڑ گئیں۔حضرت عثمانؓ اپنی خواہش کے برخلاف حق و باطل کے اس پہلے معرکے میں شریک نہیں ہو سکے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حضرت رقیہؓ کے علاج اور تیمارداری میں مصروف رہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر میں ان کی شرکت نہ ہونے کے باوجود نہ صرف انھیں جہاد کے ثواب کی بشارت دی بلکہ مال غنیمت میں سے انھیں مجاہدین والا حصہ بھی دیا۔اس سے بارگاہ رسالت میں ان کے مقام و مرتبے کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔

ہر مسئلے اور ہر مرحلے میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ حضرت رقیہؓ کے انتقال سے بے حد ملول رہتے تھے۔اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک اور صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے آپ کا نکاح کردیا۔ جنگ احد میں آپ نے بڑی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب مسلمانوں کی ایک غلطی اور خالد بن ولید کی حکمت عملی سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی تو بہت سے صحابہ کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کر مدینہ آگئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر نے بھی بعض صحابہ کو مایوس کردیا تھا۔ چونکہ ان کی نیتوں میں کوئی فتور نہ تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان سب کو معاف کردیا اور انھیں مغفرت کا مژدہ سنایا:

''بیشک اللہ نے ان سب کو معاف کردیا اور یقیناً وہ بڑا بخشنے والا اور بردبار ہے'' (آل عمران:155)

4ھ میں جب غزوہ ذات الرقاع پیش آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں انھیں اپنا جانشین بنایا۔اس کے بعد حدیبیہ تک ہونے والے تمام غزوات میں آپ شریک رہے جیسے غزوۂ بنونضیر اور غزوۂ خندق وغیرہ۔

20.5.2 صلح حدیبیہ

6ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔قریش نے آپ کی آمد کی خبر سنی تو بے حد غضبناک ہوئے اور زبردست تیاری شروع کردی اور آپس میں عہد کیا کہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا یہ مکہ سے قریب ایک وادی کا نام ہے جو جدہ اور مکہ کی شاہراہ پر واقع ہے۔آپ نے قریشی سفیروں کے ذریعے اہل مکہ کو یہ پیغام دیا کہ وہ جنگ کے لئے نہیں آئے ہیں صرف زیارت مقصود ہے لیکن قریش نے خود اپنے سفیروں کی باتیں نہیں سنیں۔ایک طرف تو ان کا فخر و گھمنڈ انھیں اس بات کو ماننے سے روک رہا تھا دوسری طرف انھیں یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں مسلمان اس بہانے مکہ پر قبضہ نہ کرلیں۔

گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اپنا سفیر بنا کر بھیجنا چاہا تو انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ قریش سے مجھے اپنی جان کا خدشہ ہے اور میرے خاندان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے پناہ دے سکے قریش بھی میری دشمنی اور سختی کو جانتے ہیں۔ آپ میرے بجائے عثمان بن عفان کو بھیجئے کیونکہ وہ قریش کے نزدیک مجھ سے زیادہ عزیز و محترم ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلایا اور انھیں اپنا نمائندہ بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ اشراف قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موقف سے مطلع کر سکیں۔

حضرت عثمان خدا کے پیغمبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیامبر بن کر مکہ روانہ ہوئے۔ مکہ میں داخل ہونے سے قبل ہی اُبان بن سعید بن عاص سے ان کی ملاقات ہوئی جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس وقت تک کے لئے اپنی امان میں لے لیا جب تک وہ قریش کو رسول اللہ کا پیغام نہ پہنچا دیں۔ وہاں سے حضرت عثمانؓ ابوسفیان اور دوسرے اشراف قریش کے پاس آئے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دیا۔ جب گفتگو مکمل ہوگئی تو قریش نے ان سے کہا کہ اگر وہ طواف کرنا چاہیں تو انھیں اجازت ہے تو آپ کی غیرت ایمانی نے اساطین قریش کو جواب دیا کہ:

''اس وقت تک میں ہرگز طواف نہیں کروں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ فرمائیں''

یہ سن کر قریش نے انھیں روک لیا اور یہ خبر مشہور ہوگئی کہ قریش نے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مشرکوں سے قتال کئے بغیر یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا۔ اور صحابہ سے لڑنے مرنے کی بیعت لینے لگے اور یہ بیعت بیعت رضوان کے نام سے جانی جاتی ہے جس کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے:

''بیشک اللہ مومنین سے راضی ہوگیا جب وہ پیڑ کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے'' (الفتح:18)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے بھی بیعت لی اس طرح کہ اپنے ایک ہاتھ کو عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت کی تکمیل کی۔ اس واقعے میں حضرت عثمان کی عزت افزائی بھی تھی اور ان کے باحیات ہونے کا اشارہ بھی۔

20.5.3 غزوۂ تبوک

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بیزنطینی حکومت ایک خطرے کے طور پر دیکھ رہی تھی۔ رومی حکومت اس سلسلے میں بے چینی بھی محسوس کر رہی تھی اور اس خطرے کے سدباب کے لئے قیصر کے دربار میں غور و خوض بھی چل رہا تھا۔ اسی درمیان مدینے میں یہ خبر پہنچی کہ قیصر مدینے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں دشمن کا انتظار کرنے کے بجائے سرحدوں پر اس سے مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کے لئے تبوک کے میدان کا انتخاب کیا۔ آج یہ مقام سعودی عرب کے شمال میں اردن کی سرحد کے قریب ہے۔ رومیوں سے جنگ کے لئے نہ صرف ایک بڑے لشکر کی ضرورت تھی بلکہ کافی دولت اور سرمائے کی بھی حاجت تھی۔ یہ زمانہ بھی بے حد غربت اور عسرت کا تھا۔ لہٰذا نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری اور جنگی ساز و سامان کی خریداری کے لئے تعاون کی دعوت دی۔ یہ 9ھ کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے بھی اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر

دل کھول کر تعاون کیا۔ اس غریب فوج کے لئے حضرت ابوبکر نے اپنا کل مال اور حضرت عمر نے اپنا آدھا مال بارگاہ رسول میں پیش کیا لیکن سب سے بڑی مالی امداد حضرت عثمان کی طرف سے آئی۔ انھوں نے دس ہزار سے زیادہ پیدل فوج اور تین ہزار سے زیادہ سواروں کی پوری ذمہ داری اٹھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فراخدلانہ تعاون سے بے حد خوش ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی پیش کردہ اشرفیوں کو اپنے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''مَاضَرَّ عثمان ماعمل بعد الیوم''

(آج کے بعد عثمان کچھ بھی کریں وہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گا)

تنگ دست اسلامی فوج کو اس عظیم تعاون کے سبب انکا لقب ''مُجھِزُ جیش العسرۃ'' پڑ گیا۔ یعنی لشکر نادار کو سازوسامان مہیا کرنے والے۔ 10ھ میں حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک رہے۔

20.5.4 خلافت شیخین

عہد رسالت کی طرح خلافت شیخین میں بھی آپ نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ آپ کے پیش رو دونوں خلفاء نے آپ پر اعتماد کیا اور آپ ان دونوں حضرات کی مجلس شوری کے ممتاز رکن اور ہر چھوٹے بڑے معاملے اور فیصلے میں ان کے شریک رہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مرض الموت میں جب اپنے جانشین کے لئے وصیت نامہ لکھوانا چاہا تو ان کی نظر انتخاب آپ پر ہی گئی جب حضرت ابوبکرؓ نے وصیت لکھوانا شروع کیا تو ٹھیک اپنے جانشین کا نام لکھوانے سے پہلے بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ ان کے مزاج شناسی تھے انھوں نے اپنی طرف سے حضرت عمر کا نام لکھ دیا' جب حضرت ابوبکرؓ ہوش میں آئے تو پوچھا: سناؤ کیا لکھا؟ جب حضرت عثمانؓ نے انھیں سنایا تو وہ بے حد خوش ہوئے کیونکہ حضرت عمرؓ کا نام انھوں نے خلیفہ کی عین مرضی کے مطابق لکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کسی فرد کو اپنا جانشین نہیں بنایا بلکہ امر خلافت کو ایک چھ رکنی کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان میں سے ایک تھے۔

20.6 عہد خلافت

20.6.1 خلافت کے لئے انتخاب

جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو صحابہ نے آپ سے اصرار کیا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیں انھوں نے چھ بڑے صحابہ پر مشتمل ایک مجلس شوری قائم کی اور انھیں یہ اختیار دیا کہ وہ آپس میں کسی ایک کو خلیفہ اور امیر المومنین منتخب کر لیں۔ اس مجلس کے ارکان میں: حضرت علی بن ابی طالب' حضرت عثمان بن عفان' حضرت عبد الرحمان بن عوف' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت زبیر بن عوام اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے انھیں حکم دیا کہ میری وفات کے تین دن کے اندر اندر نئے خلیفہ کا تعین ہو جانا چاہئے۔ اتوار یکم محرم کو حضرت عمرؓ کی تدفین ہوئی اور اسی دن مجلس شوری نے اپنا کام شروع کر دیا۔

طویل غور و خوض اور گفت وشنید کے بعد اس مجلس کے تین افراد نے تین لوگوں کا نام پیش کیا۔ حضرت زبیر نے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔ حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کے نام کی تجویز رکھی اور حضرت سعدؓ نے حضرت عبد الرحمانؓ کو خلیفہ بنانا طے کیا۔ حضرت عبد

الرحمان بن عوفؓ نے اپنا نام واپس لے لیا۔اس کے بدلے میں اصحاب شوری نے انتخاب کی ذمہ داری انھیں پرڈالدی۔حضرت عبدالرحمانؓ نے پہلے خودغوروخوض کیا۔پھر بقیہ اصحاب شوری‘اصحاب رسول اورانصارومہاجرین سے بھی مشورہ کیااوردونوں نامزد افرادیعنی حضرت علیؓ اورحضرت عثمانؓ سے بھی مشورہ کیا۔حضرت علیؓ سے انھوں نے پوچھا:اگرمیں آپ کی بیعت نہ کروں توآپ کسے نامزدکرتے تو حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کا نام پیش کیااورانھوں نے جب یہی سوال حضرت عثمانؓ سے کیا توانھوں نے حضرت علیؓ کا نام لیا۔مہاجرین وانصارکی اکثریت نے بھی انھیں دونوں حضرات کا نام پیش کیا۔بعدازیں حضرت عبدالرحمان بن عوف نے چہار شنبہ‘چارمحرم 24ھ کونماز فجر کے بعدتمام مہاجرین وانصارکومسجدنبوی میں جمع کیااورلوگوں سے خلیفہ کے بارے میں سوال کیا۔کسی نے حضرت علیؓ کا نام لیاتوکسی نے حضرت عثمانؓ کااورلوگوں کے درمیان شورہونے لگا۔حضرت عبدالرحمانؓ نے لوگوں کوخاموش کرایا اورحضرت علیؓ سے مخاطب ہوکرپوچھا کہ:

’’اگرآپ کوخلیفہ بنایاجائے توکیاآپ سنت رسول اوردونوں پیش روخلفاء کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے‘‘؟حضرت علی نے جواب دیاکہ: میں اپنے علم اورطاقت کے مطابق کام کروں گا۔پھر یہی سوال انھوں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھاتوانھوں نے کہا کہ:’’انشاءاللہ میں انھیں کی طرح عمل کروں گا‘‘حضرت عبدالرحمانؓ نے اس کے بعدحضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑااورکہا کہ:’’اے اللہ میرے گلے میں جوذمہ داری پڑی تھی وہ میں نے عثمانؓ کے گلے میں ڈال دی‘ یہ کہہ کرانھوں نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی اور ان کے بعدتمام حاضرین نے بیعت کی۔بیعت خلافت کے بعدحضرت عثمانؓ نے خطبہ دیااورحمدوصلاۃ کے بعدفرمایاکہ:

> ’’اے لوگوں!تم سب اپنی اپنی زندگی کے آخری حصے میں ہولہٰذاموت سے قبل جوبھی نیک کام کر سکتے ہوکرڈالوتمھیں صبح یاشام کسی بھی وقت کوچ کرناپڑسکتاہے۔جان لوکہ دنیاغروروگھمنڈمیں لپٹی ہوئی ہے۔تم اس کے فریب میں گرفتارنہ ہواورنہ تمھیں کوئی بھی شئے اللہ سے غافل کرسکے۔وہ دنیا دارلوگ کہاں ہیں جنھوں نے دنیاکوآبادکیااورعرصہ درازتک دنیاسے مزہ لیاکیادنیانے انھیں (گورستان)میں پھینک نہیں دیا‘‘۔

ایک روایت کے مطابق آپ کی بیعت خلافت پہلی محرم 24ھ میں ہوئی اورایک اورروایت کے مطابق 29/ذی الحجہ 23ھ میں آپ کی بیعت ہوئی۔

خلیفہ بننے کے بعدحضرت عثمانؓ کے سامنے جوپہلامسئلہ درپیش ہواوہ سابق خلیفہ کے بیٹے عبیداللہ بن عمرکا مقدمہ تھا۔جنھوں نے حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک دوافرادہرمزان فارسی اورجفینہ نصرانی کے ساتھ ساتھ ابولولوفیروزکی کم عمرلڑکی کوبھی قتل کر دیاتھا۔ہرمزان اورجفینہ کے خلاف گواہ بھی موجودتھےاورجس خنجرسے حضرت عمرپرحملہ کیاگیاوہ خنجربھی ہرمزان کے پاس دیکھاگیاتھا لہٰذاجب عبدالرحمان بن ابوبکراوردوسرے صحابہ سے یہ باتیں عبیداللہ بن عمرکومعلوم ہوئیں توانھوں نے غصے میں ان دونوں کواور ساتھ میں ابولولوکی بیٹی کوبھی مارڈالاجب مقدمہ شروع ہواتوخلیفہ نے کہامسلمانوں سے مشورہ کیاجائے حضرت علیؓ کامشورہ تھاکہ چونکہ قتل کی سازش میں ہرمزان وغیرہ کی شرکت ثابت نہیں ہےلہٰذاعبیداللہ کاعمل قصاص نہیں قراردیاجاسکتااورپھرابولولوکی لڑکی کےقتل کا کوئی جوازنہیں بنتاہے۔لیکن عمروبن عاص کی رائے حضرت علی کی رائے کے خلاف تھی۔حضرت عثمانؓ نے مصلحت وقت کے پیش نظرعمر

و بن عاص کے مشورے کو قبول کیا اور مقتولین کے والی کی حیثیت سے دیت کو قبول کرلیا اور خود اپنے پاس سے دیت کی رقم ادا کر دی کیوں کہ مقتولین کے ورثہ نہیں تھے، خلیفہ ہی ان کا والی تھا اور بطور والی قصاص یا دیت میں سے کوئی ایک قبول کرنا ان کا حق تھا۔

20.6.2 بغاوتوں کا انسداد

حضرت عثمانؓ نے خلافت کی زمام سنبھالی تو اس وقت مختلف مفتوحہ علاقوں میں بغاوت اور شورش چل رہی تھی۔ بعض علاقوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا اور بعض علاقوں سے خراج آنا بند ہو گیا تھا۔ انھی میں آرمینیا اور آذربائیجان بھی تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ علاقے پوری طرح سے فتح نہیں ہوئے تھے اور وہاں کے امراء مسلمانوں کو خراج دے رہے تھے لیکن حضرت عمرؓ کی وفات کی خبر ملنے کے بعد انھوں نے خراج دینا بند کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے شام کے گورنر معاویہ بن سفیانؓ کو باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ انھوں نے حبیب بن مسلمہ فہری کو چھ ہزار فوجیوں کے ساتھ یہ مہم سر کرنے کے لئے روانہ کیا حبیت بن مسلم نے آذربائیجان سے باغیوں کو بھگا دیا لیکن انھیں خبر ملی کہ آرمینیا کا ایک عیسائی پادری مسلمانوں سے مقابلہ آرائی کے لئے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر رہا ہے چنانچہ حبیب بن مسلمہ نے دربار خلافت سے مدد کی اپیل کی۔ خلیفہ نے کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو مدد بھیجنے کا حکم دیا چنانچہ سلیمان بن ربیعہ باہلی کی قیادت میں ایک لشکر آرمینیا روانہ کیا۔ ان دونوں لشکروں نے نہ صرف آذربائیجان اور آرمینیا کی بغاوتوں کو ختم کیا بلکہ پورے قوقار کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔

دوسری بڑی بغاوت اسکندر کی بغاوت تھی۔ جس وقت مسلم فوجیں طرابلس سمیت لیبیا اور دوسرے مقام پر مصروف تھیں، اسکندریہ اور اس کے قرب وجوار کے رومیوں کو بغاوت کا موقع مل گیا چنانچہ وہاں کے رومی سرداروں نے قیصر روم قسطنطین بن ہرقل کو خفیہ طور پر لکھا کہ اس وقت اسکندر کی حفاظت کے لئے صرف ایک ہزار مسلم فوجیوں کا مختصر سا دستہ ہے لہٰذا یہ بے حد مناسب موقع ہے اور اس کا فائدہ اٹھا کر اسکندریہ جیسی اہم بندرگاہ کو واپس لیا جا سکتا ہے اور رومیوں اور عیسائیوں کو جزیہ اور زیردستی کی ذلت سے بھی بچایا جا سکتا ہے۔ قیصر نے اس کے جواب میں اپنے ایک معتمد ساتھی امینویل (Emanual) کی قیادت میں تین سو جہازوں پر مشتمل ایک بحری بیڑا اسکندریہ کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت نہیں تھی۔ رات کی تاریکی میں اچانک یہ بیڑا اسکندریہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور اس بیڑے میں سوار رومی سپاہی اسکندریہ پر ٹوٹ پڑے۔ مسلم فوج کے بیشتر افراد مارے گئے اور امینویل نے نہ صرف اسکندریہ پر قبضہ کر لیا بلکہ موجودہ قاہرہ کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دی۔ لیکن رومی افواج نے اسکندریہ کے آس پاس لوٹ مار کرنے میں کافی وقت ضائع کر دیا۔ اس وقت خلیفہ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کے ہاتھ میں دوبارہ فوجی کمان دے دی جنھیں خود خلیفہ نے کچھ عرصہ قبل فوجی قیادت سے برطرف کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمرو بن عاصؓ کی یہ تقرری اہل مصر کے مطالبے اور جنگی معاملے بالخصوص مصر کے معاملے میں ان کی مہارت کے سبب ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں عمرو بن عاص کو بھی اپنے لشکر کی تنظیم کا تھوڑا موقع مل گیا۔

حضرت عمرو بن عاص جذبۂ شہادت میں شرابور اپنے پندرہ ہزار فوجیوں کو لے کر رومی لشکر کے مقابلے میں نکلے۔ نقیوس قلعے کے پاس دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہوئیں اور ایک بے حد خونریز لڑائی کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ امینویل اسکندریہ کی طرف بھاگا اور اسکندریہ کہ قلعے میں پناہ گزیں ہوا مگر جلد ہی اسلامی فوج نے قلعے کی دیواروں کو گرا کر

رومیوں کو ہمیشہ کے لئے سرزمین مصر سے باہر نکال دیا۔ یہ واقعہ اوائل 25ھ میں پیش آیا مصر کے مقامی باشندوں نے بھی اس جنگ میں رومیوں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دیا۔

مسلمانوں نے رومیوں سے جو مالِ غنیمت حاصل کیا اس میں مقامی قبطیوں کا بھی مال تھا جو رومیوں نے ان سے لوٹا تھا حضرت عمر وبن عاصؓ نے وہ تمام سامان جن کی شناخت ہوگئی، اسے ان کے مالکوں کو واپس کر دیا۔ اس حسن معاملہ نے قبطیوں کو بے حد متاثر کیا۔ اس واقعے کو مسلم مورخین کے ساتھ مغربی تاریخ نویسوں نے بھی ذکر کیا ہے اور حضرت عمر بن عاصؓ کے حسن عمل کا اعتراف کیا ہے۔

20.6.3 فتوحات

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں نہ صرف مفتوحہ ممالک میں بغاوتوں کو کامیابی کے ساتھ دبایا گیا اور اسلامی سرحدوں کو مستحکم کیا گیا بلکہ نئی نئی فتوحات کا ایک سلسلہ بھی شروع ہوا اور مشرق و مغرب اور شمال تینوں جہتوں میں فتوحات ہوئیں۔

اسکندریہ کی بغاوت کے خاتمے کے بعد حضرت عثمانؓ نے عبداللہ ابن ابی سرح کو بلا شرکت غیر مصر کا والی مقرر کیا ہے اور انھیں طرابلس اور اس کے قرب و جوار کے ساتھ افریقہ فتح کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس عہد میں افریقہ سے مراد طرابلس ہے جو مغرب میں واقع علاقہ تھا جہاں آج ٹیونیشیا، الجزائر اور مراکو (مراکش) واقع ہیں۔

عبداللہ بن ابی سرح دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر مصر سے طرابلس کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینے سے بھی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت میں ایک لشکر عبداللہ ابن ابی سرح کی مدد کے لئے چلا۔ اس لشکر میں بہت سارے اشراف بنو ہاشم اور قریش نے شرکت کی جیسے حضرت حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر طیار اور عبداللہ بن عمر بن عاص وغیرہ رضی اللہ عنہم اور ان دونوں مشترکہ لشکروں نے طرابلس کی فتح کی تکمیل کی اور طرابلس کی سرحدوں سے طنجہ تک کے وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی عظیم حکومت کے حکمراں گرگوری کو شکست فاش دے کر شمال افریقہ کے تمام علاقوں کو فتح کر لیا۔ گرگوری اگر چہ بظاہر رومیوں کا گورنر تھا لیکن درحقیقت پوری طرح سے خود مختار تھا۔ اس کی بھاری بھرکم فوج کو شکست دینا بظاہر مسلمانوں کے لئے دودھ کی نہر بہانے سے کم نہ تھا۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی حکمت وشجاعت کے سہارے مسلمانوں نے یہ عظیم معرکہ سر کر لیا اور گرگوری عبداللہ ابن زبیر کے ہاتھوں ہی مارا گیا۔ 27ھ میں فتح حاصل ہوئی جسے اسلامی تاریخ کی کتابوں میں فتح افریقہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ ابن ابی سرح مصر واپس چلے گئے اور عبداللہ ابن نافع کو وہاں کا عامل بنا دیا گیا۔

فتح افریقہ کے بعد عہد عثمانی کی ایک اہم کامیابی قبرص (Syprus) کی فتح ہے۔ جنگی حکمت عملی کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے بحیرہ روم (Mediterranean sea) میں واقع اس جزیرے کی بڑی اہمیت تھی جو شام کی سرحد سے بے حد قریب واقع ہے۔ بحیرہ روم کے مشرق میں شام اور جنوب میں مصر سے لے کر مراکش تک اسلامی حکومت کی ہزاروں میل لمبی سرحدیں تھیں جن کی حفاظت کے لئے اس سمندر میں واقع جزیروں پر مسلمانوں کا کنٹرول بے حد ضروری تھا۔ اور ان تمام جزیروں میں بیزنطینی یا رومی حکومت کے فوجی اڈے تھے جن سے اسلامی حکومت کی سرحدوں کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا اسی کے سد باب کے لئے امیر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ سے بحری فتوحات کی اجازت مانگی تھی لیکن وہ چونکہ بحری مہمات کے خلاف تھے لہٰذا امیر شام کو اس کی اجازت نہیں ملی لیکن

جب حضرت عثمانؓ کے سامنے امیر معاویہؓ نے دوبارہ قبرص کو فتح کرنے کا مطالبہ رکھا اور اس کے فوائد اور حکمتوں کو بیان کیا تو حضرت عثمانؓ نے تھوڑے پس و پیش اور بعض شرائط کے ساتھ انھیں اجازت دے دی۔ ان کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کسی کو جبراً اس بحری مہم پر نہ بھیجا جائے اور اس کے لئے صرف رضا کاروں پر مشتمل لشکر تیار کیا جائے چنانچہ امیر معاویہؓ نے ایسا ہی کیا اور اسلام کے پہلے بحری بیڑے کی تیاری شروع کر دی اور عبداللہ بن قیس کی قیادت میں اس بحری بیڑے کو قبرص کی طرف روانہ کیا۔ مصر کے لئے بھی ایک مضبوط بحری فوج اور بحری بیڑے کی ضرورت تھی اس کا اندازہ مسلمانوں کو اسکندریہ کی بغاوت میں بھی ہو چکا تھا چنانچہ مصریوں نے بھی اسی درمیان ایک زبردست بحری بیڑا تیار کیا۔ یہ عبداللہ بن سعد کی قیادت میں قبرص کی طرف متوجہ ہوا۔ اور دونوں بحری بیڑے کے جہازوں پر سوار مسلمان مجاہدین نے قبرص پر حملہ بول دیا اور ایک سخت مقابلے کے بعد اہل جزیرہ نے ہتھیار ڈال دیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے۔ جزیہ کے طور پر وہی رقم متعین ہوئی جو قبرص والے قیصر روم کو دیا کرتے تھے۔ یہ معاہدہ 28ھ میں ہوا لیکن اہل جزیرہ معاہدے پر قائم نہیں رہے اور تین سال بعد انھوں نے رومی جہازوں کی مدد کی۔ اس کی پاداش میں امیر معاویہ نے دوبارہ قبرص پر حملہ کیا اور 33ھ میں اسے فتح کر کے ممالک اسلامیہ میں شامل کر لیا۔

بحیرۂ روم میں دوسرا بڑا فوجی مرکز سسلی تھا جسے عرب صقلیہ کہتے تھے 32ھ میں امیر معاویہ نے اس کی فتح کا ارادہ کیا اور تین سو جہازوں کا ایک بیڑا روانہ کیا اس مہم میں بھی مسلمانوں نے اپنی طاقت اور جنگی حکمت کا دشمن سے لوہا منوایا۔ اور متعدد بحری اور بری لڑائیوں میں سسلی کی فوجوں کو شکست دی۔ ان لڑائیوں کا احوال سن کر رومیوں کے دارالحکومت قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) سے چھ سو جہازوں پر مشتمل ایک زبردست فوجی بیڑا روانہ کیا جن میں فوجیوں کی بڑی تعداد اور اسلحہ کی بھاری مقدار تھی لہٰذا مسلمانوں نے طاقت کے بگڑتے ہوئے توازن کو محسوس کر کے عارضی طور پر پسپائی اختیار کر لی تاہم رومیوں پر ان کی بحری قوت کی دھاگ پوری طرح جم چکی تھی۔

رومی اس حقیقت کو جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بحری قوت کے خاتمے کے بغیر شام و مصر کی واپسی کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انھوں نے 34ھ میں قسطنطین بن ہرقل کی قیادت میں ایک زبردست جنگی بیڑا روانہ کیا مصر و شام کے بحری بیڑے بھی مقابلے کے لئے آگے بڑھے اور ایک زبردست جنگ کے بعد مسلمانوں نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔ قسطنطین بری طرح زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ رومی بحری بیڑے کی اس شرمناک ہزیمت نے نہ صرف رومیوں کی بحری قوت کو ختم کر دیا بلکہ پورے بحیرۂ روم پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں مسلمانوں نے مشرقی محاذ پر بھی بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ والی بصرہ عبداللہ بن عامر اور سعید بن عاص کی قیادت میں 30ھ میں دو الگ الگ راستوں سے مسلم افواج خراسان اور طبرستان کے لئے روانہ ہوئیں۔ سعید بن عاص کے لشکر میں امام حسن امام حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اس لشکر نے جرجان، خراسان اور طبرستان کو فتح کیا۔ عبداللہ بن عامر اس کے بعد ہرات، کابل اور سجستان کو فتح کر کے نیشاپور کی طرف بڑھے۔ نیشاپور والوں نے ایک طویل مزاحمت کے بعد شکست تسلیم کر لی اور خراج دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آرمینیا کی فتح کی تکمیل بھی حضرت عثمان کے عہد کا ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وصیت کس سے لکھوائی؟
2. خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کی بنائی مجلس شوری میں کون کون لوگ تھے؟
3. اسکندریہ کی بغاوت کس سن میں پیش آئی؟
4. بحیرہ روم کو آج کیا کہتے ہیں؟
5. سائپرس کو عرب کس نام سے ذکر کرتے ہیں؟

20.7 نظام حکومت

20.7.1 ملکی نظم ونسق

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں صوبوں کی حالت حسب سابق رہی البتہ ایک نئے صوبے آرمینیا کا اضافہ ہو گیا علاوہ ازیں حضرت عثمانؓ نے بحرین اور عمان کی دو خلیجی تنظیمی اکائیوں کو بصرہ کے تابع کر دیا جس کے نتیجے میں بصرہ آمدنی اور بشری قوت کے اعتبار سے ایک بڑا صوبہ بن گیا اور اس کے عامل عبداللہ بن عامر بن کریز کو مشرق میں عظیم الشان فتوحات حاصل کرنے میں سہولت ہوئی۔ 29ھ میں جب عبداللہ بن عامر کی بطور بصرہ کے گورنر کے تقرری عمل میں آئی تو ان کی عمر صرف پچیس سال تھی اور انھیں حضرت ابوموسی اشعری جیسے بزرگ صحابی کی جگہ بھیجا گیا تھا لیکن اپنی کم عمری کے باوجود نئے گورنر نے عسکری اور انتظامی دونوں سطحوں پر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ نہ صرف افغانستان اور پورے ماوراء النہر کو اسلامی مملکت کا حصہ بنا دیا بلکہ اپنی مالی اور زرعی اصلاحات کے ذریعے اس صوبے کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا۔ عبداللہ بن عامر نے بصرہ شہر کی توسیع کی اور بصرہ سے مکہ اور مدینہ تک حجاج کرام کے لئے پانی کا مستقل انتظام کیا۔

حضرت عثمانؓ والیوں کے انتخاب میں فوجی، سیاسی اور تنظیمی صلاحیتوں کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ مصر میں ان کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح، جنھیں خلیفہ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی جگہ نامزد کیا تھا، نے بڑی بڑی فوجی فتوحات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مصر کے محصولات میں بھی زبردست اضافہ کیا۔ حضرت عثمانؓ اپنے گورنروں کے خلاف عوام کی شکایت کو سنتے تھے اور کبھی کبھی عوام کی شکایت پر گورنر کو معزول بھی کرتے تھے۔ حضرت ابوموسی اشعریؓ اور ولید بن عقبہ کی معزولی عوامی شکایتوں کی بنیاد پر عمل میں آئی۔ مؤخر الذکر پر شراب نوشی کا الزام تھا اور ان پر حد بھی جاری کی گئی۔ ولید بن عقبہ کا تقرر حضرت عثمانؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر کے کیا تھا کیونکہ صوبائی بیت المال کے نگراں حضرت عبداللہ بن مسعود سے ان کا کسی مالی مسئلے میں نزاع ہو گیا تھا بعد میں خلیفہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بھی ہٹا دیا اور بیت المال بھی ولید کے حوالے کر دیا تھا۔ ولید بن عقبہ خلافت شیخین کے زمانے میں بھی کئی عہدے سنبھال چکے تھے۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ نے سعید بن عاص بن امیہ کو کوفے کا گورنر بنایا جو بقول ذہبی: ایک شریف

بردبار، سخی، محتاط اور عقلمند امیر تھے۔ سعید بن عاص کے عہد میں ہی کوفہ شورش کا مرکز بن گیا اور خلیفہ اور ان کے والیوں اور عاملوں پر طرح طرح کے الزام لگا کر عوام کو ان سے بدظن کیا جانے لگا۔

حضرت عثمانؓ اپنے والیوں سے برابر رابطے میں رہتے تھے۔ اور انھیں ہمیشہ ضروری نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ سبھی کو حج میں اکٹھا کرتے تھے اور سب کا محاسبہ کرتے تھے۔ والیوں کے انتخاب میں ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کی بھی رعایت کی جاتی تھی تاکہ تنظیمی اور ادارتی کاموں کو بغیر کسی تاخیر کے پورا کیا جا سکے۔ ان کے چونتیس (34) والیوں اور عاملوں میں سے صرف سات (7) ایسے تھے جو ان کے رشتہ دار تھے اور ان میں سے بھی اکثر وہ تھے جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے اپنے اپنے عہدوں پر چلے آ رہے تھے۔

دوسرے بڑے عہدے داروں میں عبداللہ بن ارقم مرکزی بیت المال کے نگراں تھے۔ مروان بن حکم خلیفہ کے کاتب (سکریٹری) جابر بن عمرو بن مزنی، سمّاک انصاری تحصیل خراج کے نگراں، حمران بن ابان حاجب (سیکورٹی افسر) اور زکریا بن جہم بن قیس، خارجہ بن حذافہ اور عبداللہ بن قنفذ وغیرہ پولیس اور امن عامہ کے نگراں تھے۔

حضرت عثمانؓ خود فقیہ و مجتہد تھے۔ ان کے عہد میں عدلیہ کا نظام حسب سابق برقرار رہا۔ ہر صوبے میں ایک قاضی ہوتا تھا جس کے زیر نگرانی عدلیہ کا نظام چلتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مدینے میں خلیفہ کے علاوہ زید بن ثابت، دمشق میں ابودرداء، بصرہ میں کعب بن مسور، کوفہ میں شریح کندی، یمن میں یعلی بن امیہ، مصر میں عثمان بن قیس بن ابی عاص اور صنعاء میں ثمامہ قاضی تھے۔

20.7.2 محصولات

حضرت عثمانؓ کے عہد میں آمدنی کے ذرائع وہی تھے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھے یعنی: جزیہ، خراج، مال غنیمت، زکاۃ اور مال تجارت کا دسواں حصہ جسے عشور التجارہ کہا جاتا تھا۔ آمدنی کے یہ ذرائع مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں بدلتے رہتے تھے۔ کیونکہ بعض علاقوں میں بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں اور ہر صلح کی شرائط بھی بدلتی رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں مفتوحہ علاقوں کی زمینیں بھی اپنی اپنی زرخیزی میں مختلف ہوتی تھیں۔

جزیہ کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں پیش رو خلیفہ کی پالیسیوں کو برقرار رکھا گیا۔ جزیہ صرف بالغ مردوں سے لیا جاتا تھا۔ اسلام لانے والوں اور ادائیگی کی استطاعت نہ رکھنے والوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں جزیہ دینے والوں سے زکاۃ یا کوئی دوسرا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا اور انھیں فوجی خدمات سے بھی مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔ شیخین کی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی جزیہ کے نفاذ میں ہمیشہ انسانی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جزیہ کی مقدار کے بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں جس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ بعض مقامات کو کئی کئی بار فتح کیا گیا اور صلح میں ہر بار جزیہ کی مقدار مختلف رہی۔ یہ اختلاف تاریخی روایتوں میں بھی آ گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روایتوں کو بیان کرنے اور بوسیدہ کتابوں سے انھیں نقل کرنے میں خطاء و تحریف کے بڑے امکانات ہوتے ہیں۔

آمدنی کا دوسرا ذریعہ خراج تھا۔مفتوحہ علاقوں سے وہاں کے قدیم باشندوں کو بے دخل نہیں کیا جاتا تھا ان کی زمینیں بھی انھی کے پاس رہتی تھیں اور وہ لوگ اسلامی نظام کو خراج کی شکل میں ٹیکس دیا کرتے تھے یہ نظام صحابہ کے مشورے سے حضرت عمرؓ کے زمانے میں شروع کیا گیا تھا۔اس کے کئی فائدے تھے۔ایک تو مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کا اعتماد حاصل ہوتا اور ان سے اچھے تعلقات قائم ہوتے تھے۔اس طریقے سے زراعت میں ترقی ہوتی تھی اور خراج میں اضافہ ہوتا تھا۔دوسری طرف شام،مصر،عراق، ایران اور خراسان جیسے بڑے بڑے ملکوں کو یا ان کے پانچ حصوں میں سے چار کو فوجیوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں تھا۔اس سے نہ صرف ان کی فوجی صلاحیتوں میں کمی آنے کا خطرہ تھا بلکہ ان کی ناتجربہ کاری سے زرعی پیداوار کے کم ہونے کا بھی خطرہ تھا۔حضرت عمر کے زمانے میں شروع کیا گیا نظام حضرت عثمان کے زمانے میں بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے اپنی کتاب ''عصر خلافت راشدہ'' میں مختلف کتابوں اور روایتوں کے سہارے حضرت عثمان کے عہد میں جزیہ وخراج کی آمدنی کا ایک جمالی گوشوارہ پیش کیا ہے۔جس کے مطابق اس عہد میں ان دونوں آمدنی کے ذرائع سے بائیس کڑوڑ درہم سے زیادہ آمدنی ہوتی تھیں۔اس میں اس طرح ہے:

☆ عراق سے دس کروڑ درہم

☆ مصر سے چار کروڑ اسی لاکھ درہم

☆ افریقہ (ٹیونیشیا) سے تین کروڑ درہم

☆ ایران سے دو کروڑ سات لاکھ درہم

☆ برقہ (لیبیا) سے تیرہ ہزار درہم

☆ شام کے اعداد وشمار کسی روایت میں ڈاکٹر موصوف کو نہیں ملے

لیکن ان کے مطابق شام کی آمدنی کسی بھی حال میں مصر سے کم نہیں رہی ہوگی۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں مصر کی آمدنی حضرت عمرؓ کے عہد سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔اور یہ آمدنی حضرت عمرو بن عاصؓ کی معزولی اور عبداللہ بن ابی سرح کی تقرری کے بعد ہوئی۔اس کے بارے میں ایک مشہور وجہ تاریخ کی کتابوں میں یہ ہے کہ عمرو بن عاص کے مقابلے میں عبداللہ بن ابی سرح نے جزیہ وغیرہ کی رقم کو زیادہ کر دیا اور اسے قدرے سختی سے وصول کیا گیا۔ایک بار جب خلیفہ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو بلا کر کہا کہ: اس بار اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے برجستہ کہا کہ: لیکن اس کے بچے کے لئے کچھ نہیں بچا۔ان تاریخی روایتوں سے ہٹ کر اس اضافہ کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کچھ نئے مفتوحہ شہر اور علاقے مصر میں شامل ہو گئے امن وامان کی صورت حال بھی بہتر ہوئی تھی ان سب کا اثر آمدنی میں اضافے کی صورت میں ہوا۔

مال غنیمت بھی حضرت عثمان کے عہد میں بیت المال کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔لیکن تاریخ کی کتابوں اور حدیث کی روایتوں میں مختلف فتوحات میں حاصل ہونے والی مال غنیمت کی آمدنی کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا ہے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں اور ان کی حکومت دونوں کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا اور دونوں کو غنی کرنے میں مال غنیمت کا اہم کردار تھا۔

عہد خلافت میں زکاۃ بھی بیت المال کی آمدنی کا اہم ذریعہ تھا حضرت عمرؓ کے عہد تک زکاۃ جمع کرنے کے لئے باقاعدہ محصلین مقرر کئے جاتے تھے۔لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مال اور سونے چاندی کی زکاۃ نکالنے کا کام خود ان کے مالکوں کے ذمہ چھوڑ دیا گیا البتہ مویشی اور کھجور کی زکاۃ جمع کرنے کا کام حکومت حسب سابق کرتی رہی۔

باہر سے آنے والے تاجروں پر حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔اور یہ نیا ٹیکس ان کے مال پر دس فیصد کی شرح سے لگایا جاتا تھا۔یہ ٹیکس حضرت عثمانؓ کے عہد میں حسب سابق برقرار رہا۔

بیت المال کی یہ تمام آمدنیاں کتاب وسنت کی روشنی میں اور ضرورت کے مطابق خرچ کی جاتی تھیں۔جن میں جہاد کی تیاری' عمال کی تنخواہیں' مسلمانوں کے وظیفے اور دوسرے بہت سارے رفاہی کام تھے۔حضرت عثمانؓ نے مفتوحہ زمینوں میں سے بہت سارے صحابہ وغیرہ کو زمینیں دیں۔ان حضرات نے ان زمینوں کو قابل کاشت بنایا جس سے مسلمانوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔شہروں کی تعمیر' مسجدوں کی توسیع مہمان خانوں' چراگاہوں' نہروں' سڑکوں اور کنوؤں کی تعمیرات بھی بیت المال کے اخراجات کا حصہ تھیں۔

20.7.3 تعمیرات وتوسیعات

حضرت عثمانؓ کے عہد میں دینی اور رفاہی نوعیت کی بہت سی تعمیرات ہوئیں۔ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر خیبر کا باندھ اور مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع ہے۔خیبر کی جانب سے سیلاب کا پانی مدینے کی جانب بہہ کر آتا تھا۔اس سے اہل مدینہ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔حضرت عثمانؓ نے سیلاب کے راستے میں ایک زبردست باندھ بنوایا جس سے سیلاب کے پانی کا رُخ دوسری طرف مڑ گیا اور شہر مدینہ اور مسجد نبوی دونوں محفوظ ہوئے۔ 29ھ میں حضرت عثمان نے مسجد نبوی کی توسیع کروائی کیونکہ نمازیوں کی کثرت سے مسجد میں جگہ تنگ ہوگئی تھی۔آپ نے مسجد کی تعمیر میں ذاتی طور پر دلچسپی لی۔رات دن خود اس کی تعمیر کی نگرانی فرماتے تھے دس ماہ میں تعمیر مکمل ہوئی۔یہ تعمیر اینٹ چونا اور پتھر کی مدد سے کی گئی جو بے حد مستحکم' مضبوط اور خوبصورت تھی۔

حضرت عثمانؓ نے طرابلس،طبرستان،قبرص اور آرمینیا وغیرہ میں نئی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔نئی نئی چراگاہیں بنوائیں اور کئی پرانی چراگاہوں میں توسیع کا کام کرایا۔حضرت عثمان کے عہد میں ہی بحری فوج کی تشکیل ہوئی اور بحری بیڑے بنائے گئے۔

20.8 جمع قرآن

قرآن کی جمع اور تدوین حضرت عثمان کا سب سے عظیم الشان کارنامہ ہے۔اسی وجہ سے ان کا سب سے مشہور لقب ''جامع قرآن'' پڑ گیا۔اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگرچہ قرآن قریش کے لہجے میں نازل ہوا لیکن مختلف قبیلوں کے افراد قرآن کو اپنے اپنے لہجے میں پڑھا کرتے تھے۔لیکن پھر اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور عجمی لوگ بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے ان عجمیوں میں سے جو جس عرب قبیلے کے فرد سے قرآن سیکھتا اسی کی قراءت اپنا لیتا۔آرمینیا کی جنگ میں جب شام وعراق کی فوجیں اکٹھا ہوئیں تو قراءت کا یہ اختلاف سامنے آیا۔شامی مقداد بن اسود اور ابودرداء کی قراءت پر قرآن پڑھتے تھے جب کے

عراقی زیادہ تر عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوموسیٰ اشعری کی قرأت کے مطابق تلاوت کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی قراءت کو صحیح تر اور افضل سمجھتا تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ لوگ ایک دوسرے کی قراءت کو غلط بھی ٹھہراتے تھے۔ آرمینیا میں قرات کے اس اختلاف نے فتنہ کی شکل اختیار کر لی تو حذیفہ بن یمان نے حضرت عثمانؓ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ مبادا قراءتوں کا یہ اختلاف عربی زبان سے ناواقف عجمیوں کو کتاب اللہ میں ایسے اختلاف میں نہ ڈال دے جیسا اختلاف یہود و نصاریٰ میں تھا۔ یہ احوال سن کر حضرت عثمانؓ کو بھی شدید تشویش لاحق ہوئی اور بلا شبہ یہ ایک ایسی خطرناک بات تھی جو دین محمدی کا شیرازہ منتشر کر سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور ان کے سامنے امت کو ایک قراءت پر متفق کرنے کی تجویز پیش کی جسے سبھوں نے اتفاق رائے سے قبول کیا چنانچہ حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں حفاظ قرآن کی ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی تشکیل دی اور انھیں حکم دیا کہ حضرت ابوبکر کے عہد میں جو صحیفہ قرآن مرتب کیا گیا تھا اسے سامنے رکھ کر پورے قرآن کو قراءت قریش کے مطابق نقل کریں۔ صحیفہ صدیقی ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس موجود تھا چنانچہ یہ مہتم بالشان کام عمل میں آیا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگر قرآن کی مختلف قراءت اور املاء کو نہیں ختم کیا گیا ہوتا تو بائبل کے طرح آج اس کے متعدد نسخے ہوتے۔

بعد میں صحابہ کے ذریعے قراءت قریش کے مطابق تیار کردہ نسخے کو حضرت عثمانؓ نے نقل کرا کر مختلف صوبوں میں روانہ کیا اور وہاں کے عاملوں کو دوسری قراءتوں پر مشتمل نسخوں کو تلف کر دینے کا حکم دیا۔ چونکہ یہ کام اجماع صحابہ کے ذریعے ہوا تھا۔ لہٰذا پوری امت نے اسے قبول کر لیا۔ اس موضوع کو لے کر حضرت عثمانؓ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت علیؓ خود فرماتے ہیں جیسا کہ کتاب المصاحف میں ہے:

> ''اے لوگو! عثمان کے سلسلے میں مبالغہ بازی سے بچو' اور ان کے بارے میں ہمیشہ اچھی بات کہو انھوں نے مختلف قرأت اور املاء پر مشتمل مصحفوں کو جلانے کا جو حکم دیا ہے وہ ہم سب کی مرضی سے دیا ہے۔ اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو عثمان نے کیا ہے۔''

20.9 شہادت

حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت صرف خلافت راشدہ ہی کا نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس سے پہلے امت کبھی اس قدر شرت کے ساتھ مختلف نہیں تھی اور اس کے بعد کبھی باضابطہ طور پر متحد نہیں ہوئی۔ وہ فتنہ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سبب بنا وہی جنگ جمل' صفّین اور نہروان کا موجب بنا۔ اس فتنے کے آثار نے عہد اموی اور عباسی کے تمام داخلی فتنوں کو جنم دیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ گزشتہ چودہ سو برس میں ہونے والی تمام نفسیات' فرقہ واریت اور داخلی شورشیں اسی فتنہ کبریٰ کے آثار و نتائج ہیں اس فتنے میں امت محمدیہ کے جسد پر جو زخم لگے وہ آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔

جس وقت حضرت عثمانؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے اس وقت وہ اپنی عمر کی ساتویں دہائی سے گزر رہے تھے۔ اس پیرانہ سالی کے علاوہ وہ بے حد نیک طبیعت اور نرم مزاج کے تھے جس کا فائدہ ان کے اپنے اور پرائے' دوست اور دشمن سب نے اٹھایا، ان کی خلافت کے پہلے چھ سال تو بڑے امن و امان سے گزرے۔ لیکن حضرت عمر کی سختی کے بعد ان کی نرمی اور حضرت عمر کے چست

ودرست نظام کے بعد ڈھیلا ڈھالا طرز حکومت زمانے کی تبدیلیوں اوران کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے تغیرات کا مقابلہ نے کرسکا۔ ہر جگہ شورشیں ہونے لگیں اور فتنے برپا ہونے لگے۔ مال ودولت میں غیر معمولی اضافے کے سبب مسلمان تعیش کی زندگی جینے لگے۔ دربار خلافت کے فیضیاب بے حد پرتکلف زندگی کے عادی بننے لگے۔ عراق شام اور مصر تہذیب کے گہوارے تھے۔ وہاں رہنے والے مسلمان بھی ان تہذیبی تکلفات کا شکار ہونے لگے۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد دولت کی اس فراوانی کے نتیجے میں لہو ولعب میں بھی گرفتار ہوگئی۔ حضرت ابوذرغفاریؓ شام میں رہتے تھے جب انھوں نے مسلم امراء اور قائدین کی یہ حالت دیکھی تو ان پر سخت تنقید کرنے لگے اور انھیں عہد رسالت کی سادگی کی یاد دلانے لگے لیکن انھیں وہاں سے مدینہ بھیج دیا گیا۔ اہل ثروت کے خلاف اپنی بے باک رائے اور سخت تنقید کے سبب وہ مدینہ میں بھی قیام نہیں کرسکے اور ایک گاؤں میں جاکر مقیم ہوئے۔ دولت کی یہ فراوانی اور امراء وغرباء کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کے فتنے کی آگ کو شخصی مصلحت قبیلہ جاتی حمیت نے مزید بھڑکایا اور قومی عصبیت نے فتنے کی اس آگ میں گھی کا کام کیا۔ منافقین نے بھی اس ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور خلیفہ کے خلاف ماحول سازگار کرنے کے لئے متحرک ہوگئے۔ دھیرے دھیرے یہ فتنہ وشورش پوری حکومت اسلامیہ میں پھیل گئی' کوفہ بصرہ اور فسطاط (قاہرہ) اس کے خاص مراکز تھے۔

ان میں سے کچھ لوگ واقعی ایسے تھے جن کے مسائل درست اور مطالبات صحیح تھے۔ وہ حضرت عثمان کے عاملوں اور افسروں کی زیادتی کا شکار ہوئے تھے۔ ان کی شکایتوں کو قرار واقعی سننے اور انھیں دور کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس غیر واضح صورت حال میں مظلوموں اور فتنہ بازوں کے درمیان فرق نہیں ہوسکا اور نہ ہی یہ مظلومین فتنہ پروروں کو پہچان سکے تاکہ وہ خود کو ان سے الگ کر سکے۔ پروپیگنڈے کا ایسا بازار گرم تھا جس میں حق وباطل کی تمیز مشکل تھی۔ حضرت عثمان اور ان کے نظام کے خلاف جو اعتراضات تھے ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

1. حکم بن عاص کو رسول اللہ نے مع اس کے اہل خانہ شہر بدر کردیا تھا' حضرت عثمان نے واپس بلالیا۔
2. عبداللہ بن مسعود' عبدالرحمان بن ارقم، ابوموسیٰ اشعری بنی شعبہ، عمار بن یاسر وغیرہ بزرگوں کو ہٹا کر زمام اقتدار اپنے ناتجربہ کار رشتہ داروں کے سپرد کردیا۔
3. بیت المال میں حسب مرضی تصرف کیا اور اپنے عزیز واقارب کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کیا۔
4. بزرگ صحابہ کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی جیسے عبداللہؓ بن مسعود کا وظیفہ بند کردیا گیا اور حضرت ابوذر کو مدینے سے باہر کردیا گیا۔ عبادہ بن صامت اور عمار بن یاسر جیسے جلیل القدر صحابہ کے ساتھ سختی کی گئی۔
5. عبیداللہ بن عمر سے ابولولو کی بیٹی اور ہرمزان کا قصاص نہیں لیا
6. ولید بن عقبہ کی شراب نوشی کے بعد اس کی معزولی اور سزا میں تاخیر کی گئی۔
7. حضرت عثمانؓ نے سنت کے خلاف منیٰ میں قصر کے بجائے پوری نماز پڑھی۔
8. مصر سے آنے والے وفد کے ساتھ بدعہدی کی۔

ان اعتراضات کے علاوہ بھی حضرت عثمانؓ کے مخالفین ان پر بہت سارے الزامات لگاتے ہیں جن میں سے کئی ایک کے جواب پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں۔ان تمام اعتراضات کے جواب خود حضرت عثمان نے اپنے خطبوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کی نظیروں کے ساتھ دئے۔لیکن فتنہ پردازوں کے شور وشغب میں بہت سے نیک لوگ بھی ان الزامات سے متاثر ہوئے۔اور حضرت عثمان کی معزولی اور ان کے عمال کی برطرفی کے مطالبے میں فتنہ پردازوں کے ہمنوا بن گئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ راشد اور بشارت جنت سے سرفراز حضرت عثمانؓ کو باغیوں نے دارالخلافہ میں مظلومانہ شہید کر دیا۔اور امت سکوت و جمود میں مبتلا رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اور سلسلہ واقعات جس طرح پیش آیا اس کے سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔ اکثر روایتیں مختلف فیہ ہیں بلکہ باہم متعارض ہیں چنانچہ اس سانحہ کبریٰ اور فتنہ عظیمہ کے حقیقی اسباب تک پہنچنا ناممکن ہے۔

فتنہ پرداز شکایت کنندگان کے ساتھ مل کر مدینہ پہنچے اور اپنی ریشہ دوانائیوں میں لگ گئے۔حضرت عثمان نے اس اجتماع کی خبر سنی تو حضرت علی کی وساطت سے کہلوایا کہ وہ تمام جائز مطالبات کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ اس گفتگو کے بعد شکایت کنندگان مدینے سے واپس ہو گئے۔آنے والے جمعہ کے دن حضرت عثمان نے اپنے اصلاحی پروگرام کا اعلان بھی کیا' اہل مدینہ بھی ان اعلانات سے بے حد خوش ہوئے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔لیکن ایک دن اچانک مصری وفد بے حد غیظ وغضب کے ساتھ مدینے میں داخل ہوا۔اور مدینے کی گلیوں میں انتقام انتقام کے نعرے لگانے لگا۔حضرت علی کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ واپسی میں انھوں نے دربارِ خلافت کے ایک قاصد کو پکڑا جو خلیفہ کی جانب سے ہم لوگوں کے قتل کا فرمان لے کر مصر جا رہا تھا۔حضرت عثمان نے ایسے کسی خط کی تحریر سے حلفیہ انکار کیا لیکن قاصد نہیں مانے اور انھوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ وفد میں شامل مفسدین اور فتنہ پردازوں نے اس جدید صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔بعض صحابہ نے محاصرین کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ خلیفہ کی معزولی سے کم پر راضی نہیں تھے۔اور حضرت عثمان کسی قیمت پر ان کے اس انتہا پسندانہ مطالبے کو ماننے کو تیار نہیں تھے۔حضرت حسن بن علی اور عبداللہ بن زبیر حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے ان کے گھر پر موجود تھے۔محاصرے کے دوران حضرت عثمان نے کئی بار باغیوں کو سمجھانے کی کوششیں کیں انھیں اسلام کے لئے اپنی خدمات یاد دلائیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔محاصرین کی تمام تر زیادتی کے باوجود حضرت عثمان نے ان کے خلاف قوت کے استعمال کو سختی سے منع کر دیا اور مدینہ سے باہر جانے سے بھی انکار کر دیا۔انھیں اپنی شہادت نظر آ رہی تھی جس کی پیشین گوئی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کئی بار کی تھی۔

دوسری طرف اپنے مطالبات منوانے کے لئے محاصرین بھی اپنا محاصرہ سخت کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض فتنہ گروں نے 8/ ذوالحجہ 25ھ بروز جمعہ بوقت عصر خلیفہ ثالث کو شہید کر دیا۔شہادت کے وقت حضرت عثمان روزے سے تھے اور قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔گریگورین کلنڈر کے اعتبار سے یہ تاریخ تھی ۱۷ مئی 656ء تھی' سنیچر کا دن گزار کے رات میں جنت البقیع کے پیچھے آپ کی تدفین ہوئی۔ بعد میں یہ حصہ بھی جنت البقیع میں شامل کر لیا گیا۔

20.10 فضائل ومناقب

حضرت عثمانؓ کی منقبت کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ذوالنورین اور صاحب ہجرتین ہیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر انھیں جنت کی بشارت دی۔ وہ کاتب وحی تھے اور مجتہدین صحابہ میں شامل تھے۔ حج کے ارکان ومناسک سے متعلق مسائل میں خصوصی درک رکھتے تھے۔ عہد جاہلیت میں بھی وہ شراب سے ناآشنا تھے۔ اسلام کے بعد خوف خدا اور محبت رسول آپ کی طبیعت کا حصہ بن گئے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے جس ہاتھ سے رسول اللہ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کی تھی اس ہاتھ کو کبھی نجاست یا نجاست کی جگہ سے مس نہیں کیا۔

حیا آپ کی سب سے نمایاں صفت تھی۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمانؓ کی آمد کی خبر سن کر اپنے کپڑے برابر کرنے لگے تو لوگوں نے پوچھا کہ عثمان کے لئے اس اہتمام کی کیا وجہ ہے تو فرمایا: ''میں اس شخص سے شرم کیوں نہ کروں جس سے فرشتے تک شرم کرتے ہیں''۔

نرمی وتواضع آپ کا خاص وصف تھا حتیٰ کہ محکومین اور خدام کے ساتھ بھی نرمی وتواضع سے پیش آتے تھے۔ وہ صرف مال کے دھنی نہیں دل کے بھی دھنی تھے۔ انھوں نے اپنے مال خاص سے متعدد مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ان کے اہل بیت اور عام مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ فیاض شخص سبھی کے ساتھ فیاضی کرتا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی فیاضی کا سلوک کیا۔ مفسدین ومنافقین نے جس کا افسانہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بڑے عابد زاہد تھے۔ شہادت کے وقت بھی وہ روزے سے تھے اور قرآن کی تلاوت کررہے تھے۔ صبر وتحمل بھی آپ کا ایک بڑا وصف تھا جس کا مظاہرہ آپ نے محاصرے کے دوران کیا۔ اگر آپ چاہتے تو محاصرین کو طاقت سے جواب دے سکتے تھے۔ لیکن خود ان سے لڑنے کے بجائے دوسروں کو بھی ان سے لڑنے سے سختی کے ساتھ منع کردیا تھا۔

معلومات کی جانچ

1. حضرت عثمان کے عہد میں کس نئے صوبے کا اضافہ ہوا؟
2. حضرت عثمان کے سکوریٹی افسر کا نام بتائیے۔
3. حضرت عثمان کے عہد میں آمدنی کے دو ذرائع کو بتائیے۔
4. حضرت عثمان نے کون سا باندھ تعمیر کیا؟
5. شہادت کے وقت حضرت عثمان کی عمر کیا تھی،

20.11 خلاصہ

حضرت عثمان غنی تیسرے خلیفہ راشد اور جنت کی بشارت سے مشرف ہونے والے دس خوش نصیب افراد میں سے ایک ہیں۔ ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا جو بنو ہاشم کے بعد قریش کا سب سے معزز خاندان تھا۔ اپنے خاندانی مقام ومرتبے کے ساتھ ساتھ وہ ایک

بے حد نیک نفیس رحم دل اور متواضع انسان تھے۔ آپ کی پیدائش 576ء یا اس کے آس پاس ہوئی۔ شریف خاندان کے بچوں کی طرح آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی اور آپ کا بچپن بے حد آرام و راحت کے ساتھ گزرا۔ آپ نے عرب کے روایتی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھا۔ بڑے ہوکر آپ نے اپنے والد کی طرح تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اس میں خوب ترقی کی۔ حضرت ابوبکر کی ترغیب پر آپ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور سب سے پہلے ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی یہ ہجرت حبشہ کی طرف تھی۔ آپ نے دوسری ہجرت مدینہ کی جانب کی مدینے میں آپ کا قیام اوس بن ثابت انصاری کے یہاں تھا رسول اللہ نے ان دونوں کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ بھی قائم کردیا تھا۔ مدینے میں بھی آپ نے اپنی تجارت کو جاری رکھا آپ کی تجارت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت عطا فرمائی۔ آپ ایک مالدار اور صاحب ثروت تاجر تھے۔ آپ کی مالداری سے عام مسلمان اور اسلامی لشکر دونوں کو متعدد مواقع پر فائدہ پہنچا۔ بدر کے علاوہ آپ نے تمام غزوات میں شرکت کی غزوہ بدر میں آپ حضرت رقیہ کی بیماری کے سبب شریک نہیں ہو سکے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر اہل مکہ کے پاس بھیجا آپ کے ہی سبب بیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے۔ غزوہ تبوک میں حضرت عثمان نے اسلام کے نادار لشکر کی بڑی فراخ دلی کے ساتھ مدد کی اگر آپ اتنی خطیر رقم راہ خدا میں نہ دیتے تو یہ مہم پائے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں آپ بے حد نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور آپ کی یہ حیثیت خلافت شیخین کے عہد میں بھی برقرار رہی۔ حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں اپنی وصیت لکھوانے کے سلسلے میں آپ پر اعتماد کیا اور حضرت عمرؓ نے اپنے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کے لئے بنائی گئی کمیٹی کا آپ کو رکن بنایا جس کمیٹی نے بطور خلیفہ آپ کا انتخاب کیا۔ آپ کا انتخاب محرم 24ھ میں ہوا۔

آپ کے عہد خلافت میں بڑے بڑے کارنامے انجام پائے آرمینیا اور اسکندریہ کی بغاوتوں کا انسداد کیا گیا۔ اسلامی سرحدوں کی مستحکم کیا گیا۔ اور مملکت اسلامیہ کے مغرب' مشرق اور شمال تینوں جانب فتوحات حاصل ہوئیں اور ہر سہ جانب اسلامی حدود کی توسیع ہوئی۔ آپ کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن کریم کی جمع و تدوین ہے۔ جس کے سبب آپ کا ایک لقب ''جامع قرآن'' ہوا۔ آپ کے عہد مبارک میں ہی مسلمانوں نے اپنا عظیم الشان بحری بیڑہ تیار کیا۔ اور سائپرس پر قبضے کے ساتھ ساتھ بحیرہ روم میں کئی معرکے سر کئے۔

آپ کے عہد کی فتوحات بھی قابل ذکر ہیں۔ سائپرس اور بحیرہ روم کے جزائر کے ساتھ ساتھ طرابلس (لیبیا) بھی آپ کے عہد خلافت میں فتح ہوا۔ حضرت عثمان کے عہد میں آمدنی کے ذرائع میں جزیہ' خراج' مال غنیمت اور تجارتی مال کا دسواں حصہ شامل تھا۔ حضرت عثمان نے فوجی اور مالی پالیسیوں میں گزشتہ خلفاء کے طریقہ کار کو جاری رکھا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد کا پہلا نصف حصہ بے حد امن وسکون سے گزرا لیکن دوسرے نصف میں بے اطمینانی اور بدامنی کا آغاز ہوگیا اور اس کے پس پشت منافقین اور اسلام دشمن طاقتیں تھیں یہ فتنہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ جب مختلف امصار و بلاد سے عمال کی شکایت لے کر لوگ مدینے آئے تو ان کے ساتھ ان منافقین اور فتنہ پروروں کی ایک جماعت بھی آگئی اور محاصرے کے دوران انھیں میں سے بعض نے امیر المومنین حضرت عثمان کو شہید کردیا۔

20.12 نمونے کے امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب دیجئے، جواب تیس سطروں سے کم نہ ہو:

1. حضرت عثمان کی سوانح پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. اسلام کے لئے حضرت عثمان کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔
3. حضرت عثمان کے عہد خلافت کا جائزہ لیجئے۔
4. خلافت عثمانی میں ہونے والی شورشوں کو بیان کیجئے اور ان کے عوامل واسباب کا بھی ذکر کیجئے۔
5. حضرت عثمان کے فضائل ومناقب کا تعارف کرائیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب لکھئے کوئی جواب پندرہ سطروں سے کم نہ ہو:

1. حضرت عثمان کے خاندان کا تعارف کرائیے۔
2. حضرت عثمان کے القاب: غنی، ذوالنورین، جامع القرآن، صاحب ہجرتین اور مجہز جیش العسرہ کے معنی کو بیان کیجئے۔
3. صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان کے کردار کا جائزہ لیجئے۔
4. عہد عثمانی کی فتوحات پر روشنی ڈالئے۔
5. حضرت عثمان کا بطور خلیفہ انتخاب کیسے عمل میں آیا۔

20.13 فرہنگ

حریف	مقابل
حرب وضرب	جنگ
شرست	طبیعت ومزاج
جزءلا یتجزیٰ	علاحدہ نہ ہونے والا جزء
ودیعت کرنا	رکھنا، عطا کرنا
بایں ہمہ	ان سب کے باوجود
وجاہت	بلند مقام

سبیل	راستہ
مواخات	بھائی چارہ
فریب خوردگی	دھوکہ کھانا
اساطین	بڑے لوگ
سدِّ باب	دروازہ بند کرنا
عسرت	تنگی
پیش رو	پہلے والے
ہزیمت	شکست
ماسبق	گزرے ہوئے، پچھلے
تلف کرنا	ختم کرنا، ضائع کرنا
مندمل ہونا	(زخم کا) بھرنا
جسد	جسم
سانحہ کبری	عظیم حادثہ
وساطت	ذریعہ
منقبت	تعریف
درک	قدرت

20.14 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الطبقات الکبری (اردو ترجمہ) — ابن سعد
2. عبقریۃ عثمان (عربی) — عباس محمود عقاد
3. سیر الصحابہ (جلد اول) — شاہ معین الدین ندوی
4. AShort History of the Saraceng - Ameer Ali Syed

اکائی 21 : حضرت علی ابن ابی طالبؓ

اکائی کے اجزاء

21.1 مقصد

21.2 تمہید

21.3 ذاتی احوال

21.4 غزوات

21.5 مدنی زندگی

21.6 حضرت علیؓ اور خلفاء ثلاثہ

21.7 منصب خلافت

21.8 واقعہ جمل

21.9 جنگ صفین

21.10 شہادت

21.11 نظام حکومت

21.12 فضائل و کردار

21.13 خلاصہ

21.14 نمونے کے امتحانی سوالات

21.15 فرہنگ

21.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

21.1 مقصد

اس اکائی کا بنیادی مقصد طلبہ کو خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی سوانح ان کے عہد خلافت اور ان کے فضائل و مناقب سے واقف کرانا ہے۔ ان کے عہد خلافت میں ہونے والے فتنوں اور شورشوں سے طالبان علم کو آگاہ کرنا ہے۔ اور ان کے بلند اخلاق و کردار اور عادات و اطوار سے واقف کرانا ہے۔

21.2 تمہید

حضرت عثمان غنی کی مظلومانہ شہادت کے بعد امت کے افق پر اختلاف وانتشار ایسے سیاہ اور مہیب بادل چھا گئے جس نے اس کے اتفاق ووحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہر ایک اس صورتحال سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔ ایک طرف اسلام دشمن' یہود ونصاریٰ اور منافقین پوری طرح سے متحرک وفعال تھے تو دوسری طرف قبیلہ جاتی عصبیت بھی فضاؤں میں زہر گھول رہی تھی۔ اقتدار کے حصول اور اس میں اضافے کی کوششیں بھی پورے شباب پر تھیں۔ امت مرحومہ کی اکثریت مخلصین کی تھی لیکن غلط فہمیوں اور پروپگنڈوں کے غبار نے ان کی بصارت کو محجوب کر رکھا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ احوال میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے مہاجرین وانصار کے مطالبے پر زمام خلافت سنبھالی لیکن امت کا وہ طبقہ جو آرام وراحت کا خوگر ہو گیا تھا وہ حضرت علیؓ کی خلافت کی صورت میں عہد فاروقی کی واپسی نہیں چاہتا تھا۔ حضرت علیؓ کی عظمت اور ان کے استحقاق کو تو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا البتہ مختلف حیلوں سے ان کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا انھیں میں سے ایک حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ تھا۔ بلا شبہ خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ' وارضاہ عنا کی مظلومانہ شہادت کا قصاص لینا امت کا ایک بہت بڑا فریضہ تھا۔ لیکن اس سے بڑا فریضہ مہاجرین وانصار کے منتخب کردہ امیر المومنین کی بیعت اطاعت کا تھا۔ حضرت عثمان کے محاصرین میں بہت سے لوگوں کی حضرت علی سے وابستگی نے بھی غلط فہمیوں کو ہوا دی۔ یہودی ابن سبا اور اس کا ٹولہ بھی محبت اہل بیعت کے نام پر اسلام کی بیخ کنی میں لگا تھا انھیں جاہ پسندوں، غلط فہمیوں کے شکار، منافقین اور ابن سبا کے متبعین کی شورشوں نے جنگ صفین کی راہ ہموار کی۔ جنگ صفین کے سبب مسلمانوں میں جو خونریزی ہوئی سو ہوئی جان ومال کا جو زیاں ہوا سو ہوا دہشت گرد اور شدت پسند خارجیوں کا فرقہ بھی اس جنگ کا ایک شاخسانہ ہے۔ جس نے نہ صرف خلیفہ چہارم حضرت علی کو شہید کر دیا بلکہ ان کی شہادت کے ساتھ ساتھ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا بھی خاتمہ کر دیا۔

21.3 ذاتی احوال

21.3.1 نام ونسب اور کنیت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور ان کی آغوش کے پروردہ، خاتون جنت فاطمہ زہراء کے شوہر نامدار اور نوجوانان جنت کے سرداروں کے والد ماجد' حکمت ودانائی کا منبع اور شجاعت وہمت کے پیکر' چوتھے خلیفہ راشد اور جنت کا مژدہ پانے والے دس خوش نصیبوں میں سے ایک حضرت علی ابن ابی طالب ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ۔ اور نضر بن کنانہ کا ہی لقب قریش تھا۔

آپ کی کنیت ابوالحسن تھی۔ لیکن آپ کو ابوتراب کی کنیت سب سے زیادہ عزیز تھی کیونکہ یہ کنیت آپ کو بارگاہ رسالت سے ملی تھی۔ ایک بار آپ مسجد نبوی میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ کی پیٹھ خاک آلود ہو گئی تھی اللہ کے رسول آپ کے پاس آئے اور آپ کی

پیٹھ میں لگی ہوئی مٹی کو صاف کرتے ہوئے فرمایا: ''اجلس یا اباتراب ''یعنی اے ابوتراب بیٹھ جاؤ، تراب عربی میں مٹی کو کہتے ہیں۔ آپ کے بہت سے القاب ہیں جن میں حیدر سب سے زیادہ مشہور ہے جس کا معنی شیر ہے۔

21.3.2 خاندان عالی شان

آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم آپ کے والد جناب ابوطالب کی چچازاد بہن تھیں۔اس طرح آپ نجیب الطرفین ہاشمی تھے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔آپ کا خاندان بنو ہاشم قریش کا ممتاز ترین خاندان تھا اور قریش عرب کا سب سے ناموراور معزز قبیلہ تھا۔کعبہ کی تولیت کے سبب اس قبیلے کو پورے عرب میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔قصی بن کلاب، ہاشم بن عبدمناف اور عبدالمطلب بن ہاشم نے اپنی حکمت ودانائی اوراخلاق وکردار سے قبیلۂ قریش کوسارے عرب کا مذہبی اورسیاسی رہنما بنادیا۔

حضرت علی کے دادا عبدالمطلب نے اس عظیم خاندان کی شہرت ونا موری میں مزید اضافہ کیا۔انھوں نے قریش کے تجارتی اسفار کو نئے سرے سے شروع کرایا۔زمزم کے کنویں کی بازیافت کی۔یمن کا بادشاہ ابرہہ انھی کے زمانے میں کعبہ پرحملہ آور ہوا تھا۔

آپ کے والد ابوطالب بن عبدالمطلب اپنے والد کے بعد خاندان کے سربراہ ہوئے۔اپنے زمانے میں یہ قریش کے ممتاز ترین فرد تھے۔تمام قریش اوراہل مکہ انھیں اپنے تنازعات میں حاکم بناتے تھےاوراپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں جناب ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش وپرداخت میں جس الفت ومحبت اورتوجہ وعنایت سے کام لیا اور کفار مکہ کے مقابلے میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی نصرت وحمایت کی اوراس کے لئے جس ہمت واستقلال سے کام لیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

یہ خاندان اپنی شرافت ونجابت، مروت وسخاوت' اور شجاعت وعدالت میں اپنی مثال خود آپ تھا۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے اولاد اسمٰعیل (علیہ السلام) میں سے کنانہ کا انتخاب کیا، کنانہ میں قریش کا انتخاب کیا اور بنو ہاشم کو قریش میں سے منتخب کیا''

21.3.3 پیدائش وپرورش

حضرت علی کی ولادت واقعہ فیل کے تیس سال بعد اور بعثت نبوی سے دس سال قبل ہوئی۔مشہور روایت کے مطابق رجب کی تیرہ تاریخ تھی۔مکان پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ایک روایت کے مطابق آپ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسی روایت کوترجیح دیا ہے۔

حضرت علیؓ کی ابتدائی پرورش ان کے والدین نے کی۔ابوطالب کا کنبہ بڑا تھا اور معاشی حالت کمزور تھی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب ومحسن چچا کی ذمہ داریوں میں تعاون کی غرض سے حضرت علی کی کفالت کی ذمہ داری خود لے لی اور آپ

کی تحریک پر عباس بن عبد المطلب نے جعفر بن ابو طالب کی پرورش کا ذمہ اٹھالیا۔اور اس طرح آپ کی پوری پرورش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش رحمت میں ہوئی جس کے آثار و برکات حضرت علی کی زندگی میں خوب خوب نمایاں ہیں۔ نہ آپ نے کبھی شراب نوشی کی، نہ بتوں کو سجدہ کیا، نہ کسی مشرکانہ رسم میں شریک ہوئے۔

21.3.4 قبول اسلام

بعثت نبوی کے فوراً بعد ایک دن حضرت علیؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ خدیجہ مصروف عبادت ہیں۔ وہ اسی گھر میں رہتے تھے لیکن یہ نظارہ انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا' بعد میں انھوں نے حیرت کے ساتھ اس کے بارے میں سوال کیا تو رسول اللہ نے انھیں اپنے مبعوث کئے جانے کے بارے میں اطلاع دی اور انھیں بھی اسلام کی دعوت دی اور ان کو اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی۔ حضرت علیؓ صرف آغوش رسول کے پروردہ نہیں تھے بلکہ ان کی پاکیزہ زندگی بلند کردار کے شاہد عدل بھی تھے اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود غور وفکر اور تدبر وتعقل کی صفات سے متصف تھے۔ انھیں اسلام کی حقانیت کو سمجھنے اور ماننے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور اگلے ہی دن انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اور اس طرح انھوں نے حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اور یہ ایک فطری بات بھی تھی۔ وہ رسول کے پروردہ تھے اور انھی کے گھر میں رہتے تھے اور دونوں کے شب وروز ساتھ ساتھ گزرتے تھے۔ لہٰذا انھیں قبول اسلام کی سعادت اور حضور کے ساتھ نماز ادا کرنے کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوا۔

21.3.5 ہجرت

جب دار الندوۃ میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر اتفاق کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھی ہجرت کا حکم دے دیا۔ اس سے پہلے مظلوم مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مدینہ ہجرت کر چکی تھی اور مکہ میں رسول اللہ کے علاوہ قابل ذکر لوگوں میں صرف حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ باقی رہ گئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے کمزور اور ناتواں لوگ تھے جو ہجرت پر مختلف اسباب کی بنا پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ شب ہجرت اللہ کے رسول نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ آج رات ان کے بستر پر سوئیں کیونکہ انھیں ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔ اللہ کے رسول کے پاس کفار مکہ کی امانتیں تھیں آپ نے انھیں بھی حضرت علیؓ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ ان امانتوں کو واپس کرکے مجھ سے مدینے میں آکر ملو۔ اس وقت تک سازش کے مطابق کافروں نے رسول اللہ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا لیکن حضرت علیؓ کے جذبۂ ایمان و یقین نے ان خطرات کی کوئی پروانہ کی اور بستر رسول پر آرام سے سو گئے۔ شب ہجرت فداکاری و جان نثاری کا یہ عدیم المثال مظاہرہ حضرت علی کی کتاب عظمت کا ایک روشن باب ہے۔ دوسری طرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکل کر حضرت ابوبکر کے گھر آئے اور وہاں سے ہجرت کے لئے روانہ ہو گئے۔

کافر بار بار رسول اللہ کے گھر کے اندر جھانک کر دیکھتے اور حضرت علیؓ کو بستر نبوی پر محو خواب دیکھ کر مطمئن ہو جاتے لیکن صبح سویرے جب وہ قتل کے ارادے سے گھر میں داخل ہوئے تو حضرت علیؓ کو پایا اور بڑے غصے اور شرمندگی کے ساتھ واپس ہوئے اور رسول اللہ کی تلاش میں لگ گئے۔ حضرت علی تین دن تک مکہ ہی میں رہے۔ لوگوں کی امانتیں واپس کیں اور پھر مدینے کے لئے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؑ راتوں میں سفر کرتے تھے اور دن میں چھپ کر وقت گزارتے تھے۔ اس دشوار گزار سفر کے سبب آپ کے دونوں پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔

اس حال میں وہ مدینے پہنچے۔ جب رسول اللہ نے اپنے صحابہ میں مواخات اور بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت علیؑ سے فرمایا: ''أنت أخي في الدنيا والآخرة ''یعنی تم دنیا وآخرت میں میرے بھائی ہو۔ حضرت علیؑ مدینے میں بھی رسول اللہ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

21.3.6 حضرت فاطمہؓ سے نکاح

2ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چہیتی اور محبوب بیٹی فاطمہ کا نکاح حضرت علیؑ سے کر دیا اور حضرت فاطمہؓ سے فرمایا میں نے تمہارا نکاح اپنے اہل بیت کے سب سے بہتر شخص سے کیا ہے۔ نکاح کے بعد آپ نے دونوں پر وضو کا پانی چھڑکا اور انھیں خیر و برکت کی دعائیں دیں۔ نکاح کے گیارہ ماہ بعد حضرت فاطمہ کی رخصتی ہوئی اس کے لئے حضرت علیؑ نے حارث بن نعمان کا مکان کرائے پر لیا۔ خود اللہ کے رسول نے اس مقدس جوڑے کو نئی زندگی گزارنے کے لئے ضروریات زندگی کی کچھ چیزیں فراہم کیں جن میں بستر اوران کے لوازمات' چکی اور مشکیزہ وغیرہ تھے۔ لیکن یہ آج کے معروف معنی میں جہیز ہرگز نہیں تھا۔ عربی میں جہیز تیاری کے سامان کو کہتے ہیں خواہ وہ شادی شدہ جوڑے کے لئے نئی زندگی گزارنے کا سامان' مسافر یا فوج کی تیاری کا سامان ہو یا وفات یافتہ کی تیاری کا سامان ہو۔ چونکہ حضرت علی بالکل خالی ہاتھ تھے لہٰذا آپ نے حضرت فاطمہ کو ضروری سامان دیا، لیکن حضرت عثمانؓ چونکہ متمول اور مالدار تھے لہٰذا حضرت رقیہ اور ام کلثوم کو اس طرح کا کوئی سامان نہیں دیا تھا۔

حضرت علیؑ اور فاطمہ کی زندگی بے حد سادہ اور پر مشقت تھی۔ کئی کئی دن فاقوں کے سہارے زندگی گزرتی تھی۔ چکی پیستے پیستے فاطمہ زہراء کے ہاتھوں میں نشان پڑ جاتے تھے۔ حضرت علیؑ کی تنگ دستی اور فاقہ کشی کے باوجود ان کی محبت رسول کا یہ عالم تھا کہ ایک بار انھوں نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے تو ایک یہودی کے یہاں مزدوری کر کے صلۂ محنت کو حضور کی حذمت میں پیش کیا جو چند اجواء کھجور کی صورت میں تھا۔

21.4 غزوات

21.4.1 بدر سے فتح مکہ تک

حق و باطل کی پہلی لڑائی غزوۂ بدر میں ایک علم حضرت علیؑ کے ہاتھ میں تھا۔ لڑائی کی ابتداء میں عتبہ بن ربیعہ بڑے غرور و تمکنت کے ساتھ آگے بڑھا اس کے ساتھ اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید بھی تھا۔ اور اس نے مسلمانوں کو دعوت مبازرت دی اس دو بدو لڑائی کے لئے تین انصاری آگے بڑھے لیکن عتبہ نے انھیں واپس کر دیا' اور پکار کر کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہم پایہ لوگوں کو ہمارے مقابلے کے لئے روانہ کرو۔ اگر اللہ کے رسول چاہتے تو کسی بھی قریشی بہادر کو مقابلے کے لئے بھیج دیتے لیکن آپ نے اسلام و کفر کی اس پہلی لڑائی کے پہلے معرکے کے لئے اپنے قریب ترین رشتہ داروں کا انتخاب کیا اور حضرت حمزہ' حضرت علی

اور حضرت عبیدہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت علی نے ایک ہی وار میں ولید کا صفایا کر دیا۔ حضرت حمزہ نے شیبہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر ان دونوں نے مل کر عتبہ کو بھی ختم کر دیا البتہ حضرت عبیدہ شدید زخمی ہو گئے اور بعد میں شہید ہو گئے۔

بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ذوالفقار حضرت علیؓ کو عطا فرمائی تھی اور انھوں نے میدان جنگ میں اس کا حق ادا کر دیا۔

غزوۂ بدر میں بھی آپ نے خوب داد شجاعت دی۔ جب خالد بن ولید کے حملے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تو ثابت قدم رہنے والے اصحاب میں حضرت علیؓ بھی تھے آپ نے جان کی بازی لگا کر مشرکین کو پیچھے دھکیلا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد آپ نے ہی اسلامی علم کو تھاما۔ مشرکین کے علم بردار ابوسعید نے آپ کو للکارا تو آپ نے اس پر ایسا وار کیا کہ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور اس کا تہبند اتر گیا اسے اس حال میں دیکھ کر حضرت علیؓ اس کے پاس سے ہٹ گئے۔

اللہ کے رسول مشرکین کی پتھر بازی سے زخمی ہو گئے تھے۔ جب مشرکین کسی قدر پسپا ہوئے تو حضرت علی بعض صحابہ کی مدد سے انھیں پہاڑ پر لے کر گئے جہاں حضرت فاطمہ موجود تھیں حضرت علیؓ نے پانی ڈالا اور سیدہ فاطمہؓ نے آپ کے زخموں کو دھویا۔ جب خون بہنا کسی طرح بند نہیں ہوا تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کا ایک حصہ جلا کر راکھ کو زخم میں بھر دیا۔ جس اسلامی لشکر نے بنونضیر کو جلا وطن کیا اس لشکر کے علمبردار حضرت علیؓ تھے۔

غزوۂ خندق میں حضرت علیؓ نے اپنی شجاعت اور جنگی حکمت عملی کے خوب جوہر دکھائے۔ اسی غزوۂ میں حضرت علیؓ نے عرب کے مشہور شہسوار عمرو بن عبدودّ کی دعوت مبازرت قبول کی اور ایک ہزار سواروں کے برابر سمجھے جانے والے اس نامور عربی پہلوان کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

6ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے سفیر سہیل بن عمرو نے صلح نامہ سے ''رسول اللہ'' کے لفظ کو حذف کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اگر ہم انھیں رسول اللہ مانتے تو نہ ان سے جنگ کرتے اور نہ انھیں مکہ آنے سے روکتے۔ چنانچہ اللہ کے رسول نے فرمایا کہ اے علی جو پہلے لکھا ہے اسے مٹا دو۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کر سکتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود الفاظ کو مٹا دیا۔

21.4.2 فتح خیبر

فاتح خیبر، حضرت علیؓ کے القاب میں سے ایک لقب ہے۔ جو آپ کے لئے طرائے امتیاز میں سے ایک ہے۔ 7ھ میں معرکۂ خیبر پیش آیا۔ یہاں کے قلعے بے حد مضبوط و مستحکم اور فوجی نقطۂ نظر سے بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ یہ قلعے مدینہ سے ایک سو پندرہ کیلومیٹر کے قریب شمال میں واقع تھے۔ مسلمانوں نے یہاں کے کئی قلعوں کو فتح کر لیا لیکن القموص کا قلعہ کسی طور بھی فتح نہیں ہو رہا تھا اصحاب رسول میں سے کئی بزرگوں نے اسے مسخر کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ ایک رات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''کل میں ایک شخص کو عَلَم (قیادت) دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے فتح عطا فرمائے گا''۔

صحابہ کرام رات بھر منتظر رہے کہ یہ جلیل القدر منصب کسے ملتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے لئے اس منصب کی تمنا کرتا رہا۔ دوسرے دن اللہ کے رسول نے حضرت علی کو بلوایا جو آشوب چشم کا شکار تھے۔ آپ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا جس سے ان کے آنکھوں کی بیماری جاتی رہی اور اللہ کے رسول نے ان کے ہاتھوں میں علَم اسلام دیا اور فرمایا کہ پہلے انھیں اسلام کی دعوت دینا: اے علی! ''خدا کی قسم اگر کوئی ایک شخص تمھارے ذریعے ہدایت پا جائے تو تمھارے لئے لاتعداد سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''۔

حضرت علی القموص کی طرف بڑھے دوسری طرف یہودیوں کا سب سے بڑا بہادر مرحب ان کے مدمقابل آیا اور بہادری کے نشے میں مغرور رجزیہ اشعار پڑھتا ہوا حضرت علی کے روبرو کھڑا ہوا۔ دونوں میں مقابلہ شروع ہوا اور جلد ہی شیر خدا نے مرحب کے سر پرغرور کو اس کے تن سے جدا کر دیا۔ اور اس کے بعد قلعہ آسانی سے فتح ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی نے اپنی خداداد طاقت سے باب خیبر کو اکھاڑ کر اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ جس سے مسلمان بآسانی قلعے میں داخل ہو گئے۔

فتح کے بعد اسی سال یعنی 8ھ میں حنین کا معرکہ پیش آیا۔ مسلمان اس معرکے میں کامیاب ہوئے اور جب وہ مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہوئے تو دشمن نے ان پر حملہ کر دیا اور ایسی افراتفری مچی کہ اکثر لوگوں کے قدم اکھڑ گئے اور حضرت علی سمیت بہت تھوڑے لوگ ثابت قدم رہ سکے۔ حضرت علی نے اس مشکل گھڑی میں جس ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا وہ انھیں کا حصہ تھا اور آخر کار کامیابی مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔

21.5 مدنی زندگی

21.5.1 مدنی زندگی کے بعض اہم واقعات

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر حضرت علی نے خانۂ خدا کو بتوں سے پاک کیا۔ ایک بت کافی بلندی پر تھا اس کو گرانے کے لئے اللہ کے رسول حضرت علی کے کاندھوں پر چڑھے لیکن وہ جسم اطہر کا بار نہیں اٹھا سکے تو رسول اللہ نے انھیں اپنے شانوں پر سوار کیا اور انھوں نے اس بت کو مسمار کیا۔

رجب 9ھ میں ہونے والے غزوۂ تبوک کے موقع پر اللہ کے رسول نے انھیں مدینے میں رہ کر اہل بیت کی حفاظت کا حکم دیا تو حضرت علیؑ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں جہاد میں شرکت کے بجائے یہاں رہ کر عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا کام کروں۔ یہ سن کر اللہ کے رسول نے وہ کلمات کہے جو ان کے لئے باعث تسکین بھی تھے اور قابل افتخار بھی۔ آپ نے حضرت علی سے فرمایا:

''کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمھارا رتبہ وہی ہو جو موسیٰ کے نزدیک ہارون کا تھا البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

9ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے اس سال عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کے افراد نے مدینے آ کر اسلام قبول کیا۔ یمن سے آنے والی ایک جماعت کے ساتھ اللہ کے رسول نے حضرت علیؑ کو بھیجا۔ ان کی تبلیغ سے یمن کا قبیلہ ہمدان دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ یہ قبیلہ بہت بڑا اور بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ جب حضرت علی نے اس قبیلے کے مشرف بہ اسلام ہونے کی اطلاع رسول اللہ کو دی تو آپ فوراً سربسجود ہو گئے اور قبیلہ ہمدان کے لئے سلامتی کی دعا کی۔

9ھ میں مسلمانوں نے پہلا حج کیا اللہ کے رسول اس بار خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ حضرت ابوبکر کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ قافلۂ حج کی روانگی کے بعد سورۂ براءت نازل ہوئی اللہ کے رسول نے حضرت علیؑ کو اس سورت کی ابتدائی آیات کے ساتھ مکہ روانہ کیا اور فرمایا کہ قربانی کے دن ان آیات کو پڑھ کر لوگوں کو سنانا اور اعلان کر دینا کہ آئندہ سال کوئی بھی مشرک حج نہیں کر سکے گا اور نہ کسی کو برہنہ طواف کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے اس حکم کو پورا کیا۔

حجۃ الوداع میں حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ آپ یمن سے آ کر آپ کے ساتھ حج میں شریک ہوئے تھے۔ قربانی کے دن اللہ کے رسول نے سو جانور ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا، ترسٹھ جانور آپ نے اپنے ہاتھوں سے ذبح فرمائے اور باقی کو حضرت علی نے ان کی طرف سے ذبح کیا۔

حج کے خاتمے کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں جب غدیر خم نامی جگہ پر پہنچے تو لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں حضرت علیؑ کے مقام و مرتبے کا ذکر کیا اور فرمایا:

> ''میں جس کا حامی اور دوست ہوں علی بھی اس کے حامی اور دوست ہیں۔ اے اللہ جو علی کو دوست رکھے اسے دوست رکھ اور جو ان سے دشمنی کرے اس سے دشمنی کر۔''

21.5.2 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا سب سے زیادہ غم حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؑ کو ہوا۔ حضرت فاطمہؓ کا غم تو فطری تھا اور ایسا گہرا تھا کہ آپ نے چھ ماہ کے اندر اندر اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ لیکن حضرت علیؑ کا غم بھی کچھ کم نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان کے لئے سب کچھ تھی باپ، بھائی، ہادی، مشیر، دوست اور محرم راز۔ ان کے لئے رسول اللہ سب کچھ تھے۔ حضرت علیؑ چونکہ رسول اللہ کے سب سے قریبی عزیز تھے لہٰذا رسول اللہ کے تمام آخری مراسم انھیں کے ہاتھوں سے ادا ہوئے۔ حضرت عباس ان کے دونوں صاحبزادگان فضل اور قثم بھی آپ کے شریک تھے۔ غسل سے پہلے قبیلۂ بنوخزرج کے ایک بدری صحابی حضرت اوس بن خولی انصاری دروازے پر آئے اور آواز دی کہ اے علی آپ کو خدا کا واسطہ اس سعادت میں مجھے بھی شریک کر لیجئے چنانچہ حضرت علیؑ نے ان کو بھی اندر بلا لیا۔ حضرت علی نے غسل دیا۔ حضرت عباس اور ان کے صاحبزادگان رسول اللہ کو کروٹ بدلوا رہے تھے اور حضرت اسامہؓ پانی ڈال رہے تھے۔ رسول اللہ کی تدفین بھی انھیں حضرات کے ذریعے عمل میں آئی۔

21.6 حضرت علیؓ اور خلفاء ثلاثہؓ

21.6.1 حضرت علیؓ اور خلافت صدیقی

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شوری کے ذریعے اور مسلمانوں کے عام اتفاق سے عمل میں آئی تھی۔ اگر حضرت علیؓ کی تاخیر سے بیعت کی روایت صحیح بھی ہے تو اس کا سبب کوئی ذاتی عناد یا مسلمانوں کے اجماع سے اختلاف نہیں تھا بلکہ سیدہ فاطمہ زہراءؓ کی دل جوئی اور ان کی غمگساری تھی۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے سیدہ فاطمہؓ کی وفات کے فوراً بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کر لی اور ان کے فضل و مقام کا اعتراف کیا۔ جسٹس امیر علی لکھتے ہیں کہ:

> ''عربوں میں قبیلے کی سرداری کوئی موروثی چیز نہیں ہوتی تھی...... انتخاب متوفی سردار کے خاندان کے افراد میں سے ہوتا تھا اور اس کے عمر بزرگی اور فضل کی بنیاد پر ہوتا تھا...... ابوبکرؓ اپنی عقلمندی اور مزاجی اعتدال و توازن کے سبب ایک خاص مقام کے حامل تھے ان کے انتخاب کو حضرت علیؓ اور جملہ اہل بیت رسول نے اپنے روایتی اخلاص و وفاداری کے سبب قبول کر لیا۔''

حضرت علیؓ اور خلافت صدیقی میں ہمیشہ بطور مشیر شریک رہے۔ ہر چھوٹی بڑی مہم میں خلیفۃ المسلمین ان سے مشورہ کرتے رہے۔

21.6.2 حضرت علیؓ اور خلافت فاروقی

خلافت فاروقی میں بھی حسب سابق حضرت علیؓ امتیازی حیثیت کے حامل رہے۔ اور حضرت عمرؓ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا گئے تھے۔ دونوں حضرات کے خوشگوار تعلق کا ہی نتیجہ تھا جس نے آپس کی دوستی کو رشتہ داری میں بدل دیا۔ بایں طور کہ حضرت علیؓ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کر دیا۔ حضرت علی تمام مہمات میں خلیفۃ المسلمین کے شانہ بشانہ رہتے تھے۔ خواہ وہ فوجی امور سے متعلق ہوں یا انتظامی امور سے متعلق یا عدل و قضاء سے متعلق ہوں۔ ایک روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ: ''**لولا علی لا لهلک عمر**'' یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے۔ جب نہاوند کا معرکہ پیش آیا تو ایرانیوں کے عظیم الشان لشکر کے پیش نظر مسلمانوں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ حضرت عمر نے مدینہ میں اصحاب رسول کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے صواب دید سے مختلف مشورہ دیئے۔ حضرت عثمانؓ کی رائے یہ تھی کہ شام اور عراق کی فوجوں کے ساتھ ساتھ خلیفۃ المسلمین خود بھی مدینے سے فوج لے کر نکلیں اور تینوں افواج مل کر ایرانیوں کے لشکر کا مقابلہ کریں۔ لیکن حضرت علیؓ کا مشورہ اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے کہا کہ خلیفۃ المسلمین کو مدینے میں موجود رہنا چاہئے۔ اور وہ فوجی قیادت کے لئے کسی کو اپنا نائب مقرر کریں اور تمام والیوں کو بھی اپنے اپنے مقام پر رہنا چاہئے۔ کیونکہ خلیفۃ المسلمین اگر خود فوج کی قیادت کرتے ہیں اور انھیں خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ حضرت علیؓ کی یہ رائے ان کی دور بینی اور اخلاص دونوں کی دلیل ہے۔

حضرت علیؓ نے جنگ یرموک کے موقع پر بھی اسی طرح کا مشورہ دیا تھا۔اس کے برعکس فتح بیت المقدس کے وقت جب عیسائیوں نے یہ شرط رکھی کہ وہ شہر کی چابیاں براہ راست خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ میں دیں گے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے اس صورت حال سے انھیں مطلع کیا۔حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو مشورہ کے لئے طلب کیا' کئی صحابہ جن میں سرفہرست حضرت عثمانؓ تھے۔انھیں مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ بیت المقدس نہ جائیں کیونکہ اس میں عیسائی اپنی ذلت وحقارت محسوس کریں گے اور وہاں موجود فوج طاقت کے ذریعہ بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔لیکن جب حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی رائے دریافت کی تو ان کا مشورہ تھا کہ امیر المومنین کو بیت المقدس ضرور جانا چاہئے۔اس سے ایک طرف تو مسلمانوں کو جنگ سے نجات ملے گی اور غیر مسلمین کو ایک اچھا پیغام ملے گا۔دوسری طرف اس عظیم الشان تاریخی عمل میں آپ کی شمولیت ہوگی۔حضرت عمر کو یہی رائے پسند آئی۔جب آپ بیت المقدس تشریف لے گئے تو حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنایا۔ان کے علاوہ تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں۔جن سے حضرت عمرؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

21.6.3 حضرت علیؓ اور خلافت عثمانی

حضرت عثمانؓ بھی ہمیشہ حضرت علیؓ سے مشورہ کیا کرتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔حضرت عثمانؓ کے آخری عہد میں جب فتنہ وفساد شروع ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علی سے مشورہ کیا اور شورش اور فتنوں کا سبب جاننے کی کوشش کی۔حضرت علیؓ نے انھیں سچائی اور حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سارا فتنہ وفساد آپ کے بعض گورنر اور عاملوں کی بدعملی اور بے اعتدالی کے سبب ہے۔حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں نے ان عاملوں کے انتخاب میں اسی طریقہ کار پر عمل کیا ہے جس پر حضرت عمر کے زمانے میں عمل ہوتا تھا۔حضرت علیؓ نے فرمایا بلاشک عاملوں کے انتخاب کا طریقہ تو قدیم ہے لیکن عاملوں کے ساتھ آپ کا معاملہ حضرت عمر کے معاملہ سے مختلف ہے۔اپنے عاملوں پر حضرت عمر کا پورا کنٹرول تھا اور کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں تھی۔نہ کسی کو خلیفہ کے حکم میں کسی اضافے یا کمی کی ہمت تھی۔لیکن عمرؓ کے برخلاف آپ بے حد نرم ہیں اور اپنے عاملوں سے نرمی کا سلوک کرتے ہیں جس کے نتیجے میں تمام گورنر اور عمال اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں اور عوام سمجھتے ہیں کہ سارا کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔نتیجے میں لوگ آپ کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں۔جب حضرت عثمانؓ کے گھر کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا تو حضرت علی نے اپنے صاحبزادے امام حسن کو ان کی حفاظت پر مامور کیا۔محاصرین کو سمجھانے کی کئی بار کوشش کی اور ایک بار انھیں مدینہ سے واپس بھیجنے میں کامیاب بھی ہوئے۔لیکن ہوا وہی جو قضاء وقدر کے مطابق تھا۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کو سن کر حضرت علیؓ کو بے حد صدمہ ہوا اور ان کی حفاظت پر مامور امام حسن' امام حسین اور حضرت عبداللہ ابن زبیر کو ڈانٹ پھٹکار بھی لگائی۔مذکورہ بالا روایات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ خلفاء ثلاثہ کے عہد میں ان کے مخلص مشیر کے طور پر رہے اور امور خلافت کی انجام دہی میں ہمیشہ ان کے شریک رہے۔

21.7 منصب خلافت

21.7.1 انتخاب

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد صحابہ کرامؓ اور اہل مدینہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر حضرت علیؓ اس منصب کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے حضرت عثمان کی شہادت نے لوگوں کو بری طرح متاثر کیا تھا اور ہر فرد سکتہ میں تھا اور لوگ سمجھ نہیں رہے تھے کہ امت ان ہوشربا حالات اور ان کے اثرات سے کیسے نبرد آزما ہوگی۔ آخر انصار و مہاجرین کے اصرار پر حضرت علیؓ فتنہ و فساد اور اختلاف و انتشار کے اس ماحول میں منصب خلافت کی ذمہ داریاں اٹھانے پر تیار ہو گئے۔ ارباب حل وعقد مہاجرین و انصار اور عام مسلمانوں نے 21/ ذی الحجہ 35ھ کو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت علی نے خطبہ خلافت ارشاد فرمایا جس میں مسلمانوں کو اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے اور بھلائی کو اختیار کرنے کی نصیحت کی' مسلمان کی عزت و حرمت کی اہمیت کو بیان کیا اور کسی مسلمان کو ایذا دینے کی مذمت فرمائی۔ لوگوں کو قرب قیامت کی یاد دلائی اور انھیں قیامت کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنے اور اللہ کی معصیت سے بچنے کی تعلیم دی۔

حضرت علیؓ نے خلافت کی ذمہ داری ایسے وقت میں اٹھائی جب کہ اسلامی تاریخ کا سب سے مشکل' پیچیدہ اور نازک دور چل رہا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت سے لوگ بے حد غم و غصے میں تھے اور فوری طور پر قاتلوں کو سزا دلانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف حضرت عثمانؓ کی شہادت جس ہنگامے اور شور شرابے میں ہوئی اس میں قاتل کا تعین کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ سارے محاصرین کو قصاص میں قتل کر دیا جائے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ان کی اہلیہ حضرت نائلہ کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ انھوں نے گھر میں داخل ہونے والوں میں صرف محمد ابن ابی بکر کو پہچانا لیکن یہ گواہی بھی دی کہ محمد ابن ابی بکر حضرت عثمانؓ کی سرزنش کے بعد لوٹ گئے تھے اور ان کے قتل میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ خود محمد ابن ابی بکر بھی نہیں جانتے تھے کہ قاتل کون ہے؟

قانونی چارہ جوئی اور عدالت کے تقاضوں کو پورا کئے بغیر کسی کو سزا دینا ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف قصاص عثمان کا مطالبہ کرنے والوں میں مخلصین بھی تھے اور مفسدین و منافقین بھی تھے۔ عبداللہ ابن عامر حضرمی' مروان بن حکم اور سعید بن آس وغیرہ قصاص عثمان کا بہانہ لے کر خلیفۃ المسلمین کے خلاف ماحول سازگار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس پروپگنڈہ سے بہت سارے لوگ متاثر ہوئے جن میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ سرفہرست تھیں۔

دوسری طرف شام میں امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کی خون آلود قمیص دکھا کر لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خون کے حق کا قصاص لینے کے لئے تیار کیا۔ انھوں نے شام کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور حضرت علی سے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران حضرت علیؓ کو خبر ملی کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے بصرہ پہنچ کر لوگوں سے بیعت کر لی ہے۔ حضرت علیؓ بھی عراق پہنچ کر وہاں کے انتظامات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا آپ نے عراق کے سفر کا ارادہ کیا۔ حضرت عقبہ ابن عامر نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن حضرت علیؓ کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ عراق پہنچ کر اپنی پوزیشن کو مضبوط کریں اور شام' بصرہ اور مکہ معظّمہ میں جمع اپنے مخالفین کے خلاف مناسب کارروائی کر سکیں۔ چنانچہ حضرت علی کوفہ منتقل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ کے ساتھ اہل مدینہ کی اکثریت بھی کوفہ کے لئے نکل پڑی اور مدینے میں بہت تھوڑے سے لوگ باقی رہ گئے۔

21.8 واقعہ جمل

حضرت علیؓ نے کوفہ میں داخل ہونے سے پہلے ذی قار کے مقام پر قیام کیا اور وہاں سے کوفہ اور مدینہ کے لوگوں پر مشتمل اپنی فوج کو ترتیب دی اور بصرہ کے طرف رُخ کیا۔ حضرت علیؓ کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا۔ بلکہ وہ گفت وشنید کے ذریعہ حضرت طلحہ اور زبیر کو اپنا موقف سمجھانا چاہتے تھے اور اپنی بیعت کی دعوت دینا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہ بھی حضرت زبیر وطلحہ کے ساتھ شامل ہوگئی تھیں۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ جنگ کی نوبت آئے۔ چنانچہ فریقین میں اچھے ماحول میں گفتگو شروع ہوئی اور امید تھی کہ یہ قضیہ ناضیہ بحسن وخوبی طے پا جائے گا لیکن منافقین اور شر پسندوں کو یہ کب پسند تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا ہو چنانچہ ان شر پسندوں نے رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر حملہ کر دیا اور دونوں فریق نے یہ سمجھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور اسی غلط فہمی میں جنگ شروع ہوئی۔ بصرہ کی فوج کی قلب میں حضرت عائشہ کا ہودج تھا۔ ام المومنین کی موجودگی سے بصرہ کی فوج میں بے حد جوش وجذبہ تھا۔ اور اس فوج کی کمان حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ہاتھ میں تھی۔ دوران جنگ حضرت علیؓ حضرت زبیرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اے ابوعبداللہ کیا تمھیں وہ دن یاد نہیں جب تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک دن تم علیؓ سے ناحق جنگ کرو گے۔ حضرت زبیر کو جب اللہ کے رسول کی یہ پیشن گوئی یاد آئی تو وہ جنگ سے دست بردار ہوگئے۔ حضرت زبیر کو میدان جنگ سے نکلتے دیکھ حضرت طلحہ بھی کنارہ کش ہوگئے۔ لیکن مروان ابن حکم نے حضرت طلحہ کو میدان جنگ سے باہر نکلتے دیکھ۔ ایک زہر آلود تیر سے انھیں نشانہ بنایا۔ وہ میدان جنگ سے نکلنے میں تو کامیاب ہوگئے لیکن اس جان لیوا تیر نے ان کی جان لے لی۔ اب میدان جنگ میں صرف حضرت عائشہ تھیں اور ان کے نام پر ان کے چاروں طرف جوش وجذبات سے لبریز مسلمان اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے حضرت عائشہ کے اونٹ کو بٹھا کر حضرت علیؓ جنگ ختم کرانے میں کامیاب ہوئے۔

حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ لڑنے والوں کو عام معافی عطاء کی اور حضرت عائشہ کو پوری عزت وتکریم کے ساتھ مدینے بھیج دیا۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی محمد ابن ابی بکر اور بصرہ کی بہت ساری خواتین کو بھی بھیجا اور ام المومنین کے اعزاز واکرام کے اظہار کے لئے خود بھی کافی دور تک ساتھ رہے۔ حضرت عائشہؓ نے بھی اس اعزاز واکرام کا مناسب جواب دیا اور اپنے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

بصرہ میں چند روز قیام کرنے کے بعد آپ 12 / رجب 36ھ کے دن کوفہ میں داخل ہوئے۔ وہاں ان سے گذشتہ والیوں کے محل میں ٹھہرنے کو کہا گیا۔ لیکن حضرت علی نے ان عالیشان محلات میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا اور مسجد اعظم سے متصل ایک میدان میں قیام کیا اور یہی حضرت علی جیسے قانع اور زاہد کے شایان شان بھی تھا۔

21.9 جنگ صفین

حضرت علی نے کوفہ میں کچھ وقت اپنی حکومت کے نظم ونسق پر صرف کیا۔ اس کے بعد شام کی طرف متوجہ ہوئے اور امیر معاویہؓ کو اپنی بیعت کے لئے ایک قاصد کے ذریعے خط روانہ کیا۔ خط کا خلاصہ حسب ذیل تھا۔

’’تم سب پر میری بیعت لازم ہے کیونکہ جن مہاجرین وانصار نے ابوبکر عمر اور عثمان کو خلیفہ منتخب کیا تھا انھوں نے ہی میرا انتخاب کیا ہے......تم نے عثمان کی شہادت کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر تم قاتلین عثمان سے بدلہ لینے کا واقعی جذبہ رکھتے ہو تو پہلے میری اطاعت کو قبول کرو اور میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا اور تمہارا طریقہ نہایت دھوکہ اور فریب کا ہے۔‘‘

لیکن حضرت امیر معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے سے پہلے بیعت کے لئے تیار نہیں تھے حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ بنو امیہ کے علاوہ حضرت علیؓ کے تمام مخالفین اور ان کے برطرف کردہ سارے عاملین جمع ہو گئے تھے حضرت عثمانؓ کی خون آلود قمیص اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی صبح شام نمائش نے ہزاروں لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔ لہٰذا حضرت علیؓ کے بار بار اصرار کے باوجود بھی وہ قصاص عثمان سے پہلے بیعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ مجبوراً حضرت علیؓ کو امیر معاویہ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دونوں فوجیں صفین کے مقام پر جمع ہوئیں۔ میدان جنگ میں بھی حضرت علیؓ نے مصالحت کی آخری کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ ابتداء میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئیں اور صفر 37ھ میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ بے حد خوں ریز اور ہلاکت خیز تھی اور قریب تھا کہ شامی فوجیں شکست سے دوچار ہو جائیں۔ عمرو ابن عاص نے شامی فوجوں کے ذریعہ قرآن کو نیزوں پر بلند کرایا اور نعرہ دیا کہ کتاب اللہ ان دونوں کا فیصلہ کرے گی۔ حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ یہ ایک جنگی چال ہے اور شامیوں نے اپنی شکست کو قریب دیکھ کر یہ چال چلی ہے لیکن حضرت علیؓ ہی کی فوج میں کچھ ایسے لوگ نکل آئے جو حضرت علیؓ کے سمجھانے کے باوجود بھی قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہو گئے۔ عمرو ابن عاص کی اس حکمت عملی نے حضرت علیؓ کی فوج کو دو صفوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد عمرو ابن عاص اور ابوموسیٰ اشعری پر مشتمل دو رکنی مجلس تحکیم بنائی گئی تاکہ وہ کتاب اللہ اور سنت کے مطابق فیصلہ کرے صفر 37ھ کو یہ معاہدہ ہوا لیکن دونوں حکم کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی حضرت علی کی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے اس معاہدے سے اختلاف کیا اور انسانوں کو حکم بنانے پر اعتراض کیا۔ ان کے خیال میں انسان کا فیصلہ قبول کرنا اور اللہ کے دین میں انسانوں کو حکم بنانا غلط تھا چنانچہ ان لوگوں نے اسلام میں ایک مستقل فرقے کی بنیاد ڈال دی جسے خوارج کے نام سے جانا جاتا ہے۔

دوسری طرف مجلس تحکیم میں عمرو ابن عاص نے ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ مل کر جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا جائے چنانچہ فیصلہ سنانے کے وقت ابوموسیٰ اشعری نے حسب اتفاق دونوں کی معزولی کا اعلان کیا لیکن عمرو ابن عاص نے باہمی اتفاق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حضرت معاویہ کو اپنے اعلان میں ان کے منصب پر برقرار رکھا۔ اس تحکیم سے صرف یہ ہوا کہ جنگ بند ہو گئی اور خوارج کی صورت میں حضرت علی کے لئے ایک نئی مشکل کھڑی ہو گئی۔

خارجیوں نے رفتہ رفتہ ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر لی اور بہت سے لوگوں کو وہ لوگ اپنی یہ بات منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ دینی معاملات میں کسی انسان کو حکم یا ثالث بنانا کفر ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی نظروں میں عمرو ابن عاص ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ ان کو حکم بنانے والے یعنی حضرت علی اور امیر معاویہ اور تحکیم سے راضی ہونے والے سب کافر ہو گئے اور ان کی خوں ریزی مباح ہو گئی۔

بہت سارے لوگ اس عقیدے کے ساتھ متفق ہو گئے اور ان سبھوں نے عبداللہ ابن وہب کو اپنا قائد بنایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ سب نہروان میں جمع ہوئے اور قرب و جوار میں قتل و غارت گری کرنے لگے۔ حضرت علی نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کافی کوششیں کیں لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ نتیجے میں نہروان کی خوں ریز جنگ ہوئی اور اکثر خارجی اس جنگ میں مارے گئے۔

حضرت علیؓ کا پورا عہد اخلافت شامی مخالفت اور خارجی بغاوت سے مقابلہ کرنے میں گزر گیا اور انہیں فتوحات کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ نہ ہی ملکی ترقی اور اصلاح کی طرف وہ خاطر خواہ توجہ دے سکے۔ اگر حضرت علیؓ کو امن و امان کی صورت حاصل ہوتی تو وہ یقیناً عہد فاروقی کو واپس لانے میں کامیاب رہتے۔

21.10 شہادت

نہروان کے بعد اگر چہ خارجیوں کی مرکزی قوت ختم ہو گئی تھی مگر ان کے افراد مختلف شہروں میں اب بھی موجود تھے چنانچہ حج کے موقع پر چند خارجی جمع ہوئے اور آپسی گفتگو میں یہ طے کیا کہ مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لئے حضرت علیؓ، امیر معاویہ اور عمرو ابن عاص کو ختم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کام کے لئے تین خارجیوں نے بطور رضا کار اپنی خدمات پیش کیں: عبدالرحمان ابن ملجم نامی خارجی نے حضرت علی کے قتل کا ذمہ لیا اور نزال اور عبداللہ نامی خارجیوں نے امیر معاویہ اور عمرو ابن عاص کو قتل کرنے کا ذمہ لیا۔ رمضان 40ھ میں تینوں نے ایک ہی دن تینوں بزرگوں پر حملہ کیا۔ ابن ملجم نے فجر کی نماز میں اور حالت سجدہ میں حضرت علی پر تلوار سے وار کیا۔ تلوار زہر آلود تھی چنانچہ وہ زہر پورے جسم میں پھیل گیا اور 20/رمضان 40ھ کو آپ شہید ہو گئے۔ امیر معاویہ اور عمرو بن عاص کے قتل کے ارادے سے نکلنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔

21.11 نظام حکومت

21.11.1 ملکی نظم ونسق

حضرت علیؓ کا پورا عہد خلافت ہنگاموں کے نظر ہو گیا' لیکن اس کے باوجود آپ کے عہد میں بہت سارے قابل ذکر کام انجام پائے۔ حضرت علیؓ کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ زہد و تقویٰ کے جس راستے پر لوگوں کو لے جانا چاہتے تھے بدلی ہوئی صورت حال میں لوگ اس راستے پر چلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد حضرت علیؓ کے ساتھ تھی' انھیں حالات سے مجبور ہو کر عثمانی عاملوں اور گورنروں کو ہٹانا پڑا تھا۔ انھیں حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا سراغ بھی نہیں مل سکا تھا۔ یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے نہ صرف ان کے مخالفین کو ان کے خلاف پروپگنڈہ کرنے کا موقع دیا بلکہ سیدہ عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے علاوہ بھی بہت سارے غیر جانب دار یا خود ان کے طرفدار لوگوں کو ان کے خلاف غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔

حضرت علیؓ کا نظم و نسق حضرت عمرؓ کے طریقے کے مطابق تھا۔ وہ اپنے عاملوں کی نگرانی کرتے تھے اور ان سے سختی سے باز پرس کرتے تھے۔ ایک بار ''اردشیر'' کے عامل نے بیت المال سے قرض لے کر کچھ لونڈی اور غلام کو آزاد کیا' کچھ دنوں کے بعد حضرت علیؓ

نے ان کا محاسبہ فرمایا تو انھوں نے کہا کہ حضرت عثمانؓ اتنی چھوٹی چھوٹی رقموں کا کوئی حساب نہیں لیا کرتے تھے یہ تو ایک ایک پیسے کا حساب لیتے ہیں، اور چونکہ وہ عامل قرض ادا کرنے سے معذور تھا لہٰذا مجبوراً وہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھاگ کر پناہ گزیں ہوا۔

21.11.2 حضرت علیؓ کے عمال

حضرت علیؓ نے مدینے کو چھوڑ کر مرکز خلافت کوفہ کو بنالیا۔ عراق، ایران، خراسان، جزیرہ اور مصر آپ کی خلافت کے تابع رہا اور شام کبھی بھی آپ کے زیر تصرف نہیں رہا۔ 38ھ میں مصر بھی آپ کے ہاتھوں سے نکل گیا اور آپ کے خلافت کے آخری دور میں جزیرے کا نظم ونسق بھی پوری طرح سے آپ کے کنٹرول میں نہیں رہ گیا۔ مختلف تنظیمی اکائیوں میں مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل عمال تھے۔

1. مدینہ : سہل بن احنف، ابوایوب انصاری اور تمام بن عباس بن عبدالمطلب
2. مکہ : ابوقتادہ، قثم بن عباس
3. بحرین : عمر بن ابی سلمہؓ قدامہ بن عجلان، نعمان بن عجلان اور عبیداللّٰہ بن عباس
4. جزیرہ عربیہ: شبیب بن عامر، کمیل بن زیاد اور مالک اشتر (بعد میں یہ مصر کے عامل بنے)
5. مصر : محمد بن حذیفہ، قیس بن سعد بن عبادہ انصاری اور محمد بن ابی بکر صدیق
6. بصرہ : عثمان بن حنیف انصاری، ابوالاسود دولی اور عبداللّٰہ بن عباس
7. کوفہ : ابوموسیٰ اشعری، ہانی بن ہوذہ اور ابومسعود وغیرہ
8. فارس : سہل بن حنیف انصاری اور زیاد بن ابی سفیان
9. اصبہان : عمر بن سلمہ اور محمد بن سلیم
10. خراسان : خلید بن قرۃ، عبدالرحمان بن ابری اور جعدہ بن ہبیرہ

ان کے علاوہ آزربائیجان، بجستان، اہواز اور ہمذان میں بھی مختلف اوقات میں مختلف عاملین تھے۔

21.12 فضائل وکردار

21.12.1 فضائل ومناقب

حضرت علیؓ سبقت اسلام اور رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی قربت وقرابت کے سبب بے حد بلند مقام کے حامل ہیں حضرت شاہ ولی اللّٰہ دہلوی ''اِزالۃ الخفا'' میں لکھتے ہیں کہ امام احمد سے مروی ہے کہ جس قدر فضائل حضرت علیؓ کے وارد ہوئے ہیں کسی دوسرے صحابی کے نہیں۔ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور کاتبین وحی میں شامل تھے۔ علوم قرآن میں آپ کا مرتبہ بے حد بلند ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں جا بجا آپ کے اقوال ملتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کے سبب آپ نے تمامی اسلامی علوم میں دستگاہ حاصل کی' قضاء میں آپ کی عظمت و مہارت مسلم تھی۔اس کی بے شمار مثالیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔تصوف کے اکثر و بیشتر سلسلے ان پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ امت محمدیہ کے سب سے بڑے خطیب تھے۔وہ شاعری کا بھی اعلیٰ درجہ کا ذوق رکھتے تھے۔علم نحو کی ایجاد بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ: حضرت علی رسول اللہ کے بعد امت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ: علی ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں۔

21.12.2 اخلاق وکردار

حضرت علیؓ صفات عالیہ اور اخلاق نبویہ کے جامع تھے۔وہ بڑے عبادت گزار اور زاہد شب زندہ دار تھے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ''میرے علم کے مطابق وہ بہت زیادہ روزہ رکھنے والے اور بہت زیادہ عبادت کرنے والے تھے''۔سخاوت حضرت علیؓ کا نمایاں وصف تھا۔وہ اپنے آگے کا کھانا بھی سائل کو دے دیتے تھے۔قرآن پاک کی آیت کریمہ:

''**ویطعمون الطعام علی حبه مسکیناً و یتیماً وأسیراً**''

(یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

آپ اور آپ کے اہل بیت کی شان میں نازل ہوئی۔

حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی اور ان کے تواضع کا پیکر تھے وہ اپنی سوانح میں کبھی اونٹ چراتے ہوئے کبھی جوتا سلتے ہوئے اور کبھی فرش خاک پر بے تکلفی کے ساتھ سوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دشمنوں کے ساتھ آپ کا سلوک بھی قابل ذکر ہے۔آپ نے جنگ جمل میں جس وسیع القلبی اور عفوودرگزر کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔اپنے قاتل ابن ملجم کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تاکید فرمائی اور معمولی طور پر اس سے قصاص لینے کا حکم دیا۔اپنی دور بینی اور اصابت رائے میں وہ تمام معاصرین سے ممتاز تھے حتیٰ کہ عربی زبان میں یہ مثل مشہور ہوگئی کہ''ایک مسئلہ ہے لیکن اس کے لئے کوئی ابوالحسن (حضرت علیؓ) نہیں ہے''حضرت عمرؓ فرماتے تھے جیسا کہ اوپر گزرا کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

آپ کی اصابت رائے کا تذکرہ کتب حدیث اور تاریخ میں جا بجا ملتا ہے اور آج بھی آپ کے فیصلوں کو نظیر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے ایک بار ضرار صدائی سے کہا کہ: علی کا وصف بیان کرو' انھوں نے کہا: اگر اس کام سے مجھے معاف کر دیجئے تو بہتر ہے لیکن امیر معاویہ کے اصرار پر بولے:

''اگر ان کا وصف بیان کرنا ناگزیر ہے تو وہ خدا کی قسم بڑے دور بین اور قوت والے تھے۔بولتے تھے تو ان کی بات فیصلہ کن ہوتی تھی' فیصلہ کرتے تھے تو ان کا فیصلہ ہمیشہ عدل پر مبنی ہوتا تھا۔ان کے

ہر گوشے سے علم پھوٹتا تھا اور ہر پہلو سے حکمت کے چشمے جاری تھے۔ دنیا اور اس کی رعنائی سے وحشت کرتے تھے' رات اور اس کی تنہائی سے مانوس رہتے تھے۔ وہ بہت زیادہ عبرت پکڑنے والے اور غور وفکر کرنے والے تھے۔ کپڑوں میں پھٹا پرانا اور کھانے میں موٹا دانہ پسند کرتے تھے۔ وہ ہم میں ہماری طرح ہی رہتے تھے ہم جو بھی مانگتے تھے وہ عطا کرتے تھے...... میں نے انھیں دنیا کو مخاطب کرکے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ: اے دنیا میرے علاوہ کسی اور کو فریب دینے کی کوشش کر...... میں نے تجھے تین طلاقیں دے رکھی ہیں جس میں واپسی کا امکان نہیں ہے۔ تیری عمر مختصر اور تیرا خطرہ بڑا ہے' زادسفر کم اور سفر طویل ہے' اور راستہ بے حد پر خطر ہے'

یہ سنکر امیر معاویہ رونے لگے اور کہا: بخدا ابوالحسن ایسے ہی تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔

21.13 خلاصہ

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ ابن ابی طالب بن عبدالمطلب ہاشمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور رسول اللہ کی لخت جگر اور نور نظر سیدہ فاطمہ زہراؓ کے شوہر تھے۔ آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بھی ہاشمی تھیں آپ کی کنیت ابوالحسن اور ابوتراب تھی۔ آپ کا خاندان قریش کا سب سے معزز اور محترم خاندان تھا۔ حضرت علیؓ کی پیدائش بعثت نبوی سے دس برس پہلے ہوئی اور مشہور روایت کے مطابق آپ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی۔ حضرت علیؓ کی پرورش و پرداخت کا ذمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ آپ کی نشونما ہوئی۔ جمہور کے مطابق بچوں میں آپ سب سے پہلے ایمان لائے بعض روایتوں کے مطابق آپ مطلقا سب سے پہلے ایمان لائے۔ شب ہجرت آپ نے رسول اللہ کے بستر پر لیٹ کر شجاعت وفداکاری کا غیر معمولی نمونہ پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب سے محبوب اور چہیتی بیٹی فاطمہ زہراؓ سے آپ کی شادی کی اس طرح رسول اللہ سے آپ کی قربتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں آپ نے شرکت کی۔ فتح خیبر آپ کی خداداد بہادری کا نتیجہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت بے مثال تھی اور آپ بھی رسول اللہ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔

خلفاء ثلاثہ کے عہد حکومت میں حضرت علیؓ ان کے وزیر ومشیر کی حیثیت سے رہے اور اپنے غیر معمولی علم وفضل سے خلفاء کی معاونت اور مدد کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ ان کے مشوروں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد اتفاق سے ان کا انتخاب ہوا لیکن سیاسی وسماجی صورتحال کچھ اس قدر بگڑ چکی تھی کہ ان کا پورا عہد خلافت داخلی فتنوں اور شورشوں کے انسداد میں ہی گزرا۔ ان کے عہد خلافت میں جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے خونریز معرکے پیش آئے جن میں ہزاروں مسلمانوں کی جانیں گئیں۔ اور آپ خود بھی ایک خارجی ابن ملجم کے ہاتھوں رمضان 40ھ میں شہید ہوگئے۔ حضرت علی کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں امام احمد فرماتے ہیں کہ کی جس قدر فضائل حضرت علی کے وارد ہوئے ہیں وہ کسی اصحابی کے نہیں ہیں۔ آپ ہی کی ذات پر خلافت راشدہ کا خاتمہ ہوگیا۔

21.14 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجئے۔

1. حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب اوراخلاق وکردار پر روشنی ڈالئے۔
2. حضرت علیؓ کی سوانح حیات کے اہم واقعات کا جائزہ لیجئے۔
3. غزوات میں حضرت علیؓ کے کردار سے بحث کیجئے۔
4. حضرت علیؓ کی خاندانی وجاہت اوران کے قبول اسلام کا جائزہ لیجئے۔
5. خلفاء ثلاثہ کے ساتھ حضرت علیؓ کے روابط وتعلقات پر ایک نوٹ لکھئے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1. جنگ صفین کے اسباب ونتائج کو مختصر طور پر تحریر کیجئے۔
2. واقعہ جمل کو بیان کیجئے۔
3. خارجی کسے کہتے ہیں اور یہ فرقہ کیسے وجود میں آیا؟
4. حضرت علی کی خلافت کو اختصار کے ساتھ بیان کیجئے۔
5. حضرت علی کے ملکی نظم ونسق اوران کے عمال کا ذکر کیجئے۔

21.15 فرہنگ

آغوش	گود
مژدہ	خوشخبری
تولیت	نگرانی، انتظام
بازیافت	دوبارہ پانا
کفالت	نگہداشت، پرورش
کاشانۂ نبوت	نبی کا گھر
متمول	مالدار

پرمشقت	محنت بھری
مبارزت	دوبدولڑنا
صواب دید	مرضی، صلاح
شمولیت	شرکت
محاصرین	گھیرابندی کرنے والے
ہوشربا	ہوش اڑانے والے
ارباب حل وعقد	قائدین، ذمہ دار لوگ
سرزنش	ڈانٹنا
قضیہ نامرضیہ	ناپسندیدہ مسئلہ
قانع	زہدوقناعت والے
تحکیم	فیصلہ کرنا
دورکنی	دوممبروں پر مشتمل
صلاح وفلاح	بھلائی وکامیابی
دستگاہ	دسترس، قدرت، عبور

21.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الطبقات الکبری (اردو ترجمہ) ابن سعد
2. سیرالصحابہ شاہ معین الدین ندوی
3. المرتضی ابوالحسن علی ندوی
4. AShort History of the Saraceng - Ameer Ali Syed